من رقصم
Tu
&
Mein
ارشد ابرار ارش

من رقصم

ارشد ابرار ارش

قلمی تعارف

خدا نے ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی مخفی صفت رکھ چھوڑی ہے ۔جس لمحے اسے اپنے اس ہنر کا ادراک ہوتا ہے اسی لمحے ایک نئے انسان یا آرٹسٹ کا جنم ہو جاتا ہے ۔

ایک مصور تصویریں کیوں بناتا ہے؟کسی بھی مدھر دھن پر رقاصہ کے پاؤں خود بخود کیوں تھرکنے لگتے ہیں؟

بس یہی اس کا جواب ہے ۔۔۔یہ سب میرے اندر تھا اگر میں نہ لکھتا تو شاید اپنی ذات و وجود کی قید میں مر جاتا۔

کہانیاں اندر تھیں ،مشاہدے اور مطالعے نے اسے مہمیز کیا تو میرا لکھنا شروع سے طے تھا شاید۔

شعور کی آنکھیں کھلیں تو اپنے گھر میں پھٹے پرانے اور دریدہ حالت ڈائجسٹ دیکھے ۔تب ڈائجسٹ پڑھنا ایک فینٹیسی تھا جیسے کسی ونڈر ورلڈ میں قدم رکھنا۔

پہلی بار میری بڑی ہمشیرہ اپنی کسی سہیلی سے عمیرہ احمد کا ناول "پیر کامل" پڑھنے کیلیے مستعار لے آئیں تو یہ مجھ جیسے ایک کم فہم بچے کیلیے حیرتوں بھرا دن تھا۔

عمر کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے جب شہر پڑھنے کیلیے آیا تو کتابوں کے ایک نئے جہان سے روشناس ہوا۔

اب کتابوں سے یارانے کو کئی برس بیت چلے تو قریب پانچ چھ سال قبل ایک دن لکھنے بارے یونہی خیال سا آیا۔

قلم اٹھایا اور کہانی لکھنے بیٹھ گیا۔۔۔قلم سے اتری یہ پہلی کہانی "عشقاوے" تھی ۔یہ ابتدا تھی ،آگے کہانیوں کی ایک طویل کہانی ہے۔

اپنے سفر کے شروعات میں شاعری کی طرف زیادہ رجحان تھا لیکن بہت جلد ادراک ہو گیا کہ یہ میرا میدان نہیں ہے ۔پھر بتدریج ناول اور افسانے کی طرف آیا۔میرا مزاج اور اسلوب بھی افسانوی ہے ۔

اپنے قلمی سفر کی شروعات پرنٹ میڈیا سے کی تھی ۔سرگزشت ،سچی کہانیاں کے بعد دوشیزہ ڈائجسٹ میں بھی دو تین سال تواتر سے لکھتا رہا۔

سوشل میڈیا پر بھی لکھا ہے اور مختلف ویب سائٹس پر میرے ابتدائی ناول بھی شائع ہوئے ۔

فی الوقت صرف اپنے افسانوی مجموعے کو ہی کتابی قالب میں ڈھال پایا ہوں ۔آٹھ ماہ میں میری اولین کتاب "ریزگاری" کے دو ایڈیشن شائع ہوئے جو اب مارکیٹ میں اپنے اختتام کو پہنچ چکے ۔ خدائی کرم نوازی کہ میری کتاب قارئین میں پسندیدگی کی سند پانے میں کامیاب رہی۔

ارشد ابرار ارش

پہلا حصہ

زندگی ایک مسلسل سفر ہے۔اور سفر چاہے انفرادی طور پر کیا جا ہے یا قافلے کی شکل میں ہمیں منزل تک پہنچنے کیلیے کسی راہنمائی لازمی ضرورت پڑتی ہے۔

کیونکہ سچا راہنماء ہمیشہ سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔منزل کا تعین کرتا ہے

راہنما کا کام راستہ دکھانا ہوتا ہے کسی کو زبردستی سیدھے راستے پر چلانا نہیں

راہنما کے بغیر سفر ہمیشہ تھکا دیتا ہے۔ہم منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی بھٹک جاتے ہیں۔بے نشان منزلوں کے مسافر بن جاتے ہیں۔جن کا سفر کبھی اپنے اختتام کو نہیں پہچتا۔راستوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔گرد سے آنکھیں دیکھنے کی قدرت کھو دیتی ہیں۔اور پھر ہم آنکھیں رکھتے ہوئے بھی ہوا میں اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگتے ہیں۔مگر تب کوئی سہارا ہمیں میسر نہیں آتا۔کوئی ہاتھ ہمارے لیئے لاٹھی نہیں بنتا۔کوئی راہبر خضر نہیں بنتا۔

سفر آسان صرف تب ہوتا ہے جب ہم اپنے اصل راہنما کے پیروں پر چلتے ہیں۔وہ راہنما جو ہمیشہ سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔وہ پیر کامل جو ہماری انگلی پکڑ کر ہمیں بھٹکنے سے بچاتا ہے۔وہ مرشد جو ہمارے لیے ہماری منزل آسان بناتا ہے۔وہ راہنما صرف ایک ہی ہے صرف وہ جو ہادی عالم ہے۔وہ جو قیامت تک کیلیے اپنی کتاب سمیت ہر انسان کیلیے ہدایت کا آخری چراغ ہیں۔۔۔وہ راہنما جو ہمیشہ ہمارے لیئے متفکر رہتا تھا۔اپنی تن آسانیوں اور دنیاوی آسائشوں کو چھوڑ کر جس نے ہمیشہ صرف ہمارے لیئے آگے آسانی کی دعا مانگی۔ہمیں سیدھا راستہ دکھایا۔برے راستے پر چلنے سے خبردار کیا۔ہمیں ہماری منزل بتائی۔راستے کی دشواریوں سے آگاہ کیا۔اور منزل تک پہنچنے کیلئے سہارے میسر کیے۔مگر ہم میں

سے اکثر نے وہ سہارے ہی رد کر دیئے۔وہ راستہ ہی چھوڑ دیا جو ہماری منزل کو جاتا تھا۔تبھی تو دنیا میں ذلیل خوار ہو رہے ہیں۔اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔

اور وہ اسی ہادی عالم کے پیروں سے ہٹ گیا تھا۔اس نے آخری پیر کامل کی انگلی نہیں تھامی تھی۔تبھی راستوں نے اسے تھکا مارا تھا۔اس کا سفر کبھی نا ختم ہونے والا سفر ثابت ہوا تھا۔۔۔

دریائے سندھ سے کوئی پچاس میل دور اس پسماندہ ترین بستی میں ایک چوک پر بندر والا اپنے معصوم تماش بینوں کو بندر کے کرتب دکھانے میں مصروف ہے۔اس بڑھی ہوئی شیو اور الجھے بالوں والے گورے چٹے مالک کے کہنے پر بندر مختلف کرتب سے بچوں کو محظوظ کر رہا تھا۔کبھی بندر عینک لگا کر ایک ادا سے شاہ رخ کے جیسے چلنے کی اداکاری کرتا تو کبھی فوجیوں کی طرح زوردار سلیوٹ مار کے دکھاتا۔کبھی آٹا گودھنے کی ایکٹنگ کرتا تو کبھی شوہر سے ناراض بیوی کی طرح منہ پھلا کر دوسری طرف رخ پھیر لیتا۔ہر نئے کرتب پر اسکے تماش بینوں میں موجود بچے کھلکھلا کر تالیاں بجاتے تو وہاں موجود کچھ بڑے حیرت سے اس سدھارے ہوئے بندر کی کمال اداکاری کی داد دیتے۔تماشہ ختم ہو چکا تھا۔بندر اب اپنے سر پر ایک چھوٹا سا ڈبہ رکھ کے وہاں موجود تماشائیوں سے اپنی اداکاری کا معاوضہ لیتے ہوئے سرکل میں گھوم رہا تھا۔کچھ بچوں نے اپنے جیب خرچ کے چند سکے ڈرتے ڈرتے بندر کے اس ڈبے میں ڈالے تو وہاں موجود چند بڑوں نے بھی بچوں کی دیکھا دیکھی نا چاہتے ہوئے بھی اپنی جیب سے دس بیس کے نوٹ نکال کر ڈبے میں ڈال دیئے۔جبکہ کچھ نے تو بندر کے ڈبہ اٹھاتے ہی دائرے سے نکل کر قدموں کا رخ تبدل کر لیا۔

" بندر کی محنت کی کمائی ہے صاحب۔تماشہ دیکھ کر دل چھوٹا مت کریں صاحب۔کچھ نا کچھ تو دیتے جائیے۔معصوم بے زبان جانور ہے۔دعا دے گا میاں بھلا ہو" اس میلے کپڑوں والے بندر کے مالک نے تماشہ ختم ہوتے ہی کچھ لوگوں کو واپس جاتے دیکھ کر اونچی صدا لگائی۔مگر جانے والوں کے پاؤں واپس نہیں مڑے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنا تھوڑا سا سامان اور وہ پیسوں والا ڈبہ سنبھال کر بغل میں لٹکی رنگ برنگے

کپڑوں سے بنی تھیلی میں ڈال کر جانے لگا تو اس کچی بستی کے کچھ معصوم بچے بھی اس بندر کے پیچھے پیچھے چلنے لگے ۔بچوں کا جوش اور خوشی دیدنی تھی ۔ان کی آنکھوں میں اتری وہ چمک سوائے اس بندر والے کے شاید اور کوئی نہیں جان سکتا تھا۔اور میلے کپڑوں والا یہ سب کچھ اسی لیے ہی تو کرتا تھا۔ بندر کے پیچھے چلتے بچوں کا ہجوم آہستہ آہستہ کم ہوتا ہوا ختم ہوگیا۔بچے کھلکھلاتے شور مچاتے ایک دوسرے سے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے واپس اپنے گھروں کو لوٹ گئے

☆......☆......☆

شام ڈھلنے لگی تو وہ بھی آہستہ آہستہ چلتا چلتا شہر سے دو میل باہر اس خیمہ بستی پہنچ گیا جہاں پر ترتیب سے دس بارہ خیمے لگے ہوئے تھے ۔وہ آواز لگا کر اس قطار میں موجود تیسرے خیمے میں داخل ہوا جہاں بالا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

” آو صاحب ۔۔۔میں آپ ہی کی راہ تک رہا ہوں کب سے ۔کہیے میری ریشماں نے زیادہ تنگ تو نہیں کیا۔۔۔“ اسے خیمے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہاں زمین پر بچھی پرانی چٹائی پر سویا بالا جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

” بالکل بھی نہیں بالے ۔تیری ریشماں بڑی فرمانبردار نکلی تیرے ایک بار کہنے پر ہی مجھے مالک مان کر میرا حکم ماننے لگی“ اس نے بندر کی لمبی رسی بالے کو پکڑاتے ہوئے کہا

” ہاں بابو۔۔۔یہ بھلے بے زبان جانور ہے پر اپنے مالک کے حکم پر سر خم کر دیتا ہے ۔خود کو تابع فرمان کر دیتا ہے ۔سر جھکا دیتا ہے ۔یہ ہم انسانوں کی طرح تھوڑی ہے جو زبان اور عقل کے ہوتے ہوئے بھی اپنے مالک کو نہیں پہچانتے“ بالے نے بندر کو خیمے میں موجود ایک چھوٹی لوہے کی کلی سے باندھتے ہوئے اپنی دھن میں کہا۔

اور وہ جو بالے کے میلے کپڑے اتار کر اپنا مہنگا سوٹ پہن رہا تھا۔بالے کی بات سنتے ہی ایک ہتھوڑا سا لگا تھا اسکے دماغ پر ۔اسکے اپنی سفید اور بے داغ قمیض کی کریزیں درست کرتے ہاتھ یکدم رک گیے ۔اور اگلے ثانیے وہ سر جھٹک کر پھر کپڑے پہننے لگا۔

" ہاں بالے ۔۔۔سہی کہتے ہوتم ۔ہم انسان ہو کر بھی اپنے مالک کو بھول بیٹھے ہیں ۔اور یہ جانور ہو کر مالک کے تابع فرمان ہیں ۔"

" بابو جی ۔۔۔ہم انسان ہیں سب کچھ سمجھتے ہیں ۔عقل رکھتے ہیں اپنے برے بھلے کا اچھی طرح ادراک ہوتا ہے ہمیں ۔پھر بھی ہم غلط راہ کیوں چلتے ہیں ۔؟"

" کیونکہ ہمارے مالک نے ہمیں ڈھیل دے رکھی ہے ۔ہمیں چسکا لگ چکا ہے ۔ہم عادی ہو چکے ہیں ۔ہم اپنے مالک کی اس ڈھیل کا زمی کا فائدہ اٹھاتے ہیں ۔جان بوجھ کر غلطیاں کرتے جاتے ہیں ۔جب تک کوئی بڑا نقصان نہیں کر بیٹھتے ۔اور وہ اوپر سے بیٹھا ہمیں دیکھ رہا ہوتا ہے کہ میرا بندہ کس حد تک جاتا ہے ۔"

"تو سبق سیکھنے کیلئے کسی بڑے نقصان کا ہونا لازم ہے کیا؟ ہم پہلوں سے عبرت کیوں نہیں پکڑتے ؟"

" نہیں بالے لازم تو نہیں ہے ۔مگر ہم لازم بنا چکے ہیں ۔جب تک چوٹ نا ملے سیکھتے ہی نہیں ہیں ہم"

" اچھا بابو جی ۔۔۔ایک بات بتایئے ۔آپ کے پاس دھن ہے دولت عزت شہرت کسی چیز کی کچھ کمی نہیں دی اوپر والے نے ۔پھر کیا ضرورت ہے آپکو ہم جیسے بے گھر فقیروں کی کٹیا میں آنے کی اور اس طرح بھیس بدل کر یہ سب تماشہ کرنے کی ۔۔۔؟؟؟

" سچ بتاوں تو بالا اس سوال کا جواب خود میرے پاس بھی نہیں ۔شاید میں ادھورا ہوں ،شاید اپنی ذات کی کمیوں کو چھپانے کیلئے خود سے بھاگ رہا ہوں ۔یا پھر شاید یہ سب ایسا نا ہو جو میں نے کہا ۔کچھ اور ہو ۔کچھ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا ۔۔۔"

" اس نے اپنی جیب سے کچھ ہرے ہرے نوٹ نکال کر بالے کو تھماتے ہوے جواب دیا ۔

" صاحب کیوں شرمندہ کرتے ہیں ۔آپ ہر بار اتنا کچھ دے کے چلے جاتے ہیں ۔مجھے لیتے ہوئے شرم آتی ہے آپ سے ۔آپ واپس رکھ لیں انہیں " بالے نے پیسے پکڑنے سے انکار کر دیا

" رکھ لو بالے کبھی نا کبھی کام آجائیں گے ۔مجھے اتنی ضرورت نہیں ہے ۔میرے پاس بہت کچھ

ہے ۔رکھ لو یہ۔۔۔"

" چلتا ہوں بالا ۔۔۔زندگی باقی تو پھر ملیں گے۔" مغرب کے بعد اندھیرا چھاتے ہی وہ خیمے کا پردہ اٹھا کر بالے کو ایک بار پھر حیران پریشان چھوڑ کر چلا گیا۔

☆......☆......☆

مغرب کے بعد آہستہ آہستہ اترنے والے اندھیرے نے پورے گاؤں پر تاریکی کی ایک چادر سی تان دی تھی ۔گلیاں سنسان تھیں ۔گاؤں کے اس چھوٹے سے بازار میں اکادکا کھلی دکانوں میں لالٹین کی مدھم روشنی دکھائی دیتی تھی مگر بازار میں کہیں بھی کوئی دن والی رونق کا سماں نظر نہیں آتا تھا وہ تمام بوڑھے جو عصر کے بعد سارے دن کا حال احوال ایک دوسرے کو سنانے کیلیے اکٹھے ہوتے تھے وہ بھی مغرب ہوتے ہی کھانے کے بعد اپنے گھروں میں اپنی اپنی چار پائیوں پر گہری نیند میں گم دن بھر کی تھکاوٹ اتار کے سو رہے تھے ۔کہیں کہیں سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز کچھ وقت کیلیے گاؤں کی خاموشی میں خلل ڈال دیتی تھی ۔اگر گاؤں کے اس چھوٹے سے بازار سے نکلتی گلی میں جاؤ تو آگے دائیں ہاتھ مڑتی گلی کے آخرے سرے پر موجود اس گھر میں باقی گھروں کی طرح آج خلاف معمول بالکل بھی خاموشی نہیں تھی ۔اور نا ہی اتنے اندھیرے کے باوجود ابھی تک کوئی سو پایا تھا۔گھر کے صحن میں ترتیب سے رکھی لکڑی کی چار پائیوں میں سے پہلی چار پائی پر قمیض اتارے بیٹھے دین محمد عرف دینو کی غم و غصے بھری آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی

" سلطان ۔۔۔نوری تیری بچپن کی منگ ہے زبان دی تھی میں نے اپنی بہن کو۔۔میں ہر حال میں اپنی بہن سے کیا وعدہ نبھاؤں گا۔"

" ابا۔۔۔نہیں کرنی مجھے نوری سے شادی ۔آپ کو اپنی مری ہوئی بہن کا خیال ہے مگر میرا نہیں ۔میرا دل نہیں مانتا نوری کیلیے ۔بس میں نے بھی کہہ دیا" تیسری چار پائی پر کھانا کھاتے ہوئے سلطان نے دین محمد کو دو بدو جواب دیا۔

" کیسے نہیں کرے گا تو۔۔۔وہ تمہارے نام پر بچپن سے اس لیے نہیں بیٹھی کہ تو جوان ہو کر اسے

ٹھوکر مار دے ۔دیکھتا ہوں کیسے تو شادی نہیں کرے گا نوری سے ۔۔۔" دینو کی آواز میں حیرت کے ساتھ ساتھ غصہ بھی شامل تھا

" آہستہ بولو دین محمد ۔۔ہمسائے کیا سوچیں گے ۔مان جائے گا ۔میں سمجھاوں گی اپنے سلطان کو ۔" دین محمد کی چارپائی کے ساتھ زمین پر بیٹھی اسکی بیوی بختاور نے دین محمد کو خاموش کرانے کی ایک ناکام سی کوشش کی

" ہاں جیسے تیرے کہنے پر تو سر جھکا دے گا ۔مان لے گا تیری بات ۔اور سنتے ہیں تو سن لیں ۔دنیا کو بھی تو پتا چلنا چاہیے نا کہ دین محمد کی اکلوتی اولاد کتنی ناخلف ہے ۔کیا منہ دکھاوں گا میں اپنی بہن کو اگلے جہان کہ اسکی بیٹی کو بچپن سے اپنے پتر سے منسوب کرکے کسی غیر کے حوالے کر دیا ۔نا کبھی نہیں ۔مجھ سے تو نہیں ہو گا ایسا ۔کبھی نہیں ۔" اس بار دینو کی آواز میں غصہ کی بجائے دکھ زیادہ غالب تھا

" ہاں اماں ۔۔۔انکو اگلے جہان کی فکر ہے اس جہان کی اور اپنی اکلوتی اولاد کی کوئی فکر نہیں ۔آپ ہی بتاؤ اماں کیا جوڑ ہے میرا اور نوری کا ۔۔؟ وہ کھانا چھوڑ چکا تھا کیسے نا چھوڑتا لقمے اب حلق سے اترتے ہی نہیں تھے

" کیوں کیا کمی ہے نوری میں ۔۔۔دنیا سے زیادہ کو جھی نہیں ہے وہ ۔اور صورت کا اچار نہیں ڈالا جاتا پتر ۔چار دن بعد ڈھل جاتی ہے ۔اصل چیز سیرت ہوتی ہے اور پورا گاوں نوری کی سیرت کے گن گاتا ہے" اس بار اماں نے پیار سے اسے سمجھانے کی کوشش کی

" وہ بچپن سے تیرے نام سے بندھی بیٹھی ہے ۔ورنہ نوری کو بھی رشتوں کی کمی نہیں ہے" دین محمد نے بھانجی کی طرف داری کی ۔اور سچ ہی تو کہا تھا ۔اس کیلئے کہاں رشتوں کی کمی تھی ۔بس بچپن سے ہی سلطان کا نام اس کے نام کے ساتھ لگا دیا گیا تھا ۔ورنہ آج بھی گاوں کی کتنی عورتیں نوری کے گن دیکھ کے اسے حسرت سے دیکھتی ہیں ۔کہ کاش یہ گنوں بھری سانوی صورت ان کے آنگن اتر آتی

" کمی نہیں ہے تو بیاہ دیں نا اسے کسی کے ساتھ ۔میرے پلے کیوں باندھ رہے ہیں آپ لوگ ۔۔؟"

" سلطان تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو ۔۔۔وہ تیری منگ ہے ۔سالوں سے بیٹھی ہے تمہارے لیئے

۔ایسے کسی سے ساتھ کیوں بیاہ دیں اسے۔۔۔"

"تو میں نے نہیں کہا تھا میری منگ نوری ہو۔نا ہی کبھی یہ کہا کہ میرے نام پر اسے بٹھائے رکھو ۔میں تو چاہتا ہوں بھلے آج ہی بیاہ دو اسے میری بلا سے۔"

"پتر کیسی باتیں کر رہے ہو۔کوئی بھلا ایسے بھی کہتا ہے۔عقل سے کام لو کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔کہ نوری میں کوئی عیب ہوگا جو سلطان اس طرح انکار کرتا ہے بیاہنے سے۔بدنام ہو جائے گی وہ معصوم" اماں نے ایک بار پھر سے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی مگر سلطان نے کہاں سمجھنا تھا اس پر تو کسی اور کا بھوت سوار تھا

"بس اماں آپ لوگ جو بھی کہیں۔مجھے نوری سے کبھی شادی نہیں کرنی۔بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"واہ۔۔۔اس گھر میں تمہارا نہیں میرا فیصلہ چلتا ہے شہزادے۔اور میرا بھی یہ آخری فیصلہ ہے کہ تیری شادی ہوگی تو صرف نوری سے بس۔ورنہ کسی سے نہیں۔نوری نہیں تو کوئی اور بھی میرے گھر کی دہلیز پار نہیں کرے گی" دین محمد نے بھی بات ختم کر دی

"ٹھیک ہے ابا۔۔۔آپ اپنے فیصلے پر قائم رہیے اور میں اپنے فیصلے پر" سلطان کھانا ادھورا چھوڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کچے آنگن سے گزر کر گھر کی دہلیز پار کر گیا تھا

"دیکھ لے بختو۔۔۔اولاد بڑی ہوتی ہے تو باپ کی گردن میں سریا لگ جاتا ہے اسے مائڑ ہوتا ہے فخر ہوتا ہے کہ اب میری اولاد میرے کندھے تک پہنچ گئی ہے مگر اس نے تو میرے کندھوں تک پہنچتے پہنچتے ہی میرے دونوں کندھے ہی جھکا دیے ہیں"

دین محمد اپنا صافہ جھاڑتے ہوئے نیچے زمین پر بیٹھی بختاور سے بولے جو اب ارمان سے سر پکڑے بیٹھی تھی

"غم نا کرو۔۔۔سیکھ جائے گا ابھی جوانی نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔مگر مجھے یقین ہے میرا سلطان میری بات مان جائے گا میں پیار سے سمجھاؤں گی ساتھ بٹھا کر۔۔تم غم نا کرو" بختو کے لہجے میں ماں کی ممتا بول رہی تھی۔اور شوہر کو تسلی بھی تو دینی تھی۔جانے ایک عورت کو ایک ہی وقت میں کتنے

روپ دھارنے پڑتے ہیں

"عمران کے ساتھ یہ بھی ڈوب کر مر جاتا تو آج اتنا غم نا ہوتا" دین محمد نے کروٹ بدل کر صافہ منہ پر رکھ لیا

خدا جانے یہ سونے کی کوشش تھی یا آنسو چھپانے کی

مگر دینو کی آخری بات نے بختاور کا کلیجہ چیر دیا تھا

" خدا نا کرے ۔۔۔ کیسی باتیں کرتے ہو دین محمد ۔۔۔ ایک آخری سہارا ہی تو بچا ہے ہمارے جینے کا ۔۔۔ ایک تو خدا نے چھین لیا ۔۔۔ منہ دیکھنا بھی نصیب ہوا ۔ خدانخواستہ سلطان کو بھی کچھ ہو گیا تو ہم کس کیلئے جیئیں گے ۔ اور ہے ہی کون ہمارا ۔ یہی ایک آخری سہارا تو ہے"" بختاور کے سینے سے ایک دردناک آہ نکلی اور وہ اب منہ پر دوپٹہ رکھ کے رونا شروع کر چکی تھی

" زندگی ان کی بھی گزر جاتی ہے جو بے اولاد ہوتے ہیں" صافے کے نیچے سے دین محمد کے ہونٹوں نے حرکت کی تھی

" ہاں جانتی ہوں کہ کتنی سکھ سے گزرتی ہے ان کی زندگی ۔ ساری زندگی بے اولادی کی انی گڑی رہتی ہے سینے میں ۔ مر کے بھی قبر میں چین نہیں پڑتا کہ کوئی بھی پیچھے نام لیوا نہیں ہے ہمارا"

" تو اب اولاد کے ہوتے ہوئے ہم کون سا چین سے جی رہے ہیں ۔ کون سا سکھ دے دیا ہے سلطان نے ہمیں؟" دین محمد نے منہ سے صافہ ہٹا کر دو بدو بیوی کو جواب دیا

"سیکھ جائے گا ۔ مان جائے گا ۔ آپ دل برا نا کریں بس ۔" بختاور نے ایک بار پھر شوہر کو تسلی دی

مگر اس بار دین محمد کی طرف سے کوئی جواب نا آیا جیسے انکے سارے الفاظ ختم ہو گیے ہوں

رات کی تاریکی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا ۔ آدھے سے زیادہ گاوں سو چکا تھا ۔ دین محمد نے بھی خاموشی اوڑھ کر سونے کی کوشش شروع کر دی ۔ مگر بختو کا درد جاگ چکا تھا اسے اب رونا تھا ۔ اسے اب خدا جانے کب تک رونا تھا ۔ ایک بیٹے کو رونا تھا جو بچپن میں ہی دریا میں ڈوب کر وفات پا چکا تھا اور لاکھ کوششوں کے باوجود بھی سارا گاوں اسکی معصوم لاش ڈھونڈنے میں ناکام رہا تھا ۔

ایک زندہ اور جوان بیٹے کیلیے بھی رونا تھا جو ابھی ابھی غصہ میں گھر سے نکلا تھا۔خدا جانے وہ اب رات کے کس پہر واپس آئے گا مگر بختو ماں تھی اسے جاگنا تھا انتظار کرنا تھا اور رونا تھا۔۔۔

☆......☆......☆

گاؤں کی اس واحد چھوٹی سی مسجد سے بچوں کے زور زور سے سیپارہ پڑھنے کی ملی جلی آوازیں مسجد کے باہر تک آ رہی تھیں۔۔۔اس کچی پکی مسجد کے اندر جھانکو تو نورانی چہرے اور ماتھے پر سجدے کے ہلکے سے کالے نشان والے مولوی صاحب جائے نماز پر بیٹھے بچوں کو پڑھانے میں مصروف تھے۔مولوی صاحب کے آگے رکھی لکڑی کی پھٹی کے آگے ایک چھوٹا سا بچہ اور ایک 9 سالہ لڑکی جنت اپنا سبق سنا رہے تھے۔جب کہ مولوی صاحب کے آگے دائیں طرف لڑکیوں اور بائیں طرف لڑکوں کی ایک لمبی سی لائن آگے پیچھے ہل ہل کر زور زور سے اپنی گود میں رکھے سیپارے پڑھنے میں مصروف تھے۔

چند منٹ بعد جنت نے اپنا سبق سنا کر مولوی صاحب سے شاباشی وصول کی اور آگے کا سبق لے اپنی جگہہ واپس آ کے اپنا کل کا دیا ہوا سبق یاد کرنے لگی۔اس کے بیٹھتے ہی ساتھ والی لڑکی سبق سنانے چلی گئی تھی جبکہ دوسری لائن میں بھی اسی طرح لڑکے باری باری اپنا سبق سنا رہے تھے۔۔

جوں جوں لڑکے سبق سنا کر واپس آتے جا رہے تھے اسی لڑکوں والی لائن میں سب سے آخر میں بیٹھے خوشی کے دل کی دھڑکن کی رفتار ڈر کی وجہ سے اور زیادہ تیزی سے بڑھنے لگی تھی۔اور اس کے چہرے پر مولوی صاحب سے پڑنے والی مار کے سائے لہرانے لگے۔

آخر کچھ دیر بعد خوشی کی باری آ ہی گئی۔وہ ڈرتے ڈرتے نا چاہتے ہوئے اٹھا مگر مولوی صاحب کے آگے بیٹھتے ہی اسے وہ سبق بھی بھول گیا جو اس نے تھوڑی دیر پہلے بڑی مشکل سے یاد کیا تھا۔۔۔

"او بد بخت کبھی سبق یاد بھی کر لیا کر۔روز تمہیں مار پڑتی ہے مگر روز تمھارا وہی حال ہوتا ہے"

مولوی صاحب نے زور سے خوشی کا دایاں کان مروڑتے ہوئے غصے سے کہا

خوشی کی آواز بند ہو چکی تھی۔اور درد کی وجہ سے آنکھوں میں آنے والے آنسو اب اسکے گالوں تک پہنچ چکے تھے

"کل صحیح صحیح یاد کر کے سناؤں گا مولوی صاحب ۔وعدہ ۔۔۔آ آ آ۔۔" درد کی شدت سے خوشی چلا اٹھا

" روز تمہارے ایسے ہی وعدے ہوتے ہیں اور روز تمہیں مار پڑتی ہے مگر تم پر سر سے اثر ہی نہیں ہوتا ۔ڈھیٹ بن چکے ہو تم ۔عادت بنا لی ہے تم نے" مولوی صاحب نے اب اسکا دوسرا کان بھی مروڑنا شروع کر دیا

خوشی کے دونوں ہاتھ مولوی صاحب کے ہاتھوں کے نیچے اور درد سے آنکھیں سختی سے بند ہو چکی تھی ۔۔۔سارے بچے اپنا سبق بھول کر خاموشی سے سہمے ہوئے خوشی کو مولوی صاحب سے روز کی طرح مار کھاتے دیکھ رہے تھے ۔مسجد میں اب صرف مولوی اور درد سے روتے خوشی کی آواز سنائی دے رہی تھی ۔

" یاد کرتا تو ہوں ۔لیکن آپ کے سامنے آتے ہی بھول جاتا ہے سبق ۔" مولوی صاحب کی پکڑ ذرا ڈھیلی ہوئی تو خوشی نے اپنا مسئلہ بیان کر دیا

" اچھا ۔۔؟

کیوں میرے سر پر سینگ لگے ہوئے کیا ۔۔اور بچے بھی تو سناتے ہیں ۔انہیں سبق کیوں نہیں بھولتا ۔صرف ایک تمہیں بھول جاتا ہے روز ۔تم پڑھتے ہی نہیں ہو ۔دھیان کسی اور طرف ہو تو سبق کیسے یاد ہو گا تمہیں نالائق ۔۔۔" مولوی صاحب نے ایک بار پھر اس کے کانوں پر پکڑ سخت کر دی تھی جو اب کافی سرخ ہو چکے تھے ۔اور وہ اب درد سے بلبلا رہا تھا

" مولوی صاحب آج خوشی کو چھوڑ دیں کل میں اسے خود سبق یاد کروا دوں گی ۔۔" لڑکیوں والی لائن میں تیسرے نمبر پر بیٹھی جنت سے خوشی کا رونا برداشت نہیں ہوا تو اس نے ڈرتے ڈرتے مولوی صاحب سے معصومیت بھرے التجانہ لہجے میں درخواست کی ۔۔

باقی بچوں کے ساتھ مولوی صاحب نے بھی حیرانی سے جنت کو دیکھا پھر خدا جانے کیا سوچ کر انہوں نے خوشی کے دونوں کان چھوڑ دیئے جو اب تک سرخ لال ہو چکے تھے ۔مولوی صاحب سے چھٹکارہ پاتے ہی خوشی تیزی سے کان سہلاتا اپنی جگہہ واپس چلا گیا ۔

"ٹھیک ہے جنت ۔۔۔آج سے یہ تیری ڈیوٹی ہے کہ تم نے روز پہلے خوشی کو سبق یاد کروانا ہے پھر اپنا سبق سنانا ہے"

جنت مولوی صاحب کی بات پر سر ہلاتے ہوئے اپنی جگہ واپس بیٹھ گئی

"تم سبق یاد کیوں نہیں کرتے خوشی ۔۔۔روز مار کھاتے ہو مولوی صاحب سے" چھٹی کے بعد سارے بچے بھاگ کر گھروں کی طرف رواں دواں تھے تو خوشی کے ساتھ چلتی سیپارہ سینے سے لگائے جنت نے اس سے سوال کیا

"روز یاد کرتا ہوں مگر مولوی صاحب کے آگے جاتے ہی سارا سبق بھول جاتا ہے مجھے"

ایک ہاتھ سے سینے پر سیپارہ پکڑے اور دوسرا ہاتھ اپنے درد کرتے کان پر رکھے خوشی نے اسے جواب دیا۔

"اب میں یاد کروا دوں گی روز تمہیں۔اب کبھی نہیں ماریں گے تمہیں مولوی صاحب"

11 سالہ سانولے رنگ کا مالک خوشی ایسا ہی تھا۔اسے پڑھنے کے علاوہ باقی ہر چیز سے پیار تھا ۔روز مولوی صاحب کی مار اب معمول بن چکی تھی۔کبھی کبھی تو اسے خیال آتا کہ بس اب کبھی سیپارہ پڑھنے نہیں جانا مگر مجبوراً اسے مولوی صاحب کی مار کھانے اسے مسجد لازمی آنا پڑتا ورنہ دوسری صورت میں اسے اپنی نانی سے مولوی صاحب سے بھی زیادہ مار پڑتی تھی۔

اسکی دل ہی دل میں مانگی جانے والی دعاوں میں سے پہلی دعا یہ بھی ہوتی کہ اللہ کرے مولوی صاحب مر جائیں اور اس کی روز روز کی اس مار اور بے عزتی سے جان چھوٹ جائے۔مگر شاید خدا نے اسکی اس دعا کو کبھی قبول نہیں کرنا تھا

اور یہ تو چھوٹی چھوٹی ماریں تھیں۔جو بظاہر کچھ دیر کیلئے تکلیف دہ ثابت ہوتیں۔تھوڑی دیر سب کچھ نارمل ہو جاتا۔مگر اس نے زندگی میں ابھی اور بہت سی ماریں کھانی تھیں۔یہ تو شروعات تھی

☆......☆......☆

"ابا نہیں مان رہے ملوکھاں ۔۔۔میں ابھی ان سے جھگڑا کر کے آ رہا ہوں" سلطان نے ملوکھاں کا ہاتھ پکڑے اداس لہجے میں بتایا۔

سلطان خان جھگڑے کے بعد رات کی تاریکی میں سیدھا وہیں آیا تھا جہاں وہ دونوں ہمیشہ ملتے تھے

"کیا کہتے ہیں چچا دین محمد۔۔۔" ملوکھاں نے تجسس سے بھرپور لہجے میں پوچھا دوپٹے کا کونہ منہ

میں دبائے اس کے لہجے سے خوف واضح تھا۔حالانکہ پچھلے کئی مہینوں سے اسی جگہہ اسی طرح رات کی تاریکی میں ملتے تھے۔مگر آج اس کا دل ڈر رہا تھا وہ خوفزدہ تھی

"وہ کہتے ہیں مجھے ہر حال میں نوری سے شادی کرنی ہوگی۔ابا بہت غصے میں ہیں۔اماں بھی نہیں مان رہی۔دونوں سمجھتے ہیں کہ میں غلط کر رہا ہوں۔اور ایسا نہیں ہونے دیں گے کبھی" اس نے رات کے اندھیرے میں جانے کیا تکتے ہوئے ملوکھاں کے کانوں میں سیسا انڈیلا

"تو پھر۔۔۔اب کیا ہوگا" ناک میں پتلی سی لونگ ڈالے گھنگھریالے بالوں والی ملوکھاں کے لہجے سے جدائی کا خوف واضح جھلک رہا تھا۔

"دیکھو کیا ہوتا ہے۔جو ہوگا دیکھا ہی جائے گا"

"میں جانتی ہوں دینو چچا اپنی دھن کے پکے ہیں وہ اپنی منوا کر ہی رہیں گے" ایک اور خدشے نے سر ابھارا

"تو فکر مت کر۔۔۔دھن کا کچا میں بھی نہیں ہوں ملوکھی"

"چچا کہتے بھی تو ٹھیک ہیں۔نوری کا قصور بھی تو کوئی نہیں ہے جو اسے سزا ملے۔قصور تو صرف ہم دونوں کا ہے جو۔۔۔" نوری کو احساس تھا۔وہ بے حس نہیں تھی مگر اب موجودہ صورتحال میں وہ ایسے موڑ پر پہنچ چکی تھی جہاں اسے اپنے فائدے کے علاوہ دوسرا راستہ نہیں دیکھنا تھا

"ہاں جانتا ہوں۔پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ویسے بھی نوری کیلئے میرے دل میں کوئی جگہہ شروع سے ہی نہیں تھی۔ابا نے بچپن میں ہی زبردستی گانٹھ باندھ دی تھی۔

تمہیں چھوڑ کر نوری سے نہیں بیاہ سکتا میں۔نوری کی مجبوری ہم دونوں سے بڑی تو نہیں ہے۔سوچتا ہوں آگے ہمارا کیا ہوگا۔خود سے زیادہ تمہاری فکر ہے مجھے"

آدھی سے زیادہ رات بیت چلی تھی۔آسمان نے اپنے دامن میں لاتعداد ستارے ٹانک لیے تھے اور وہ دونوں اپنی محبت کی ناؤ کو کنارے لگانے کا عزم کر چکے تھے

"میں تو مر جاؤں گی سلطان۔تمہارے بغیر جینے سے موت اچھی ہے۔" ملوکھاں نے جدائی کے خوف سے روتے ہوئے کہا

"جھلی ہوگئی ہے ہوکیا۔ایسا کچھ بھی نہی ہوگا۔میں کچھ کرتا ہوں" سلطان نے اسے دلاسہ دیا
"کیا کر سکتے ہو تم آخر۔۔۔کچھ بھی نہیں۔۔۔یہ لوگ ہمیں کبھی ایک نہیں ہونے دیں گے"
"ایک تو ہم نے ہونا ہے ملوکھاں۔ہر صورت ایک ہونا ہے۔چاہے اس کیلئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔کسی بھی حد تک جانا پڑے بھلے"
"سلطان۔۔۔میں بدنام ہو جاؤں گی کوئی منہ نہیں لگائے گا مجھے۔ہمارا بچہ۔۔۔سلطان۔۔۔ابا مجھے قتل کر دیں گے" وہ اب سسکیوں میں رو رہی تھی
کچھ دن پہلے وہ دونوں اپنی محبت کو ناپاک کر چکے تھے
اسی طرح ایک رات کے کسی کمزور لمحے میں بہک کر وہ دونوں شادی سے پہلے ہی وہ سب کچھ کر چکے تھے جو عام الفاظ میں شادی سے پہلے ناپاک اور حرام گردانا جاتا ہے۔
احساس تب ہوا تھا جب سب کچھ ہو چکا تھا۔دونوں کی محبت نے اس رات ہوس کا چولا پہن لیا تھا۔جانے یہ محبت تھی بھی یا کچھ اور تھی
سلطان تو پھر بھی مرد تھا۔گاؤں چھوڑ سکتا تھا بھاگ سکتا تھا،لڑ سکتا تھا میرا کیا ہوگا۔۔۔؟؟؟؟؟
یہی اندیشے اسے اندر ہی اندر تڑپا رہے تھے
"کچھ بھی کرو سلطان مجھے بدنامی سے بچالو۔خدا کیلیے ورنہ میں زہر کھالوں گی"
"صرف ایک آخری راستہ ہے اگر تم ساتھ دو تو۔۔۔"
"میں ہر راستے پر تمہارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلوں گی۔بتاؤ کون سا راستہ ہے۔۔۔؟" وہ سلطان کی پجارن تو پہلے دن سے ہی تھی اس کی محبت کی بیڑیاں پہنے اس کی قیدی۔اور اب تو وہ اس موڑ پر تھی کہ اس کے آگے اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا
وہ خاموش ہوگیا۔کچھ پل ایسے ہی گزر گئے۔ملوکھاں مجسم کان بن کر اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کی منتظر تھی۔اس آخری راستے کے انتظار میں تھی جو سلطان سوچے بیٹھا تھا
"نکاح کر سکتی ہو میرے ساتھ۔۔۔؟؟؟

☆......☆......☆

دوسرا حصہ

یہ دریائے سندھ سے ملحقہ بستی شاہ والی ہے۔لوگوں کی زیادہ تر آبادی خط غربت سے بھی نیچے زندگی گزارنے پر مجبور۔کہنے والے کہتے ہیں کہ سینکڑوں سال پہلے یہاں کسی شاہ صاحب نے دریا کنارے اپنا خیمہ لگایا تھا۔ان کے بعد انکے مریدین دریا کے اس ویران کنارے پر آنے لگے۔

شاہ صاحب کے مریدین کے خیمے بڑھنے لگے۔یوں کچھ ہی ماہ میں یہاں ایک خیمہ بستی سی آباد ہوگئی۔شاہ صاحب اللہ والے تھے۔انہیں یہ دریا کنارہ بہت محبوب تھا۔اکثر جب عبادت سے فراغت نصیب ہوتی تو شام کو اپنے مریدین کے ساتھ اسی دریا کے کنارے ٹہلنے نکل آتے۔۔

شاہ صاحب کے قرب سے فیض پانے یہاں وہاں سے،آس پاس کے لوگ اسی دریا کنارے آباد ہونے لگے۔ضروریات زندگی اور آبادی بڑھنے لگیں تو خیموں میں گزارہ مشکل ہونے لگا۔لوگوں نے اپنی سہولت کی خاطر اور سرد و گرم سے بچنے کیلئے کچے پکے مکان بنانا شروع کر دیئے۔لوگ آنے لگے کچے پکے گھر بنانے لگے۔یوں یہ بستی تو آباد ہوگئی مگر چند سال بعد شاہ صاحب خدا جانے کیوں اپنے چند خاص مریدوں کے ساتھ اس بستی سے ہمیشہ کیلیے چلے گئے

اور پھر کبھی مڑ کر اس کچی پکی بستی واپس ہی نہیں آئے۔یوں شاہ صاحب تو ہمیشہ کیلئے اس بستی سے چلے گئے مگر ان کے نام کی یہ چھوٹی سی بستی یہیں رہ گئی۔لوگ یہیں رہ گئے۔بس اسی شاہ کی نسبت سے بستی کا نام شاہ والی پڑ گیا۔

آبادی بڑھنے لگی تو اس بستی کے عوام کو اپنے لیئے،اپنے بچوں کیلئے فکر معاش و روزگار ستانے لگی مگر یہاں اس ویران دریا کنارے ایسا کچھ بھی نہیں تھا جو روزی روٹی کا سبب بنتا۔ماسوائے اسی ایک دریا کے۔لوگوں نے اسی دریا کو اپنے لیئے رحمتِ خداوندی جانا اور اسی کو اپنا وسیلہ روزگار بنالیا۔کچھ لوگوں

نے اپنی مدد آپ کے تحت جنگلوں سے مضبوط لکڑیاں کاٹ کاٹ کر کشتیاں بنانا شروع کر دیں۔ کچھ لوگوں نے جال بننے شروع کر دیئے اور اس طرح اس بستی کے عوام نے ماہی گیری اور کشتی رانی کو اپنا ذریعہ معاش بنالیا

شاہ والی کے آدھے سے زیادہ عوام کا روزگار زندگی دریا سے جڑا ہوا تھا۔ زیادہ تر لوگ ملاح تھے لوگ دور دور سے آتے اور کشتیوں پر دریا کی سیر کرتے۔ دوسرا بڑا کاروبار اسی دریا کی مچھلی کا شکار تھا۔ یہ لوگ روز لاتعداد مچھلیاں پکڑ کر لاتے اور پھر یہاں سے مچھلیاں دوسرے شہروں میں بھیجی جاتی۔ نوجوان دریائی مچھلیوں کو مچھلی منڈیوں میں لے جانے لگے۔ جہاں انہیں ان کی محنت کا معقول معاوضہ مل جاتا۔ اس دریا کی دیسی مچھلی کی منڈی میں بڑی مانگ تھی۔ اس لیئے مچھلیاں منڈی میں پہنچاتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک جاتیں۔ شاہ والی کے لوگ محنت پسند تھے۔ جہاں دن بھر مرد دریا میں خواری کرتے وہاں عورتیں بھی گھروں میں فارغ نا بیٹھتی۔ اور اپنے مردوں کی معاونت کیلئے گھروں میں مچھلیوں کے ٹوکرے بناتیں، مچھلیاں پکڑنے کے لیئے بڑے بڑے اور مضبوط جال بناتیں

۔ یہاں کا ہر بچہ تیراک پیدا ہوتا تھا اور دریا کی محبت اسکے خون میں رچی ہوتی۔ اور کیوں نا رچی ہوتی بھلا۔۔۔ یہی دریا تو ان کے جینے کا، ان کی روزی روٹی کا واحد وسیلہ تھا

لوگ ان پڑھ تھے، مگر جاہل نہیں تھے۔ دینی و دنیاوی شعور رکھتے تھے۔ شروع میں بجلی کی سہولت نہیں تھی۔ مسائل بدرجہ اتم موجود تھے مگر پھر بھی اس گاؤں کے لوگ محبتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ شام کو گاؤں کے واحد بازار میں بڑے بوڑھے لکڑی سے بنائی گئی چھوٹی چھوٹی چوکیوں پر چائے کے پیالے ہاتھوں میں پکڑے ایک دوسرے سے سارے دن کے حال احوال پوچھتے تو ان کی یہ محفلیں گھنٹوں طویل ہو جاتیں۔ محبتیں بانٹی جاتی۔ ایک دوسرے کے ساتھ اپنے مسائل بانٹے جاتے۔

لوگ اچھے تھے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ گاؤں میں پردے کا سرے سے رواج بھی نہیں تھا پھر بھی ان کی عزتیں محفوظ تھیں۔ گھروں کے کواڑ ساری ساری کھلے رہتے مگر پھر بھی سب چین کی نیند سوتے۔ کبھی کسی کو چوری ڈکیتی کا اندیشہ نا ہوتا۔

ایسا نہیں تھا کہ دریا نے صرف ہمیشہ ان لوگوں کو فائدے دیئے ہوں۔اسی دریا نے بستی شاہ والی کے کئی نوجوان سپوت بھی زندہ نگل لیے تھے۔ہر سال دریا میں آنے والی طغیانی کئی بار یہاں کے واسیوں کے کنارے کے ساتھ بنے کچے گھر ساتھ بہا کے لے جاتی۔مگر بستی شاہ والی کے عوام پھر بھی دریا سے بہت پیار کرتے۔یہ سندھ دریا ان سب کیلیے خدا کی خاص مہربانی تھی۔

دریا کی طرف سے ملنے والے زخموں میں ایک زخم آج سے 21 سال پہلے دین محمد کے گھرانے کے حصے میں بھی آیا تھا۔تب دین محمد مچھیرا تھا۔پوری شاہ والی بستی کا سب سے مشہور مچھیرا اور تیراک۔اس کے سینے میں طاقت تھی، بازوؤں میں دم تھا۔جب کبھی گاؤں کے نوجوانوں کے ساتھ دریا میں تیراکی کو پاؤں ڈالتا تو لہروں کو ایسے چیرتا ہوا آگے بڑھتا جیسے تیز دھار قینچی کسی ملائم کپڑے کا کاٹتی گزرتی ہے

ایسا بہت ہی کم ہوتا تھا کہ کبھی دینو روز کے شکار سے خالی ہاتھ واپس آیا ہو اسے دریا کی ساری مچھلیوں کے بارے علم تھا۔اسے یہ بھی علم ہوتا تھا کہ کونسی مچھلی دریا کے کس کونے میں زیادہ پائی جاتی ہے۔وہ بھی ایسی ہی ایک شام تھی۔دین محمد روز کے شکار سے ابھی واپس نہیں آیا تھا۔اور بختو اپنی ہمسائی کے ساتھ دریا پر کپڑے دھونے میں مصروف۔سلطان تب تین ماہ سے بختاور کے پیٹ میں پل رہا تھا اور۔بختو کا تین سالہ بیٹا عمران ان دونوں سے زرا دور دریا کے کنارے چھوٹے پانیوں میں ہمسائی کے چھوٹے بیٹے کے ساتھ اپنے ننھے ہاتھوں میں گیند پکڑے کھیلنے میں مگن۔وہ دونوں کھیلتے کھیلتے تھوڑی دور نکل آئے تھے یہاں پانی ان دونوں کی ناف کو چھونے لگا تھا

اچانک ایک بے رحم لہر آئی جس سے عمران اپنا توازن برقرار نا رکھ پایا اور گر گیا۔پانی اسکی ناک اور منہ میں داخل ہونے لگا۔دوسرا ہمسائی کا معصوم بیٹا گھبرا کے پیچھے بھاگ گیا مگر اس کے کنارے تک پہنچنے سے پہلے ہی دریا کی بے رحم موجیں عمران کو اپنے ساتھ بہا کر کہیں دور لے جا چکی تھی۔

جب بختاور کو عمران کا خیال آیا اور اپنی بے دھیانی پر چونکی تو دیکھا کہ کنارے پر ہمسائی کا معصوم لڑکا اکیلا خوف زدہ حالت میں منہ پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔بختو نے ادھر ادھر دیکھا مگر عمران اسے کہیں نظر نا

آیا تو کپڑے چھوڑ کر دیوانہ وار ہمسائی کے بچے کی طرف بھاگی اور پاگلوں کے جیسے اس سے پوچھنے لگی مگر وہ طفل خوف سے آواز نہیں نکال سکا۔اسی اثنا میں اسکی ماں بھی اس تک پہنچ گئی۔کافی دیر سوالات کے بعد اس طفل نے ایک ہاتھ سے پانی کی طرف اشارہ کیا۔تو بختاور اندھا دھند پانی کی طرف بھاگی مگر ہزار کوششوں کے باوجود بھی وہ عمران کو کہیں نا ڈھونڈ سکی

اتنے میں آس پاس موجود لوگ بھی جمع ہونے لگے تو 3،4 جوان اور پانی میں اترے۔بختاور کا بخت آج گہنا چکا تھا اس سے پہلے وہ کبھی دریا میں اتنا آگے نہیں آئی تھی پانی اس کے سینے کو چھونے لگا تو بختو کے بھائی نے زبردستی واپس اسے کنارے کی طرف کھینچنا شروع کر دیا کہ بھانجا تو گیا خدا نا کرے کہ بہن بھی۔۔۔

ایک بندے کو کشتی میں دین محمد کی طرف روانہ کیا گیا۔تھوڑی ہی دیر میں دین محمد بھی اپنی کشتی میں آپہنچا۔مضبوط اعصاب کے مالک دین محمد کو یقین تھا کہ وہ عمران کو ڈھونڈ نکالیں گے۔مگر ساری رات گاؤں کے دو چار مشہور تیراکوں کے ساتھ دین محمد نے پورا دریا چھان مارا مگر اسے عمران کہیں نا ملا۔خدا جانے دریا کی بے رحم لہریں اسے کہاں تک بہا لے گئیں۔اس تلاش کے سارے دورانیے میں بختاور نے دریا کے کنارے کو ایک سیکنڈ کیلیے نا چھوڑا۔مگر ممتا کی آہوں،فریادوں اور سسکیوں پر بھی دریا کو رحم نا آیا اور اس کی لہروں نے عمران کا معصوم لاشہ باہر نا پھینکا۔۔۔

،دین محمد کی تلاش کا سلسلہ تین دن تک جاری رہا۔مگر بے سود۔۔۔بس اسی دن سے دین محمد نے دریا میں کبھی پاؤں نا رکھنے کی قسم کھا لی۔شاہ والی کے مشہور تیراک اور شکار باز دین محمد نے دریا کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا،اس نے تیراکی چھوڑ دی،اس نے مچھلیوں کا شکار کرنا چھوڑ دیا۔

عمران کے زخم پر زرا کھرنڈ جما تو دین محمد نے روزی روٹی کے لیے کچی اینٹیں بنانے کا کام شروع کر دیا۔وہ ایک شریف النفس اور محنتی انسان تھے سو کام چل نکلا۔گاؤں اور آس پاس کے لوگ اینٹوں کے لیے صرف دین محمد پر ہی بھروسہ کرتے۔وہ اینٹوں کیلئے مٹی گوندھتا۔ایک مخصوص قالب سے اینٹیں بناتا۔انہیں دھوپ میں سوکھنے کیلیے الگ الگ رکھ دیتا۔اور جب اینٹیں مکمل خشک ہو جاتیں تو

انہیں ایک ترتیب سے ڈھیر کی شکل میں سجا دیتا۔نزدیکی گاؤں میں موجود اینٹوں کے بھٹے کا مالک اس سے اینٹیں خریدتا یوں دین محمد کا روزی روٹی ایک بار پھر چل نکلا۔اینٹیں بنانے کا کام مچھلیاں پکڑنے سے زیادہ مشکل اور محنت طلب تھا مگر پھر بھی دین محمد ہمیشہ اپنی قسم پر قائم رہے اور اس نے اپنے بیٹے کے پھر کبھی پانی میں قدم نہیں رکھا

6 ماہ بعد خدا نے بختاور کی جھولی میں سلطان خان کو ڈالا ۔گویا عمران کا بدل عطا کر دیا۔سلطان خان بچپن سے ہی گورا چٹا تھا۔اوپر سے ماں باپ نے ہمیشہ ہاتھ کے چھالے کی طرح رکھا۔عمران کے حصے کا پیار بھی سلطان خان کے حصے میں آنے لگا۔اس بے جا پیار اور لاڈ نے سلطان خان کو قدرے اکھڑ اور ضدی بنا دیا تھا۔اس کی ہر بات ہمیشہ منہ سے نکلتے ہی پوری ہو جاتی،جو پوری نا ہوتی وہ اپنی ضد اور اکھڑ مزاجی کے سبب منوا لیتا۔

یوں جیسے جیسے سلطان بڑا ہونے لگا اس کی ضد اور انا پرستی بھی بڑی ہونے لگی۔وہ ہر پسند آنے والی چیز کو حاصل کر کے چھوڑتا۔وہ لوگ غریب تھے مگر سلطان ہمیشہ اونچے خواب دیکھتا۔اپنے گھر میں والدین نے ہمیشہ اسے شہزادے کی طرح رکھا تو اس عمل سے سلطان کا دماغ ساتویں آسمان پر جا پہنچا وہ خود کو صرف اس گھر کا ہی نہیں کسی ریاست کا شہزادہ سمجھتا۔بچپن سے ہی حسن پرست واقع ہوا ہر خوبصورت اور چمکدار چیز اس کا دل لبھاتی۔اور وہ اسے پانے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔اس کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں اس کے دل میں ایک نرم گوشہ بھی موجود تھا۔شاید بختاور اور دین محمد کی تربیت کا اثر کہیں نا کہیں تو موجود تھا ۔دونوں اپنے بیٹے کو اپنی جان سے زیادہ پیار کرتے تھے۔

بچپن میں ہی دادا جان کی خواہش پر نور بانو کو سلطان خان کے پلے باندھ دیا گیا۔منگنی ہوئی تو سلطان خان نے کوئی اعتراض نا کیا بلکہ اسے اندر ہی اندر عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ایک اجنبی سا خوش کن احساس تھا کہ اس کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام بھی جڑا ہوا ہے۔کوئی اور بھی اس کے نام کے ساتھ بندھی بیٹھی ہے

مگر لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھتا سلطان ایک دن دریا پر کپڑے دھوتی کمہاروں کی لڑکی

ملوکھاں سے نین لڑا بیٹھا۔

نوری، ملوکھاں کے مقابلے میں ذرا سانولی رنگت کی تھی اور بچپنے کی یتیمی نے اسے خاموش طبع بنا دیا۔
جبکہ ملوکھاں ذرا صاف رنگ کی گھنگریالے بالوں والی چلبلی طبیعت کی مالک لڑکی تھی۔ جو بولتی تو باقی ہر چیز خاموش ہو کے صرف اسے سننا شروع کر دیتی۔

سلطان خان نے دل ہی دل میں نوری کا موازنہ ملوکھاں سے کیا تو اسے ملوکھاں والا پلڑا جھکا ہوا ملا۔ اسی جھکے ہوئے پلڑے نے سلطان خان کے قدم ملوکھاں کی جانب کھینچے

ملوکھاں نے بھی اپنی سہیلیوں کی زبانی سلطان خان کے ابھرتے اونچے قد اور خوبصورتی کے چرچے سن رکھے تھے۔ اور جب یہی سلطان خود چل کے اس کے پاس آیا تو اسے اس پل اپنی قسمت پر رشک آیا پھر ملوکھاں کو بھی پگھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

دونوں محبت کی پھولوں بھری شاہراہ پر ہمقدم چلنے لگے۔ یہی دن تھے جب سلطان کے دل میں نوری کیلیے تھوڑی سی جو جگہہ تھی اس پر بھی ملوکھاں نے قبضہ کر لیا۔

وہ روز رات کے اندھیرے میں اپنی محبت کی تسکین کیلیے ملنے لگے۔ سلطان کا جگری دوست کلیم اللہ عرف کلی رات کو پہرہ دیتا اور وہ دونوں دنیا سے بے خبر ایک دوسرے میں ڈوب جاتے۔ روز رات کو نوری کو چھوڑ کے ملوکھاں کو اپنانے کی ترکیبیں سوچی جاتی۔ اور ایک رات ایسی بھی آئی کہ سلطان خان خود سے شرمندہ بیٹھا تھا اور ملوکھاں دوسری طرف منہ کیئے اپنے گھٹنوں میں سر چھپائے رو رہی تھی۔ شیطان نے اس کالی تاریکی بھری رات میں انکی آنکھوں پر گناہ کی کالی پٹی باندھ دی تھی مگر اب خود سے شرمندہ ہونے یا گھٹنوں میں منہ چھپا کے رونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ملوکھاں سلطان کے عشق میں مکمل ڈوب چکی تھی۔ مگر سلطان کے دل میں جانے نوری کی محبت تھی یا نہیں مگر وہ اس کے حسن کا دلدادہ ضرور تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح اپنی عادت سے مجبور سلطان اچھی چیز کو اپنانے کی خوشی میں ملوکھاں کو نوری پر فوقیت دینے لگا

اور دوسری طرف سلطان کی محبت میں مبتلا نور بانو کی راتیں آسمان پر تارے گنتے اور کروٹیں بدلتے گزر جاتی۔ بن ماں کی بچی تھی۔ زمانے کی تلخیوں نے اس کی زبان پر ان دیکھے تالے لگا دیئے

تھے۔خاموشی کو اس نے سر کی چادر کی طرح اوڑھ لیا۔اوپر سے سلطان کی بے توجہی اور بے اعتنائیوں نے اندر ہی اندر چور چور کر ڈالا تھا۔مگر نوری نے اپنے اندر پڑتی دراڑوں کو کبھی باہر اپنے بدن کی سطح تک نا پہنچنے دیا کہ مبادا کہیں کوئی اس کا اندر نا پڑھ لے۔جہاں سلطان خان کی محبت ایک چھوٹے سے پیڑ کی صورت سے پرورش پاتے پاتے اب ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکی تھی کر چکی تھی۔

نوری نے کبھی کسی انسان کو خود پر حاوی نا ہونے دیا مگر سلطان خان کی محبت کے آگے وہ بھی گھٹنے ٹیک کر کسی پجارن کی کی طرح ہاتھ باندھے طابع فرمان ہوگئی

یہ اور بات ہے کہ کبھی اس نے اس بات کا ادراک سلطان خان کو بھی نا ہونے دیا کہ منگنی کے ساتھ ہی اس کے دل میں جو محبت کی کلی پھوٹی تھی وہ اب تناور درخت بن چکی۔ہے۔سلطان جس قدر بے اعتنائیاں برتتا،نوری بھی خود کو اس قدر بے پرواہ ظاہر کرتی۔شخصیت کی مضبوطی کے اس جھوٹے خول نے اس کے اندر کی دراڑوں کو سلطان خان سمیت سب کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا تھا،

☆......☆......☆

خوشی سیپارہ سینے سے لگائے گھر میں داخل ہوا تو نانی تاج آج بھی ساتھ والے گاوں سے آئے کسی لڑکے کا ٹوٹا بازو جوڑ رہی تھی۔۔۔

" آگیا میرا چنل۔۔۔سلام کیوں نہیں کیا آتے ہوئے" نانی تاج نے پہلے پیار اور پھر تیوری چڑھاتے ہوئے پوچھا

مگر خوشی کوئی بھی جواب دیئے بغیر سیپارہ اندر قرآن شریف رکھنے والے لکڑی کے ڈبے میں رکھنے کے بعد باہر آ کر ایک چار پائی پر ڈھیر ہوگیا۔۔۔

" لگتا ہے آج پھر میرے چنل کو مار پڑی ہے مولوی صاحب سے" نانی تاج نے خوشی کے سرخ کانوں کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

خوشی نے بغیر کوئی جواب دیئے منہ بسور کر اپنا رخ تبدیل کر لیا۔سفید بالوں والی نانی تاج کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ساتھ ساتھ وہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لڑکے کے بازو پر لکڑی کے پیمانے

کو توڑ کر بنائے گئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھنے کے بعد اب انگوپٹی سے کس کر باندھ کے جکڑ رہی تھیں

نانی تاج سارے گاؤں کی نانی تھی۔بہت شفیق ،نیک ،عزت دار،اور پاک دامن عورت۔پچپن برس کی عمر میں بھی ان کا چہرہ چاند کی طرح چمکتا تھا۔گاؤں کے بڑے بتاتے ہیں تاج اس گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔بغیر کسی میک اپ کے خوبصورت دمکتا چہرہ ،اونچا لمبا قد ،خدا نے اسے مردوں کے جیسی طاقت سے نوازا تھا۔جوانی میں اپنے باپ اور بھائیوں کے شانہ بشانہ مردوں کی طرح کام کرتی تھی۔

اس کی شادی اپنے دوسرے بھائی کے وٹے میں بھابھی کے بھائی سے ہوئی۔بھائی کی اپنی بیوی سے نا بن پائی تو اس نے بیوی کو طلاق دے دی۔تاج کے شوہر اقبال کی غیرت جاگ اٹھی اس نے سارا غصہ بیوی پر نکالا اور شادی کے پہلے سال ہی بھری جوانی میں تاج کو طلاق دے کر گھر بھیج دیا۔

تاج کے منہ سے پھر بھی کبھی کسی نے اپنے شوہر کا شکوہ نہیں سنا۔اس نے اسے بھی خدا کی رضا سمجھ کر صبر شکر کر لیا۔

دوسرے سال بھائی نے دوسری شادی کر کے دوبارہ گھر بسا لیا مگر پورا گھر مل کر بھی تاج کو دوسری شادی پر راضی نا کر سکا۔اس کی کوئی اولاد نہیں تھی جس کے لیے وہ اپنی جوانی قربان کرتی۔مگر پھر بھی تاج دوسری شادی پر آمادہ نا ہوئی۔خدا نے ماں باپ کا سہارا واپس لیا تو بھائیوں کے در پہ آگئی۔

اللہ نے اسے ہنر دے دیا۔گاؤں میں کسی کی بھی ہاتھ ،بازو ،ٹانگ ٹوٹتی یا کبھی پاوں میں موچ آتی وہ سیدھا تاج کے پاس بھاگتا۔اسکی شہرت آس پاس کے گاؤں تک جا پہنچی۔لوگ دور دور سے آنے لگے اور تاج مخلوق خدا کی خدمت کرتی رہی۔اپنی بھری جوانی سے لے کر اب تک تاج نے کبھی کسی مرد کے سامنے اپنا پردہ نا اتارا۔

کبھی کسی نے کچھ دے دیا تو بسم اللہ پڑھ کے رکھ لیے نہیں تو نا کسی سے کچھ مانگا اور نہ کبھی شکوہ کیا۔۔۔

خوش بخت صرف نام کا خوش بخت تھا۔پیدا ہوا تو ماں کو زچگی میں ہی کسی پیچیدہ مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔بروقت علاج نا ہونے کے باعث خوشی کی ماں اس کی پیدائش کے تین گھنٹے بعد اس جہان

فانی سے کوچ کر گئیں۔خوشی پہلے دن سے ہی اپنی نانی کی گود میں آگیا۔تین سال بعد نانی بھی ساتھ چھوڑ گئیں تو نانی تاج نے خوشی کی پرورش کا ذمہ لے لیا۔تب سے اب تک خوشی کو انہوں نے پالا تھا

باپ کا چہرہ اس نے آج تک دیکھا ہی نہیں تھا جو اس کی پیدائش سے چند ماہ پہلے مزدوری کی غرض سے کراچی گیا تو آج تک واپس نا آیا۔نا کبھی کوئی خط نا کوئی چٹھی ،اور نا کوئی اپنی خیر سلامتی کا پیغام بھجوایا۔خدا جانے زندہ بھی تھا یا۔۔۔

خوشی کی پروش تاج کی قسمت میں آئی تو وہ نیک بخت اس معصوم کی پرورش خدا کی خود پر رحمت اور زریعہ نیکی سمجھ کر کرنے لگیں۔ضروریات محدود تھیں۔تھوڑا بہت خرچ خوشی کا نانا احمد کمہار بھجوا دیتا۔زندگی اپنی پرانی ڈگر پر دوڑنے لگی۔

"نانی مجھے روز سیپارہ کیوں یاد نہیں ہوتا۔۔۔؟؟؟"

ساتھ والے گاوں سے آئی عورت دعائیں دے کر واپس گئی تو خوشی ،نانی تاج کے پاس آ بیٹھا

"کیوں کہ ابھی تم نے اللہ سے پکی دوستی نہیں لگائی۔

"اللہ سے دوستی کیسے۔۔۔؟"

"قرآن سارا اللہ کی باتیں ہی تو ہیں۔جب تم اللہ سے دوستی لگاو گے تو اسکی باتیں بھی سمجھ آنا شروع ہو جائیں گی۔"تاج نے اسکی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے سمجھایا۔

"اللہ سے دوستی کیسے کرتے ہیں۔؟"ایک اور معصومانہ سوال آیا تھا

"اللہ کی مخلوقات سے دوستی کر کے،ان سے پیار کر کے،انکی مشکلوں میں مدد کر کے،نماز پڑھ کے قرآن شریف دل لگا کر پڑھنے سے،سبق سہی توجہ سے یاد کرنے سے۔"نانی تاج نے سمجھاتے ہوئے اس کی الجھن دور کر دی۔

"سچ میں۔۔۔؟؟؟"

"ہاں سچ میں۔۔۔اور جس سے اللہ دوستی کر لیتے ہیں تو پھر اسے بہت سے انعام بھی دیتے ہیں۔تم نماز پڑھا کرو اور سبق پڑھتے وقت سارے خیال چھوڑ کر صرف یہ سوچ کر سبق یاد کیا کرو کہ یہ سیپارے

والا سارا سبق ہمارے دوست اللہ کی باتیں ہیں۔اور اللہ تب خوش ہو گا جب ہم اس کی باتوں پر توجہ دیں گے۔پھر دیکھنا تمہیں کبھی سبق نہیں بھولے گا" نانی تاج آہستہ آہستہ خوشی کی پرورش کر رہی تھی بالکل ویسے جیسے اسکی اپنی ماں نے تاج کی پرورش کی تھی

"اللہ پھر مجھے کون سا انعام دیں گے۔۔۔؟"خوشی کی سوئی انعام پر اٹک گئی

"اللہ انعام میں پھر تمہیں جنت دیں گے۔۔۔"

"جنت۔۔۔؟ وہ تو ابھی بھی میرے ساتھ ہوتی ہے روز۔اور اسے سبق بھی آتا ہے ہمیشہ۔" وہ معصومیت سے بولا

"اس جنت کے علاوہ آسمانوں سے اوپر بھی ایک جنت ہے۔بہت خوبصورت ہے وہ جنت۔تم اللہ سے دوستی لگاؤ گے تو پھر اللہ بدلے میں تمہیں وہی خوبصورت جنت دیں گے۔۔۔"

"وہ جنت کتنی خوبصورت ہے نانی۔۔۔؟"

"وہ جنت بہت خوبصورت ہے خوشی۔۔۔ساری دنیا سے خوبصورت"

"اس جنت سے بھی وہ جنت زیادہ خوبصورت ہے کیا۔۔۔؟"

"ہاں اس جنت سے بھی بہت زیادہ خوبصورت ہے جنت۔" نانی اس کی معصومیت پر مسکرا دی تھیں اور نرمی سے اس کا گال دائیں ہاتھ سے چھوا

☆......☆......☆

ہفتے کی شام اسلام آباد کا موسم رنگ بدلنے لگا تو شہریوں نے بھی پارکوں اور تفریحی مقاموں کا رخ کیا۔راول جھیل کنارے واقع اس لیک ویو پارک کی رونقیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ہفتہ اتوار ویسے ہی یہ پارک لوگوں سے بھرا رہتا ہے۔اور اگر اوپر سے موسم بھی سہانا ہو تو سونے پہ سہاگا ہو جاتا ہے۔آج بھی یہ جھیل کنارے بنا خوبصورت پارک لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ہر طرف رنگا رنگ کپڑوں اور پینٹ شرٹس میں ملبوس لوگ ان خوبصورت لمحات کو کیمروں میں اتارنے میں مصروف تھے۔کہیں کہیں کوئی گوری چمڑی والے انگریز بھی دکھائی دے رہے تھے۔کچھ لڑکے ان انگریزوں کو پکڑ کر سیلفیاں

اتارنے میں مصروف تھے

لوگوں کی آمد کا سلسلہ ابھی تک تھما نہیں تھا۔داخلی دروازے سے ابھی بھی لوگ ٹولیوں کی صورت میں آرہے تھے۔گاڑیوں کی بھی ایک لمبی قطار تھی۔

وہیں لوگوں کے بیچوں بیچ داخلی دروازے سے آگے بنی اینٹوں کی شاہراہ پر ایک اندھا اپنے کندھے میں کٹ بیگ ڈالے، سر پر بلیک ٹوپی اور آنکھوں پر بلیک چشمہ لگائے، فولڈنگ لاٹھی ٹیکتا چھوٹے چھوٹے قدموں سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔پارک میں داخل ہونے کے بعد ابھی اس نے تھوڑا ہی سفر کیا تھا کہ لوگوں کی اس بھیڑ میں وہ ڈگمگا کر گر پڑا۔اس کا گھٹنہ اینٹوں کے پکے فرش پر لگنے سے چھل گیا۔تبھی پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک مہربان لڑکے کو اس پر ترس آیا تو اس نے آگے بڑھ کر اندھے کو اٹھایا۔اور اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے لوگوں کے بیچوں بیچ راستہ بناتا چلنے لگا۔

"نام کیا ہے آپکا۔۔۔؟" لڑکے نے اندھے سے تعارف کی غرض سے پوچھا۔

"نام میں کیا رکھا ہے۔نام تو نامیوں کے بھی مٹ جاتے ہیں۔۔" اندھے نے لنگڑا کر چلتے ہوے جواب دیا۔

ہاتھ تھامے لڑکے کو اندھے کا جواب دلچسپ سا لگا

"پھر بھی کوئی نام تو ہوگا آپکا۔۔۔" لڑکے نے اس بار مسکراتے ہوے وہی سوال کیا

"ماں باپ سے جو نام ملا وہ یاد نہیں۔۔۔لوگوں کو جیسے سہولت ہو اسی نام سے بلا لیتے ہیں۔۔۔"

اندھا واقعی دلچسپ تھا

"کمال ہے۔۔۔ویسے یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔معزرت کیساتھ کیونکہ آپ دیکھ تو سکتے ہی نہیں۔"

"سچی بات پر معزرت نہیں کی جاتی۔اور دیکھنے کیلیے صرف ان دو آنکھوں کا ہونا لازم نہیں ہوتا" اندھے نے دوسرے ہاتھ سے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوے کہا۔

"اچھا باتیں تو آپ کمال کی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ اور کیا کرتے ہیں آپ۔۔۔؟"

"کچھ بھی کر لیتا ہوں۔من کی منشا جو بھی ہو کر لیتا ہوں"

" آپ نے بتایا نہیں کہ یہاں کیا کرنے آئے ہیں ۔ یا ہماری طرح آج موسم کی لطافت کا فائدہ اٹھانے آئے ہیں؟"

" موسم تو روز ہی اچھا ہوتا ہے بس اندر کا موسم اداس نہیں ہونا چاہیئے ۔"

لڑکا مرعوب ہو کر خاموش ہو گیا۔ سبزے کے بیچ میں بنا چبوترہ آ چکا تھا۔ لڑکے نے اندھے کو اس چبوترے پر بٹھایا اور خود لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔ اس اندھے نے شکریہ ادا کرنے بعد کندھے سے لٹکا بیگ اتارا اور ٹٹولتے ہوئے اس کی زپ تلاش کر کے زپ کھولی ۔۔۔

اندر ہاتھ ڈالا اور جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اندھے کے سفید خوبصورت ہاتھ میں ایک بانسری تھی ۔ زپ دوبارہ بند کر کے بیگ کو گھٹنے تلے رکھا اور بانسری لبوں سے لگائی ۔۔۔

پھونک مارنے کی دیر تھی کہ بانسری کے سر ہوا میں بکھرنے لگے ۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ لوگوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے ارد گرد لوگ دائرے کی صورت میں جمع ہونے لگے ۔۔۔

اندھا بہت خوبصورتی سے کسی انڈین گانے کے سر بکھیر رہا تھا۔ بانسری میں ماری جانے والی پھونک اس کی انگلیوں کی تھوڑی سی حرکت کے بعد جب سوراخوں سے باہر نکلتی تو اس خوابناک ماحول کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہوئے سننے والوں کے کانوں میں سر گھول دیتی ۔۔۔

گانا ختم ہوا تو کسی منچلے نے ایک اور گانے کی فرمائش کر دی ۔ اندھے نے بانسری پھر لبوں سے لگا کر پھونک ماری تو اس بار دھن اسی لڑکے کی فرمائشی تھی ۔ لڑکے نے تالیاں بجائی تو پورا مجمع اسے داد دینے لگا ۔۔۔ پھر یہ سلسلہ رکا نہیں ۔۔ فرمائشیں رکی نہیں اور اندھے نے بھی سب کی فرمائش پوری کی ۔۔۔

تھوڑی دیر بعد اس نے بیگ کھول کر بانسری رکھی اور جب اس بار اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس کے ہاتھوں میں ایک خوبصورت سا گٹار تھا۔ اندھا گٹار کی تاروں سے انگلیوں سے کھیلنے لگا ۔۔۔ لوگ اندھے کے ہنر پر حیران رہ گئے ۔۔۔ فرمائشیں بڑھنے لگی اور وہ سب کے فرمائشی گیت بجانے لگا ۔۔۔ پورا مجمع تالیاں بجا بجا کر اس کے ہنر کی تعریف کر رہے تھے ۔ وہیں لوگوں کے اس ہجوم میں موجود ایک انگریز گورے لڑکے نے اسے جسٹن بیبر کے ایک نئے گانے کی فرمائش کی تو وہ گٹار سے وہی فرمائشی انگلش

گانا بجانا شروع کر دیا۔اس انگریز لڑکے کے ساتھ ساتھ سارا مجمع عش عش کر اٹھا۔تبھی کہیں دور سے کانوں میں مغرب کی اذان سنائی دی تو اندھے کی گٹار کی تاروں سے کھیلتی انگلیوں کو اچانک بریک لگ گئی لوگوں کو ایسے لگا جیسے کوئی سحر ٹوٹا ہو اور وہ سب ہوش میں آگئے ہوں

اس نے سر پر پہنی ٹوپی اتاری اور اپنے آگے رکھ دی لوگ اس کی زمین پر رکھی ٹوپی میں اپنی مرضی کے مطابق پیسے ڈال کر دائرے سے نکلنے لگے۔تھوڑی دیر میں اندھیرا چھانے لگا۔تو لوگوں کی گھما گھمی بھی کم پڑنے لگی وہ اندھا ابھی تک وہیں بیٹھا رہا۔جب تاریکی ہر طرف چھانے لگی اور پارک میں صرف گنے چنے لوگ بچ گئے تو اس نے بیگ دوبارہ کندھے پر رکھا ٹوپی اٹھائی اور اور لاٹھی ٹیکتا خارجی دروازے کی سمت بڑھنے لگا۔

اس بار ہاتھ تھام کر مدد کرنے والا کوئی مہربان نہیں آیا نا ہی اس بار وہ ڈگمگا کر گرا تھا۔آہستہ آہستہ چلتا وہ اندھا جب دروازے کے قریب پہنچا اپنا چشمہ اتارا ، ہاتھ میں پکڑی فولڈنگ سٹک فولڈ کر کے بیگ میں رکھی اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔قدموں کی لڑکھڑاہٹ کا کہیں بھی کوئی نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔قدموں میں بھی اب تیزی آچکی تھی۔خارجی دروازے سے تھوڑا آگے نکل کر دائیں طرف فٹ پاتھ پر بیٹھے دونوں ہاتھوں سے معذور فقیر کی جھولی میں وہ سارے پیسے ڈالے۔فقیر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کچھ دعائیں دی۔اگلے لمحے وہ دعاؤں کا سکون دل میں اتار کر ساتھ کھڑی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر کسی اگلی منزل کی طرف چل دیا۔

☆......☆......☆

"کلی۔۔۔کسی مولوی کا بندوبست کروا۔مجھے ملوکھاں سے نکاح کرنا ہے۔"

وہ دونوں شام کو دریا کنارے بیٹھے ہوئے تھے جب سلطان اپنے دوست سے سنجیدہ لہجے میں مخاطب ہوا

"کیا بول رہے ہو تم۔۔۔جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوگا۔۔۔؟؟؟"

کلی تو سوچ کے ہی ڈر گیا۔

" کلی ۔۔اب گناہ کر چکا ہوں تو اس کا کچھ نا کچھ کفارہ بھی تو ادا کرنا ہے۔ملوکھاں سے اب بے وفائی کر دی تو وہ رل جائے گی" ملوکھاں کا خیال آتے ہی وہ اداس ہو چلا

" تو یہ گناہ کرنے سے پہلے سوچنا تھا نا۔اب کیا فائدہ پچھتانے کا"

" گناہ کرتے وقت کون سوچتا ہے انجام ۔اور کوئی انجام سوچ بھی لے تو گناہ کی لذت اس کے حواسوں پر سوار ہو جاتی ہے۔عقل پر پٹی بندھ جاتی ہے۔وہ انجام کی فکر بھلا دیتا ہے۔"

" اب کیا فائدہ اس طرح فلسفی بننے کا۔۔اتنی سیانی باتیں کرنے کا اب کیا فائدہ۔پہلے ہی عمل کر لیتے۔"

سلطان خاموش بیٹھا کچھ سوچتے ہوئے پانی کی آتی جاتی لہروں کو دیکھتا رہا۔

اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

گناہ کا راستہ آسان ہوتا ہے صاف ہوتا ہے،کوئی رکاوٹ راستہ نہیں روکتی مگر یہ راستہ بے سمت ہے اور اس راستے کی کوئی منزل نہیں ہوتی ۔بلکہ منزل کی جگہہ ایک اندھی کھائی ہوتی ہے جسے کی گہرائیوں میں پھر انسان گرتا چلا جاتا ہے۔

نیکی کا راستہ مشکل ہوتا ہے۔قدم قدم پر رکاوٹیں راستہ روکتی ہیں،حوصلے پست کرتی ہیں مگر اس راستے کی اپنی ایک منزل ہے،یہ راستہ بے سمت نہیں ہوتا اور جو ثابت قدم رہتے ہیں،منزل پر پہنچ جاتے ہیں ان کے لیے اللہ کے ہاں ان گنت انعامات کی نوید ہے

" اور نوری وہ جو بیچاری بن ماں کے یتیم بچی سالوں سے تیرے نام سے بندھی ہے،اس کا کیا ہوگا۔اسے اب کون بیاہے گا اسے اب کون بیاہے گا۔۔؟؟؟" کلی نے ایک اور سچ اگلا

" اس سے بھی شادی کروں گا میں ۔۔اماں ابا کو بھی تو راضی کرنا ہے" جانے وہ کیا کیا سوچ کے آیا تھا آج

" سلطان تم کیا چیز ہو یار۔۔کبھی کسی کی سمجھ میں بھی آؤ گے یا نہیں ۔۔؟

یوں پل پل میں کیوں رنگ بدلتے ہو؟"

" میں آج تک خود کو ہی نہیں سمجھ پایا تو کسی کو کیا سمجھ آئے گی میری"

"کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے ایک بار پھر سے سوچ لو سلطان ۔ بعد میں پچھتانے والوں کو کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا" کلی نے ایک اور مشورہ دیا۔

" میں نے سب سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے کلی۔ تم کل کسی طرح مولوی اور دو چار گواہوں کا بندوبست کرو صرف ۔ مجھے کل ہی ملوکھاں سے نکاح پڑھوانا ہے ہر حال میں۔" وہ دریا میں پتھر پھینک کر کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔

کلی نے بیٹھے بیٹھے گردن اٹھا کر اس کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھا۔

" سلطان مجھے تمہارے انجام سے بہت ڈر لگ رہا ہے ۔ مجھے لگتا ہے تمہارے اس عمل کا بہت برا انجام ہو گا۔۔۔"

" اب قدم اٹھا لیا ہے تو انجام سے ڈرنا کیسا۔ جب دریا میں اترنا ہو تو پانی سے نہیں ڈرا جاتا۔۔۔ بس جو ہو گا اب دیکھا جائے گا۔"

" تو ٹھیک ہے پھر اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہنا۔ میں کل رات کو مولوی اور گواہوں کا بندوبست کر لوں گا۔ ملوکھاں کو لے کر وقت پر پہنچ جانا" وہ بھی کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا

دو انسان زمین پر فیصلہ کر چکے تھے ۔ دور پانیوں کے پار مغرب میں پیلا زرد سورج ڈوب رہا تھا ۔ خدا جانے اس سورج اور پوری کائنات کو بنانے والے کا کیا فیصلہ تھا وہ صرف وہی جانتا ہے ۔ کیونکہ اس کے راز کبھی افشا نہیں ہوتے

☆......☆......☆

تیسرا حصہ

"دل اماں میں نوری سے شادی کیلیے تیار ہوں" سلطان نے اپنی ماں سے کہا جو سلطان کے پیچھے بیٹھی اسکے بالوں پر مالش تیل کر رہی تھی

"سچ میں۔۔۔میرے لعل تم اپنی خوشی سے راضی ہو۔۔۔؟"

بختاور کے تیل ڈالتے ہاتھ رک گئے خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔تین دن پہلے یہی سلطان اپنے ابا سے اسی بات پر جھگڑ رہا تھا۔۔۔

"ہاں اماں میں راضی ہوں۔پر اپنی خوشی سے نہیں صرف ابا اور آپ کی خوشی کیلیے۔ورنہ میرا نوری کے ساتھ بالکل جوڑ نہیں بنتا۔میرے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے ابا نے" سلطان نے اپنے گھٹنے پر سر رکھ کے اداس لہجے میں کہا

"پتر ایسا نہیں بولتے۔خدا کی رضا یہی ہوگی۔خدا کو جب کچھ کرنا مقصود ہو تو وہ بات اپنے بندوں کے دل میں ڈال دیتا ہے۔پھر بندوں کو دوش نہیں دیا جاتا۔خدا کی رضا پر راضی ہونا پڑتا ہے تبھی دل کا سکون نصیب حاصل ہوتا ہے۔اور پھر جوڑے تو اوپر آسمانوں پر اللہ کی اپنی سے بنتے ہیں۔اللہ کی یہی مرضی ہوگی۔تیرا جوڑ، تیرا سنگ اوپر نے نوری کے ساتھ ہی لکھا ہوگا۔۔۔اللہ کے فیصلوں پر اعتراض نہیں کرتے پتر۔چپ چاپ خاموشی سے اللہ کی رضا میں راضی ہوجاتے ہیں بس

اور پتر سارا گاؤں جانتا ہے کہ نوری میں کتنے گن ہیں شریف ہے※ اپنے گھر کی پلی دیکھی بھالی بچی ہے※ سیدھی سادی ہے※ اتنے ہنر آتے ہیں اسکو۔خدا کا شکر ادا کر کہ اتنی اچھی لڑکی لکھی تیرے نصیب میں اللہ نے" ماں کے پاس سمجھانے کو ہزار دلیلیں تھیں

سلطان خاموش ہوگیا۔دل میں تو وہ بھی نوری کی صلاحیتوں کا معترف تھا مگر اس دل کا کیا کرتا جس پر اب ملوکھاں اپنا پورا قبضہ جما چکی تھی۔۔۔

" پر اماں میرا دل سچ میں راضی نہیں ہے نوری کیلئے۔اگر آپ دونوں کی ناراضی نا ہوتی تو میں اس رشتے پر کبھی نا مانتا۔میں نہیں مانتا ان بچپن کے بندھے رشتوں کو۔میری سوچ میرے خواب بہت بڑے ہیں۔بہت آگے تک ہیں آپ نہیں سمجھیں گی۔"

" پھر وہی بات سلطان۔میں کیا سمجھا رہی ہوں کب سے۔۔۔؟" بختاور نے پیار سے سلطان کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا

وہ اس بار چپ ہوگیا۔کچھ نا بولا

" اور یہ جو اولادیں بڑی ہو کر والدین سے کہتی ہیں نا کہ" آپ نہیں سمجھیں گے" غلط کہتی ہیں۔ والدین سب سمجھتے ہیں پتر۔

جانتے ہو کتنا دکھ ہوتا ہے جب والدین کے جسم سے نکلی اولاد انہیں کہتی ہے کہ آپ لوگ نہیں سمجھ سکتے۔

کیوں نہیں سمجھ سکتے بھلا۔۔۔؟

اولاد کیوں بھول جاتی ہے کہ انہی والدین نے اسے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا ہے۔زمانے کے سرد و گرم سے ان کی حفاظت کی ہے۔

ہم نے تم سے زیادہ زندگی دیکھی ہے۔دنیا کو اتنا تم نے نہیں سمجھا، اتنا تم نے نہیں دیکھا جتنا ہم نے۔"

اماں نے اسے اچھا خاصا لیکچر جھاڑھ دیا۔سلطان کو تو امید ہی نہیں تھی کہ اس کی سیدھی سادی اماں اتنی ساری باتیں اسے کہہ دے گی۔

" میرا یہ مطلب نہیں تھا اماں جو آپ سمجھ رہیں ہیں۔میں تو بس۔۔۔"

" اور جو تم خوابوں کی بات کر رہے ہو نا۔اپنی اوقات سے بڑے خوابوں کے پیچھے نہیں بھاگتے۔ ورنہ ساری زندگی حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔جو حاصل ہے جو میسر ہے اس پر صبر شکر کرنا چاہیئے انسان کو۔"

" سلطان پتر۔۔۔"

"ہممم" اس نے گھٹنے پہ سر رکھے ,بغیر ماں کی طرف دیکھے جواب دیا

"پتر یہ جو نکاح کے دو بول ہوتے ہیں نا۔۔۔بڑی طاقت ہوتی ہے ان میں۔بڑے بڑے زور آوروں کو زیر کر دیتے ہیں ,نکاح کے بعد خدا دلوں کو محبت سے بھر دیتا ہے۔دیکھنا تیرا دل بھی نوری کی محبت سے بھر جائے گا۔اور وہ اتنی سلیقہ شعار ہے اور مجھے یقین ہے وہ جلد ہی تیرے دل میں اپنی جگہہ بنا لے گی۔۔۔اور پھر تو خود پہ ہنسے گا کہ میں بھی کتنا جھلا تھا تو جو اتنی اچھی لڑکی کو ٹھکرا رہا تھا۔۔۔

اور پھر جب اولاد پیدا ہوتی ہے نا۔۔۔تو اللہ اولاد کی صورت میں انسان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتا ہے۔تب پھر سرکش سے سرکش انسان بھی خود کو ان بیڑیوں سے آزاد نہیں کرنا چاہتا۔خدا اس کا دل اولاد کی محبت کیلیئے بھر دیتا ہے اس کا دل نرم پڑ جاتا ہے"

ماں نے پیار سے اس کے سر پر پیچھے ہلکی سی ایک اور چپت مارتے ہوئے کہا۔بختاور بہت خوش تھی۔جیسے تیسے ہی ہی سلطان راضی تو ہو گیا۔

وہ بغیر دیکھے بتا سکتا تھا کہ اماں اب مسکرا رہی ہو گی۔

"اور دیکھنا تم۔۔۔تیری شادی کتنی بڑی اور دھوم دھام سے ہو گی۔پوری شاہ والی دیکھے گی۔" بختاور نے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کے خواب ابھی سے بننا شروع کر دیئے۔

"نہیں اماں۔۔۔بس سادگی سے نکاح پڑھ لیتے ہیں۔کیا ضرورت ہے بھلا اتنی دھوم دھام اور دھما چوکڑی کی۔فضول میں خرچے الگ سے۔" وہ چاہتا تھا بس کسی طرح ہی اس کام سے جان چھوٹے تا کہ وہ بعد میں ملوکھاں کا کچھ بندوبست کرے مگر بختاور جانے کیا کیا سوچے بیٹھی تھی

"وہ کیوں بھلا۔۔۔دھوم دھام سے کیوں نا کریں۔آخر تم ہماری اکلوتی اولاد ہو۔ہم نے اپنے سارے ارمان تمہاری شادی پہ ہی تو پورے کرنے ہیں۔

خرچے اللہ پورے کر دیتا ہے۔باقی زندگی کے اتنے اخراجات ہو سکتے ہیں تو شادی کے کیوں نہیں۔تمہاری شادی کوئی روز روز تھوڑی آئے گی بھلا۔اور پھر خوشی کو پوری خوشی سے نا مناؤ تو کیا فائدہ پھر ایسی خوشی کا۔۔۔؟"

بختاور کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ ابھی سے اکلوتے بیٹے کے سر پر سہرا بندھا دیکھ رہی تھی۔ نور بانو کو دلہن کے روپ میں اپنے آنگن میں چلتے دیکھنے لگی۔ یہ مائیں بھی نا کمال ہوتی ہیں۔

خدا جانے کس مٹی سے بنی ہوتی ہیں۔

اور وہ دل میں پشیمانی بھرے جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔ اماں کے وہم و گمان میں بھی نا تھا۔

☆......☆......☆

شام میں دین محمد آیا تو گھر آتے ہی پہلی خوشخبری بختاور نے یہی سنائی تھی۔ دین محمد بھی خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔

بختو ہم آج ہی چلتے ہیں اپنی دھی کی تاریخ مانگنے۔ میری آنکھیں بہت جلد نوری کو اس آنگن میں دیکھنا چاہتی ہیں"

دین محمد کو تو جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

" اوئے شہزادے ۔۔۔ کہاں ہو ذرا باہر آو نا۔ آج مل کے کھانا کھاتے ہیں۔ بڑا عرصہ ہوا تیرے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھائے۔"

دین محمد نے زور سے آواز لگائی اور وہ جو اندر چارپائی پر لیٹا جانے کن سوچوں میں گم تھا۔۔ ابا کی آواز پر باہر آ گیا۔

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا غائب دماغی سے چلتا وہ ابا کے ساتھ چارپائی پر آ بیٹھا

سلطان نے اس سے پہلے ابا کو کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔

اسے یاد تھا جب وہ بچپن میں اینٹوں کے اڈے پر ابا کو دوپہر کا کھانا دینے جاتا۔ تب وہ دین محمد کی ٹانگ سے بھی چھوٹا تھا۔۔ اماں اسے گرم گرم کھانا بنا کے دیتی تو وہ اڈے پر کھانا دینے پہنچ جاتا۔۔۔

دین محمد قمیض اتارے بھری دوپہر میں کچی اینٹیں تھاپ رہے ہوتے۔ سورج کا گرم تھال اوپر دہک رہا ہوتا تھا۔ چلچلاتی دھوپ کی وجہ سے پسینے کی لکیریں اس کے چہرے، گردن کو کراس کرتی پیٹ سے ہوتی ہوئی شلوار تک پہنچ جاتی۔ دھوپ نے دین محمد کی جلد کو جھلسا دیا تھا۔

جوانی میں جو دین محمد کی گوری چٹی چمڑی ہوتی تھی۔ مسلسل دھوپ میں ننگی پیٹھ کام کرنے سے اب اس کا رنگ پکا سانولا سا ہو گیا تھا جیسے پیدائشی ہی اس کا یہی رنگ ہو۔ مگر جاننے والے جانتے تھے کہ دین محمد کا اصلی رنگ یہ نہیں تھا۔ اور خدا نے اس کے نصیب میں کوئی اور روزی لکھا ہوتا تو اس کی چمڑی پہلے جیسی ہی گوری چٹی ہوتی

دین محمد سلطان کو کھانا اٹھائے آتا دیکھتے تو آگے بڑھ کے اس سے کھانا لیتے اور اسے ہاتھ لگائے بغیر جھک کر اسکے گال پر ایک ہلکا سا بوسہ دیتے۔ اپنے مٹی لگے ہاتھوں سے سلطان کو بالکل نا چھوتے کہ کہیں اس کا خوبصورت بیٹا اس کی طرح میلا نا ہو جائے۔ وہ تو دین محمد کیلئے شہزادوں جیسا تھا۔ اور شہزادوں کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھا جاتا ہے۔ میلا نہیں کیا جاتا

ابا سلطان کو اڈے پر لگے واحد درخت کے نیچے بٹھا کر کھانا شروع کرتے تو اسے بھی اپنے ساتھ زبردستی کھلاتے۔ حالانکہ وہ جانتے بھی تھے کہ بختو اسے ہمیشہ کھانا کھلا کر ہی بھیجتی ہے کبھی سلطان کو بھوکا نہیں بھیجا۔ مگر دین محمد ایک لقمہ خود کھاتے تو دوسرا چھوٹا لقمہ بنا کر سلطان کے منہ میں ڈال دیتے۔ اور وہ پیٹ بھرے ہونے کے باوجود بھی ابا کو انکار نا کر پاتا اور کھا لیتا۔

کھانا ختم کرنے کے بعد وہ اسے درخت تلے چھوڑ کر خود پھر سے کام میں جت جاتے۔ سلطان کو کوئی گھنٹہ بھر انتظار کرنا پڑتا اس ایک گھنٹے میں اسے جتنی گرمی محسوس ہوتی وہ پورے دن کے کسی حصے میں نا ہوتی۔ اس کے گورے گورے گال گرمی سے سرخ پڑنے لگتے۔ دین محمد وقفے وقفے سے پیچھے مڑ کر اس کی سمت نگاہ کرتے۔ پھر اٹھ کر اپنی قمیض یا صافہ درخت کی ان ٹہنیوں پر ڈالتے جہاں سے دھوپ چھن چھن کر آ رہی ہوتی۔ اپنے مٹی والے ہاتھ پیچھے پیٹھ پر باندھ کر جھک کے اس کے گالوں پر بوسہ دیتے جہاں اب پسینہ کی لکیر نیچے گردن کی طرف سفر کر رہی ہوتی۔ اچھے سے تسلی کر لینے کے بعد جلدی جلدی کام ختم کرتے اور ہاتھ دھو کر اسے کاندھے پر بٹھا کر گھر کی طرف چل دیتے۔۔ حالانکہ سلطان اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ خود چل کر نا جا سکتا۔ لیکن پھر بھی سلطان اپنے بیٹے کو تھکان سے بچانے کیلئے اپنے کندھے پر سوار کر لیتے۔

وہ راستے بھر دین محمد کے کندھے پر بیٹھا اس سے باتیں کرتا جاتا۔ اور دین محمد کے لب اس کی

معصوم باتوں پر مسکراتے رہتے۔

سلطان کو یاد تھا کہ زندگی میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو سلطان نے منہ سے نکالی ہو اور دین محمد نے لا کر نا حاضر کی ہو۔۔۔

سوائے ایک خواہش کے اور وہ تھی دریا کی سیر۔۔۔سلطان کی ہزار ہا ضد کے باوجود بھی دین محمد اور بختاور اسے دریا کی طرف نا جانے دیتے۔جبکہ وہ اسی بات کیلیے بار ہا ضد کرتا کہ بستی کا ہر بچہ دریا پر جاتا ہے کشتی کی سیر کرتا ہے، بڑا ہو تو خود کشتی چلاتا ہے، تیراکی کرتا ہے، مچھلیاں پکڑتا ہے ایک اکیلا وہ کیوں نہیں جا سکتا۔

اس کیوں کا جواب اس کبھی دین محمد یا بختاور نے نہیں دیا انہوں نے ہمیشہ خاموشی اختیار کر لی۔۔۔اس کیوں کا جواب اسے 15 سال کی عمر میں اس کے جگری دوست کلی نے دیا جسے ایک بار اپنے ابا نے عمران کے ڈوبنے اور لاش نا ملنے کا قصہ سنایا تھا اس کے بعد کبھی سلطان نے دوبارہ دریا پہ جانے کی ضد نہیں کی تھی۔

”کہاں کھوئے ہو یار۔۔۔کھانا کب سے پڑا پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور تم خدا جانے کس کے خیالوں میں گم ہو۔“ وہ جو خیالوں میں کہیں دور بچپن تک جا پہنچا تھا ابا نے اس کا کاندھا جھنجھوڑ کر سلطان کے خیالوں کا تسلسل توڑ دیا۔اور کھانے کی طرف توجہ دلائی

سلطان چونک کر حال میں واپس آیا۔غائب دماغی سے اپنا بایاں ہاتھ اپنے گال پر رکھا جہاں کبھی گرمی میں دین محمد بوسہ دیا کرتا تھا مگر اب اسے اپنے گال پر کہیں ابا کے بوسے کی حدت محسوس نا ہو سکی۔۔۔

پھر ابا کے ساتھ ساتھ بے دلی سے کھانا کھانے لگا۔بالکل چھوٹے چھوٹے لقموں کے ساتھ جیسے وہ بچپن میں اینٹوں کے اڈے پر درخت تلے بابا کے ساتھ کھاتا تھا۔

دین محمد بہت خوش تھے۔وہ کھانا کھانے کے دوران سارا باتیں کرتے رہے۔اور سلطان جانے کن خیالوں میں گم ہوں ہاں کرتا رہا۔

☆......☆......☆

"جنت تمہارا نام کس نے رکھا تھا۔۔۔؟" وہ دونوں دریا کنارے ریت پر گھروندے بنا رہے تھے جب خوشی نے جنت سے معصومانہ سوال کیا

"اماں نے" جنت نے اس کی طرف دیکھے بغیر دو لفظی جواب دیا

تھوڑی دیر خاموشی چھا گئی

"اماں کہتی ہیں کہ تم میری جنت ہو۔۔۔" جنت نے خود ہی بتا دیا

"پر مولوی صاحب تو کہتے ہیں کہ بچوں کی جنت انکی ماں کے قدموں میں ہوتی ہے۔۔۔"

خوشی کو اچانک مولوی صاحب کی بات یاد آ گئی

"ہاں بولتے تو ہیں۔۔۔میں اماں سے پھر پوچھوں گی۔۔۔"

"یہ ہر بار میرا گھر مکمل کیوں نہیں ہوتا۔۔۔ ہر روز مکمل ہونے سے پہلے کیوں گر جاتا ہے" خوشی نے رونی شکل بنا کے جنت کی طرف دیکھا۔جواب گیلی نم ریت سے اپنے محل کو مکمل کر چکی تھی۔ایک سکون اور خوشی کی لہر تھی جنت کے چہرے پر۔مگر اس نے جب خوشی کا نامکمل اور ٹوٹا ہوا گھر دیکھا جواب ریت کے ایک گوبڑ کی شکل اختیار کر چکا تو تھوڑی دیر پہلے اس کے چہرے پر آئی خوشی کی جگہہ اب اداسی نے لے لی۔

"پتل گھر دھیان سے بنائے جاتے ہیں، پیار سے بنائے جاتے ہیں۔ایک ایک اینٹ پیار سے لگانی پڑتی ہے تب جا کے گھر مکمل تعمیر ہوتے ہیں۔۔گھر کو جنت بنانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔تھوڑی سی بے دھیانی اور بگاڑ سے گھر مکمل ٹوٹ جاتے ہیں ہمیشہ کیلیے۔پھر کبھی نا بننے کیلیے۔۔۔" ان کی طرف پشت کیے کنارے پر کپڑے دھوتی نانی تاج نے مڑ کر خوشی کی بات کا جواب دیا جو بظاہر تو کپڑے دھونے میں مصروف تھی مگر دھیان ان دونوں بچوں کی باتوں اور حرکات پر لگا رکھا تھا۔۔۔

نانی تاج کی نگاہوں کے سامنے سالوں پہلے کا ایک منظر کسی فلم کی طرح چلنے لگا جس دن اسے شوہر نے طلاق دی اور اسکے بابا اسے واپس اپنے گھر لینے آئے تھے۔کتنا مشکل تھا وہ دن۔شاید اس کی زندگی کا سیاہ ترین دن۔۔۔اچانک یاد آ جانے والی اس یاد نے اس کے بوڑھے کمزور دل پر ایک بھاری اور

وزنی سل لا کے دھر دی تھی ۔ایک نو جوان بیٹی کیلئے اپنی پیشانی پر طلاق کا لیبل لگوا کر واپس باپ بھائیوں کی دہلیز پر آنا کس قدر مشکل ہوتا ہے وہ اس درد سے بخوبی واقف تھیں

اگلے پل اس نے اپنی آنکھ کے بھیگے کنارے سے آدھا آنسو اپنی گیلی انگلی سے چن کر پھر سے کپڑے دھونا شروع کر دیئے ۔کہ زندگی ہمیشہ آگے چلتی ہے ۔پیچھے کبھی مڑ کے واپس نہیں جاتی ۔ یہ ہم انسان ہی ہوتے ہیں جو بار بار پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتے رہتے ہیں

" پر جنت کے گھر تو ہمیشہ مکمل بنتے ہیں ۔اس کا گھر تو کبھی نہیں ٹوٹتا ۔۔۔" خوشی نے ایک اور معصومانہ مگر اداس لہجے میں سوال پوچھا

اس بار نانی تاج نے کوئی جواب نہیں دیا اور نا ہی اب کی بار اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے والوں کی آنکھیں گیلی بھی ہو سکتی ہیں ،پیچھے مڑ کر دیکھنے والے کبھی کبھی پتھر بھی ہو جاتے ہیں ۔

اور چھڑی سے چھو کر پتھروں کو دوبارہ انسان بنانے والے شہزادے صرف کہانیوں میں آتے ہیں اصل زندگی میں کبھی نہیں ۔

" کیونکہ میں ہمیشہ پیار سے گھر جو بناتی ہوں ۔" نانی کی طرف سے جواب نا آیا تو جنت نے اسے جواب دیا

" پیار سے تو میں بھی بناتا ہوں ۔لیکن میرا ہمیشہ ٹوٹ جاتا ہے ۔"

" اگلی بار تمہارا گھر میں بناوں گی ۔۔۔" جنت نے اسے تسلی دی

" پھر اس سے اگلی بار کون بنائے گا ۔۔؟" خوشی دور کی سوچنے لگا

" پھر بھی میں ہی بنا دوں گی ۔ہر بار تمہارا گھر میں ہی بناوں گی"

"کیا ساری زندگی تم میرا گھر بناو گی ۔۔۔؟"

" ہاں ساری زندگی تمہارا گھر میں بناوں گی ۔اب کبھی تمہارا گھر نہیں ٹوٹے گا ۔" جنت نے اس کی سارے خدشے دور کر کے یقین دہانی کروا دی ۔۔۔

" وعدہ ۔۔۔؟؟؟"

"ہاں پکا وعدہ۔۔۔"

"اگر کبھی وعدہ توڑا تو۔۔۔؟"

"تو یہ دریا مجھے نگل جائے"

جنت نے اپنے مٹی لگے ہاتھ سے پانی کی طرف انگلی سے اشارہ کیا

"نا۔۔تم ڈوب گئی تو پھر میں کس کے ساتھ کھیلوں گا۔میرا گھر کون بنائے گا پھر۔۔تم کبھی ناڈوبنا۔"

خوشی۔۔۔خوش ہو گیا تھا۔معصوم چہرے پر پھر سے مسکراہٹ لوٹ آئی تھی۔

دریا کنارے دو معصوم اور پاکیزہ دلوں کے بیچ ایک وعدہ طے ہوا تھا۔

اور دوسری طرف منہ کیے کپڑے دھوتی نانی تاج کے گیلے کپڑوں پر چلتے ہاتھ ایک دم رک سے گئے

"۔لاج رکھنا۔۔۔پھر کبھی کوئی گھر ٹوٹنے نا پائے۔۔۔

اے پانی۔۔۔گواہ رہنا۔"

نانی تاج نے پہلے اوپر آسمان کی جانب اور پھر وسیع و عریض دریا کے نیلے پانی پر نگاہ دوڑاتے ہوئے دل ہی دل میں کہا اور پھر سے کپڑے دھونا شروع کر دیے

☆......☆......☆

"کلی۔۔۔تمہیں ایک بات بتاؤں۔۔؟"

"ہاں بتاؤ۔۔"

"جانے کیوں اب ملوکھاں کیلئے میرے دل میں ویسی محبت نہیں رہی جیسے پہلے تھی شروع میں"

سلطان نے دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہا

"کیوں۔۔۔؟؟؟

بس ہو گئی محبت پوری۔۔۔؟"

کلی کو حیرت ہوئی

"محبت تو کبھی پوری نہیں ہوتی۔ یہ ہمیشہ ادھوری ہی رہتی ہے۔محبت کی تشنہ لبی کبھی ختم نہیں ہوتی ۔۔" سلطان آج عجیب سی باتیں کر رہا تھا۔

"تو پھر تمہاری محبت کیوں پوری ہوگئی۔تمہارا دل کیوں چند ماہ میں بھر گیا۔" کلی نے اس پر چوٹ کی

" اس لیئے کہ شاید مجھے ملوکھاں سے محبت تھی ہی نہیں۔بس کوئی وقتی دلچسپی تھی۔وقتی جذبہ تھا جسے میں محبت کا نام دے بیٹھا۔محبت سمجھ بیٹھا"

" ہاں اب اس کا سب کچھ حاصل کر کے تمہیں اب لگتا ہے کہ یہ محبت نہیں تھی وقتی دلچسپی تھی۔مگر یاد رکھو ملوکھاں کو کوئی وقتی دلچسپی نہیں ہے۔وقتی جذبہ یا وقتی انسیت نہیں ہے۔وہ سچ میں تم سے محبت کرتی ہے اور اسی محبت میں اس نے تمہیں اپنا آپ دان، اپنی عزت دان دی۔

سلطان ۔۔۔مجھے تمہاری طرح اتنی گہری باتیں نہیں آتی۔لیکن اتنا جانتا ہوں کہ عورت کے پاس سب سے قیمتی چیز اس کی عزت ہوتی ہے۔اور جب وہ اپنی عزت کسی کو یوں تھالی میں رکھ کہ پیش کرتی ہے تو وہ اپنی قدر کھو دیتی ہے۔بے مول ہو جاتی ہے۔کہیں کی نہیں رہتی پھر۔۔۔"

سلطان نے چونک کر کلی کی طرف دیکھا آج سے پہلے کلی نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی

وہ گنگ رہ گیا

" وہ محبت کرتی ہے تم سے۔ملوکھاں اپنا سب کچھ سونپ چکی ہے تمہیں۔آج نکاح ہے تمہارا اس سے۔اور تم بول رہے ہو کہ اب پہلے جیسی محبت نہیں رہی تمہیں؟"

کلی ایک لمحے کو سانس لینے کو رکا

" اور اگر محبت نہیں رہی تو پھر نکاح کیوں کر رہے ہو اس سے؟" آج کلی کیلیئے حیرتوں کا دن تھا۔

" ملوکھاں سے کیا وعدہ نبھانے کیلئے، اپنے گناہ کے ہلکے سے کفارے کیلئے۔اپنے بچے کو اپنا نام دینے کیلئے۔۔۔" سلطان نے کلی کے ہر سوال کا جواب دے دیا۔

" اور میں کل نوری سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔اسے ملوکھاں سے اپنے نکاح کا بتاؤں گا۔میں اسے بے خبر رکھ کر دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔" آج تو واقعی انکشافات کا دن تھا

"تم عجیب ہو سلطان ۔۔۔ تمہیں سمجھنا بہت مشکل ہے۔" کلی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"تم سچ کہتے ہو کلی۔ میں واقعی عجیب ہوں۔ کبھی کبھی تو میں خود کو بھی نہیں سمجھ پاتا کہ میں کیا ہوں اور کیا چاہتا ہوں میں۔ اپنے گناہ پر ندامت بھی ہے گناہ کا کفارہ بھی کرنا چاہتا ہوں، نوری کو دھوکے میں بھی نہیں رکھنا چاہتا اور دل اس سے شادی پر بھی رضامند نہیں ہے اور اماں ابا کے وعدے کی لاج بھی رکھنی ہے۔ میں تو ہر طرف سے بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہوں۔"
کلی کے پاس اس کی الجھی گتھیوں کو سلجھانے کا وقت نہیں تھا۔ مغرب قریب تھی۔ اسے مولوی صاحب اور گواہان کا بندوبست کرنا تھا۔ سو وہ دونوں چلے گئے۔
چند گھنٹے بعد جب رات کی تاریکی نے بستی شاہ والی کے اوپر اپنی کالی چادر تان لی تو سلطان، ملوکھاں کو لے کر آ گیا۔ جہاں گواہان اور مولوی صاحب ان دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک مخصوص اور محفوظ جگہ پر نکاح کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مولوی کا بندوبست کسی دوسری بستی سے کیا گیا تھا۔ اور اسے نکاح کی دگنی فیس دے کر خاموش کروا دیا گیا تھا۔ جبکہ گواہان میں اپنے ہی گاؤں کے سلطان اور کلی کے مشترکہ دوست شامل تھے۔ سو ان کی طرف سے بھی کسی راز افشانی کا کوئی خطرہ نہیں تھا
نکاح کے بعد سلطان اسی طرح خاموش اور تاریک رات میں ملوکھاں کو واپس چھوڑ آیا۔ دونوں کے دل کچھ مطمئن تھے کہ اب وہ ایک دوسرے پر حلال ہو چکے ہیں۔ ایک دوسرے کیلئے جائز ہو چکے ہیں۔ اب ان کے گناہ کا کچھ نا کچھ کفارہ ممکن ہو جائے گا۔ کوئی ان کے بچے کو کبھی ناجائز کہہ کر نہیں پکار سکے گا۔ مگر مکمل خوش نہیں کیونکہ ابھی ایک امتحان اور باقی تھا۔

☆......☆......☆

خوشی بغل میں کپڑے کا ہاتھ سے سلائی کیا بستہ اٹھائے گھر میں داخل ہوا تو نانی تاج دیوار کے سائے میں چارپائی پر آنکھیں موندے سو رہی تھی۔ سر کے نیچے رکھے تکیے کے ساتھ رکھے پرانے وقتوں میں لئے گئے نانی کے ریڈیو پر کوئی گلوکار پرانی غزل اپنی سریلی آواز میں گا رہا تھا۔
وہ قدموں کی چاپ کئے بغیر آہستہ آہستہ چلتا نانی کی چارپائی کے پاس پہنچا تو دیکھ کر حیران رہ گیا

کہ نانی کی آنکھوں سے آنسوؤں نکل کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔ گائیک ابھی بھی غزل گا رہا تھا۔

" ڈاچی والے آ۔۔۔موڑ مہار وے "

" نانی۔۔۔رو کیوں رہی ہیں آپ۔۔۔؟" تھوڑی دیر انتظار کے بعد جب نانی نے آنکھ نا کھولی تو اس نے نانی کا بازو ہلایا تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھی

" کچھ نہیں پتر۔۔۔بس ایسے ہی۔تم کب آئے ہو سکول سے۔۔۔؟" نانی نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے ہوئے خوشی کو جواب دیا

" نانی۔۔۔عشق ہو گیا ہے کیا آپکو۔۔۔؟" خوشی نے اس بار ہنستے ہوئے مذاق میں نانی کو چھیڑا

" جھلا۔۔۔دنیا میں انسان کو صرف عشق نہیں رلاتا۔ تم جب بڑے ہو جاؤ گے تو خود سمجھ جاؤ گے کہ میں کیوں رو رہی ہوں" نانی تاج نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے ہوئے جواب دیا

" ابھی اور کتنا بڑا ہونا باقی ہے نانی۔۔۔آٹھویں میں تو پہنچ گیا ہوں اب۔۔۔"

" نہیں جھلا۔۔۔دنیا کو سمجھنے کیلئے ابھی تم بہت چھوٹے ہو۔ کبھی کبھی تو ساری عمریں بیت جاتی ہیں پھر بھی انسان کچھ نہیں سیکھ پاتا۔ بس ہمیشہ دھکے ہی اس کا نصیب بنتے ہیں۔ تم بڑے ہو جاؤ گے تو آہستہ آہستہ سب سمجھ آجائے گا تمہیں۔"

نانی خوشی کی بات کا جواب دے کر اس کے لیے کھانا لے آئی تو وہ ہاتھ دھو کر اسی چارپائی پر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔

نانی نے خوشی کا جواب سن کر مسکرا کے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو اب بچپن سے لڑکپن میں داخل ہو رہا تھا۔ ناک کے نیچے مسیں پھوٹ رہی تھیں اور وہ قد نکال رہا تھا

نانی نے اسے گاؤں کے واحد پرائیویٹ مڈل سکول میں داخل کروایا تھا جہاں لڑکے اور لڑکیوں کو ایک ہی سکول میں تعلیم دی جاتی تھی۔ سکول کیا تھا سکول کے نام پر ایک بوسیدہ سی پرانی عمارت تھی۔ چار پرانے کمروں والے اس سکول میں عملے کے نام پر ٹوٹل تین استاد تھے۔ یہ سکول گاؤں کے واحد پڑھے لکھے ماسٹر عابد صاحب نے کھولا تھا۔

حکومت کی طرف سے بستی کو ایک پرائمری سکول عنایت کیا گیا تھا۔تعلیمی فقدان کے باعث چھٹیوں میں وہاں بستی والے اپنے جانور بھی باندھ دیتے ۔وہ سکول دوسری پسماندہ بستیوں کی طرح صرف نام کا سکول تھا۔پڑھائی کا نام نشان تک نا تھا۔بچے سارا دن کھیل کود کرآپس میں لڑ بھڑ کر واپس آجاتے ۔کبھی کوئی بچہ دوسرے کے کپڑے کالی دوات سے سیاہ کر ڈالتا تو کوئی بچہ لڑائی میں تختی سے دوسرے کا سر زخمی کر دیتا

سکول میں تعینات اساتذہ کافی دور دراز سے تھے سو وہ اپنی مرضی پر کبھی کبھی چکر لگانے آجاتے ۔نہیں تو پیچھے بچے سارا دن خالی سکول میں اودھم مچائے رکھتے ۔اور جس دن کبھی خوش قسمتی سے اساتذہ سکول پاؤں رکھ لیتے وہ دن پورا اساتذہ کے آپس میں حال احوال اور خوش گپیوں میں گزر جاتا۔گاؤں میں کوئی پڑھا لکھا تھا کسی کی پوچھ گچھ کا خطرہ نہیں تھا۔بلکہ وہ چند والدین جن کے بچے سکول نکل جاتے شکر ادا کرتے کہ کسی طرح کچھ وقت کیلئے گھر میں سکون رہے گا۔اوپر سے بھی کبھی کسی تعلیمی عملہ کو سکول کی کارگردگی یا تعلیمی پراگریس دیکھنے کی کبھی توفیق نا ہوئی ۔سو اساتذہ کیلئے شانتی ہی شانتی تھی ۔اگر بچوں کا مستقبل برباد ہو رہا تھا یا بچے کچھ سیکھنے کے یا کچھ تربیت حاصل کرنے کے مزید بگڑتے جا رہے تھے تو انہیں کیا یہ تو ان بچوں کے والدین کا درد سر تھا۔اساتذہ تک تو ہر مہینے کی پہلی کو ان کی مخصوص تنخواہیں پہنچ جاتی تھی

گنے چنے بچے تھے جو پرائمری پاس کر گئے خوشی بھی ان چند بچوں میں شامل تھا مگر نانی نے اسے پرائمری کے بعد عابد صاحب کے پاس داخل کروا دیا تھا۔جہاں وہ درجہ بدرجہ کلاسز پاس کرنے کے بعد اب آٹھویں میں پہنچ گیا تھا۔

”نانی آج عابد صاحب بتا رہے تھے کہ وہ اگلے سال ہائی کلاسز لگانے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں ۔مگر ان کے پاس ٹیچرز کی کمی ہے ۔“کھانے کے دوران اس نے نانی کو آج سکول کا احوال دیتے ہوئے بتایا۔

عابد صاحب خوش قسمت تھے جو اسے بچپن سے ہی لاہور میں مقیم انکے ماموں اپنے ساتھ لاہور لے گئے وہیں سے انہوں نے ماسٹر کیا اور کوئی جاب کرنے کی بجائے اپنے گاؤں کے بچوں کو تعلیم دینا زیادہ لازم سمجھا اسلئیے چند سال پہلے واپس آنے کے بعد انہوں نے آتے ہی پہلا کام گاؤں میں

پرائیویٹ مڈل سکول کھولنے کا کیا تھا۔شروع میں بہت زیادہ مشکلات پیش آئیں مگر وہ ڈٹے رہے اور آج ان کی محنت کے باعث سکول چل پڑا تھا۔تعلیم سے ناواقف بستی شاہ والی کے لوگ اب اپنے بچوں کو سکول بھیجنے لگے تھے۔۔۔

"بھلے انسان ہیں عابد صاحب۔ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو مشکل راستوں پر پہلا قدم رکھتے ہیں۔ہم لوگ سب لشکروں کے پیچھے چلنے کے عادی ہو چکے ہیں۔نئے راستے ڈھونڈھنے کی کوشش کوئی نہیں کرتا۔۔۔"

اگر سب لوگ اپنے حصے کی شمع جلا لیں کسی راستے میں اندھیرا باقی نا رہے۔سارے راستے روشن ہو جائیں گے۔" نانی سے اسے سمجھاتے ہوئے جواب دیا۔

☆......☆......☆

انکے نکاح کو پورا ایک ماہ گزر چکا تھے دونوں اب بھی ملتے تھے اسی اپنی مخصوص جگہہ پر۔مگر اب جذبات اور سوچ بدل چکی تھی۔اب دونوں ایک دوسرے پر حلال ہو چکے تھے۔سو اب کسی بات کی کچھ فکر نہیں رہی تھی۔

ملوکھاں کے دل میں سلطان کی محبت نکاح کے بعد کچھ مزید بڑھ چکی تھی۔گو اس نے نکاح سے پہلے گناہ عظیم کیا تھا۔اس کے پیٹ میں جو زندگی جنم لے رہی تھی وہ جائز نہیں تھی۔

اسے بھی اپنے گناہ پر شرمندگی تھی ندامت تھی۔مگر وہ سلطان کی محبت کیلئے کچھ بھی کر سکتی تھی۔سو اس نے سب کچھ اپنے محبوب کو نکاح سے پہلے سونپ دیا۔

اب وہ مطمئن تھی کہ سلطان نے اپنا وعدہ پورا کیا۔دونوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ اس بچے کو کبھی یہ آشکار نہیں ہونے دیں گے کہ وہ حرام کا ہے۔اور وہ اسکی پرورش میں کبھی کوئی کمی نہیں آنے دیں گے۔ مگر انسان اگلی زندگی کی ترکیبیں سوچتے وقت ہمیشہ یہ

بھول جاتا ہے اس نیلی چھت کے اوپر ایک ذات اور بھی ہے جو سارے فیصلے ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔

ملوکھاں نڈر تھی ،با اعتماد تھی اسے زمانے کی کوئی فکر نہیں تھی اگر کچھ فکر تھی تو صرف اپنے ماں باپ کی ۔ایک امتحان جو باقی تھا وہ آج نکاح کے ایک ماہ بعد سر پر آپہنچا تھا

دن کے سارے کام کاج ختم کر کے جب وہ اپنی ماں کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھی تو کھانے کے دوران ہی اسے اپنی طبیعت خراب ہوتی محسوس ہوئی ۔تو ملوکھاں دوڑ کر متلی کرنے دیوار کی طرف بھاگی ۔۔۔ اسے قئے آنے لگی تو ماں بھی بے چینی سے اس کے پیچھے آئی ۔اور اس کی حالت دیکھ ملوکھاں کے کچھ بتائے بغیر بھی وہ سب جان چکی تھی ۔اماں کو اپنے پیروں تلے زمین کھسکتی محسوس ہونے لگی ۔

ملوکھاں کی طبیعت زرا سنبھلی تو وہ واپس جانے کیلئے پیچھے مڑی مگر اماں اس کے سر پر پہنچ چکی تھی ۔ملوکھاں نے اماں کی شکل دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ سب جان چکی ہے ۔اس لیئے سچ چھپانے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا ۔تو وہ گھڑی آن پہنچی تھی جس کا اسے دھڑکا لگا رہتا تھا ۔

"تمہیں اس بچے کی قسم ۔سچ بولنا ۔کس کا بچہ ہے تیرے پیٹ میں ۔۔۔؟؟؟؟؟؟"

☆......☆......☆

رنگا رنگ کہانیوں سے سجا، خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اُردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ) کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجئے ۔نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے ۔

ابھی sohnidigest@gmai.com پر ای میل کریں ۔

چوتھا حصہ

وہ دن بھی عام دنوں جیسا ہی تھا۔نوری کے ابا کام پر گئے ہوئے تھے ۔اور وہ ابھی گھر کے روزمرہ کے کام کاج میں ہی مصروف تھی جب اس کی سہیلی بلقیس اس سے ملنے آگئی ۔بلقیس اکثر ہی آتی رہتی تھی ۔گھر کے کام سے فارغ ہو کر دونوں سہیلیاں دوپٹوں پر کڑھائی کا کام کرتی تھیں ۔ہنر کا ہنر تھا اور وقت گزاری کا بھی اچھا بہانہ تھا۔اسی بہانے چار پیسے بھی ہاتھ آجاتے تھے جو نوری سنبھال کر رکھ لیتی ۔بلقیس نے آتے ہی نوری کے کاموں میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔کبھی کبھار نوری خود بھی بلقیس کے گھر چلی جاتی تھی لیکن اکثر اوقات بلقیس خود ہی آجاتی اپنے گھر کے کام نبٹا کر۔نوری کو روز روز گھر کو تالا لگا کر بلقیس کے گھر چلے جانا اچھا نا لگتا اور بلقیس بھی اپنی سہیلی کی اس مجبوری سے واقف تھی سو وہ بغیر کسی ناراضگی کے اکثر خود ہی نوری کے پاس اپنے دوپٹے اٹھا کر پہنچ جاتی تھی ۔بلقیس کی مدد شامل ہوگئی تو آدھے گھنٹے میں ہی تمام کاموں سے فراغت کے بعد اب دونوں سہیلیاں اپنے اپنے سفید دوپٹے اٹھا کر ان پر کڑھائی کرنے میں لگی ہوئی تھی

”نوری ۔۔۔“

”ہمممم“ نوری نے اپنی سہیلی اور ہمسائی کو جواب دیتے ہوئے دانتوں کے ساتھ دھاگہ توڑا اور پھر اسے سوئی کے باریک سوراخ میں ڈالنے لگی۔

وہ دونوں نوری کے گھر کے آنگن میں لگے پیپل کے گھنے درخت کی چھاؤں تلے دوپٹوں پر کڑھائی کرنے میں مصروف تھیں۔

” سلطان کے آجکل بڑے چرچے سننے میں آرہے ہیں کمہاروں کی ملوکھاں کے ساتھ ۔۔۔“

بلقیس نے پھول کی پتی بناتے ہوئے بے دھیانی میں کہا
سوئی باریک کپڑے کے پار سے گزرتی ہوئی نوری کی انگلی کی پور میں جا چبھی تھی۔اس کی انگلی سے سرخ سرخ خون کا قطرہ نکلا تھا جسے اس نے دوسری انگلی سے دبا کر وہیں روک دیا۔مگر وہ چبھن کا احساس ختم نہیں کر سکی تھی جو انگلی سے زیادہ اندر کہیں دل میں محسوس ہو رہی تھی۔
"کس سے سن لیا تم نے یہ سب۔۔۔"نوری کو اپنی آواز بھی اجنبی سی لگی کہیں دور سے آتی ہوئی۔
"ارے ملوکھاں کی ہمسائی میری پکی سہیلی ہے۔اور ملوکھاں نے خود اسے بتائی ہے یہ بات کہ سلطان مجھ سے محبت کرتا ہے۔"بلقیس نے ہاتھ کے اشارے سے سمجھاتے ہوئے کہا
نوری اس کا انکشاف سن کر خاموش ہی تو ہوگئی۔کچھ بھی نا بول سکی
"تم بچپن کی منگ ہو سلطان کی اور میری سہیلی بھی۔جان سے زیادہ پیاری ہو مجھے قسم لے لو۔اسلیئے مجھے تو بہت دکھ ہوا۔مگر تم ہو کے دنیا سے بے خبر۔تمہیں کچھ اپنی فکر بھی ہے کہ نہیں۔کہتے ہیں مرد ایک بار پھسل جائے تو پھر سیدھے راستے پر مشکل سے ہی آتا ہے"
بلقیس نے کسی بڑی بزرگ خاتون کی طرح نوری کو سمجھاتے ہوئے کہا
"فکر بھلا کسے نہیں ہوتی بلقیس" اتنے بڑے انکشاف پر بولی بھی تو وہ چار چھ مختصر لفظ۔اور لہجہ ایسا پرسکون کہ جیسے کچھ ہوا ہی نا ہو۔جیسے اسے پرواہ ہی نا ہو اس بات کی
"نوری تمہیں سچ میں کوئی دکھ کوئی پریشانی نہیں ہے۔یا پھر سلطان سے۔تمہیں سرے سے کوئی محبت ہی نہیں ہے؟؟؟" اسے اتنے بڑے انکشاف کے بعد نوری سے اس درجے بے فکری کی ہرگز امید نہیں تھی۔وہ ابھی تک دوپٹے پر جھکی کڑھائی میں مصروف تھی جیسے کچھ بات ہی نا ہوئی ہو۔
(چھوٹے دیہاتوں میں آج بھی یہ روایت چلی آرہی ہے کہ جب دو جسم رشتے کی ڈور سے ایک دوسرے سے باندھے جاتے ہیں تو پھر انہیں خود بخود ایک دوسرے سے محبت بھی ہو جاتی ہے۔بھلے وہ ایک دوسرے سے سینکڑوں میل دور ہی کیوں نا ہوں، بھلے کبھی ایک دوسرے کی صورت بھی نا دیکھی ہو۔مگر یہ رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے یہ کسی کے نام کی اپنے ساتھ منسوبی ہی ایسی ہوتی ہے محبت خود بخود ہی

ہونے لگتی ہے۔بشرطیکہ وہ دل پہلے کسی کی محبت میں مبتلا نا ہو)

"بلقیس۔۔۔جب پرندے کا دل پنجرے سے تنگ ہونے لگتا ہے تو وہ پھڑ پھڑانا شروع کر دیتا ہے۔بار بار پنجرے کی سلاخوں سے سر پٹختا رہتا ہے حالانکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح پھڑ پھڑانے اور سلاخوں سے سر ٹکرانے سے سوائے خود کو زخم دینے کے حاصل کچھ بھی نہیں ہوگا۔ایسے میں پنجرہ کھول دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ہمارا دل بھی جسم کے پنجرے میں قید ایک پنچھی کی طرح ہوتا ہے۔دل جیسے پنچھی پر کوئی زور نہیں چلتا ہمارا۔یہ ہمیشہ اپنی منوا کر رہتا ہے۔

اور میں تو ہمیشہ اپنے پنجرے کا دروازہ کھلا رکھتی ہوں۔کیونکہ جو پنچھی تمہارا ہے وہ کبھی کھلے دروازے سے بھی نہیں اڑے گا۔اور اگر اڑے گا تو شام کو تھک کر پھر اسی پنجرے میں واپس آجائے گا۔

اور جو پنچھی تمہارا نا ہو اسے کبھی کوئی پنجرہ یا سلاخیں نہیں روک سکتی"

نوری نے دوپٹہ جھولی میں رکھ کر اسے تفصیل سے جواب دیا۔۔۔

"پھر کیا فائدہ ایسی واپسی کا۔جب سارا دن ادھر ادھر لور لور پھرنے پر تو یاد نا آئے شام کو جب دنیا کی رنگینی معدوم ہونے لگے تب اسے خیال آجائے کہ ہاں کوئی میری راہ بھی دیکھ رہا ہے مجھے واپس اس کے پاس جانا چاہیئے۔پھر کیا حاصل ایسی واپسی سے؟

کیا ایسی واپسی سے من کو سچی خوشی حاصل ہو سکتی ہے بھلا۔۔؟"بلقیس نے اس کا چہرہ تکتے ہوئے بڑی گہری بات کر دی تھی

"محبت میں فائدہ نقصان تو دیکھا ہی نہیں جاتا بلقیس اور یہ جو محبت ہوتی ہے نا یہ اسی سیپ کی طرح ہوتی ہے۔سارا دن سلائی کرتے رہو، خون جلاؤ، بینائی دے دو، اپنی انگلیوں کی پوریں چھلنی کرو، ایک ایک ٹانکہ دیکھ بھال کر اور پیار سے لگاؤ، مگر صرف ایک دھاگہ ادھڑنے کی دیر ہوتی ہے اور ساری ریاضت ختم ۔۔۔بغیر کسی صلے کے، بغیر کسی اجرت کے۔"نوری نے بات ختم کرتے ہی دوبارہ سیپ اٹھالیا تھا

"نوری۔۔۔یہ کس نے سکھائی ہیں تمہیں ایسی باتیں۔۔۔؟؟؟سکول کا منہ تو تم نے بھی کبھی میری طرح دیکھا ہی نہیں۔پھر کس سے سیکھ لی ایسی باتیں"

بلقیس ۔۔نوری کی باتوں پر ہکا بکا رہ گئی تھی
"بلقیس ۔یہ جو وقت ہوتا ہے نا یہ سب سکھا دیتا ہے ۔دنیا کی ساری کتابیں زبانی یاد کرا دیتا ہے ۔پھر کبھی کبھی محبت کچھ مخصوص لوگوں سے امتحان لینے آتی ہے ۔فیل پاس کی درجہ بندی اسی امتحان میں ہوتی ہے ۔۔بس دعا ہے کہ کبھی تمہیں کسی سے محبت نا ہو ۔اور اگر ہو بھی تو کبھی محبت تم سے امتحان لینے پر نا اتر آئے ورنہ تم بھی یہ سب باتیں سیکھ لوگی ۔۔۔"
نوری نے اپنے دوپٹے پر پنسل سے نقش پھول کی پتی پر سبز رنگ کا ٹانکا لگاتے ہوئے اسے جواب دیا۔
" اتنی اداس اداس باتیں نا کیا کرو نوری ۔میرا دل گھبراتا ہے ۔اور نا ہی تم کبھی اداس ہوا کرو ۔میں تمہیں اداس نہیں دیکھ سکتی"
"میری اتنی فکر نا کیا کرو جھلی ۔مجھے کچھ نہیں ہوتا ۔میں سب سہہ سکتی ہوں کچھ بھی" نوری نے مسکرا کر اسکی معصومیت کا جواب دیا
" کیوں تم انسان نہیں ہو کیا ۔تمہارے سینے میں دل کی جگہ پتھر رکھا ہوا ہے کیا ۔۔؟ کہ جو بھی آئے ضرب لگا کر چلا جائے"
"نہیں ایسا نہیں ہے بلقیس ۔مجھے بھی دکھ ہوتا ہے ۔مجھے بھی جب ضرب لگتی ہے تو تقسیم میری بھی ہو جاتی ہے ۔بس میں نے سب سہنا سیکھ لیا ہے ۔اب ان باتوں پر اداس ہونا چھوڑ دیا ہے ۔اپنا دل جلانا چھوڑ دیا ہے ۔"
کچھ دیر بعد بلقیس اپنے دوپٹے اٹھا کر واپس گھر چلی گئی تھی ۔اور وہ دور خیالوں میں کھوئی سوچ رہی تھی کہ کیا اسے واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا ۔؟ کیا واقعی اس کا دل ان باتوں پر نہیں جلتا ؟ کیا اس نے سب کچھ سہنا سیکھ لیا ہے ؟
دل سے پوچھا تو وہ انکاری تھا ۔وہ اس کی اس بات سے متفق نہیں تھا ۔کیونکہ درد تو ہوا تھا ۔بلقیس کی بات سن کر اسے تکلیف تو ہوئی تھی ۔سلطان کا نام کسی اور کے ساتھ سن کر اندر کچھ ٹوٹا تو تھا ۔چھناکہ تو

ہوا تھا پتا نہیں یہ چھناکہ دل ٹوٹنے کا تھا یا کسی اور چیز کا۔ مگر بلقیس کے سامنے اس نے اپنا بھرم رکھ لیا تھا ۔اس پر تو کچھ بھی ظاہر نا ہونے دیا۔ جیسے سچ میں اسے کوئی فرق ہی نا پڑتا ہو۔ جیسے سچ میں اسے کوئی فکر ہی نا ہو۔ مگر کوئی سمجھے تو۔ کوئی اندر تو نہیں ں جھانک سکتا۔ اندر کی توڑ پھوڑ تو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ دیکھنے والے تو صرف چہرہ دیکھتے ہیں۔ اور وہ چہرے سے کبھی کچھ ظاہر نا ہونے دیتی تھی۔ اس معاملے میں کمال کی اداکارہ تھی نوری

☆......☆......☆

سلطان کے" ہاں" بولنے کی دیر تھی اگلی رات دین محمد اور بختاور۔۔نوری کے گھر اس کے ابا سے تاریخ لینے پہنچ گئے

نوری کے گھر میں دین محمد اور بختاور کا استقبال اسی ازلی پرتپاکی سے ہوا تھا جیسے ہمیشہ ہوتا آیا تھا ۔دین محمد کو افضل میاں نے آگے بڑھ کر گلے لگایا تو دین محمد نے ان سے ملنے کے بعد نور بانو کے سر پر اپنا دست شفقت رکھا۔ بختاور نے بھی اپنی ہونے والی بہو کو خوب سینے سے لگا کر کلیجے کو ٹھنڈ پہنچائی تھی۔

رسمی دعا سلام اور حال احوال کے بعد دین محمد نے اپنے آنے کا مقصد بیان کر دیا تھا

" دین محمد۔۔نوری تو سالوں سے آپکی امانت ہے میرے پاس۔ جب دل چاہے لے جائیں آپ لوگ۔" افضل خان نے دین محمد کے تاریخ مانگنے پر اسے جواب دیا۔

" ہم دو ہفتوں بعد کا سوچ کر آئے تھے۔ اگر آپ کو کچھ مزید وقت چاہیے تیاری کیلیئے تو جیسے آپ کی مرضی ہوگی۔ وہی تاریخ رکھی جائے گی اپنے ہی گھر کی تو بات ہے جیسے آپ لوگوں کو سہولت ہو۔"

" ہم نے کیا تیاری کرنی ہے۔ نوری کی ماں زندہ ہوتی تو وہ اس کیلیئے جہیز جوڑتی سارے ارمان پورے کرتی اپنی دھی رانی کی شادی پر۔ مجھ غریب سے جو بن پڑا میں اپنی طاقت سے بھی زیادہ دوں گا اپنی بچی کو۔ اور اسکے سوا میرا ہے بھی کون۔۔۔؟

بہت فرمانبردار اور نیک بیٹی ہے میری۔ بہت خدمت کی ہے اس نے میری۔ بس میری دھی کا خیال رکھنا۔" افضل خان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ چلے تھے۔

" فکر مت کرو افضل ۔۔۔ یہ مجھے بھی اپنی بیٹی کی طرح پیاری ہے ۔میری بہن کی نشانی ہے نوری ۔خدا نے نوری کی شکل میں ہو بہو میری بہن کی فوٹو بھیجی ہے دنیا میں ۔جب بھی اس کے چہرے پہ نظر پڑتی ہے تو مجھے اپنی بہن یاد آجاتی ہے۔" ماحول میں چپکے سے پرانی یادیں در آئی تھی ۔اور اندر کمرے میں سر پہ سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے بختاور کے ساتھ بیٹھی نوری کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسوؤں ٹوٹ کر اس کی جھولی میں گرے تو بختاور نے اسے کرب سے گلے لگا لیا۔

" بیٹا میرا آنگن اداس ہے تم وہاں قدم رکھو گی تو ہمارا آنگن خوشیوں سے بھر جائے گا" جانے سے پہلے دین محمد نے نوری کے سر پہ دست شفقت رکھتے ہوئے کہا

تاریخ طے کر دی گئی دو ہفتے کس طرح پر لگا کر اڑے کسی کو پتا ہی نا چلا ۔اور شادی کا دن آن پہنچا۔دین محمد اور بختاور نے جی بھر کے خوشیاں منائیں ۔دینو ہر ہر رسم میں اک نئی توانائی سے نوجوانوں کے ساتھ ناچتا گویا اس کی بھی جوانی لوٹ آئی ہو۔

خوشیاں جلدی ختم ہو جاتی ہیں ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے خوشی کے دنوں میں وقت کی رفتار کچھ مزید بڑھ گئی ہو۔شادی کے پانچ دن بھی پلک جھپکنے میں گزرے ۔اور ولیمہ کا دن آپہنچا۔دین محمد نے پوری شاہ والی کو خیراتی دعوت دی تھی ۔سارے گاؤں والے سلطان کی شادی کے قصیدے پڑھ رہے تھے ۔اس نے جو کہا تھا سچ کر دکھایا تھا۔شادی میں ہر اک رسم ادا کی گئی ۔خوشی کے گیت گائے گئے ۔دلہے کے سہرے پڑھے گئے۔

کلی ۔۔۔سلطان کی شادی میں پہلے دن سے لے کر آخر تک سب سے آگے آگے تھا۔اس نے ہمیشہ کی طرح ایک مخلص دوست بن کر دکھایا تھا۔سلطان کے ہر دکھ میں ہمیشہ سب سے آگے آگے رہنے والا ۔

اور وہ خود سلطان ۔۔۔کس دل سے دلہا بنا تمام رسومات میں شرکت کر رہا تھا یہ صرف اسکا خدا،خود سلطان اور کلی جانتے تھے ۔سلطان کے انکار کے باوجود بھی تمام رسمیں پورے دھوم دھام سے نبھائی گئی ۔حالانکہ وہ بیچ بیچ میں کئی بار روکتا رہا کہ سادگی سے سب کچھ انجام دیا جائے مگر اس کی کسی نے نہیں سننی تھی سو نا سنی

برات کا وقت ہوا تو اونٹوں کی ایک لمبی سی قطار تھی جو دین محمد نے برات لینے کیلئے بھیجی۔ پوری شاہ والی میں اس سے پہلے اتنی بڑی شادی کسی کی نا ہوئی تھی۔ دین محمد اور بختاور کی خوشی دیدنی تھی۔ ناقابل بیان

قرآن کے سائے میں جب نور بانو عرف نوری کو سجے سجائے اونٹ پر بٹھایا جانے لگا تو وہ باپ کے گلے لگ کے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ بن ماں کے بچی تھی اس کے آنسو پونچھنے والوں میں محلے کی سب عورتیں شامل تھیں

"میری نوری کا خیال رکھنا۔۔ دین محمد۔۔۔" آخری کلمات کے بعد افضل خان نے بھیگی آنکھوں سے ان کو انکی امانت واپس سونپ دی۔

بیٹیاں بھلے ماں باپ کے پاس پرائی امانت ہوتی ہیں لیکن کوئی بھی ماں باپ یہ امانت واپس کرتے ہوئے دل سے خوش نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کے دل رو رہے ہوتے ہیں۔ بیٹیوں کو پیدا کر کے پال پوس کر، زمانے کی ہر سختیوں سے بچا کر اسے جوان کر کے پھر نا جانے کس دل سے اسے اپنے ہاتھوں سے دوسروں کو سونپ دیتے ہیں یہ دکھ سوائے والدین کے اور کوئی جان ہی نہیں سکتا۔

شاید خدا کا حکم اور شریعت کی پابندی آڑے نا آتی تو کوئی بھی والدین اپنی بچی کو کسی کے ساتھ نا بیاہتے۔ روکھی سوکھی کھلاتے مگر ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھتے۔

مغرب کے بعد نوری کو اس کے حجلہ عروسی میں پہنچا دیا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے ساری سکھی سہیلیاں ہنستی مسکراتی، ایک دوسرے سے مذاق کرتی واپس جانے لگی۔

مگر اس ✕ کی ابھی کچھ خبر نہیں تھی۔ "کیسا محسوس کر رہی ہو نوری۔۔

من میں لڈو پھوٹ رہے ہیں یا۔" سب کے جانے کے بعد بلقیس نے اسے چھیڑا

"پتا نہیں بلقیس سمجھ نہیں آرہی کہ میں کیسا محسوس کر رہی ہوں۔ خوش ہوں بھی سہی نہیں بھی۔ دل اداس بھی ہے خوفزدہ بھی۔۔۔" اس نے گھونگھٹ کے اندر سے ہی جواب دیا

"حوصلہ رکھو نوری۔۔ تم تو بہت بہادر ہو نا سب خیر ہو گی۔۔"

"بلقیس بہت دیر ہو رہی ہے تمہیں بھی گھر جانا ہے تو تم جاؤ اب۔۔۔" نوری کو وقت کا اندازہ تھا کہ

باہر اندھیرا پھیل چکا ہے

"کوئی بات نہیں نوری۔۔۔میری فکر نا کرو۔جب آپ کے" وہ" آجائیں گے تو میں بھی تسلی کر کے آرام سے بوا بختو کے ساتھ گھر چلی جاؤں گی۔وہ مجھے چھوڑ آئیں گی۔"

وقت گزر تا رہا۔رات لمحہ لمحہ پگھلتی رہی۔ان کا انتظار طویل ہوتا گیا۔مگر جس کا انتظار کیا جا رہا تھا وہ ابھی تک غائب تھا۔اس کا ابھی تک نام و نشان تک نہیں تھا۔وہ تو ابھی تک باہر سے گھر واپس ہی نہیں آیا تھا۔خدا جانے کہاں رہ گیا تھا۔دین محمد اور بختاور کے دل بھی گھبرانے لگے۔

جب رات کافی گہری ہونے لگی تو آخر کار بلقیس کے ساتھ انتظار میں تھک ہار کر گھر واپس چلی گئی۔مگر وہ اسی طرح بیٹھی۔سر پر بڑا سا گھونگھٹ ڈالے سوگوار حسن کسی کے انتظار میں مجسم منتظر تھا۔دل میں عجیب عجیب سے خیال آرہے تھے۔بلقیس کی باتیں جو اس نے کچھ دن پہلے سلطان کے حوالے سے کی تھیں بار بار نوری کے دماغ کے پردوں سے ٹکرانے لگی۔مگر وہ ہر بات کو، ہر اندیشے کو جھٹلاتی رہی اور انتظار کرتی رہی

انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا آدھی رات بیت چلی تھی۔مگر سلطان ابھی تک کمرے میں واپس نہیں آیا تھا۔اکڑ کر بیٹھے بیٹھے وہ تھکنے لگی۔پیٹ میں درد تھا اور کمر اب جواب دے رہی تھی تو وہ اپنا لمبا گھونگھٹ زرا اوپر اٹھا کر اپنے پلنگ سے نیچے اتر آئی۔اور آہستہ قدموں سے کمرے میں چلنے لگی کہ شاید اس طرح پیٹ کا درد کم ہو۔مگر اس طرح اس کے پاؤں میں پہنی پائلوں کا شور پورے کمرے میں گونجنے لگا تو وہ دوبارہ اپنے پلنگ پر جا بیٹھی۔

پلنگ کے ساتھ رکھی ٹیبل پر رات کا کھانا اور دودھ کا گلاس ابھی تک ویسے ہی دھرا ہوا تھا کھانا تو شاید اب تک ٹھنڈا بھی ہو چلا تھا۔اس نے بلقیس کے اسرار پر دو تین لقمے لیئے تو تھے مگر پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا۔سردیوں کی لمبی راتیں تھیں۔کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا کھانے کو دیکھتے ہی اس زور کی بھوک ستانے لگی مگر بھوک کے باوجود بھی نوری نے اپنا ہاتھ کھانے کی طرف نا بڑھایا

جانے کتنا وقت مزید گزر گیا نوری نے پلنگ کے تاج پر سر ٹکایا تو سارے دن کی تھکی اس کی آنکھ

وہیں لگ گئی۔

نوری یہاں اپنے حجلہ عروسی میں تھک کر سو چکی تھی اور وہ ابھی تک رات کے اس پہر کلی کے ساتھ دریا کنارے بیٹھا تھا۔دریا کنارہ اداس پڑا ہوا تھا۔سوائے ان دونوں کے اس وقت کسی اور ذی روح کا نشان تک نا تھا۔پانی کی لہریں بھی شاید سارا دن شور مچاتے مچاتے اب تھک کر سکون کر رہی تھیں ۔کلی کی ہزار منتوں ترلوں اور سمجھانے کے باوجود بھی وہ ابھی تک گھر نہیں گیا تھا۔آخر کار تنگ آ کر کلی جب اس پر غصہ ہوا تو خود گھر جانے کی دھمکی دی تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے اٹھ کر آ گیا۔

صبح اذانوں سے ایک گھنٹا پہلے سلطان بنا چاپ پیدا کئے خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا مبادا کہیں اماں ابا نا جاگ جائیں ۔کمرے میں داخل ہو کر آہستہ سے اندر کی کنڈی لگائی اور آرام سے چلتا وہ پلنگ کے قریب آ پہنچا

نوری ابھی تک خود سے بے خبر کچی نیند میں گم تھی ۔اس کا گھونگھٹ گر کر سائڈ پر جا چکا تھا۔وہ چند لمحے اس کے بے داغ سانولے حسن کو آنکھ بھر کے دیکھتا رہا جسے ہلکے سے میک اپ نے ہی دو آتشی بنا ڈالا۔دلہن کے سوٹ میں ملبوس سوئی نوری کو اس وقت یہ خبر ہی نہیں تھی کہ وہ جس کے انتظار میں پہروں سے خود کو اکڑائے بیٹھی تھی اب وہ چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

اگلے پل اس نے زبردستی

اس خود سے بے خبر حسن سے آنکھیں چرا کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا اگر مسلسل دیکھتا رہتا تو خدا جانے کیا ہو جاتا

"آمممم ۔۔۔" سلطان کو اور کچھ سمجھ نا آیا تو اسے جگانے کی غرض سے ہنکارا ابھرا

اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی ۔جلدی سے گھونگھٹ سر پر درست کیا۔اور سیدھی ہو کر سنبھل کے بیٹھ گئی۔

"آپ کھانا کھائیں گے ۔۔۔گرم کر دوں؟" نوری نے اس کی طرف دیکھے بغیر گھونگھٹ کے اندر سے سوال کیا

حیران کن طور پر اس کے لہجے میں کوئی گھبراہٹ یا لڑکھڑاہٹ نہیں تھی

سلطان دیوار کے ساتھ رکھی چار کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا

"نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔" سلطان نے بے دلی سے اس کی بات کا جواب دیا تو وہ خاموش ہو کے بیٹھ گئی

"نور بانو۔۔۔ میں تمہیں۔۔۔

"میں وہی پہلے والی نوری ہوں۔ آپ نوری کہہ سکتے ہیں مجھے۔" وہ جو کچھ بتانے لگا تھا نوری نے اس کی بات بیچ سے اچک لی

کچھ لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔

"نوری۔۔۔ تم جانتی ہو میں اس شادی پر رضامند نہیں تھا۔ صرف اماں ابا کی خواہش پر مجھے یہ شادی کرنی پڑی۔" تھوڑی دیر خاموشی کے بعد سلطان بولا بھی تو کیا

"جی جانتی ہوں۔۔۔" اس نے بھی دل پر پتھر رکھ کر اقرار کر لیا

"میں تمہیں شادی سے پہلے یہ سب بتانا چاہتا تھا۔ تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا مگر وقت نے مجھے یہ مہلت نہیں دی۔۔۔"

"میں اب بھی آپ کو دوش نہیں دوں گی یہ دلوں اور نصیب کے کھیل ہوتے ہیں۔ انسان اس کھیل میں بے اختیار ہوتا ہے۔" اس نے بھی کمال کا ضبط پایا تھا۔ سلطان اس کے ضبط پر حیران رہ گیا

"نوری۔۔۔ میں۔۔" سلطان بولتے بولتے اٹک گیا

"آپ بولتے رہیے۔ مجھ میں سہنے کا حوصلہ ہے میں سن رہی ہوں۔۔" نوری نے سلطان کو حوصلہ دیا

"نوری میں۔۔۔ میں تم سے پہلے ملوکھاں سے نکاح کر چکا ہوں۔" اس نے سہاگ رات کا یادگار تحفہ دے دیا

بڑے سے سرخ گھونگھٹ میں لپٹے وجود کے سینے میں انسانی دل تھا۔ ضبط ٹوٹا تو دو آنسو نوری کی آنکھوں سے بہتے ہوئے اس کی گود میں رکھے ہاتھوں پر آ گرے۔ تو بلقیس کی ساری باتیں سچ ہونے لگی تھی۔ بلکہ نکاح والی بات کا اسے بھی معلوم نہیں تھا

" میں جانتا ہوں میں تمہیں دکھ دے رہا ہوں ۔مجبور ہوں ۔مجھ سے تمہارا حق ادا نہیں ہو پائے گا ۔اگر ہو سکے تو مجھے معاف ۔۔۔

" رات بہت ہوگئی ہے آپ تھک گئے ہوں گے ۔آپ یہاں سو جائیں ۔" وہ اسکی بات بیچ میں کاٹ کر ایک تکیہ اٹھائے نیچے قالین پر آ کر لیٹ گئی ۔گویا ساری باتیں اس نے ختم کر دی تھیں

سلطان اسے تھوڑی دیر وہیں بیٹھے دیکھتا رہا جواب کروٹ بدل کر آنکھیں موند چکی تھی

رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی ۔سلطان وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا ۔اور نوری دوسری طرف رخ کیئے خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی کہ اب اس کی یہی زندگی تھی اسے یہی سب سہنا تھا ۔تو یہ تھی نور بانو تمہاری پہلی رات ۔وہ رات جس کا سپنے ہر لڑکی بنتی رہتی ہے ۔واہ کیا خوب قسمت پائی ہے تم نے نور بانو ۔وہ خود ہی من ہی من میں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی

اگر وہ ضبط کی بلندیوں پر تھی تو زندگی بھی اس کا ضبط آزمانے اس کے مقابل میدان میں اتر چکی تھی

☆......☆......☆

ہائی سکول کے اسمبلی گراؤنڈ میں تمام طلبہ اپنے سکول کے مخصوص یونیفارم میں قطاریں بنائے بیٹھے تھے ۔پیچھے بیٹھے طلبہ اپنی گردنیں اونچی کر کے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے ۔اسمبلی گراؤنڈ کے سٹیج پر پانچ اساتذہ ترتیب سے کرسیاں لگائے بیٹھے تھے اور سٹیج سے تھوڑا سا آگے وہ اونچے قد کا آدمی لمبا سا کالے رنگ کا اوورکوٹ پہنے ہاتھ میں ایک شیشے کا خالی چوکور ڈبہ اٹھائے طلباء کے سامنے کھڑا تھا ۔اس کی گول ٹوپی کے نیچے پتلی لمبی موچھیں ٹھوڑی تک آ رہی تھیں ۔سب طلباء جادوگر کا کرتب دیکھنے کیلئے بیتاب تھے ۔پورے گراؤنڈ میں لڑکوں کی سرگوشیوں کی ملی جلی اور سمجھ نا آنے والی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔آج سکول میں آخری دو پیریڈ ختم کر کے سکول کے تمام بچوں کو تفریح فراہم کی گئی تھی ۔تمام چھوٹے بڑے لڑکے خوش بھی تھے اور کرتب دیکھنے کو پر جوش کو بھی

" میرے ہاتھ میں یہ شیشے کا ایک خالی ڈبہ ہے ۔" اس جادوگر نے شیشے کا ڈبہ کھول کر اونچا کر کے سب طلباء کے سامنے کیا ۔پھر اپنا رخ تبدیل کر کے ایک جھلک سٹیج پر بیٹھے اساتذہ کو دکھائی ۔پورے مجمع

کو سانپ سونگھ گیا

"اور یہ ایک گیند" دوسرے ہاتھ سے جادوگر نے اپنے کوٹ کی جیب سے سبزی مائل رنگ کی ٹینس گیند نکال کر سب کو دکھائی

اگلے لمحے میں اس نے وہ چوکور شیشے کا ڈبہ کھول کر گیند اس میں رکھ دی ۔اور ڈبے کو چھوٹا سا لاک لگا دیا۔شیشے کے چوکور ڈبے کے اندر گیند پڑی صاف نظر آرہی تھی ۔تمام طلبہ و اساتذہ بخوبی اس گیند کو دیکھ سکتے تھے

پیچھے بیٹھے طلباء کھڑے ہو کر ڈبے کو دیکھنے لگے ۔

جادوگر اب وہ بند ڈبہ سب کو دکھا رہا تھا جس میں گیند بند تھی ۔پھر اس نے وہ ڈبہ دوبارہ سٹیج پر رکھ دیا۔اور جھک کر ڈبے سے دو فٹ اوپر مہارت سے ہوا میں انگلیاں چلانے لگا

"غور سے دیکھیے ڈبے میں بند اس گیند کو۔۔۔"

تمام طلباء اور اساتذہ ٹکٹکی باندھ کر ڈبے کو دیکھنے لگے ۔

جادوگر نے تالی بجائی ۔ایک لمحے کے وقفے کے بعد دوسری تالی بجائی اور تیسری تالی پر سٹیج پر رکھا ڈبہ خالی تھا۔گینداس میں نہیں تھی ۔لڑکے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ڈبے کو دیکھ رہے تھے ڈبہ واقعی خالی تھا ۔اس میں گیند اب نہیں تھی

"گیند کہاں گئی ۔۔۔" گراؤنڈ میں طلبا کی سرگوشیاں ابھرنے لگی

جادوگر نے پھر تالی بجائی پھر دوسری اور تیسری تالی پر گیند اساتذہ کے سامنے رکھی ٹیبل پر پڑی تھی

پورا گراؤنڈ تالیوں سے گونج اٹھا تھا ۔وہاں موجود ہر بندہ حیران تھا کہ تالا لگے ڈبے سے گیند کس طرح اچانک ٹیبل پر جا پہنچی ۔حالانکہ ابھی تک وہ چوکور شیشے کا ڈبہ تالے سے بند تھا ۔اور جادوگر نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ساری آنکھیں حیرت اور بے یقینی سے پھٹی جا رہی تھی

جادوگر سینے پر ہاتھ رکھے سب کی داد وصول کر رہا تھا

" مجھے ایک بچہ چاہیئے جو سکول میں سب سے چھوٹا اور کمزور ہو

" تالیوں کی گونج کم ہوئی تو وہ مجمع سے ایک بار پھر مخاطب ہوا۔اس نے طلباء پر ایک طائرانہ نظر ڈالی

اور پہلی قطار میں بیٹھے چھٹی کلاس کے ایک کمزور سے بچے کو ہاتھ پکڑ کر اٹھایا جو سب سے چھوٹا لگ رہا تھا

وہ بچے کی انگلی تھامے اسے سٹیج پر لے آیا

"کیا آپ کے خیال میں یہ بچہ 70 کلو سے اوپر وزن اٹھا سکتا ہے۔۔۔" وہ اونچی آواز میں مخاطب ہوا

سب لڑکوں کی گردنیں منفی میں ہلنے لگی اور گراونڈ میں نہیں نہیں کی آوازیں گونجنے لگیں

اس نے بچے کو سٹیج پر لٹا دیا۔بچہ کافی خوفزدہ ہو چکا تھا

" بیٹا آپ کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔بے فکر ہو کر سو جاو۔" اس نے خوفزدہ بچے کو سرگوشی کر کے حوصلہ دیا

"کہیں یہ کوئی خطرناک کرتب تو نہیں یا اس میں بچے کو تو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔۔۔؟" سٹیج پر بیٹھے اساتذہ میں ایک نے جادوگر سے سوال کیا

"تسلی رکھیے سر۔۔۔نا تو یہ خطرناک کرتب ہے اور نا ہی اس میں بچے کوئی نقصان ہوگا۔بھروسہ رکھیئے مجھ پر" اس نے سکون سے جواب دے کر استاد کو تسلی دی۔جو اس کا جواب سن کر واقعی کچھ حد تک پر سکون ہو گیا تھا

اگلے پل وہ پھر طلبا کی قطاروں کی طرف گیا اور اس بار ساتویں کلاس کے ایک بچے کی انگلی پکڑ کر اسے سٹیج پر لے آیا

سٹیج پر آ کر وہ بیٹھ گیا اور دوسرے بچے کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر بٹھا کر ایک بار پھر کھڑا ہو گیا

"کیا آپ سب کے خیال میں یہ چھوٹا سا کمزور بچہ ہم دونوں کا وزن اٹھا سکتا ہے" وہ ایک بار پھر اونچی آواز میں مخاطب ہوا

ایک بار پھر نہیں نہیں کی آوازیں پورے گراونڈ میں گونجنے لگیں

"ٹھیک اسے دیکھتے ہیں۔۔۔براہ مہربانی سب خاموشی سے کرتب دیکھیئے۔مجھے تھوڑی دیر کیلئے خاموشی چاہیئے۔۔۔"

تمام ہال میں ایک دم سے خاموشی چھا گئی

جادوگر نے اپنا ایک پاؤں سٹیج پر سوئے بچے کے پیٹ پر رکھا۔اپنے دونوں ہاتھ لمبائی میں کھول کر توازن درست کیا اور پھر آرام سے اگلے پل دوسرا پاؤں بھی بچے کے پیٹ پر رکھ دیا۔

پورا مجمع خوشگوار حیرت میں مبتلا تھا۔کہ کس طرح اس چھوٹے بچے نے اتنا وزن اٹھا لیا

دو منٹ کے وقفے کے بعد وہ بچے کے پیٹ سے اترا اور اپنے کندھے پر بیٹھے بچے کو بھی نیچے اتارا۔

"آپ سب لوگ اس بچے سے پوچھ سکتے ہیں کہ کتنا وزن محسوس کیا۔۔۔" جادوگر ایک بار پھر بلند آواز میں سب سے مخاطب ہوا

ایک ٹیچر نے جب بچے سے وزن کا پوچھا تو اس کا جواب نفی میں تھا۔اس نے کہا مجھے تو کچھ بھی وزن محسوس نہیں ہوا۔میں تو جیسے عام حالت میں سویا ہوتا ہوں ویسے ہی سویا تھا مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہوا

ایک بار پھر تالیوں کی گونج سنائی دینے لگی۔

جادوگر اب اپنا سامان بیگ میں رکھ رہا تھا۔سامان رکھنے کے بعد اس نے سر سے اپنی گول ٹوپی اتاری اور طلباء سے ہوتا ہوا سٹیج پر اساتذہ کے پاس آیا بچوں نے دس بیس کے نوٹ ڈالے تھے تو اساتذہ نے پچاس سو والے۔ٹوپی پیسوں سے بھر گئی اور وہ وہاں پر موجود سب کا شکریہ ادا کرتا بیگ کندھے پر لٹکا کے چلا گیا

پیچھے ہر کوئی حیرت میں مبتلا تھا۔اور وہ اڈے پر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف رواں دواں۔راستے میں پڑتی ایک مسجد کے پاس چند پل رکا جیب سے وہ سارے پیسے نکال کر مسجد کے چندے والے ڈبے میں ڈالے۔اور اگلی نامعلوم منزل کی طرف چل دیا

☆......☆......☆

"سچ سچ بتا کس کا بچہ ہے تمہارے پیٹ میں؟" ملوکھاں قئے کر کے مڑی تو اس کی ماں کڑے تیوروں کے ساتھ سر پر پہنچ چکی تھی

"سلطان کا۔۔۔" ملوکھاں کے حلق سے بمشکل آواز برآمد ہوئی

"کون سلطان۔۔۔" رحمت بی بی کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلنے لگی تھی سارے اندیشے سچ ہونے لگے تھے۔جب ملوکھاں الٹی کرنے بھاگی تو رحمت بی بی نے دل ہی دل میں دعا کی کہ اس کا اندیشہ صرف اندیشہ ہی ہو سچ نا ہو۔مگر ساری دعاؤں کے نصیب میں قبولیت نہیں لکھی ہوتی

"دین محمد چچا کے بیٹے سلطان کا۔" ملوکھاں نے ڈرتے ڈرتے ماں کو بتایا

"کیا۔۔۔؟؟؟؟؟" ایک زناٹے دار تھپڑ پڑا تھا ملوکھاں کے چہرے پر۔پھر رحمت بی بی نے آؤ دیکھا نا تاؤ

ملوکھاں کے چہرے اور سر پر تھپڑوں، مکوں کی بارش کر دی۔اور اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ تھپڑ اس کے چہرے پر پڑ رہے ہیں، سر پر یا پیٹھ پر۔

کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس نے غلطی ہی ایسی کی ہے کہ اب تھپڑ نصیب بن جائیں گے۔چلو ابتداء اماں سے ہی سہی۔وہ بھی پٹتی رہی چپ چاپ۔مار کھاتی رہی خاموشی سے۔اور

کیا کرتی اس کا جرم ہی اتنا بڑا تھا

اور اماں بھی دونوں ہاتھوں سے ملوکھاں کو پیٹتی رہی۔جب تک اس کے ہاتھوں میں درد نا ہو گیا اور تھک کر بیٹھ نا گئی

"ملوکھاں تم منہ پر کالک ملنے سے پہلے دریا میں ڈوب کر مر کیوں نہیں گئی" اماں کے ہاتھ تھک چکے تو زبان سے وار کیا

"منہ کالا نہیں کیا اماں۔نکاح کیا ہے جائز طریقے سے"

اس نے آدھا سچ چھپا لیا۔پورا سچ بتا دیتی تو شاید قتل کر دی جاتی

"کیوں کیا نکاح، کیا ضرورت تھی نکاح کرنے کی اور اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے تم نے ہمیں بتانا

بھی گوارا نہیں کیا۔۔۔؟؟؟ ماں ہوں میں تمہاری۔اگر اتنی مر رہی تھی تم تو ہمیں بتاتی ہم کوئی مناسب راستہ نکال دیتے"

رحمت بی بی غم و غصے سے چیخ رہی تھی۔چلو دل میں ہلکی سی ٹھنڈک تو اتری تھی کہ نکاح کیا ہے ملوکھاں نے۔چھپ کر ہی سہی مگر حرام کا تو نہیں ہے

سارا دن اسی طرح روتے ہوئے اماں کی گالیاں سنتے اور وقفے وقفے سے مار کھاتے گزر گیا

مغرب کے بعد کا اندھیرا چھا چکا تھا۔گھر میں عجیب سی خاموشی پورے آنگن میں بکھری تھی۔ہر فرد جیسے ایک دوسرے سے منہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ملوکھاں تم نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔جیتے جی مار ڈالا ہے تم نے ہم سب کو۔" ملوکھاں کی ماں چارپائی کا پایا پکڑے سر پر پٹی باندھے رو رہی تھی۔

"اب کس کس کو صفائیاں دیں گے ہم کون ہمارے کہنے پر یقین کرے کہ تم دونوں نے نکاح کیا ہے۔۔کیسے سامنا کرو گی اپنے باپ کا۔۔۔دنیا کا" ؟؟؟

"کیوں یقین نہیں کریں گے۔نکاح خوان موجود ہے گواہ موجود ہیں نکاح فارم بھی موجود ہے۔پھر کیوں یقین نہیں کرے گی دنیا۔اور اگر تب بھی دنیا یقین نہیں کرتی تو بھاڑ میں جائیں سب۔نا کریں یقین۔مجھے دنیا کی نہیں آپ دونوں کے یقین کی فکر ہے۔صرف آپ دونوں کی فکر ہے"

"تو نکاح کرنے سے پہلے ہماری فکر کیوں نا ہوئی تمہیں۔۔۔؟ تب ہمارا خیال کیوں نا آیا۔یہ تب کیوں نا سوچا کہ بوڑھے ماں باپ تمہارے اس عمل سے رل جائیں گے۔کہیں کے نہیں رہیں گے۔۔۔" رحمت بی بی جی بھر کے اپنے سینے کی بھڑاس نکال رہی تھیں

"تب بھی خیال تھا اماں۔تب بھی فکر تھی آپ دونوں کی۔بس کچھ مجبوریوں نے بیڑی باندھ دی تھی پاؤں میں۔میرے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں بچا تھا سوائے کے"

"کون سی ایسی مجبوری تھی۔کیا مسئلہ تھا مجھے بتاؤ سچ سچ بتاؤ ملوکھاں۔ماں ہوں میں تمہاری" مجبوریوں کے ذکر پر ایک بار پھر رحمت بی بی کے اندیشوں نے سر آٹھایا تھا

”ایسا ویسا کچھ نہیں اماں ۔دل میں برے خیال نا پالیں ۔بس سلطان کے ابا راضی نہیں تھے اس شادی کیلئے ۔انہوں نے سلطان کی شادی زبردستی نور بانو سے کر دی تو مجبوراً ہمیں بھی چوری چھپے نکاح کرنا پڑا ۔۔۔“ ملوکھاں نے عین وقت پر صفائی سے جھوٹ گھڑ لیا تھا ۔سچ بتانے کی نا تو اس میں طاقت تھی نا ہی اماں کے پاس ایسا سچ سننے کی سکت تھی ۔سو اس نے جھوٹ کی انگلی پکڑ لی

ان کا غم اب ختم ہونے کا نہیں تھا ۔وقت گزرتا جا رہا تھا ابھی ایک اور محشر لگنا تھا ۔انسانی محشر ۔جہاں اسے کٹہرے میں کھڑے ہو کر ابا کی عدالت میں جوابدہ ہونا تھا ۔اور اس کے پاس کوئی وکیل صفائی بھی نہیں تھا ۔کوئی دلیل بھی نہیں تھی ۔صرف اسے اقرار کرنا تھا اپنے جرم کا ۔

اور سزا سننی تھی سر جھکا کر

☆......☆......☆

پانچواں حصہ

سورج کا گرم تھال آسمان سے نیچے بستی شاہ والی کے مکینوں پر آگ برسا رہا تھا۔بستی سے تھوڑا آگے سفر کیا جائے تو جہاں کچی پکی آبادی کا اختتام ہوتا ہے وہیں سے آگے سر سبز کھیت اور لہلہاتی فصلوں کی ایک لمبی لائن شروع ہوتی ہے جو آگے حدِ نگاہ تک جاتی ہے۔وہیں ان کھیتوں میں سے کچھ کھیت زمیندار صاحب کی اراضی میں بھی شامل تھے۔جہاں نور بانو درانتی لیئے اپنی بھینسوں کا چارہ کاٹنے میں مصروف تھی جبکہ خوشی اور جنت اس کھیت میں موجود درختوں کے بیچوں بیچ لگے بیری کے ایک گھنے اور پرانے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھے باتیں کر رہے تھے

"خوشی۔۔۔تمہیں زندگی میں سب سے زیادہ کیا اچھا لگتا ہے۔۔۔؟" بیری کے گھنے درخت تلے بیٹھے جنت نے اس سے سوال کیا

وہ دونوں جنت کے ابا کے کھیتوں میں آئے ہوئے تھے۔

گاؤں کے اکثر لوگوں کے پاس اپنی ذاتی ملکیت کی زمینیں نہیں تھی۔وہ لوگ ٹھیکے پر زمین لے کر کاشت کرتے۔بہت کم لوگ ایسے تھے جن کے پاس اپنی زمینیں تھیں۔ان گنے چنے لوگوں میں جنت کے ابا بھی شامل تھے جن کا شمار بستی کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا اسی لیئے سب لوگ انہیں اپنے اصلی نام کی بجائے زمیندار صاحب کے نام سے ہی بلاتے تھے بلکہ اب تو یہی ان کا نام مستقل یہی پڑ گیا تھا۔جیسے یہ ان کا پیدائشی نام ہو

"کیا مطلب۔۔۔؟؟؟"

"مطلب تمہیں دنیا میں کیا کیا

اچھا لگتا ہے۔کیا خواہشیں
ہیں تمہاری۔۔۔؟" اس
بار پندرہ سالہ جنت نے اسے وضاحت سے سمجھا کر پوچھا
" مجھے۔۔۔ پتا نہیں ایسا تو کبھی سوچا ہی نہیں۔۔۔"
"تو اب سوچ کے بتا دو" جنت نے آج پوچھ کر ہی دم لینا تھا۔
" مجھے۔۔۔اپنا گاؤں اچھا لگتا ہے۔۔۔"خوشی نے ایک لمحے بعد سوچ کر جواب دیا

" اور۔۔۔؟"

" اور۔۔۔بارش۔"

" اور۔۔۔؟"

" بارش کے بعد ہلکی دھوپ میں بی بی کا جھولا "

" اور۔۔۔؟"

" اور۔۔۔چاندنی رات"

" اور۔۔۔؟"

" اندھیری رات میں چمکتا جگنو۔۔۔"

" اور۔۔۔؟"

" اور۔۔۔سرمئی کے کھیت"خوشی نے ساتھ والے کھیت
کی اشارہ کرتے ہوئے بتا بتایا

" اور۔۔۔؟"

" اور۔۔۔پھولوں کا رس چوستی رنگ برنگی تتلیاں"

" اور۔۔۔؟" جنت کا لہجہ مدھم ہوتا جا رہا تھا

" اور۔۔۔دریا"

"اور"

"دریا کنارے ریت پر ننگے پاؤں چلنا۔۔۔"

"اور۔۔۔؟"

"اور۔۔۔نانی تاج۔۔۔"

"اور۔۔۔؟"

"نانی کا مجھے خوشی کی بجائے ہمیشہ پگل کہنا۔۔۔"

"اور۔۔۔؟"

"اور۔۔۔اور پتا نہیں۔۔۔بس سب کچھ تو بتا دیا ہے۔"

جنت کا دل کسی گہری کھائی میں جا گرا تھا۔وہ تو

ان سب میں کہیں بھی نہیں تھی کہیں بہت اندر کچھ ٹوٹا تھا

"اب تم بتاؤ۔۔۔تمہیں کیا کیا اچھا لگتا ہے۔۔۔؟" اس بار سوال خوشی کی طرف سے آیا

اسی لمحے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ہوا کے زور سے بیری کے درخت سے کچھ بیر زمین پر آ گرے ان میں سے ایک سرخ بیر جنت کے پاؤں کے ساتھ آ گرا۔تو اس نے وہ بیر اٹھا لیا۔۔۔

"مجھے۔۔۔تم۔۔۔" جنت نے ہاتھ خوشی کے آگے کرتے ہوئے کہا۔ہتھیلی پر وہ سرخ بیر پڑا تھا۔ خوشی کا اس کی ہتھیلی پر سے بیر اٹھاتا ہاتھ رک گیا۔نظریں بے اختیار جنت کے چہرے پر جا ٹکی تھی۔اس نے جنت کی آنکھوں میں اسی لمحے اپنی شبیہہ دیکھ لی تھی۔اور جنت تو جیسے اس وقت خوشی کے سامنے بیٹھی آگے اس کی طرف بڑھائے کوئی محبت کی مورت لگ رہی تھی یا دور سے دیکھو تو جیسے کسی نے وہاں جنت کا مجسمہ لا کے گاڑ دیا ہو۔جیسے خوشی کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے اس ساکت مجسمے کو اگر کوئی ہلکا سا بھی دھکا دے دیتا تو وہ وہیں زمین پر گر کر ٹوٹ جاتی،ریزہ ریزہ ہو جاتی۔

دیکھا جائے تو ہم سب انسان بھی مٹی کے مجسمے ہی تو ہیں چلتے پھرتے،اٹھتے،بیٹھتے،سانس لیتے اور حرکت کرتے مجسمے۔اگر جو ان ہمارے مجسموں میں سے سانس کھینچ لی جائے پھر بڑے بڑے مالز میں رکھے

ساکت مجسموں میں اور ہم جیسے حرکت کرتے مجسموں میں کیا فرق رہ جانا ہے بھلا۔۔۔؟ کچھ بھی تو نہیں۔

"ایک بار" اور" پوچھو جنت"

"اور۔۔۔؟؟؟؟؟" ایک آخری امید نے انگلی تھامی۔جنت کے ساکت مجسمے کے لبوں میں ایک ہلکی سی حرکت ہوئی تو آواز خوشی کی سماعتوں سے ٹکرائی

"اور۔۔۔ان سب چیزوں سے زیادہ تم۔۔۔" خوشی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بتایا

"تو پہلے کیوں نہیں بتایا۔۔؟" جنت کو ایسا لگا جیسے کسی نے اسے اندھے کنویں میں پھینک کر اسی جلدی سے واپس باہر نکال کر چکا چوند روشنیوں میں لا کھڑا کیا ہو۔

"کیونکہ مجھے تمہاری آنکھوں میں خوشی کو دیکھنا تھا"

ان کی باتیں ابھی جاری تھیں اور جانے کب تک جاری رہتیں جو اگر نور بانو اس دوران ان دونوں کے آکر مخل نا ہوتیں۔جنت کی ماں نور بانو مویشیوں کا گھاس کاٹ کر اب اس درخت تلے تھوڑی دیر سستانے پہنچ گئی تھی۔ان دونوں کی بات نامکمل رہ گئی۔اس کے سانولے چہرے پر دھوپ میں گھاس کاٹنے کے باعث پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔وہ دونوں جو کسی طلسم ہوشربا میں پہنچے ہوئے تھے اچانک اسی کھیت میں واپس آگئے۔طلسم ٹوٹ گیا تھا۔جیسے کوئی خواب ہی تو ٹوٹا ہو۔خوشی کو ہمیشہ ہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ کچھ لمحے جو وہ جنت کے ساتھ گزارتا ہے ان لمحوں میں جیسے کسی خواب کی سی کیفیت میں جی رہا ہو۔اور جب جنت کے ساتھ ہمراہی کے لمحے اختتام پزیر ہوتے تو یوں لگتا جیسے اچانک سے خواب ٹوٹ گیا ہو اور وہ حقیقی زندگی میں واپس آگیا ہو۔اب بھی ایسا ہی تو ہوا تھا

"آؤ خوشی کھانا کھائیں۔" کچھ لمحے سستانے کے بعد جنت کی ماں نے اس درخت کی ٹہنی سے کپڑے کے ساتھ بندھی دن کی روٹی کھول کر وہیں بیچ میں رکھتے ہوئے کہا۔

اور بھوک نا ہونے کے باوجود بھی ان کا دل رکھنے کو شامل طعام ہو گیا جانے کیوں وہ بھی نور بانو

پھپھو کی کسی بات پر انکار نہیں کر پاتا تھا

"نانی تاج کی طبیعت کیسی ہے۔ٹھیک تو ہیں نا۔؟" کھانے کے دوران جنت کی ماں نے خوشی سے سوال کیا

"جی بالکل ٹھیک ہیں نانی۔۔"

وہ تینوں ساتھ ساتھ کھانا بھی کھا رہے تھے۔ہلکی ہلکی چلنے والی ٹھنڈی ہوا نے اب گرمی کا زور کچھ کم کر دیا تھا۔

"کافی دن سے انہوں نے چکر بھی نہیں لگایا۔۔۔"

"بس بڑھاپے کے سبب اب زیادہ چلنے پھرنے سے ان کے گھٹنے درد کرتے ہیں۔اس لیئے زیادہ تر گھر پر ہی رہتی ہیں۔"

وہ انہیں نانی کے متعلق بتانے لگا

"اچھا پھپھو۔۔۔میں اب چلتا ہوں۔۔"خوشی دو چار لقمے لے کر اٹھ کھڑا ہوا

"ارے کھانا تو مکمل ختم کر کے جاؤ۔۔۔"

"نانی انتظار کر رہی ہوں گی۔صبح سے نکلا ہوا ہوں۔۔۔"

نانی کا خیال آتے ہی وہ ان سے اجازت لے کر چلا گیا

"اماں۔۔۔ایک بات پوچھوں۔۔۔؟"خوشی کے جانے بعد معصومیت بھرا سوال کیا

"آپ کو خوشی اتنا اچھا کیوں لگتا ہے۔۔۔؟؟؟"

عجیب سا سوال تھا۔ماں نے چونک کر اجنبی آنکھوں سے جنت کی طرف دیکھا۔

پھر اگلے ہی پل وہ جیسے منظر میں دوبارہ واپس آ گئیں

"جنت۔۔۔کچھ چیزوں یا لوگوں کے اچھا لگنے کیلئے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔بس وہ دل کو اچھے لگتے ہیں بغیر کسی وجہ کے۔"

"خوشی کی موجودگی میں تو آپ اکثر مجھے بھی بھول جاتی ہیں۔۔۔"

" ارے نہیں ۔۔۔تم تو میرے کلیجے کا ٹکڑا ہو۔میری جنت ہو تمہیں کبھی کیسے بھول سکتی ہوں بھلا۔۔۔؟ نور بانو کے لہجے سے ماں کی ممتا چھلکی تھی

"بس سمجھو جیسے تم میری جنت ہو نا۔۔۔ویسے ہی خوشی میں میری خوشی ہے۔"

ماں نے جنت کی پیشانی پر پیار بھرا بوسہ دیتے ہوئے جواب دیا

☆......☆......☆

سارے گھر میں طوفان کے گزر جانے کے بعد کی خاموشی پھیلی تھی۔ابا کی عدالت میں ملوکھاں پر فرد جرم عائد ہوا تھا۔ایک بیٹی کیلئے اپنے باپ کے سامنے کٹہرے میں کھڑے ہو کر اپنے گناہ کا دفاع کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے جب اس کے سامنے جرح کرنے والا بھی خود اسی کا پیدا کرنے والا باپ ہو۔

یہ عدالت کسی دو مخالفین کے بیچ کسی زمین یا قتل کے تنازعے پر نہیں لگی تھی۔

یہ عدالت تین خونی رشتوں کے بیچ گھر کے اندر لگی تھی۔یہاں والدین پر حیرتوں کے پہاڑ بھی ٹوٹے تھے کہ ان کی بیٹی نے انہی کے ناک کے نیچے اتنا بڑا قدم اٹھالیا اور انہیں خبر تک نا ہوئی۔وہ کس طرح اپنی بیٹی سے غافل ہو گئے۔انسان کو لمحوں کی خطا لمحوں کی بھول چوک بھی کبھی ساری زندگی کی سزا کے طور پر جھیلنی پڑتی ہے۔اور وہ لوگ خطا کر چکے تھے۔ان کا قصور اپنی اولاد پر اندھا اعتبار تھا،اور شاید حد درجہ غفلت بھی۔

یہاں جذبات بھی مجروح ہوئے تھے۔یہاں اعتبار کا خون بھی ہوا تھا۔یہاں اب سب کو زمانے میں رسوائی کے ڈر کا سامنا بھی تھا۔

اقبال کمہار گاؤں کا واحد اور مشہور کمہار تھا۔سارے گاؤں کے گھڑے،مٹی کے پیالے،وغیرہ اسی کے ہاتھ سے بنے ہوئے تھے۔شاہ والی میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو جہاں اقبال کمہار کی کاریگری کا نمونہ موجود نا ہو۔شام کو تھکا ہارا گھر واپس آتا تو روٹی کھا کے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد دن بھر کی تھکن اتارنے کو سو جاتا۔

زاہدہ خاتون بھی شریف اور بھلے مانس عورت تھیں۔ایک ہی بیٹی اللہ نے دی تھی جس کا نام انہوں

نے بڑے چاؤ سے ملوکھاں رکھا۔وہ بڑی ہوئی تو اپنے نام کا پرتو نکلی۔ملوکھا ایسی کہ جیسے ابھی ٹوٹنے کا خطرہ ہو۔ملوکھاں نے گھر میں سکھ دیکھا تھا کسی تنگی یا پریشانی کا سامنا نہیں تھا۔اقبال کی اتنی آمدنی تھی کہ یہ تین افراد کا گھرانہ اچھی بھلی خوش کن زندگی گزار رہا تھا

اقبال کمہار کو اللہ نے ایک ہی بیٹی سے نوازا تھا۔بیٹی بھی ایسی کہ ایسی کہ اگر ایک بار کسی کی نگاہ ملوکھاں پر اتفاقاً پڑ جاتی تو اگلا بندہ دوسری بار ملوکھاں کو دیکھنے سے خود کو کبھی نا روک پاتا۔وہ بلا کی حسین تھی اور حسین لوگ اگر اپنے حسن سے واقف بھی ہوں تو مزید قیامت ڈھاتے ہیں۔جوں جوں ملوکھاں بڑی ہونے لگی اسے اپنے اردگرد سے اپنی سہیلیوں سے اپنے رشتے داروں اپنے حسن کے قصیدے سننے کو ملنے لگے۔اور وہ بھی اسے اپنا حق سمجھ کر سب تعریفیں وصول کرنے لگی۔

باپ کمہار تھا سارا دن مٹی کے برتن بناتا۔شام کو واپس آتا تو ہر روز کوئی نا کوئی اپنے ہاتھ سے بنا چھوٹا سا مٹی کا برتن اپنی گڑیا کے لیئے ضرور بنا کے لاتا۔بچپن کے دن اسی طرح خوشیوں کے جھولے جھولتے گزر گئے پتا بھی نہیں چلا۔

کہتے ہیں بیٹیاں بہت جلد جوان ہو جاتی ہیں اور ملوکھاں نے بھی کب لڑکپن کی سیڑھی پھلانگ کر جوانی کے آنگن میں قدم رکھا پتا ہی نہیں چلا۔یہی وہ دن تھے جب اس کی زندگی میں سلطان نامی لڑکے کی آمد ہوئی۔اس نے سلطان کے قصیدے پہلے بھی کئی بار اپنی سہیلیوں کی زبانی سن رکھے تھے۔اور جب اسے پہلی بار دیکھا تو وہ اپنے دل کو اس مغرور سے لڑکے کی جانب بڑھنے سے روک نا پائی۔مگر وہ لڑکی ذات تھی اور لڑکی ذات ہمیشہ اپنے اردگرد کچھ پابندیوں کی باڑ لگائے رکھتی ہے اور وہ خود خواہش کے باوجود بھی یہ باڑ کبھی نہیں پھلانگنا چاہتی سو ملوکھاں نے بھی خود کو روکے رکھا اور یہ اپنے اردگرد کی باڑ کبھی نا پھلانگی۔

اس کہانی میں بھی ہمیشہ ہر کہانی کی طرح ابتداء لڑکے کی طرف سے ہی ہوئی تھی۔سلطان کا ہر روز اس کے راستوں میں رکنا اور پیار لٹاتی نظروں سے مسلسل ملوکھاں کی طرف دیکھتے رہنا کوئی اندھا بھی واضح محسوس کر سکتا تھا۔اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا جب سلطان نے موقع دیکھ کر اس کے سامنے اپنا دل کھول کے رکھ دیا۔وہ بھی خود کو اس دھارے میں بہنے سے بالکل نا روک پائی۔قربتیں میسر آنے لگی

۔دوریاں مٹنے لگیں۔وہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے سب کی نظروں سے چھپ کر جب رات اپنی کالی چادر پورے گاؤں پر پھیلا کر سب کو میٹھی نیند سلا دیتی تب وہ دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کی قسمیں کھا رہے ہوتے۔ملوکھاں سلطان کی محبت میں خود کو غرق کر چکی تھی ۔اس کیلئے ساری دنیا اب صرف سلطان ہی تھا۔سارا دن انگاروں پہ لوٹتے گزرا اور وہ ہر وقت دعائیں کرتی رہتی کہ جلدی رات ہو اور وہ سلطان کا مکھڑا دیکھے۔اپنی آنکھوں کی جلن کم کرے اپنے سینے پر اس کی صورت سے ٹھنڈی پوار کرے۔

وہ دونوں محبت میں ہر حد پھلانگنے کو اور ایک دوسرے کو پانے کیلئے ہر رکاوٹ سے لڑنے کو تیار تھے۔انہی راتوں کی ایک کمزور گھڑی ایسی بھی آئی جب سلطان کے کندھے پر سر رکھے ملوکھاں اسے خود پر حاوی ہونے سے روک نا پائی۔سلطان بھی اس رات بہک چکا تھا اور اس نے ہر وہ حد پھلانگ لی جو شادی سے پہلے کبھی نہیں پھلانگنی چاہیئے تھی۔ملوکھاں نے بھی سلطان کو انکار نہیں کیا اور اس رات سب کچھ اسے سونپ دیا اپنا جسم اپنی عزت بھی۔عقل تب آئی جب وہ دونوں اپنے چہروں پر گناہ کی کالک تھوپ چکے تھے اپنی محبت کو داغدار کر چکے تھے،

پھر اس غلطی کا خمیازہ بھی تو بھگتنا تھا اب۔ملوکھاں ہر وقت اپنے انجام اور رسوائی سے ڈرنے لگی۔اپنی ،اپنے ماں باپ کی بدنامی اسے ہولانے لگی۔سلطان کیلئے اور کوئی راستہ نہیں بچا تھا صرف ایک ہی راستہ تھا جس سے پر چل کے وہ خود کو تھوڑا بہت دنیا کے سامنا کرنے کے قابل بنا سکتے تھے اور وہ نکاح تھا۔دونوں نے نکاح کر لیا تھا

اقبال کمہار نے سب کچھ جاننے کے بعد بھی ملوکھاں پر ہاتھ نا اٹھایا تھا۔بس وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھے اپنی چارپائی پر ڈھے گئے۔اس شریف منش انسان نے سب کچھ جان لینے کے بعد چپ سادھ لی تھی ۔جامد چپ،دل دہلا دینے والی چپ۔

بچپن سے انہوں نے غربت دیکھی تھی۔ساری عمر برتن بنائے تھے۔مٹی کے پیالے،گھڑے، صراحیاں بنائی ان کے کاریگر ہاتھ ایسے خوبصورت نقش و نگار کاڑھتے کہ سب منہ میں انگلیاں رکھ لیتے۔ان

کے فن کو داد دیتے پر آج وہ ساری عمر کی ریاضت کے بعد بھی اپنی کاریگری کو زیرو سمجھ رہے تھے کہ اس کے کاریگر ہاتھ اس کی اکلوتی بیٹی کے کردار کو خوبصورت نہیں بنا سکے ۔بیٹی کی تربیت پر نقش ونگار نہیں لا سکے ۔پھر کس کام کی یہ سب مہارت ۔کیا فائدہ ایسے ہنر کا۔۔؟؟؟

اور وہ اب اداسی کی تصویر بنی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے زمین پر مجسمہ بنی بیٹھی تھی ۔جیسے یہ دیوار ہی آخری سہارا ہوا گر یہ بھی چھن گیا تو وہ کسی پاتال میں جا گرے گی

اسے اپنے گناہ کا ادراک تھا ۔بھلے ان دونوں نے نکاح کا فیصلہ کر کے اپنے گناہ کو چھپانے کا دانش مندانہ فیصلہ کیا تھا مگر کبھی کبھی زندگی کے کسی ایک پل میں کی جانے والی خطا کی سزا ہمیں ساری زندگی ملتی رہتی ہے۔

اسے بھی ملنی تھی ۔اور وہ ہر سزا کیلئے تیار بھی تھی ۔پر جو دکھ اس کے والدین کو اس نے خود دیا تھا اس کا مداوا ملوکھاں کبھی نہیں کر سکتی تھی ۔

" زاہدہ ہماری تربیت میں ہی کہیں کمی رہ گئی ہو گی ۔جو ملوکھاں نے یہ راستہ چن لیا"

اقبال کمہار وہیں سوئے سوئے اپنی بیوی سے مخاطب ہوا ۔جو چار پائی کے پاس ہی زمین پر سر پکڑے بیٹھی تھی

میں بے جان چیزوں کی صورتیں سنوارنے میں لگا رہا تمام عمر ۔۔۔اور میری اپنی صورت ایسی بگڑے گی کہ بازار جاتے میری نظریں شرم سے جھک جائیں گی ایسا تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا" لہجے میں دکھ تھا اداسی تھا ۔کرب تھا

دیوار کی ٹیک لگائے بیٹھی ملوکھاں کے کانوں میں باپ کے الفاظ تیزاب گھولتے اتر رہے تھے

"کیا کریں گے اب ۔۔۔؟کس کو قصوروار ٹھہرائیں گے ۔کس کے پاس فیصلہ لے کے جاؤں گا؟ کہ میری بیٹی نے ہم سے چھپ کر نکاح کر لیا ہے ۔ہمارا فیصلہ کریں ۔۔۔کونسی پنچائیت بیٹھے گی اب اس فیصلے کیلئے ۔۔۔؟؟؟"

ایسے ہزاروں سوالات تھے جو اقبال کمہار کے ذہن میں کسی بپھرے ناگ کی طرح پھن

پھیلائے ڈنگ مار رہے تھے۔

"کیا ہوگا۔۔۔؟؟؟

جا کے گریبان پکڑو اس موئے کا۔اس کے باپ دین محمد کا۔"

زاہدہ ہاتھ نچا کر بولی

"جھلی ہوگئی ہے تو۔۔۔اپنی مرضی سے نکاح کیا ہے ملوکھاں نے۔کسی زبردستی سے نہیں۔جو جا کر ان کا گریبان پکڑو۔

اس کی مرضی شامل نا ہوتی تو گولیوں سے اسے چھلنی بھی کر دیتا۔پر یہ برابر کی شریک ہے۔زرا سی بھی بات اچھلی تو پوری شاہ والی ہم پر ہی تھوکے گی۔"

وہ اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے بولے۔

"آرام سے معاملہ نبٹانا ہوگا سوچ سمجھ کر۔ایک ہی حل ہے بس اسکی رخصتی کروادی جائے سلطان کے ساتھ۔تبھی کچھ عزت باقی رہے گی۔۔۔" کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد اسے یہی ایک ہی حل نظر آیا تھا

"پر پچھلے ماہ تو سلطان کی شادی ہوئی ہے نوری سے۔دین محمد کس طرح راضی ہوگا۔اور وہ کیوں اپنی بھانجی پر سوکن لائیں گے بھلا۔۔۔" زاہدہ نے اس بار حقیقت سامنے رکھی

"سوچنا پڑے گا کچھ۔۔۔سوچنے دو مجھے۔" اقبال کمہار چارپائی کے پاس پڑا ہوا حقہ سلگاتے ہوئے بولے

وہ ساری رات سوئے نہیں تھے۔پوری رات حقہ سلگائے رہے۔سوچتے رہے۔دھوئیں کے مرغولے ہوا میں چھوڑتے رہے۔رات کے آخری پہر سونے سے پہلے وہ ایک نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔اقبال کمہار کو بس ایک ہی حل نظر آیا تھا اور اس پر عمل کرنے کا بہت جلد فیصلہ بھی کر لیا کیونکہ تاخیر ان کیلئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ابھی بات ان کے گھر میں ہی تھی باہر نہیں نکلی تھی۔جونہی بات نکلنی تھی پھر وہ کبھی بازار میں سر اٹھا کے چلنے کے قابل نا رہتے۔اس لیئے جو کرنا تھا جلدی کرنا تھا اسے۔

☆......☆......☆

" نانی ۔۔۔ سنا ہے رشید مچھیرے نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ۔۔۔؟" خوشی کوئی دینی کتابچہ اٹھائے وقت گزاری کیلئے پڑھ رہا تھا۔

نانی کے جائے نماز پر سلام پھیرتے ہی اس نے سوال کر دیا

" ہاں ۔۔۔ سچ ہے ۔ پچھلی گلی میں میکہ ہے اس کا تین دن سے آئی ہوئی ہے واپس ماں باپ کے گھر۔۔۔"

نانی ۔ نے وہیں سے اس کی معلومات میں اضافہ کیا

" کیسے کاٹے گی بھری جوانی

۔ اوپر سے دو معصوم بچے ۔" نانی کو اب بہت افسوس ہو رہا تھا۔

" نانی ۔۔۔ دنیا اتنی ظالم کیوں ہے ۔۔۔؟" خوشی نے کتابچہ بند کر کے رکھ دیا

" دنیا ظالم نہیں ہے خوشی ۔۔۔ دنیا میں رہنے والے ہم انسان ظالم ہیں ۔

خدا نے زمین پر انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا مگر یہاں آتے ہی یہ انسان خدا بن بیٹھا ہے ۔ ذرا سا کسی کو اختیار کیا ملتا ہے وہ خود کو بادشاہ سمجھ لیتا ہے ۔ سب کو اپنا محکوم سمجھ لیتا ہے ۔"

نانی اسے سمجھاتے ہوئے بولی ۔۔۔

" ہم اگلے حساب کو بھول کے ظلم کیے جاتے ہیں کیئے جاتے ہیں ۔ یہ سوچے بغیر ایک خدا ہم سب کے اوپر بھی ہے جو ہمارے ہر ظلم کو دیکھ رہا ہے ۔ ہمارا ایک ایک فعل لکھا جا رہا ہے ۔۔ ہم ظلم کرتے بھی ہیں اور ظلم ہوتے دیکھتے بھی ہیں ، اپنی آنکھوں سے ناانصافیاں ہوتے دیکھتے ہیں مگر پھر بھی چپ رہتے ہیں ۔

جبکہ اللہ نے تو فرمایا ہے کہ ظلم اور ناانصافی یا کوئی بھی غلط کام ہوتا دیکھو تو اسے روکو ہاتھ سے ، زبان سے نہیں تو دل میں برا سمجھو اس کا یہ فعل ۔

مگر ہم ظالم کو ظلم سے نہیں روکتے گویا ہم تو ظالم کا ساتھ دے رہے ہوتے ہیں ۔۔۔"

" پر نانی ہم کمزور ہیں ۔۔۔ آخر کر بھی کیا سکتے ہیں ہم ۔۔۔؟"

خوشی انہماک سے نانی کی باتیں سن رہا تھا

"کوئی کمزور نہیں ہوتا خوشی۔ضرورت صرف اپنی سی کوشش کی ہوتی ہے،ضرورت صرف پہلا قدم اٹھانے کی ہوتی ہے۔جو ہم کبھی نہیں کرتے۔بس ظلم ہوتے دیکھتے رہتے ہیں۔ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔بس زبان سے چار لفظ بول دیئے یا دو منٹ کیلئے دل میں افسوس کر لیتے ہیں مگر اس سے زیادہ ہم کچھ بھی نہیں کرتے۔پتا ہے کیوں؟

کیونکہ ہمارا ایمان بہت کمزور ہو چکا ہے۔ہم ایمان کے کمزور ترین درجے پر پہنچ چکے ہیں۔

تم نے وہ حضرت ابراہیمؑ کا قصہ تو سنا ہو گا جب انہیں نمرود نے آگ میں ڈالا تھا۔۔؟"

"ہاں نانی میں نے پڑھا تھا۔۔"

خوشی نے تائید کی

"جب ابراہیمؑ کیلئے آگ کا الاؤ روشن کیا جا رہا تھا تو ایک چڑیا اڑی اور کہیں سے اپنی چونچ میں تھوڑا سا پانی بھر کے لائی اور اس الاؤ پر ڈال دیا۔

وہ اپنا عمل دہرانے لگی بار بار جاتی اور چونچ میں ایک دو قطرہ پانی بھر کے لاتی اور آگ پر ڈال دیتی۔۔۔

اس کے اس عمل کو دیکھتے ہوئے کسی دوسرے پرندے نے سوال کیا کہ"تمہارے ان دو،دو قطروں سے اتنی بلند آگ پر کیا فرق پڑے گا جس کی تپش میلوں تک گرمی دے رہی ہے؟"

تو معلوم ہے اس چڑیا نے کیا جواب دیا۔۔۔؟

اس نے کہا میں جانتی ہوں کہ میرے دو قطروں سے آگ کو فرق نہیں پڑنا مگر جب روز محشر اللہ مجھ سے سوال کرے گا کہ تم نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔۔۔؟

تو میں کہوں گی کہ ہاں میں نے اپنی بساط بھر کوشش کی تھی۔۔۔"

"خوشی ہم ظلم دیکھتے رہتے ہیں،ناانصافی دیکھتے رہتے ہیں پر اسے روکنے اور اس کے سدباب کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔ہم تو اپنی طاقت کے برابر بھی مزاحمت نہیں کرتے"

"اچھا پھر ایمان کیسے مضبوط ہوتا ہے۔۔۔؟"

"پانچ نمازیں پڑھ کر کوئی متقی نہیں بن جاتا۔ چہرے پر داڑھی سجا لینے سے کوئی پرہیز گار نہیں بن جاتا کیونکہ داڑھی تو فرعون کے چہرے پر بھی تھی۔ جبکہ وہ نعوذ باللہ خدائی کا دعوے دار تھا۔

کعبے کے گرد چکر لگانے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا جب تک ہمارا اندر پاک نا ہو۔ ہمارا اندر باہر ایک نا ہو۔ ظاہر کو تو ہر انسان صاف ستھرا اور اجلا رکھتا ہے مگر خدا کی خوشنودی تب حاصل ہوتی ہے جب ہمارا باطن بھی ویسے ہی اجلا ہو جیسا ہم اپنا ظاہر رکھتے ہیں۔

خدا کو ظاہریت پسند نہیں ہے۔ پہلے ہمیں اپنے اندر کو ہر غلاظت سے پاک کرنا ہوگا۔ پہلے اندر کی صفائی لازم ہے۔ اپنے اندر سے بغض، کینہ، لالچ نکالنا ہوگا۔ پھر باہر کی باری آتی ہے۔ کیونکہ ایمان ہمارے اندر ہوگا تو تبھی ہمارے قول و فعل سے باہر اس کا اظہار ہوگا۔ جب اندر ہی کالا ہو تو پھر کیسے انسان ایمان کے اعلیٰ درجوں تک پہنچ سکتا ہے۔

اس کے بعد ہمیں ہمارے قول و فعل میں تضاد ختم کرنا ہوگا۔ دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت والا کلیہ ہمیشہ کیلئے ترک کرنا ہوگا۔ جب تک ہم خود عمل نہیں کریں گے ہماری ہر بات تاثیر سے خالی ہوگی۔"

نانی باتیں کرتے کرتے اب تھک چکی تھیں۔ تھوڑی سانس ہموار کرنے کیلئے انہوں نے کچھ دیر کا وقفہ لیا

"اچھا نانی پھر۔۔۔ پھر کیا کرنا ہوگا آگے۔۔۔؟" خوشی اپنی نانی کی پیاری پیاری باتوں میں کھویا ہوا تھا کانوں کے ذریعے دل میں ایک سکون سا اتر رہا تھا

"بس پہلے ان پر عمل کر لو پھر آگے چلیں گے۔" نانی نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا شاید وہ بولتے بولتے تھک گئیں تھی۔ نانی کی بات سن کر وہ بھی مسکرا دیا

☆......☆......☆

رات کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ ہر طرف تاریکی بکھری ہوئی تھی۔

دین محمد کا پورا گھر بھی تاریکی میں ڈوبا تھا۔ مگر ایک کچے کمرے سے لالٹین کی ہلکی مدھم روشنی باہر سے بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ کمرے کے اندر جھانکو تو ایک چارپائی پر دین محمد اپنی بیوی بختاور سمیت بیٹھے تھے جبکہ

دوسری سامنے پڑی چارپائی پر اقبال کمہار پریشان چہرے کے ساتھ براجمان تھے اور ان کے بائیں طرف پڑی چارپائی پر ان کی بیوی بیٹھی تھی جو اقبال کے انکار کے باوجود بھی ضد کر کے ساتھ آئی تھی اور اقبال اس شرط پر انہیں ساتھ لائے تھے کہ وہ کچھ بولے گی نہیں اس معاملے میں۔ وہ خود سلجھائیں گے یہ معاملہ۔ کیونکہ وہ اچھی طرح سوچ بچار کر کے ہی آئے تھے اور جانتے تھے اس معاملے کا بہتر حل کیسے نکالنا ہے

"دین محمد میں جو بات بتانے لگا ہوں اس پر جوش کی بجائے ہوش سے کام لینا ہوگا۔"

اقبال نے تمہید باندھی

"کھل کے بتاؤ اقبال بھائی۔۔۔ آپ کی اتنی رات گئے آمد ہی مجھے چونکا رہی ہے خدا خیر کرے۔ آپ بتائیں کیا معاملہ ہے۔" دین محمد نے اسے جواب دیا۔ وہ واقعی اقبال کے یوں آدھی رات کو ان کے گھر خصوصی کام سے آنے پر پریشان تھے

"بات یہ ہے کہ۔۔۔

سلطان اور ملوکھاں نے ہم سب سے چوری ایک دوسرے سے نکاح کر لیا ہے۔" اقبال نے ہوش اڑا دینے والا انکشاف کیا

"کیا مطلب۔۔۔ کب اور کیسے۔؟" دین محمد ہکا بکا اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگے

"ایک ماہ پہلے۔۔۔ اور کل ہی یہ بات مجھے پتا چلی ہے۔ دین محمد دیکھو یہ ہماری عزت کا معاملہ ہے۔ سوچ سمجھ کر کام لینا ہوگا۔۔"

اقبال نے نکاح فارم کی ایک کاپی دین محمد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا جو انہوں نے آج ہی ملوکھاں کے زریعے سلطان سے منگوالی تھی

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ سلطان نے تو ہمیں کچھ بھی نہیں بتایا اس نکاح کے بارے میں۔۔۔" بختاور کی آواز کسی گہری کھائی سے نکلی تھی وہ تو دنگ رہ گئی نکاح نامہ دیکھ کر

نکاح نامہ ہاتھ میں آتے ہی دین محمد کے چہرے پر آتے جاتے رنگ واضح دکھائی دے رہے تھے۔

"دین محمد میں جانتا ہوں اس سب سے آپ لوگ بھی میری طرح بے خبر تھے۔ اسلئے میں معاملہ

سلجھانے کیلیے رات کے اس اندھیرے میں آیا ہوں۔" اقبال سلجھے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں انہیں سمجھا رہے تھے

دین محمد۔۔۔رسوائی ہمیشہ بیٹی والوں کی ہی ہوتی ہے۔اس سے پہلے کہ یہ بات زبان زد عام ہو اور ہمارا تماشہ بنے میں چاہتا ہوں۔جلد از جلد اس کا کوئی بہتر حل نکالا جائے۔۔۔

کیونکہ ملوکھاں کے پیٹ میں سلطان کا بچہ پل رہا ہے۔" اقبال نے ایک اور دل دہلانے والا انکشاف کیا۔ایسا بولتے ہوئے ان کی زبان ہلکی سی کانپی تھی

"یاخدا۔۔۔یہ آج میں کیا سن رہا ہوں۔۔۔" دین محمد نے پریشانی سے پیشانی پکڑ لی

"اب کیا ہوگا۔۔۔" بختاور کے دل سے اندیشہ نکلا

"آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا اس معاملے کا؟ اور جب پانی سر سے گزر گیا تب آگئے ہیں آپ۔اب کیا فائدہ کیا ہوسکتا ہے اب۔۔۔؟" دین محمد ہلکے سے تلخ ہوئے۔انہیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ سلطان اس حد تک بھی چلا جائے گا

"دین محمد تحمل سے کام لو،میں پہلے بھی بتاچکا ہوں کہ مجھے اس سارے معاملے کا رات ہی علم ہوا ہے۔اور میں برداشت اس لیئے کرگیا کہ اس میں میری بیٹی بھی برابر کی شریک ہے۔بیٹی کا باپ ہونے کے باوجود بھی میں نے سب کچھ سلطان پر نہیں ڈالا۔قصور دونوں کا ہے۔عقل دونوں رکھتے تھے پھر بھی غلط قدم اٹھالیا دونوں نے۔قصوروار دونوں ہیں"

"پھر اب۔۔۔؟" دین محمد کے لبوں نے ہلکی سی حرکت کی

انہیں ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا مگر ہاتھوں میں پکڑا نکاح نامہ اس کڑوے سچ کا واضح ثبوت تھا

"ایک ہی حل ہے۔۔۔آپ لوگ سادگی سے رخصتی کروالیں۔ہماری بھی عزت رہ جائے گی سارا معاملہ بھی حل ہوجائے گا۔"

اقبال نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے اقبال۔ابھی پچھلے ماہ سلطان کی شادی ہوئی ہے میری بھانجی سے۔دنیا کیا

کہے گی۔۔۔" دین محمد فکرمندی سے بولے

" دین محمد۔۔۔یہ بھی تو سوچو ہم کیا منہ دکھائیں گے دنیا کو۔۔۔؟ کب تک چھپائیں گے۔بہت جلد پورے گاؤں کو علم ہو جائے گا ہماری ناک کٹ جائے گی۔کون یقین کرے کہ یہ بچہ جائز ہے یا ناجائز۔۔۔؟؟؟" اس بار اقبال کی آواز ذرا بلند ہوئی تھی

دین محمد بغیر کوئی جواب دیئے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔کچھ پل یوں ہی خاموشی کی نظر ہو گئے۔

" دوسری صورت میں معاملہ پنچائیت میں جائے گا اور پھر وہاں بھی یہی فیصلہ ہو گا۔اسلیئے میں چاہتا ہوں بجائے اس کے کہ بات باہر تک جائے۔ہم خود آرام سے معاملہ نبٹا لیں۔۔۔"

ان کو مسلسل خاموش دیکھ کر اقبال ایک بار پھر مخاطب ہوئے

" بختو۔۔۔سلطان کہاں ہے۔؟" دین محمد اس بار بیوی سے مخاطب ہوئے

" خدا جانے کہاں ہے۔ابھی تک واپس ہی نہیں آیا۔۔۔"

" اقبال۔۔۔میں اپنی بھانجی پر سوکن تو کسی صورت نہیں لا سکتا۔۔"

" ٹھیک ہے نالاؤ۔۔۔دوسرا راستہ یہ ہے کہ ملوکھاں کی ملکیت کچھ زمین اور زیور لکھ دو۔وہ وہیں رہے گی ہمارے گھر۔چند لوگوں کو بلا کر دعا منگوالیں گے۔۔۔کچھ ہماری عزت کا بھی تو سوچیں آپ لوگ"

اقبال کمہار دو دن سوچ بچار کے بعد سارے راستے نکال کر ہی آیا تھا یہاں۔

" مجھے کچھ دن وقت دو اقبال۔۔۔سوچنے کیلئے۔۔" دین محمد نے کچھ سوچ کر کہا۔

" اتنا وقت ہی تو نہیں ہے دین محمد۔۔۔پھر بھی آپ لوگ سوچ لیں میں کل پھر آؤں گا۔۔لیکن کچھ بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ہماری عزت کا خیال ضرور ذہن میں رکھنا۔۔یہ بات بھی ذہن میں رکھنا کہ میں نے بھی اسی معاشرے اسی گاؤں میں زندگی گزارنی ہے۔انہیں لوگوں میں رہنا ہے۔۔۔

ورنہ پھر دوسرا راستہ پنچائیت کا بھی ہے۔اس میں بھلے میری رسوائی سہی لیکن فیصلہ میری خواہش کے مطابق ہو گا۔تم خود سمجھدار ہو دین محمد" اقبال نے جانے سے پہلے ایک بار پھر ان کے کانوں میں بات ڈال دی۔

اس کے جانے کے بعد دین محمد نے ایک لمبی سانس خارج کی اور کہا

"بختو۔۔۔آج پتا چلا ہے کہ خدا نے اولاد کو والدین کیلئے آزمائش کیوں کہا ہے۔۔۔"

ان پر ہر راستہ بند ہو گیا تھا۔ چاروں طرف سے۔ گھٹن بڑھنے لگی تھی۔

اور یہاں جب یہ سب لوگ معاملہ سلجھانے میں لگے ہوئے تھے۔۔۔وہیں ان سب سے بہت دور رات کے اس اندھیرے میں سلطان اور ملوکھاں اپنی مخصوص جگہہ پر ملنے آئے ہوئے تھے۔

"سلطان۔۔۔اماں ابا آج دونوں آپکے گھر گئے ہوئے ہیں ہمارے فیصلے کیلیے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے بہت۔ خدا جانے کیا ہو گیا۔۔۔" ملوکھاں نے خوف سے سلطان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بتایا

"کچھ بھی نہیں ہو گا ملوکھاں۔۔۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اعتبار رکھو مجھ پر" سلطان نے بھی زرا طاقت سے اس کا ہاتھ دبا کر حفاظت کا احساس دلایا

"اگر چچا دین محمد نا مانے تو۔۔۔" اس نے ایک اور خدشہ اٹھایا

"کیوں نہیں مانیں گے۔۔۔؟ میں زبردستی منواؤں گا ان سے۔ جب میں نے ان کی مان کر نوری سے شادی کر لی ہے تو وہ کیوں نہیں مانیں گے میری۔۔۔؟"

"بس پتا نہیں۔ میرے دل کو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کچھ نا غلط ہو جائے گا اور آپ مجھے چھوڑ دیں گے۔

سلطان میں اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتی ہوں آپ کو"

ملوکھاں۔۔۔تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو کیا۔۔۔تمہیں چھوڑنے کیلئے تو نکاح نہیں کیا تم سے میں نے۔۔۔" سلطان اس کی بے وقوفی پر زرا تلخ ہوا تو وہ بھی زرا جھینپ گئی

"اچھا۔۔۔یہ بتاؤ کہ ہم اپنے بچے کا نام کیا رکھیں گے۔ کچھ سوچا ہے آپ نے؟" وہ محبتوں کی ماری اس کا موڈ تبدیل کرنے کو اس بار لاڈ سے بولی

"نہیں۔۔۔ابھی تو بہت دیر ہے بچے کو۔ اور اس کا نام بھی تم رکھنا سوچ کر اچھا سا" سلطان نے ملوکھاں کو خوش کرنے کیلیئے اسے مان دیا

رات اسی طرح باتوں باتوں میں قطرہ قطرہ بیتتی جا رہی تھی ۔اور ملوکھاں سلطان کے سنگ مستقبل کے خوشگوار خواب دیکھتی رہی

" اچھا سلطان میں اب چلتی ہوں رات کافی گزر گئی ہے ۔۔۔اماں ابا بھی پہنچنے والے ہوں گے ۔ان سے پہلے مجھے گھر پہنچنا ہو گا۔۔" ملوکھاں کو اچانک یاد آیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی

" ہاں ٹھیک اے ۔۔۔تم جاؤ اور اپنا خیال رکھنا ۔۔میں تمہیں کچھ دور چھوڑنے چلتا ہوں ۔۔"
سلطان بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور وہ دونوں وہاں سے چل دیئے

" سلطان ۔۔۔اگر چچا دین محمد نا مانے تو ۔۔۔؟" اپنے گھر والی گلی میں مڑنے سے پہلے ملوکھاں نے ایک آخری بار پھر سے ڈر کر سوال کیا

" تم بے فکر ہو کر جاؤ ملوکھاں ۔۔اماں ابا مان جائیں گے انہیں ماننا ہی پڑے گا۔
اگر نا مانے تو میں نوری کو طلاق دے دوں گا۔۔"

☆......☆......☆

چھٹا حصہ

رات قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ دین محمد، بختاور اور نور بانو تینوں کی نیند اس اچانک ہونے والے انکشاف سے کہیں اڑن چھو ہو گئی تھی۔ انہوں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ سلطان ان سب کو ایسے کسی موڑ پر بھی لے آئے گا۔ شادی سے پہلے سلطان نے نوری سے شادی کیلئے انکار تو کرتا رہا تھا مگر اس نے ایسے کبھی کسی لڑکی کا نام تک نہیں لیا تھا یا گھر میں کبھی اس طرح کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ وہ نوری کی بجائے کسی اور لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور اب ایسے اچانک۔۔۔ وہ سب بے یقین ہی تو تھے۔ نوری کے دل پر کیا گزر رہی تھی صرف وہی جانتی تھی۔ اور نا ہی اس نے اپنے گھاؤ کبھی کسی کو دکھائے تھے۔ ماں باپ اپنی جگہہ الگ پریشان تھے۔ اور وہ ابھی تک گھر بھی نہیں آیا۔۔۔

رات اسی طرح پل پل بیت رہی تھی۔ نوری ساری بات سننے کے بعد چپ چاپ اپنے کمرے میں واپس آ گئی تھی۔ شادی کے گزرے اس ایک ماہ میں جہاں دلہنوں کے ناز اٹھائے جاتے ہیں شوہر ان پر اپنی محبتیں نچھاور کرتے ہیں وہاں نوری کے حصے میں سلطان کی طرف سے ایسا کبھی کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ تو اپنی شادی کی پہلی رات ہی سے اپنے آنیوالی زندگی کو بخوبی دیکھ رہی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ سلطان کا دل اس کیلئے تو کسی طور نہیں دھڑک سکتا۔ بلکہ وہ اب جان چکی تھی کہ وہ واقعی سلطان پر جیسے زبردستی مسلط کی گئی ہو۔۔۔

ماموں دین محمد اور بختاور نے ہمیشہ اسے ایک بیٹی کی طرح چاہا تھا۔ ہمیشہ پیار دیا اور حتی الامکان کوشش کی کہ سلطان کی طرف سے ملنے والی محرومیوں کا ازالہ وہ دونوں اپنی طرف سے کر سکیں۔ مگر اس طرح تو زندگی اور محبتوں کی محرومیوں کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ خیر وہ بھی اسے اپنا نصیب سمجھ کر جینے لگی۔

جانے رات کا کون سا پہر تھا جب وہ اپنے گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔کمرے سے باھر آتی لالٹین کی روشنی سے ہی سلطان نے اندازہ لگا لیا کہ اماں ابا یقیناً جاگ رہے ہوں گے ۔وہ بھی سیدھا وہیں اسی کمرے میں آ گیا۔اماں ابا نے اسے اجنبی آنکھوں سے ایسے دیکھا جیسے آج پہلی بار دیکھ رہے ہوں ۔ہاں شاید وہ سلطان کا یہ روپ پہلی بار ہی تو دیکھ رہے تھے ۔آج اماں نے اسے گھر آتے ہی کھانے کا بھی نہیں پوچھا اور نا ہی یہ پوچھا گیا کہ وہ اتنی رات تک کہاں تھا آخر۔۔!

"ایسا کیوں کیا سلطان ۔۔۔؟"تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد دین محمد کے پہلے سوال نے ان تینوں کے مابین خاموشی توڑی ۔

"میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا سوائے ملوکھاں کو اپنانے کے ۔۔۔"اس نے بھی باپ کی طرح دھیمے لہجے میں جواب دیا۔وہ جان چکا تھا کہ سوال کس تناظر میں کیا گیا ہے ۔

"" جانتے ہو تم نے ہمیں کس طرح رسوا کیا ہے ۔؟ جانتے ہو آج تم نے ہمیں کس موڑ پر لا کھڑا کیا ہے؟"اس بار دکھ سے دین محمد کا لہجہ قدرے بلند ہوا

"اس سب کے ذمے دار آپ ہیں ابا۔میں نہیں ہوں ۔۔۔میں نے پہلے دن ہی کہا تھا کہ مجھے نوری شادی نہیں کرنی ۔یہ سب آپ کی مرضی سے ہی ہوا ہے ۔۔۔"اس کا لہجہ بھی پہلے سے بلند تھا

"لیکن تم نے ایسا کبھی کچھ نہیں کہا تھا کہ تم ملوکھاں سے گوٹیاں جوڑ چکے ہو۔ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہماری اولاد اس قدر بے حیا ہو چکی ہے کہ وہ ماں باپ کے علم میں لائے بغیر نکاح کر آئے ۔آخر کیا ضرورت آن پڑی تھی تمہیں چوری چھپے نکاح کرنے کی ۔۔۔؟" آج عدالت ویسی ہی تھی اور کیس بھی وہی تھا مگر آج یہ عدالت دین محمد کے گھر میں لگی ہوئی تھی ۔

"ابا ملوکھاں اچھی لگتی تھی مجھے ۔شادی کرنا چاہتا تھا اس سے مگر آپ نے مجبور کیا مجھے نوری سے شادی کیلئے ۔۔میں نے آپ کے کہنے پر نوری سے زبردستی شادی کر لی ۔مگر میری پسند ملوکھاں ہی تھی ۔۔تو اور کیا کرتا میں ۔۔۔؟"سلطان نے ویسے ہی لہجے میں دو بدو باپ کو جواب دیا

ان کی بلند آوازیں ساتھ والے کمرے میں سلطان کے کپڑے استری کرتی نوری کے کانوں

میں جیسے پگھلا ہوا سیسہ انڈیلتی جا رہی تھیں۔ اپنی ذات کی نفی اور ٹھکرائے جانے کا احساس ہی انسان کو اندر سے مارنے کیلئے کافی ہوتا ہے اور وہ اس احساس کے ساتھ پچھلے کئی مہینوں سے جی رہی تھی۔ یہ کوئی وقت نہیں تھا کپڑے استری کرنے کا مگر پھر بھی اس نے اپنے دل کی جلن کم کرنے کو انگاروں والی استری اٹھا کر سلطان کے کپڑے استری کرنے شروع کر دیئے

" اور کیا برا کیا ہے میں نے۔۔؟ کوئی دین سے باہر تو نہیں چلا گیا۔۔نکاح ہی تو کیا ہے کوئی گناہ نہیں۔۔" آج کٹہرے میں ملوکھاں نہیں کھڑی تھی سلطان تھا۔ وہ غلطی پر ہوتے ہوئے بھی اپنا دفاع کرنا جانتا تھا

" تو تمہیں ذرا بھی احساس نہیں ہے، تمہارے لیئے ماں، باپ رشتے کچھ اہمیت نہیں رکھتے ۔۔ہم نے جو فیصلہ کیا تھا کیا وہ غلط تھا۔۔؟" دین محمد اس کے دن بدن بدلتے روپ پر حیران تھا

" غلط تھا یا ٹھیک مگر اس میں میری کوئی مرضی نہیں تھی۔ نوری سے شادی میں نے صرف آپ کی خوشی کیلئے کی اور اب میری خوشی پر آپ لوگ کیوں دل چھوٹا کر رہے ہیں۔۔۔آخر مسئلہ کیا آپ کو میری دوسری شادی سے۔۔۔؟؟؟" سلطان کی آواز دین محمد سے بھی بلند ہو چکی تھی۔

ساتھ والے کمرے میں نوری کے کپڑے استری کرتے ہاتھ رک رہے تھے۔ وہ استری پر نظریں جمائے بیٹھی اندازہ نہیں لگا پائی کہ زیادہ تپش استری کے جلتے سرخ کوئلوں میں ہے یا اس کے جلتے سلگتے سینے میں

" ہے مسئلہ۔ لوگ کیا سوچیں گے، کس کس کو جواب دیں گے کہ تم نے شادی کے ایک ماہ بعد کیوں دوسرا نکاح کر لیا۔ کتنوں کی انگلیاں اٹھیں گی ہم پر۔ اور اقبال زیورات اور زمین میں سے حصہ مانگ رہا ہے کہاں سے لاؤں میں۔۔۔؟

" مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے لوگوں کی۔ اور نا ہی آپ کو ہونی چاہیئے۔ اور وہ اگر زمین سے حصہ مانگ رہے ہیں تو کوئی گناہ تو نہیں کر رہے۔ اب وہ میری بیوی ہے شرعی طور پر اس کا مجھ پر اور میری جائیداد میں حق ہے ملوکھاں کا۔" جانے آج وہ کیا کیا سوچ کے آیا تھا

اور وہ دونوں آنکھیں پھاڑے سلطان کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ یہ وہی سلطان تھا جس کو

دین محمد نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا اور آج وہ ان دونوں دین، دنیا سکھا رہا تھا۔
"کیا دیکھا ہے تم نے ہمارے پاس ۔یہی ایک گھر ہے ہمارا کل ترکہ ۔اور تو کوئی جائیداد نہیں چھوڑی تھی تمہارے دادا نے۔
یہی اس کے نام لکھ کے ہم تینوں باہر خیمہ لگا لیں ۔۔۔؟؟؟
بتاؤ کہاں سے لاؤں میں ۔۔۔؟؟" دین محمد کے لہجے میں دکھ تھا، لاچاری بول رہی تھی
" اینٹوں والے اڈے کی زمین تو ہے وہی نام کر دیں ملوکھاں کے ۔۔۔" سلطان کا لہجہ بھی زرا مدھم ہوا
"کیا کہہ رہے ہو تم ۔۔۔؟؟؟
وہ اینٹوں کا اڈہ ہماری روزی روٹی کا وسیلہ ہے ۔وہ اس کے نام لکھ دوں تو کھائیں گے کیا ہم۔
اور تمہارے جیسی اولاد نے ہمیں دوسرے دن یہاں سے بے دخل کر دینا ہے ۔کہاں جائیں گے ہم بڑھاپے میں ۔۔۔"
" میں اس گھر کو نہیں بیچ کھا رہا۔ وہ میری بیوی ہے اس کا حق ہے ۔کوئی زمانے سے الگ تو کچھ نہیں دیں گے ابا ۔۔۔"
بحث بڑھتی رہی آوازیں بلند ہوتی رہی ۔اس بحث کو بریک تب جا کے لگی جب سلطان پیر پٹختا گھر سے نکل گیا۔اور
وہ دونوں حیران پریشان ایک دوسرے کے چہرے تکنے لگے
" آپ دے دیں جو وہ چاہتا ہے ۔ہمارا کیا ہے آج ہیں کل نہیں ۔۔لکھ دو اسے وہ زمین ۔" رات گئے جب دین محمد کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو بختاور اس کی چارپائی کے پاس آ بیٹھی
"بختو ۔۔۔مجھے زمین کا لالچ نہیں ہے ۔قبر میں یہ ٹکڑا ساتھ نہیں لے کے جاؤں گا۔مجھے نور بانو کی فکر ہے ۔وہ رل جائے گی ۔ہمارے آنکھ بند کرتے ہی سلطان اسے باپ کے گھر بھیج دے گا ۔۔۔" دین محمد اصل وجہ سامنے لے ہی آئے

" اللہ مالک ہے سب کا۔۔۔وہی نوری کیلئے بھی کوئی در کھول دے گا۔سلطان بگڑ چکا ہے۔اور اولاد جب بگڑ جائے تو ان کے ہاتھ والدین کے گریبان تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔بڑھاپے میں والدین کو ہی ہر بات پر سر جھکانا پڑتا ہے ۔" بختاور دھیمے لہجے میں دین محمد کو سمجھاتے ہوئے بولی

" ہاں بختو۔۔۔سہی کہتی ہو تم۔اب ہمیں ہی سر جھکانا پڑے گا۔۔۔" دین محمد آخر کار ہار گیا۔۔۔

رات اداس ہو چلی تھی۔گھٹن ہوا میں بڑھتی چلی جا رہی تھی۔سلطان ابھی گیا تو صبح تک گھر واپس نہیں آیا اور نوری کی دو آنکھوں میں انتظار نے خیمے گاڑ دیئے تھے

☆......☆......☆

اور پھر وہی ہوا جو وہ لوگ چاہتے تھے۔دین محمد نے اگلے دو دن بعد محلے کے چار ،چھے بزرگ جمع کر کے انہیں ان دونوں کے نکاح کے بارے میں بتا کے دین محمد نے اپنے اینٹوں کے اڈے والی زمین ملوکھاں کے نام لکھ دی۔اور دعائے خیر ہوتے ہی دکھ سے وہاں سے اٹھ کے چلے آئے ان سے وہاں زیادہ دیر بیٹھا بھی نہیں گیا۔جتنی دیر تک دعا نہیں ہوئی تھی ان کے سینے میں جیسے انگارے جلتے رہے۔دعا ختم ہوتے ہی وہ ایک منٹ بھی مزید وہاں نہیں رکا۔اور اٹھ کے چل دیا

مگر اس سے پچھلی رات دین محمد نوری کے پاس آئے تھے اور ان سے معافی مانگی

" نور پتر۔۔۔مجھے معاف کر دینا۔سلطان نے مجھے اس موڑ پر لا کھڑا کیا ہے کہ میں اب مجبور ہو گیا ہوں۔"

" ایسا مت کہیں ابا۔۔۔آپ میرے والد کی جگہہ پر ہیں اور باپ اپنی بیٹیوں سے معافی مانگتے اچھے نہیں لگتے۔اور نا ہی کبھی کسی بیٹی کا دل اتنا پتھر ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو معافی مانگتے ہوئے دیکھ سکے۔۔۔" اس نے دین محمد کے اپنے سامنے بندھے ہاتھ کھول کر گرا دیئے۔شادی کے بعد سے نوری نے انہیں ماموں کہنا بھی چھوڑ دیا۔وہ انہیں باپ کا درجہ دینے لگیں۔

" تمہارے ظرف کا پیمانہ بہت وسیع ہے پتر۔ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا دل سے۔ہم بوڑھے ہو چکے ہیں شاید۔کمزور ہو چکے ہیں شاید جو آج اکلوتی اولاد نے ہمیں اس موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔" لاچاری اور مجبوری ان کے لہجے اور باتوں سے عیاں تھی

"ابا۔۔۔مجھے آپ سب سے یا کسی اور سے کوئی شکوہ نہیں ہے ۔یہی میرا نصیب ہے تو میں بھی ۔اسی میں خوش ہوں ۔آپ بے فکر ہو جائیں" نوری کبھی بھی ان کے سامنے کمزور نہیں پڑتا چاہتی تھی ۔اسے معلوم تھا اگر اسکی آنکھیں بھیگنے لگیں تو دین محمد خود پر بھی کنٹرول نا کر پاتے ۔اسی لیئے نوری نے آنسوؤں کو باہر کی ۔بجائے کہیں اندر گرنے کا راستہ دکھا دیا۔

لوگوں میں چہہ میگوئیاں تو بہت ہوئی کہ سلطان کی پچھلے ماہ تو شادی ہوئی ہے تو اب پھر کیا ہوا ایسا ہوا اور وہ بھی انہوں نے نکاح پہلے کر لیا۔صرف دعا مانگ کے کچھ مٹھائی بانٹ دی گئی ۔کہیں نا کہیں کچھ گڑ بڑ تو ضرور ہو گی باتیں پھیلنے لگی سوالات اٹھنے لگے ۔کسی کی زبان سوال کرتی تو کسی کی انگلیاں اور کسی کی آنکھیں ۔۔۔سلطان نوجوان تھا ،اسے لوگوں کی ان کی اپنی طرف اٹھتی انگلیوں کی یا ان کے نکاح کے بارے میں اٹھنے والے سوالوں کی کچھ فکر نا تھی ۔ہاں دین محمد یہ سب برداشت نہیں کر سکتا تھا نا اتنے لوگوں کی باتیں سن سکتا تھا اور نا ہی ان کو جواب دے سکتا تھا ۔اس سارے سے بچنے کیلئے انہوں نے گھر سے باہر نکلنا ہی کم کر دیا

نوری کے ابا نے دین محمد سے شکوہ کیا تو انہوں نے ہاتھ جوڑ لیئے ۔بس کہنے کو اور کچھ نہیں بچا تھا ۔وہ اپنی بیٹی کو واپس لینے آئے تھے مگر دین محمد کے ساتھ ساتھ نوری نے خود بھی واپس میکے جا کے بیٹھنے سے انکار کر دیا۔۔۔

اقبال کمہار کی منشاء پوری ہوئی ۔کہیں نا کہیں تھوڑی بہت عزت بچ گئی تھی ۔

ملوکھاں بھی بہت خوش تھی اس کا پیار سلطان کیلئے مزید بڑھ گیا ۔سلطان بھی کسی درجے مطمئن ہو گیا ۔ماں باپ کو ناراض کر کے ہی سہی وہ لوگ اپنا گناہ چھپانے میں کامیاب رہے تھے ۔سوچ رہا تھا کہ چلو ماں باپ کو تو پھر بھی منا لے گا کسی نا کسی طرح ۔

اب وہ کھل کے ملنے لگے ۔اب تو کوئی بھی روکنے والا نہیں تھا ۔اب انہیں رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر ملنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی ۔

ملوکھاں خوبصورت تھی ۔اوپر سے سلطان پر فدا ۔اسکی ایک کراہ پر بھی تڑپ کے رہ جاتی ۔قربتیں

میسر آئیں تو اسکا پیار دن بدن مزید بڑھنے لگا۔

حسن کے پجاری سلطان کے دن رات ملوکھاں کے ساتھ گزرتے۔ اب تو وہ نوری کو مکمل طور پر فراموش کر بیٹھا۔ اسے یاد ہی نا رہتا کہ آدھی آدھی راتوں تک بھی کوئی وجود ایسا ہے جو اس کے انتظار میں سلگ رہا ہے۔

دین محمد اور بختاور نے سلطان کی توجہ اس جانب دلائی تو وہ نوری پر ہی سیخ پا ہو گیا۔ ماں باپ کے مجبور کرنے پر وہ گھر کو وقت تو دینے لگا مگر اب وہ نوری کے ہر ہر کام میں نقص نکال کر اپنی بھڑاس اس پر نکالنے لگا۔ کبھی سالن میں نمک مرچ پر اعتراض تو کبھی روٹی کچی ہونے پر اعتراض۔ اس دن تو حد ہی ہو گئی جب نوری بے دھیانی میں اس کا سوٹ پریس کرتے ہوئے بازو جلا بیٹھی۔

"اندھی ہو گئی تھی تم۔۔۔ دھیان کہاں رہتا ہے۔ نیا جوڑا برباد کر کے رکھ دیا میرا۔" سلطان اس پر چیخنے لگا۔ اور جب نوری نے معذرت کرتے ہوئے صفائی دینی چاہی تو سلطان کے غصے کو کچھ اور ہوا مل گئی اس نے پہلی بار نوری پر ہاتھ اٹھا دیا۔ اس کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ ایک ہاتھ گال پر رکھے وہ پلنگ پر گری پڑی تھی ایک آنسو اسکی آنکھوں سے بہہ کر پلنگ کی چادر میں کہیں جذب ہو گیا

دن اسی طرح گزرنے لگے۔ آئے روز سلطان کی گالیاں وہ اپنا نصیب سمجھ کر وصول کرنے لگی۔ پر وہ بھی ضبط کی آخری سیڑھیوں پر پہنچی ہوئی تھی۔

"نوری۔۔۔ تم گھر واپس چلی جاؤ اپنے ابا کے گھر۔۔۔"

نوری کو تھپڑ مارنے کے تیسرے دن رات کو وہ نوری سے مخاطب ہوا

"کیوں اب خالی میرا وجود بھی آپ کی برداشت پر گراں ہے؟" نوری نے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ سجاتے ہوئے اسے جواب دیا

"نوری میں الٹی کھوپڑی کا بندہ ہوں۔ جانتا ہوں تمہارا حق مار رہا ہوں تمہاری حق تلفی کر رہا ہوں۔ میرے سامنے آتی ہو تو مجھ سے ہمیشہ کچھ نا کچھ غلط ہو جاتا ہے۔ کل تم پر ہاتھ اٹھا دیا۔ آگے کوئی اور قدم بھی اٹھا سکتا ہوں۔ مجھے خود پر کوئی بھروسہ نہیں ہے۔" عجیب انسان تھا خود زخم

دے کر مرہم کا مشورہ بھی دیتا ہے

"میں نے کبھی آپ کو کوئی گلہ دیا ہے؟

یا کبھی آپ سے اپنے حق کی جواب طلبی کی ہے۔۔۔؟"

"تم گلہ دو یا نا دو۔تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے میرا ضمیر ملامت کرتا ہے۔کچھ دن نظروں سے اوجھل رہو گی تو میں اپنے ضمیر کی اس ملامت سے بچ جاؤں گا"

"ٹھیک ہے۔آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہو گا۔اگر میرے آنکھوں سے اوجھل رہنے سے آپ کو سکون قلب حاصل ہوتا ہے تو یونہی سہی۔میں کل چلی جاؤں گی کچھ دن کیلئے"

☆......☆......☆

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔؟

نوری وہ تمہارے چہرے کی رونق کہاں کھو گئی۔۔۔؟"بلقیس نے فکرمندی سے اس سے سوال کیا

نوری سلطان کے کہنے پر آج اپنے میکے آئی تھی اپنے بابا سے ملنے۔جیسے ہی بلقیس کو خبر ہوئی بھاگ کے ملنے پہنچ گئی

" کچھ بھی نہیں۔۔۔ٹھیک ہی تو ہوں میں۔ایسے وہم ہوا ہے تمہیں۔" اسکے لہجے کی وہ پرانی کھنکھناہٹ غائب تھی

"یہ جھوٹ بولنا کب سے سیکھ لیا تم نے۔۔۔"

"کون سا جھوٹ۔۔۔؟"نوری حیران ہوئی

" نوری۔۔۔ہم زبان سے جو بات نا نکالنا چاہیں وہ ہماری آنکھیں اور چہرہ بیان کر دیتا ہے۔تمہاری آنکھیں اور چہرہ بھی صاف بتا رہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو مجھ سے۔کیوں چھپا رہی ہو مجھ سے۔کیا سلطان اچھا نہیں ہے تمہارے ساتھ۔۔۔"بلقیس کو

سلطان کی دوسری شادی کی خبر مل چکی تھی مگر وہ نوری کے منہ سے سننا چاہتی تھی

"نہیں بلقیس۔۔۔سلطان اچھا ہے۔بہت اچھا ہے۔بس میری قسمت تھوڑی سی اچھی نہیں ہے

میرے ساتھ۔۔۔" نوری لمبی سانس خارج کرتے ہوئے بولی

" اور انسان کو جب قسمت ہرانے پر آجائے نا تو پھر اسکی ساری ریاضتیں بے صلہ رہ جاتی ہیں ۔۔۔" ایک بار پھر ایک اداسی بھری آہ نکلی

" ایسی باتیں کیوں کرنے لگی ہو تم آجکل ۔۔۔" بلقیس کچھ ماہ سے اس کے اندر آتی تبدیلی واضح محسوس کر رہی تھی

" ایسی باتیں کرتا کوئی نہیں ہے بلقیس ۔۔۔ایسی باتیں خود نکلنے لگتی ہیں اندر سے۔"

خیر مجھے چھوڑو تم یہ بتاؤ کب رخصتی کروا رہے ہیں چاچا تمہاری ۔۔۔؟" اس نے موضوع تبدیل کرنے کیلئے بات کا رخ تبدیل کر دیا

بلقیس کی دو سال پہلے اپنے چچا کے بیٹے سے منگنی ہوئی تھی ۔اور اگلے تین چار مہینے میں نکاح اور شادی متوقع تھی

دونوں من ہی من میں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے ۔بلقیس کی آنکھوں میں ہمیشہ اپنے منگیتر کا روپ سجا رہتا

" بات کیوں تبدیل کر رہی ہو نوری ۔۔۔پاگل سمجھتی ہو مجھے جو پوچھا ہے میں نے اس بات کا جواب دو ۔کیا سلطان اچھا نہیں ہے تمہارے ساتھ ۔؟تم وہاں خوش نہیں ہو نا ۔۔؟" ؟" وہ بھانپ گئی تھی

" ارے نہیں ۔۔۔تم سے کیوں چھپاؤں گی کچھ بھلا ۔۔۔ایک واحد تم ہی تو سہیلی ہو میری پکی ۔۔۔" نوری نے مسکا لگایا

" ٹھیک ہے نا بتاؤ ۔۔۔جا رہی ہوں میں ۔۔۔اور جھیلتی رہو تم ۔خود کو جو صبر اور وفا کا مجسمہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہو نا تم کسی کام نہیں آئے گا تمہارے ۔کیونکہ سلطان میں احساس ہی نہیں ہے ۔اسے رشتوں کی قدر ہی نہیں ہے ۔سب علم ہے مجھے اس کی ملوکھاں سے شادی کا اور تم صرف پتھروں سے سر پھوڑ رہی ہو ۔ٹھیک ہے پھوڑتی رہو مگر جان لو کہ پتھروں سے سر پھوڑنے والے کا صرف اپنا سر زخمی ہوتا ہے پتھروں کو کچھ اثر نہیں پڑتا حاصل کچھ بھی نہیں ہوگا ۔اور آج کے بعد نہیں آؤں گی ملنے تمہیں ۔"

وہ نوری کو حیران چھوڑتی سچ مچ میں ناراض ہو کے پیٹھ پر اپنا لمبا پراندہ لٹکاتی چلی گئی

"بلقیس۔۔۔ بلقیس رکو، بات تو سنو میری۔۔" وہ اس کے پیچھے بھاگی مگر بلقیس نہیں رکی

نوری واپس چارپائی پر آبیٹھی۔۔۔ سامنے پیپل کے گھنے درخت پر شام ہوتے ہی چڑیاں واپس آنے لگی۔ چڑیوں کی چہکار پورے گھر میں سنائی دینے لگی

"کیا بتاؤں تمہیں بلقیس۔۔۔ میرے پاس بتانے کو ہے بھی کیا۔ الفاظ ختم ہو گئے ہیں میرے۔ ہار گئی ہوں میں اپنے نصیب سے۔" نوری اسکے جانے کے بعد خود سے باتیں کرنے لگی تھی۔ اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ جن میں لکیریں ہی لکیریں تھیں۔ ایک جال بکھرا تھا لکیروں کا۔ اور شاید سچی خوشی کی لکیر ان لکیروں میں کہیں دب کے رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

نوری ہفتہ باپ کے گھر گزار کے واپس آچکی تھی۔ مگر حالت پھر بھی وہی تھے۔ کہیں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ بلکہ حالات دن بدن شدید تر ہوتے جا رہے تھے۔

سلطان کیلئے دو کشتیوں کی سواری بڑی مشکل ثابت ہونے لگی۔ بھلے اس کیلئے نوری کا وجود بے ضرر تھا۔ اس کا ہونا نا ہونا بے معنی تھا۔ پھر بھی وہ اس سب میں الجھ کے رہ گیا تھا۔ اور اس الجھن اور جھنجھلاہٹ میں نتیجہ میں گھر کے حالات روز بروز بگڑنے لگے۔ اب جھگڑا معمول بن چکا تھا۔ اماں ابا کی روز کی نصیحتوں سے بھی وہ تنگ آچکا تھا جو ہر جھگڑے کے بعد اسے گھول کر پینی پڑتیں۔ وہ اب اس مسئلے کے حل کیلیئے سنجیدگی سے سوچنے لگا۔

اوپر سے ملوکھاں نے سلطان پر اسے اپنے گھر میں رکھنے کی فرمائشیں شروع کر دی

"سلطان۔۔۔ آخر میرا بھی تو دل ہے ہر لڑکی کی طرح میری بھی تو میری بھی تو خواہش ہے کہ ہم اپنے گھر میں رہیں۔ کب تک میں ماں باپ کے سینے پر یوں دھری رہوں گی۔" ملوکھاں نے اسے نئی آزمائش میں ڈال دیا

"ملوکھاں۔۔۔ تم جانتی بھی ہو ابا کسی صورت یہ بات نہیں مانیں گے۔ یہ شرط انہوں نے پہلے ہی

رکھ دی تھی۔

اور تم بھی وہیں اس گھر میں آ گئی تو روز کے جھگڑے اور سر درد معمول بن جائیں گے۔
کوئی تمہیں وہاں دل سے نہیں چاہتا۔۔۔" سلطان نے اسے تلخ حقیقت بتائی۔

" میں رہ لوں گی جیسے بھی ہوا اپنی جگہہ بنا لوں گی ان سب کے دلوں میں۔ پر مجھے اب اپنے گھر رہنا ہے سلطان۔ بس۔" ملوکھاں بیویوں والے لاڈ سے بولی

" اچھا میں سوچتا ہوں کچھ اس بارے۔ مگر تم کسی اچھے نتیجے کی امید۔ یں ابھی سے مت پال رکھو۔"
وہ حقیقت پسندی بھی کمال تھا۔ سچ کو ہمیشہ سامنے رکھتا۔

اور پھر وہی ہوا جیسا سلطان نے سوچا تھا۔ جیسے اس نے ملوکھاں کو بتایا تھا۔ جب یہی بات گھر میں دین محمد کے سامنے رکھی گئی تو وہ آگ بگولہ ہی تو ہو گئے تھے

" کیوں برخوردار۔۔۔ زمین اس کے نام چڑھا دی ہے زیورات اس کے نام لکھ دیئے ہیں۔ اب کیا اس گھر پر بھی قبضہ کرنے کے ارادے ہیں اس محترمہ کے۔۔۔؟" دین محمد ہتھے سے ہی اکھڑ گئے اسے تو اب ملوکھاں کے نام سے ہی آگ لگ جاتی تھی۔ جیسے ہی وہ ان کی آخر کار بہو تو تھی ہی مگر پھر آج تک وہ ان کا منہ دیکھنے نہیں گئے تھے اور نا ہی بختاور نے ملوکھاں کی دہلیز پر ابھی تک قدم رکھا تھا

" ابا۔۔۔ قبضہ کون کر رہا ہے بھلا۔۔ ملوکھاں کا بھی تو حق ہے کہ وہ اپنے گھر میں رہے۔ بیوی ہے وہ میری آخر۔۔"

"کوئی حق نہیں ہے اس کا۔۔۔ جو حق تھا وہ میں دے چکا ہوں۔ تم جوان ہو کماؤ خود۔ کب تک میں بوڑھا تمہیں تمہاری دو دو بیویوں کے ساتھ کھلاتا رہوں۔؟
خود تمہیں احساس نہیں ہوتا کہ اب تمہیں کچھ کرنا چاہیے، کمانا چاہیے، مزدوری کرنی چاہیے۔ تم پر اب دو بیویوں کی ذمہ داری ہے کل کو بچے ہوں گے تو کیا بھیک منگواو گے اولاد سے۔۔۔؟"
دین محمد نے اسے اچھا خاصا جھڑک دیا۔ کب تک وہ اپنے بوڑھے اعضاء پر ظلم ڈھاتا؟
جوان اولاد کو خود احساس نہیں ہوا تو اسے خود احساس دلوانا پڑا

" جاؤ کہیں مزدوری ڈھونڈو، کماؤ محنت کرو اور جو اس کے نام اڈے والی زمین لکھ دی بنوا دو اسے گھر"

سلطان کی تو بولتی ہی بند ہوگئی۔ ساری زندگی ماں باپ نے ہر خواہش منہ سے نکالتے ہی پوری کردی۔ بچپن سے کھلا پلا کر بڑا کیا، شادی کی، پھر دوسری شادی۔

اس نے یہ سب تو سوچا ہی نہیں تھا۔ زندگی کے اس رخ سے اسے واقفیت ہی نہیں تھی۔

" ہاں ابا کماؤں گا۔۔۔ اور میں جانتا ہوں آج آپ کو میری بے روزگاری کی فکر کیوں پڑ گئی ہے۔ جب تک ملوکھاں وہاں تھی سب ٹھیک تھا۔ جیسے ہی اس نے یہاں آنے کی بات کی آپ کو میری بے روگاری اور اپنے بڑھاپے کا خیال آگیا۔"

سلطان کی آنکھوں پر تو جیسے پٹی بند چکی تھی اس نے باپ کی سخت باتوں کا الٹا ہی مقصد نکال لیا۔ یہ نہیں سوچا کہ وہ بالکل صحیح بول رہے ہیں۔ سچ بول رہے ہیں۔ وہ اتنی عمر اور دو بیویوں کے باوجود بھی ابھی تک نکما تھا۔ اس نے کبھی کوئی کام دھندہ یا محنت مزدوری کا سوچا ہی نہیں تھا۔ تصویر کا دوسرا رخ تو اب سامنے آرہا تھا

" اور میں نے نہیں کہا تھا میرے سر پر دو بیویوں کا بوجھ ڈالو۔ آپ کی ہی خواہش تھی۔ میں تو آج بھی نوری کو طلاق دینے کیلئے تیار ہوں۔۔۔"

" بکواس بند کرو اپنی سلطان۔ اور آج کے بعد یہ لفظ منہ سے بھی نا نکالنا۔ میری بہن کی آخری نشانی ہے وہ۔ اگر خدا نا کرے کبھی ایسی نوبت آبھی گئی تو یاد رکھنا تمہارا بھی اس گھر میں وہ آخری دن ہوگا۔"

دین محمد غصے سے آگ بگولہ ہی ہوگئے۔ ان کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو چکی تھیں۔

" اچھا تو اب وہ آپ کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہوگئی ہے؟"

اسے باپ پر حیرت ہوئی۔

" ہاں زیادہ عزیز ہے مجھے تم سے۔ کیونکہ وہ تمہاری طرح نہیں ہے۔ اس نے تمہاری طرح میرا یا اپنے باپ کا نام بدنام نہیں کیا۔ تمہاری طرح کسی سے چھپ کر نکاح نہیں کیا۔

تمہاری ہزار بے اعتنائیوں کے باوجود اس جنم جلی نے کبھی منہ ایک لفظ شکایت نہیں نکالا ۔
تم میرے بیٹے ہو، میرا خون ہو پھر بھی مجھے یہ کہتے ہوئے بالکل عار محسوس نہیں ہو رہی کہ تم جیسا بندہ نوری کے قابل ہی نہیں ہے ۔ کیونکہ تمہیں اس ہیرے کی قدر ہی نہیں ہے ۔تم صرف چمکتی چیزوں کے پجاری ہو ۔۔۔" دین محمد نے آج ساری بھڑاس نکال دی تھی ۔ وہ آج کھلے تو سارے زخم ادھڑتے چلے گئے ۔سب کچھ زبان کے رستے باہر آنے لگا ۔اب وہ اتنا بولنے کے بعد تیز تیز سانس لے رہے تھے جبکہ سلطان پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں بس دیکھے جا رہا تھا ۔ابا کی کچھ لمحے پہلے کی باتیں صرف باتیں نہیں اس پر ڈنڈوں کی طرح برسی تھیں
"تو پھر ٹھیک ہے میں آج ہی یہ معاملہ ہمیشہ کیلئے ختم کر دیتا ہوں ۔مجھے بھی کوئی ضرورت نہیں ہے ایسے گھر کی جہاں میری کوئی ضرورت ہی نہیں ، جہاں میری کوئی عزت ہی نہیں ۔۔جہاں مجھ سے زیادہ میری ان چاہی بیوی کی عزت ہو ۔میں سلطان محمد خان اپنے پورے ہوش و حواس میں نوری کو ابھی طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں ۔۔۔"
"سلططططان ۔۔۔دین محمد وہیں سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھنے کیلئے بھاگے تھے مگر سلطان قیامت ڈھا چکا تھا ۔
چولہے میں سہمی بیٹھی کب سے باپ بیٹے کا خاموشی سے جھگڑا دیکھتی نوری کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو چکی تھیں ۔اس کے سامنے کھڑا شخص ایک پل میں ہی اس کے مجازی خدا کے رتبے سے گر کر نامحرم ہو چکا تھا ۔
دین محمد کو اگلا قدم بڑھانے کی مہلت ہی نہیں ملی ۔اسے لگا جیسے اس کے سارے جسم کی توانائی نچوڑ لی گئی ہو ۔وہ وہیں بیچ میں ہی زمین پر سر پکڑ کر بیٹھتا چلا گیا ۔
اور سلطان زمین ۔پر پیر پٹختا غصے میں تن فن کرتا گھر سے باہر نکل گیا ۔
بختاور اس قیامت سے بے خبر ابھی تک زمینوں پر لکڑیاں چن رہی تھی ۔اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ گھر میں ایک گھنٹے میں کیا کچھ بدل چکا ہے

مرد اپنا اختیار استعمال کر لیتا ہے۔ یہ سوچے بنا کہ اس کے اس کام۔ کا ردعمل کیا ہو گا۔ اگر مطلقہ بے قصور ہو تو اس کے دل پر کونسی قیامت گزرتی ہے، پھر زمانہ اسے کن نظروں سے دیکھتا ہے۔ وہ دنیا میں کس طرح اپنے وجود کو سمیٹ کر جیتی ہیں۔ اس کے ماں باپ کے دل پر کیا گزرتی ہے جن۔ کی بیٹی شادی کے پہلے سال ہی طلاق لے کر انکی چوکھٹ پر آ بیٹھے۔ مگر یہ سارے سر درد مرد کے تھوڑی ہوتے ہیں جو وہ یہ سب سوچے۔ اسے اپنی بادشاہت دکھانی ہوتی ہے۔ بیوی پر ثابت کرنا ہوتا ہے کہ اسکی حیثیت تو صرف چار حرفوں کی ہے۔۔۔ط، ل، ا، ق

سلطان نے بھی اپنا اختیار کر لیا تھا۔ بے قصور نوری کو بے مول کر دیا تھا۔ اب وہ جیئے، مرے اسے تو اپنی جھوٹی شان عزیز تھی۔ اپنا طرہ اونچا کرنے کیلئے ایک بے قصور کو اس نے طلاق کی سولی پر ٹانگ دیا تھا۔ اب وہ جیئے، مرے اسکی بلا سے اسے کیا۔۔۔

شام کو بختاور لکڑیاں چن کر تھکی ہاری واپس آئی تو گھر میں معمول سے کچھ زیادہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ لکڑیوں کا گٹھڑ رکھ کر اندر کمرے میں گئی تو دین محمد زمین۔ پر بیٹھے منہ کو اپنے سفید صافے سے چھپائے بیٹھے تھے ان کے آہستہ آہستہ ہلتے وجود سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ رو رہے ہیں سسکیاں بھر رہے ہیں۔ دوسری طرف سر پر چادر سلیقے سے پہنے نوری غم کی تصویر بنی زمین پر چھوٹی لکڑی سے بے ترتیب انداز میں لکیریں کھینچ رہی تھی۔ خدا جانے یہ آڑھی ترچھی لکیریں اس کے سیاہ مقدر کی تھیں یا بد قسمتی کی۔ دوسری چارپائی پر نوری کے ابا بیٹھے سرخ آنکھوں سے آنسوؤں بہا رہے تھے۔

بختاور دہل گئی۔ ضرور کچھ غلط ہو چکا تھا۔

"دین محمد۔ کیا ہوا ہے مجھے بتاؤ کیوں رو رہے ہو سب۔۔۔؟" اس نے شوہر کا کاندھا ہلاتے ہوئے پوچھا مگر وہ بغیر کوئی جواب اسی طرح روتے رہے

"نوری۔۔۔ بیٹا تم بتاؤ آخر ہوا کیا ہے۔ کیوں رو رہے ہو سب اس طرح۔ جلدی بتاؤ ورنہ میرا دل بیٹھ جائے گا۔۔۔" اگلے لمحے بختاور نے نوری کو جھنجھوڑ ڈالا مگر اس کے بت میں کوئی تبدیلی نا آئی وہ اسی پوزیشن میں زمین۔ پر لکیریں مارتی رہی

"کیا بتائیں تمہیں بختو۔۔۔کیسے بتائیں۔۔۔؟

طلاق دے دی ہے سلطان نے نوری کو۔" وہ نوری کو بار بار جھنجھوڑنے لگی تو دین محمد نے روتے ہوئے اس کے کانوں میں سیسہ انڈیلا۔

"لا الہ الا۔۔۔ بختاور نے کلمہ پڑھتے روتے ہوتے ہو نوری کو اپنے ساتھ زور سے بھینچ لیا

"چل پتر اٹھ جا اور چادر اوڑھ لے۔۔۔یہ گھر اب تیرا نہیں رہا" نوری کے ابا نے جانے کس کرب سے اپنی بدقسمت بیٹی کو پکارا

اور وہ دھتکاری ہوئی غم کی تصویر سوچے جا رہی تھی کہ میرا حقیقی گھر کوئی ہے بھی سہی یا نہیں پہلے وہ۔۔۔پھر یہ۔۔۔اب پھر وہ

☆......☆......☆

ساتواں حصہ

گھر میں جو سلطان نے قیامت ڈھائی تھی وہ سلطان نے نوری کو طلاق دے کر ڈھادی تھی ۔اور خود وہیں چلا گیا جہاں وہ اکثر جاتا تھا ملوکھاں کے پاس ۔دین محمد اور بختاور صدمے کی کیفیت میں تھے ۔دین محمد تو ڈھے سے گئے تھے انہیں یہی دکھ ستائے جا رہا تھا کہ اب ان کی بھانجی پھر کبھی اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکے گی ۔وہ ان کیلئے ایک ہی پل میں پرائی ہو گئی تھی ۔وہ مجبور تھے اس معاملے میں لاچار تھے اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے

اور دکھ تو انہیں اس بات کا تھا کہ ان حالات کا ذمہ دار ان کا اکلوتا بیٹا،ان کا اپنا خون سلطان تھا۔

وہ دکھ سے منہ چھپائے روتے رہتے تھے انہیں یہی تکلیف کھائے رہتی کہ نوری تو بے قصور تھی ۔اس بدقسمت نے تو کبھی کوئی شکوہ بھی نہیں کیا تھا۔اور وہ خود روز محشر اپنی بہن کو کیسے منہ دکھا پائے گا؟ کیسے ان سے نظریں ملا پائے گا؟ یہی دکھ انہیں ہر وقت کھائے رہتا۔بختاور اپنی جگہہ الگ دکھ میں مبتلا تھی وہ ہمیشہ سلطان کو اکلوتی اور نا سمجھ اولاد سمجھ کر ڈھیل دیتے تھے اس کی ہر غلطی کو در گزر کر دیتے ،اس کی ہر ضد کو پورا کر دیتے مگر اس غلطی کو کیسے معاف کیا جاتا؟ سلطان انہیں ایسے دن بھی دکھائے گا یہ تو بختاور نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا

"اب کیا لینے آئے ہو تم یہاں ۔۔؟ کیا کچھ بچا کر گئے تھے ۔۔۔؟؟؟" آج سلطان تین دن بعد واپس آیا تو اماں کے لہجے میں غم وغصے کے ملے جلے تاثرات در آئے

وہ خاموش رہا۔کوئی بات نا کی ۔اور آتے ہی باہر پڑی چارپائی پر سو گیا

نوری کو اس کے ابا اسی رات واپس لے کے چلے گئے تھے۔

"بولتے کیوں نہیں ہو تم۔۔۔کیا بگاڑا تھا اس بے قصور نے تمہارا۔۔۔؟ جو اتنی بڑی سزا دے دی تم نے نور بانو کو۔جاؤ اب چلے جاؤ اس کمہارن کے پاس جس نے تمہیں پٹیاں پڑھائی تھیں۔یہاں اب تمہارے لیئے کچھ بھی باقی نہیں ہے۔" اماں آج سارے حساب چکانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

"ملوکھاں کا اس سب میں کوئی قصور نہیں ہے اماں۔" سلطان نے ملوکھاں کی طرفداری کی۔

دیکھا جاتا تو اس معاملے میں ملوکھاں کا قصور بھی کچھ نہیں تھا۔اسی کا اپنا دماغ پھر گیا تھا۔

"مت بلاؤ مجھے اماں۔۔۔مر گئی ہوں میں تمہارے لیئے۔"

بختاور نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کیئے تھے

وہ حیران نظروں سے اماں کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ نوری آخر ان دونوں کیلئے اتنی اہم کیسے ہو گئی ہے کہ وہ دونوں اپنی اولاد سے بھی زیادہ اسے چاہتے ہیں

"کیوں نا بلاؤں میں۔اسی ایک کے ہونے سے تو ہمارا رشتہ نہیں تھا جو اس کے جانے سے ہمارا رشتہ ختم ہو جائے۔اس سے پہلے بھی ہمارا رشتہ تھا خون کا رشتہ۔وہ آپ کیلئے جانے اتنی اہم کیوں ہو گئی ہے۔"

"کیونکہ اسے ہماری قدر تھی احساس تھا ہمارا، ہم سے جڑے ہر رشتے سے پیار تھا اسے۔وہ اس لیئے اہم تھی کیونکہ وہ اس اہمیت کی قابل تھی۔تم نہیں ہو۔نا تو تمہاری آنکھوں میں کچھ حیا باقی ہے۔نا ہی تمہیں انسانوں کا یا رشتوں کا کچھ احساس ہے۔تمہاری عقل پر ملوکھاں کلموہی کا پردہ پڑا ہوا ہے تمہیں اس کے سوا کوئی دوسرا انسان نظر ہی نہیں آتا"

"اماں میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں آپ کو اس سب میں ملوکھاں کا کوئی قصور نہیں ہے اس لیئے اسے بار بار بیچ میں مت لائیں۔" وہ بھی اس بار چیخ پڑا

"کیوں نا لاؤں اس کو۔سارا قصور اس کا ہے۔نا اس سے یوں چھپ کے نکاح کرتے نا ہی آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوتا۔سلطان تم نے ماں باپ کو رلا کے رکھ دیا ہے۔ہمارے سینے چیر دیئے ہیں۔مر گئی ہوں میں آج سے تمہارے لیئے۔مجھے مت پکارا کروں اماں۔" بختاور جملہ مکمل کرتے ہی کرب سے رو پڑیں۔منہ پر دوپٹہ رکھ لیا

وہ بھی حیران پریشان تھا ڈھیٹوں کی طرح پڑا رہا۔جانتا تھا اس نے قدم غلط اٹھایا ہے مگر روز روز کی اس سر دردی سے بچنے کا ایک ہی حل نظر آیا تھا اسے۔کچھ بیچ میں انا بھی آڑے آ گئی تھی غصہ بھی۔اسے حیرانگی اور دکھ بھی تھا کہ وہ اماں ابا کیلئے اتنی اہم کیوں ہو گئی ہے۔دوسرا اگر اس نے اماں ابا کی بات مان کر نوری سے شادی کر لی تھی تو اماں ابا ابھی تک اس کی پسند ملوکھاں کو کیوں دل سے قبول نہیں کر رہے۔قبول تو بہت دور انہوں نے تو اپنی بہو کا چہرہ دیکھنا تک گوارہ نہیں کیا تھا

"تم کیوں آئے ہو یہاں۔۔۔تم سے کہا تھا نا میں نے اگر نوری کو تم نے طلاق دینے کا سوچا بھی تو اس گھر میں کبھی قدم تک نا رکھنا۔۔۔اور تم نے تو وہی کچھ کر کے دکھا دیا ہمیں۔۔۔" دین محمد نماز پڑھ کر گھر واپس آئے تو سلطان بے شرموں کی طرح چار پائی پر سویا پڑا تھا۔اسے تو آگ ہی لگ گئی

"کیا بات کر رہے ہو ابا۔۔۔کہاں جاوں میں۔۔۔یہ میرا گھر ہے۔میں اسے کیوں چھوڑ دوں۔۔؟" اس نے تو سوچا تھا کہ چار

دن میں ابا کا غصہ ہمیشہ کی طرح ختم ہو جائے گا کیونکہ ابا تو اس سے کبھی زیادہ دیر ناراض رہ بھی نہیں سکتے

"یہ نوری کا بھی گھر تھا مگر تم نے اسے اس گھر سے ہمیشہ کیلئے بے گھر کر دیا۔آج سے کوئی گھر نہیں ہے یہ تمہارا۔اور نا ہی آج کے بعد ہم سب سے تمہارا کوئی رشتہ۔اگر تمہیں ہمارا، ہم سے جڑے رشتوں کا کچھ احساس نہیں ہے تو ہم بھی جی لیں گے تمہارے بغیر۔"

دین محمد سیدھا اس کی چار پائی کی طرف آئے اور اسے بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولے۔

سلطان ہکا بکا تھا۔اماں ابا کا یہ رویہ تو اس نے آج سے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا

"ابا کیا کر رہے ہو آپ۔چھوڑو مجھے۔کہیں نہیں جانا مجھے۔میں یہیں رہوں گا اپنے گھر میں۔۔" حیران و پریشان سلطان نے اپنا بازو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا

"وہی کر رہا ہوں جو تم نے ہمارے ساتھ کیا، وہی کر رہا ہوں جو تم نے نوری کے ساتھ کیا، وہی

کر رہا جو مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیئے تھا۔آج کے بعد ہمارا تم سے اور تمہاری آنے والی ہر نسل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔
میں سمجھوں گا کہ میرا ایک ہی بیٹا تھا جو ڈوب کے مر گیا تھا۔مر بھی جاؤں تو میرا آخری منہ دیکھنے مت آنا۔چار لوگ کندھا دے کے مجھے قبر تک پہنچا دیں گے۔" دین محمد نے اسے آخری دھکا دے کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور خود روتے ہوئے وہیں دروازے کے ساتھ بیٹھتے چلے گئے۔تھوڑے فاصلے پر چولہے میں بیٹھی بختاور منہ پر دوپٹہ رکھے اپنے آنسوؤں چھپانے کی کی کوشش کر رہی تھی

☆......☆......☆

"خوشی۔۔۔کبھی کبھی مجھے لگتا ہے یہ دریا ہم سب پر چڑھ دوڑے گا۔اور پورے گاؤں کو ساتھ بہا کے لے جائے گا۔۔" جنت نے دریا کے پانی پر سے نظریں ہٹا کر خوشی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
رات ہونے والی موسلا دھار بارش نے گاؤں میں جھل تھل کر دیا تھا۔گاؤں کی کچی گلیاں پانی سے بھر چکی تھی۔اور وہ دونوں شام کو دریا کنارے آئے تو جنت کو جانے کیوں آج دریا کی لہریں کچھ زیادہ بپھری نظر آئیں۔تبھی اس کے لہجے سے تشویش عیاں تھی
"کیوں ایسا کیوں سوچنے لگی ہو تم۔۔؟"
"کچھ دن پہلے میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔۔" جنت اب پھر سے دریا کی آتی جاتی لہروں کو دیکھنے لگی
"کیسا خواب۔۔۔کیا مطلب۔۔؟" خوشی کی حیرانی بجا تھی
"میں نے دیکھا کہ ایسے ہی رات کو موسلا دھار بارش آتی ہے،طوفانی بارش۔وہ بارش کئی گھنٹے تک ایک طوفانی بوچھاڑ کی طرح برستی رہتی ہے۔دریا میں طغیانی آجاتی ہے۔بپھری ہوئی لہریں بہت تیز رفتار اور بلند ہو جاتی ہیں۔اور صبح ہونے سے پہلے ہی اندھیرے میں دریا کا پانی گاؤں پر چڑھ آتا ہے۔گھر ،مکان، فصلیں سب بہہ جاتی ہیں۔ہم سب ڈوب جاتے ہیں۔۔۔"
"اللہ نا کرے کبھی ایسا ہو۔ایسا کچھ نہیں ہو گا۔۔۔وہم ہے تمہارا۔ایسا نا سوچا کرو۔"

"خوابوں اور سوچوں پر کسی کا اختیار تھوڑی ہوتا ہے بھلا۔"

"خوابوں پر تو اختیار نہیں ہوتا۔ پر ہم سوچوں کا رخ تو موڑ سکتے ہیں۔ اگر برے برے خیال یا سوچیں آنے لگیں ہم اپنا ذہن کسی طرف پھیر سکتے ہیں۔ سوچوں کو نیا رخ دے سکتے ہیں۔ اچھا سوچ سکتے ہیں۔ اور اکثر خواب بھی ہماری سوچ سے متعلق ہی ہوتے ہیں۔ انسان جو دن بھر سوچتا رہتا ہے۔ جو خیالات اس کے دماغ میں منڈلاتے رہتے ہیں اکثر رات کو وہ خیال خواب بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس لیئے تم اچھا اچھا سوچ کرو تو خواب بھی اچھے سے آئیں گے تمہیں۔" خوشی نے تفصیل سے اسے سمجھایا

"ہاں خوشی شاید صحیح کہہ رہے ہو تم۔ اور میں تو حیران ہوں تم اتنے بڑے فلسفی کیسے بن گئے۔۔۔" جنت نے اس کی تعریف کرتے ہوئے مزاح کیا۔ وہ بھی جنت کے ساتھ مسکرا دیا۔

" اور نانی کہتی ہے دریا ہمارے لیئے ایک سچے پکے یار کی طرح ہے۔ جو کبھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ باقی ہر کوئی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ رشتے دار رشتے توڑ جاتے ہیں۔ خون کے رشتے اپنا رنگ تبدیل کر جاتے ہیں۔ دوست دوستیوں سے جاتے ہیں۔ ہر کوئی تبدیل ہو جاتا ہے مگر دریا ہمارے لیئے ہمیشہ ایسے ہی شفیق رہتا ہے۔ آدھے گاؤں کی روزی دریا سے جڑی ہے۔" خوشی بھی اب دریا کی موجوں کو دیکھنے لگا تھا

"خوشی ایک بات بتاؤ۔۔ تمہیں کبھی اپنے ماں باپ کی یاد نہیں آتی۔۔۔" بات رشتوں کی طرف آئی تو اسے خوشی کے رشتے یاد آگئے

"یہ پوچھو کب نہیں آتی۔۔۔ اماں کی صورت تو کبھی دیکھی ہی نہیں ہے۔ اللہ نے مجھے بھیجنے کے ساتھ ہی انہیں واپس بلا لیا۔ اتنی زندگی گزر گئی مگر آج تک ماں کا پیار نہیں دکھا کہ کیسا ہوتا ہے۔ اور ابا ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے کسی دور دیس جانے کہاں چلے گئے ہیں۔ خدا جانے زندہ بھی ہیں یا نہیں۔" ماں باپ کا ذکر آتے ہی اس کے لہجے میں مایوسی در آئی تھی۔ رشتوں کی محرومی اس کے لہجے اور الفاظ سے واضح عیاں تھی

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ ہوا میں بھی جیسے اداسی آ کے ٹھہرنے لگی تھی۔ جنت نے مزید کوئی اس بارے سوال نہیں۔ بلکہ وہ سوچنے لگی کہ اسے یہ سوال بھی نہیں کرنا چاہیئے تھا

"اچھا خوشی میں چلتی ہوں شام ہونے لگی ہے اماں راستہ دیکھ رہی ہوں گی۔۔۔" جنت نے ہی

اس اداس خاموشی کو توڑا تھا

"ہاں تم جاؤ۔۔۔میں ابھی کچھ دیر یہاں بیٹھوں گا۔"

جنت کپڑے جھاڑتی اٹھ کے آہستہ قدموں سے واپس چل دی

"خوشی۔۔۔تم کبھی اداس نا ہوا کرو۔۔تم کبھی اداس ہو جاؤ تو مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔تمہارے ساتھ سارے منظر بھی اداس ہو جاتے ہیں" دو چار قدم چل کے وہ ایکدم سے مڑی تھی اور اپنی بات کہہ کر جواب سنے بغیر پھر تیز قدموں سے چل دی۔

وہ چلی گئی تھی پر جنت کی یہی ایک بات خوشی کو اندر تک سرشار کر گئی تھی۔اسے دل نے ایک احساس دلایا تھا کہ ایک دل دنیا میں اور بھی ہے جو تمہاری خوشی میں خوش ہوتا ہے اور تمہاری اداسی سے وہ بھی اداس ہو جاتا ہے۔بھلے سے وہ دونوں ایک دوسرے کو ساتھ کسی وعدوں سے نہیں بندھے ہوئے تھے مگر پھر بھی ان کے ایک دوسرے سے بندے تھے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔

سورج ڈھلنے کے قریب تھا۔ڈھلتے سورج کی زرد روشنی جب پانی پر پڑتی تو دریا کی لہروں پر چمک پیدا ہونے لگتی

دریا میں کہیں کہیں کوئی اکا دکا کشتی دکھائی دے رہی تھی جن کا رخ اب کنارے کی طرف تھا۔وہ کافی دیر گزرنے کے بعد بھی اسی طرح کنارے پر اسی انداز میں بیٹھا لہروں کو تکے جا رہا تھا

تھوڑی دیر بعد ایک کشتی آہستہ آہستہ پانی پر تیرتی کنارے آ لگی۔وہ کلیم چچا کی کشتی تھی۔کلیم چچا کشتی سے اترے تو انکے جال میں دو بڑی اور پانچ سات چھوٹی مچھلیاں قید تھی

"آ گئے ہو چچا۔۔آج تو شکار بھی اچھا ہاتھ لگا۔۔۔" خوشی نے کلیم چاچا کی مچھلیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اب مچھلیوں کو جال سے نکال کر لکڑی کے بڑے ٹوکرے میں منتقل کر رہے تھے۔

"ہاں پتر شکر ہے اوپر والے کا۔اسی کی دین ہے سب۔روزی بن جاتی ہے۔

"خوشی میری ایک بات مانو گے۔۔۔؟" کلیم چچا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا

"جی چاچا۔۔کیوں نہیں مانوں گا۔۔۔بولیں کیا بات ہے؟"

" خوشی تم جنت سے زرا دور دور رہا کرو۔۔۔مجھے ڈر لگتا ہے۔" کلیم چچا نے دور جاتی جنت کی پشت کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔جواب کافی دور جاتی دکھائی دے رہی تھی۔

خوشی حیران رہ گیا

" کیوں چچا ایسا کیوں بول رہے ہیں آپ۔۔۔؟" اس نے بھی بیٹھے بیٹھے مڑ کر جنت کی طرف دیکھا جوان کی باتوں سے بے خبر اپنی دھن میں مگن چلتی جا رہی تھی

" بس پتر۔۔۔کچھ باتوں کے جواب نہیں ہوتے۔وہ ہمیشہ سوال رہ جاتی ہیں۔۔۔" وہ جو تھوڑی دیر پہلے ایک سرشاری کی سی کیفیت میں بیٹھا تھا اب کلیم چچا نے اسے الجھا دیا تھا

" آؤ واپس چلتے ہیں اب مغرب ہونے لگی ہے۔شام کے بعد دریا کنارے بیٹھنا اچھا نہیں ہوتا ۔۔۔اور دریا کی تمہارے خاندان سے تو ویسے بھی بہت پرانی دشمنی ہے۔۔۔" چچا کشتی کنارے کھڑی کر کے اب ٹوکرا سر پر رکھ کے جانے لگے تھے

خوشی حیرانی سے کلیم چچا کو دیکھنے لگے۔جو آج جانے کیوں عجیب عجیب سی باتیں کر رہے تھے۔

" کونسا خاندان چچا اور کیسی دشمنی۔۔آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں آج۔مجھے تو الجھن ہونے لگی ہے آپ کی باتیں سن کر۔" وہ بھی اب ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا۔

" نانی کیسی ہیں تمہاری۔۔۔" چچا نے بات تبدیل کر دی۔

" نانی ٹھیک ہیں چچا۔پر آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔کیا مطلب ہے آپ کی باتوں کا ۔میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا"

" چھوڑ رہنے دو ان باتوں کو۔بس میری باتوں پر عمل کرنا۔میرے یار کے بیٹے ہو تم۔جگری یار تھا میرا سلطان۔اس کی نسبت سے تم بھی بہت پیارے ہو مجھے۔سمجھ لو کہ اگر تمہیں کچھ سمجھایا ہے تو اسی میں تمہارا فائدہ ہی ہوگا۔"

وہ چپ ہو گیا۔پھر کوئی سوال نہیں کیا۔مگر چچا کی باتوں نے اسے سچ مچ الجھا کے رکھ دیا تھا

☆......☆......☆

" لو اب مل گیا صلہ تمہیں۔۔۔؟ پالیا انعام تم نے اپنے صبر کا۔۔۔" بلقیس آج پھر اپنے طنزیہ جملوں کے ساتھ حاضر تھی۔نوری اسے بہت پیاری تھی۔اس کا دکھ کہاں برداشت کر سکتی تھی وہ۔طنز کبھی کبھی ہم پر ہم سے پیار جتانے کیلئے بھی تو کیا جاتا ہے۔اور آج یہی طنز تو کر رہی تھی بلقیس۔

۔" ہاں مل گیا صلہ۔اور پالیا ہے انعام میں نے۔۔۔جو میرے حصے کا تھا" سفید کپڑوں میں ملبوس سر پر دوپٹہ اوڑھے نوری نے اسے جواب دیا۔

" نوری ترس آتا ہے مجھے تم پر۔بہت سادہ دل ہو تم۔یہاں لوگ خلوص اور وفا کی قدر نہیں کرتے پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھتے ہیں خلوص کو۔بہت شفاف ہو تم۔بھولی ہو بہت تم۔دکھ ہوتا ہے مجھے تمہیں دیکھ کر۔"

" ایسا کچھ نہیں ہوتا بلقیس۔شاید میرا نصیب یہی تھا جو مجھے مل گیا" نوری نے اس کی بات کی نفی کی

" نصیب کبھی بنانا بھی پڑتا ہے۔اپنے حصے کیلئے اپنے حق کیلئے لڑنا بھی پڑتا ہے۔اور اگر نا ملے تو کبھی کبھی چھیننا بھی پڑتا ہے۔پتا نہیں تم کب سمجھو گی۔بلکہ اب تو سمجھانے کا کچھ فائدہ بھی نہیں ہے۔"

مجھے نہیں آتا لڑنا اپنے لیئے۔مجھے نہیں آتا اپنا حق چھیننا اور نا مجھے کبھی اپنا حق چھیننا سکھایا گیا ہے۔اور ایسی چیز حاصل کر کے بھی کیا حاصل جو چھیننے کے بعد ملی ہو۔"

" سارا قصور اسی کمہارن کا ہے۔سلطان اکھڑ تو پہلے سے ہی تھا اس کے آتے ہی کچھ ماہ بعد اس نے تمہیں طلاق بھی دے دی۔ذرا جو دل نہیں کانپا اس ظالم کا۔ملوکھاں نے پٹی پڑھائی ہو گی اسے۔"

" بلقیس تم اسے کیوں قصور دے رہی ہو۔اسے مجھ سے کیا پرخاش ہو گی بھلا۔وہ وہاں اپنے گھر خوش تھی۔مقدر میں جو لکھا ہوتا ہے وہ مل کے ہی رہتا ہے۔میرا جو مقدر تھا وہی ملا۔ملوکھاں کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔"

" تم اب بھی اسی کی طرف داری کر رہی ہو جو تمہارے گھر اجاڑنے کا سبب بنی۔۔۔کس مٹی سے بنی ہو تم۔۔۔؟" بلقیس نے حیرانی سے پوچھا

" ہاں۔طرف داری کر رہی ہوں کیوں کہ مجھے نہیں لگتا میرے اجڑنے کا سبب ملوکھاں ہے

۔۔بلقیس میری مٹی میں ہی عشق گندھا ہوا ہے شاید۔ یہ جو عشق ہوتا ہے نا یہ گھن چکر کی طرح ہوتا ہے اسکی رمزیں آسانی سے کبھی سمجھ نہیں آتیں جب تک اس گھن چکر کے اندر کود نا جاؤ۔تمہیں بھی سمجھ نہیں آئے گی ۔کیونکہ تمہیں کسی سے عشق ہوا ہی نہیں ہے۔

ملوکھاں ۔۔۔سلطان کی محبت ہے ۔اور سلطان میری محبوب کی پسند اپنی پسند ہوتی ہے ۔مجھے ملوکھاں سے کوئی گلہ نہیں ہے۔"

اس نے دور کہیں فضاؤں میں دیکھتے ہوئے اسے جواب دیا

"نوری کیا تم اب بھی سلطان سے محبت کرتی ہو۔۔۔؟"

"ہاں ۔۔۔بلقیس اب بھی ۔محبت تعلق اور قربت کی محتاج نہیں ہوتی۔ جیسے سپرنگ کو جتنا زور سے دباؤ وہ اتنی طاقت سے اوپر اٹھتا ہے۔ بالکل ایسے ہی محبت ہوتی ہے ۔جتنا اپنے اندر چھپاؤ گے جتنا اسے دباؤ گے اتنا ہی باہر ابھرے گی۔محبت خود کو آشکار کر کے ہی رہتی ہے باتوں سے، آنکھوں سے، چہرے سے، چال ڈھال سے، ہر ہر عمل سے۔

یہ آپ کو اندر ہی اندر کھاتی رہے گی۔کسی لاعلاج بیماری کی طرح۔"

"تم پاگل ہوگئی ہو نوری۔خود کو محبت کی دیوی سمجھتی ہو یہ تو دیکھو اتنی محبت کے باوجود تمہارے ہاتھ ابھی تک خالی ہیں۔تمہارا دامن خالی ہے ۔کیا دیا ہے تمہیں اس ریاضت نے، کیا دیا ہے تمہیں اس محبت نے۔۔۔؟"بلقیس نے کڑوا سچ لفظوں میں لپیٹ کر اس کے منہ پر مارا تھا۔

"بلقیس تم نہیں سمجھو گی کبھی ۔محبت حاصل حصول کچھ نہیں دیکھتی ۔یہ کوئی کاروبار تھوڑی ہے جو منافع دیکھ کر ہاتھ ڈالو خسارہ نظر آتے ہی ہاتھ واپس کھینچ لو۔۔۔ یہاں صرف خسارہ ہوتا ہے۔اور خسارے پا کر بھی دل ہمیشہ مسکرا رہا ہوتا ہے۔جیسے کچھ ہوا ہی نا ہو۔اور اگر محبت کو تجارت فرض کر بھی لو تو یہاں سب سے بڑا تاجر وہی ہوتا ہے جسے سب سے زیادہ ملے ہوں۔

محبت کے تو اپنے قاعدے، اپنے اصول اور اپنے ہی حساب ہوتے ہیں ۔یہاں ایک اور ایک کے ملنے سے دو نہیں صرف ایک ہی ہوتا ہے

اور اگر دونوں میں سے ایک نکالو تو ایک بھی نہیں بچتا اور حاصل زیرو ہوتا ہے"

"تو کیوں کی جائے پھر ایسی محبت۔ بھاڑ میں جائے۔ تیلی لگاؤ آگ میں جھونکو ایسی محبت کو جو کچھ بھی نا دے۔ سب کچھ چھین لے۔ جس میں صرف خسارے ہی خسارے ہوں۔۔ مجھے نہیں پڑنا اسکے حسابوں میں۔ مجھے نہیں سمجھنی اسکی رمزیں"

"اختیار میں ہوتی تو لوگ آگ میں بھی جھونک چکے ہوتے بھاڑ میں بھی پھینک آتے پر اختیار بھی ہو تب نا۔ محبت سب سے پہلے بندے سے اختیار ہی تو چھین لیتی ہے۔ بے اختیار کر دیتی ہے، تابع کر دیتی ہے اپنے۔ انسان سر جھکا دیتا ہے جیسے کوئی پجارن بیٹھی ہو اپنے دیوتا کے سامنے۔۔۔

بس بلقیس۔۔۔ تمہارے لیئے دعا ہے تمہیں کبھی کسی سے عشق نا ہو۔۔۔ خدا کرے تم کبھی محبت کے حسابوں میں نا پڑو ورنہ میری طرح الجھ جاؤ گی تم بھی" نوری نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اسے دعا دی

"کبھی نہیں پڑوں گی ایسی محبت میں۔ کبھی اپنا قدم نہیں رکھوں گی ایسی دلدل میں۔ اور اگر قدم رکھ بھی دیا تو یوں صرف خسارے نہیں سمیٹوں گی میں۔ دیکھ لینا تم۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ تمہیں کبھی خسارے نا ملیں۔" نوری اس کی سوچ اور باتوں پر ہلکا سا مسکرا دی تھی

"چاچا آگئے ہیں چلتی ہوں میں اب۔ پھر آؤں گی کبھی۔۔ اپنا خیال رکھنا" وہ دوپٹہ سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

نوری کے ابا گھر میں دروازے سے داخل ہو رہے تھے۔ ابا کچھ ہی دنوں میں بوڑھے لگنے لگے تھے۔ جیسے کسی نے ان کا سارا خون ہی نچوڑ لیا ہو۔

"سلام چاچا۔۔۔" بلقیس نے پاس سے گزرتے ہوئے انہیں سلام کیا

"وعلیکم السلام بیٹا۔۔۔ جیتی رہو۔" انہوں نے بلقیس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے دعا دی اور آہستہ قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے نوری کے پاس آئے تو نوری چادر سنبھالتی چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی

"آئیں ابا یہاں بیٹھیں اس طرف۔۔۔" نوری نے ابا کے احترام میں انکو اپنی جگہ پیش کی

"نوری اب تو مجھے یہ پوچھتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ تم کیسی ہو میری دھی۔"

"آپ اپنے دل میں کوئی دکھ نا رکھیں ابا۔ اللہ کا شکر ہے میں اچھی ہوں۔"

"نور۔ کیسے دکھ نا پالوں دل میں۔ باپ ہوں میں تمہارا۔ لاچار باپ، جو تمہارے لیئے کچھ بھی اچھا نہیں کر سکا۔۔ مجھے معاف تو کر دوگی نا۔۔۔" انہوں نے عجیب سا سوال کر دیا

"کیسی باتیں کر رہے ہیں ابا۔۔۔" نوری کا تو دل دہل گیا آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے

"بیٹا مرتے دم تک میرے سینے میں انی گڑی رہے گی کہ میں نے تمہارے لیئے صحیح شخص کا انتخاب نہیں کیا۔۔۔" ان کی آواز بھیگنے لگی

"نا ابا۔۔۔ اللہ کرے آپ سدا جیئیں میری عمر بھی آپ کو لگ جائے۔ کیوں کر رہے ہیں ایسی باتیں آپ۔۔۔ اور اس میں آپ کا تو کوئی قصور نہیں ہے نصیب کے کھیل ہیں سب۔۔۔"

"بیٹا مجھے سلطان تمہارے لیئے مناسب نہیں لگتا تھا شروع سے ہی۔ مگر یہ تمہاری ماں کی ہی خواہش تھی کہ تم ان کے بھائی کے گھر میں جاؤ۔ اور تمہارے ماموں دین محمد چوکھٹ پکڑ کر بیٹھ گئے تھے ہماری۔ میں مجبور ہو گیا تھا پتر۔ مجھے معاف کر دینا۔" وہ اب سچ مچ میں رو رہے تھے

"ابا آپ کو اللہ کا واسطہ آپ نا روئیں۔ ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔۔۔ میں خوش ہوں. بہت خوش ہوں۔ میں بس اپنے نصیب پر خوش ہوں۔" نوری ابا کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیتے بولی

بیٹیوں سے کہاں برداشت ہوتے ہیں باپ کی آنکھ میں آنسووں۔ نوری کے دل پر بھی آری سی چلنے لگے

"کیا منہ دکھاؤں گا تمہاری ماں کو اگلے جہان۔۔۔ اس نے نوری کو سینے سے لگا لیا تھا

"نوری تمہیں اللہ صلہ دے گا پتر۔ تم بہت صبر والی ہو نور۔ ضرور صلہ دے گا وہ بے انصاف بالکل نہیں ہے۔۔۔" ابا نے نوری کو خود سے بھینچتے ہوئے بھیگی ہوئی آواز میں کہا

"مجھے کوئی صلہ نہیں چاہیے ابا۔۔۔ کسی سے بھی نہیں۔ میں بس خوش ہوں ایسے ہی خوش ہوں میں"

زرد کلائی!! کالا دھاگہ
درد کی جلتی دوپہروں میں
جیون ھار کے چلتے چلتے
کالی رات سی کالی ہوگئی
دیکھ میں ہجراں والی ہوگئی

نوری اپنے نصیب پر ہزار شکر گزار ہی، صبر کی اونچی منزلوں پر براجمان سہی پر یہ بھی تو سچ تھا کہ وہ اندر سے مکمل ٹوٹ بھی چکی تھی۔ کرچی کرچی ہوگئی تھی۔ یہ اور بات کہ وہ اپنے وجود میں چھپی کرچیوں کو باہر نہیں آنے دیتی تھی۔ اپنے درد کسی کو نہیں سناتی تھی۔ لیکن یہ تو سچ تھا نا کہ وہ اب ہجراں والی بن چکی تھی اور ہجر بھی ایسا جس میں اب کبھی کسی وصل کی امید، کوئی نشان تک نہیں تھا

☆......☆......☆

" ملوکھاں ۔۔۔اماں ابا نے مجھے نکال دیا ہے گھر سے ہمیشہ کیلئے۔" وہ ملوکھاں کو بتا رہا تھا جو گھر میں شام کیلئے آٹا گوندھ رہی تھی

"یہ تو ہونا ہی تھا۔ سلطان آپکو نوری کو طلاق نہیں دینی چاہیے تھی۔ وہ تو بیچاری بے ضرر اور بے قصور تھی" اس کے آٹا گوندھتے ہاتھ رک گئے

اس نے چونک کر ملوکھاں کو دیکھا۔

" میں اس کے لیئے واقعی درد محسوس کر رہی ہوں۔ اب تو سب لوگ یہی، سوچیں گے نا دوسری بیوی کی وجہ سے سلطان نے نوری کو طلاق دے دی۔۔۔

جبکہ میں ایسا بالکل نہیں چاہتی تھی۔ مجھے میرا حق مل رہا تھا میرے لیئے یہی کافی تھا۔ ہاں میری یہ خواہش ضرور تھی کہ ھمارا ایک الگ گھر ہوتا کہ ہم اماں ابا پر بوجھ نا بنیں مگر خدا گواہ ہے سلطان میں نے ایسا بالکل بھی نہیں چاہا تھا کہ آپ نوری کو طلاق دے کے صرف میرے گھٹنے سے لگے بیٹھے رہیں۔"

ملوکھاں آٹا رکھ چکی تھی۔ وہ تب سے ہی اداس تھی جب سے سلطان نوری کو طلاق دے کر آئے۔ اسکے دل

میں تو تب سے ہی نوری کیلئے نرم گوشہ پیدا ہو چلا تھا جب سے سلطان نے اسے اپنی سہاگ رات کی کہانی سنائی کہ نوری کو ملوکھاں سے کوئی بیر نہیں وہ پھر بھی خوش تھی

" میں نے کچھ ماہ پہلے ایسا سوچا ضرور تھا کہ ابا کو طلاق کی دھمکی دے کر ہماری شادی والی بات پر راضی کرلوں گا۔

مگر اسے طلاق دینے کا میرا ہرگز کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے لگنے لگا میں اس کا حق مار رہا ہوں ۔میں انصاف نہیں کر سکتا۔ مجھے جانے کیوں وہ اچھی ہی نہیں لگتی تھی ۔تو سوچا اسے طلاق دے دینی چاہیئے ۔تا کہ اس روز روز کے جھنجھٹ سے اس کی بھی جان چھوٹے اور میری بھی ۔اور گھر میں ہونے والے اس روز کے تماشے کا بھی خاتمہ ہو جائے ۔لیکن پھر مجھے جب محسوس ہونے لگا کہ ابا کے نزدیک مجھ سے زیادہ انہیں نوری عزیز ہے تو میں حسد کرنے لگا اس سے ۔ پاگل ہو گیا تھا اس وقت ۔سمجھ ہی نہیں آئی کہ اس وقت کیا نکال رہا ہوں منہ سے ۔۔" سلطان اب سر پکڑے افسوس کر رہا تھا

مگر جب چڑیاں کھیت چگ جائیں تو سر کر پکڑ کر بیٹھنے اور افسوس کرنے سے وہ دانے واپس کرنے نہیں آتی

" وہ اچھی تھی ،شریف اور بے ضرر بھی ۔۔۔بن ماں کے جوان لڑکی ہے خدا جانے کون سہارا دے گا اس کو اب ۔۔۔"

ملوکھاں سچ میں نوری کیلئے افسردہ ہو رہی تھی

اب تو زمانہ مجھ پر تھوکے گا سلطان ۔ بندہ بندہ یہی بولے گا کہ میں نے آپکو طلاق کیلئے اکسایا ہے ۔۔۔"

سلطان بغیر کوئی جواب دیئے خاموش بیٹھا رہا۔ جب سارے دروازے انسان پر بند ہو جائیں تو ایسے ہی ہوتا ہے

" سلطان کیا سوچ رہے ہیں آپ ۔۔۔کیا ہو گا اب ۔۔۔؟؟؟" ملوکھاں سے اسکی خاموشی زیادہ دیر برداشت نا ہو سکی

" اب کیا ہو گا ۔اماں ابا نے تو سارے تعلق ختم کر دیئے ہیں ۔

اب مجھے خود ہی کوئی مزدوری کام دھندا ڈھونڈنا ہوگا۔"
"کون سی مزدوری کریں گے کچھ سوچا بھی ہے۔؟"
" میں کراچی جاؤں گا اب۔اور تب واپس آؤں گا جب تک کچھ پیسہ ہاتھ نہیں آئے گا۔اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے اب۔
" وہ نوری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔وہ سوچ چکا تھا کہ اب یہاں رہ کر کچھ حاصل نہیں ہوگا۔باہر نکلنا ہوگا زندگی گزارنے اور پیٹ بھرنے کیلیے ہاتھ پاؤں مارنے ہوں گے۔۔۔
" پر سلطان کراچی تو بہت دور ہے۔اور تین چار ماہ بعد ہمارا بچہ پیدا ہونے والا ہے۔میرا دل گھبراتا ہے آپ کے بغیر۔کیسے ہوگا یہ سب۔۔۔" وہ سلطان کی پچارن اس کا اتنا دور جانے کا سن کر ہی پریشان ہوگئی۔
" ملوکھاں۔اب کچھ نا کچھ کرنا تو ہے نا۔تم یہیں رہنا اپنے ماں باپ کے ساتھ۔کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔مجھے اب یہاں نہیں رکنا۔کچھ پیسہ ہاتھ آجائے گا تو واپس آکر اپنا گھر بنوائیں گے ہم۔" وہ ملوکھاں کو دلاسہ دیتے ہوئے بولا
جو سلطان کے دور جانے کا سوچ کر ہی اداس ہوگئی تھی
" سلطان یہیں رہ کر بھی تو کوئی کام کیا جا سکتا ہے۔اتنا دور کراچی جا کے کام ڈھونڈنا لازمی ہے کیا"
" نوری یہاں سوائے مچھلیاں پکڑنے کے اور کچھ بھی کام نہیں ہے۔میں اب کچھ بڑا سوچنے لگا ہوں جو یہاں رہ کر کبھی نہیں ہو سکتا۔کراچی بڑا شہر ہے غریبوں کی ماں ہے کراچی۔بہت کام دھندے ہیں وہاں۔میں جلد ہی کافی سارا پیسہ جمع کر کے واپس آجاؤں گا۔"
" سلطان ہمیں کیا ضرورت ہے اتنے پیسے کی؟ ہمیں بس ایک چھوٹا سا گھر ہی تو بنانا ہے۔ایک چھت ہو جہاں ہم رہ سکیں اور آپ کا ساتھ ہو بس مجھے اور کچھ بھی نہیں چاہیئے۔"
" نہیں ملوکھاں۔۔۔تم نہیں سمجھو گی۔ساری زندگی ایسے نہیں گزارنی اب میں نے۔میں نے اب کچھ بننا ہے۔کچھ بننے کیلیے یہاں سے کچھ عرصہ کیلئے نکلنا لازمی ہے۔"

اور پھر اس نے جو سوچا وہی کیا تھا۔ کلی سے کچھ پیسے ادھار لے کر وہ تیسرے دن ہی کراچی والی گاڑی پر روانہ ہو گیا۔ ملوکھاں کی آنکھیں جدائی اور اکیلے پن کے خیال سے اشکبار تھی۔ اور جانے سے ایک گھنٹہ پہلے وہ اپنے گھر آیا تھا اپنے ماں باپ سے ملنے۔ مگر دروازہ اندر سے بند دیکھ کر وہ چند پل وہیں دروازے پر رکا رہا۔ دل نے اسے دستک دینے کا مشورہ دیا مگر ہمت نا ہوئی اس کا دستک کیلئے اٹھا ہاتھ واپس نیچے گر گیا اسے لگا جیسے یہ دروازہ اب ہمیشہ کیلئے اس پر بند ہو گیا تھا کبھی نا کھلنے کیلئے۔ وہ واپس آ گیا اپنے ماں باپ سے ملے بغیر۔

وہ کراچی جانے والی بس میں بیٹھ چکا تھا۔ نیچے کھڑکی کے ساتھ کھڑا اس کا جگری دوست کلی اسے دلاسہ دے رہا تھا۔ مسافر اپنے پیاروں سے جدا ہونے والے تھے۔ اڈے پر عجیب سا سماں تھا۔ روانگی کا وقت قریب آ پہنچا گاڑی روانگی سے پہلے مسافروں کو الرٹ ہونے کیلئے بار بار ہارن بجا رہی تھی۔ ہر ہارن پر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا سفر تھا اور وہ بھی اتنی دور۔ دل میں اداس وہ بھی تھا۔ اور دل کی یہی اداسی اس کے چہرے سے بھی واضح تھی۔ گاڑی نے آخری ہارن بجایا تو اس کے دل پر جیسے کسی نے بھاری پتھر رکھ دیا ہو۔ اپنوں سے جدائی سچ میں ایک صبر طلب کام ہے۔ روانگی سے پہلے سلطان نے کلی کو گاہے بگاہے ملوکھاں کی خبر گیری کرتے رہنے کی درخواست کی۔

"سلطان ہمارا رابطہ کیسے ہو گا۔ کوئی چٹھی کوئی تار بھجوانی ہو تو یا اگر خدا نا کرے یہاں کبھی کوئی مسئلہ ہو گیا تو تمہیں خبر کیسے دیں گے ہم"

"میں خیریت سے پہنچ کر کوئی کام دھندا ڈھونڈوں گا۔ کچھ وقت لگے گا لیکن جونہی میرے قدم کہیں جم گئے میں تفصیلی تار بھیجوں گا۔ اپنے حال احوال اور پتے کے ساتھ۔"

بس آہستہ آہستہ چلنا شروع ہو گئی۔ سلطان کا نیا سفر شروع ہو گیا۔ کلی کے الوداع کہتے ہاتھ پیچھے رہ گئے۔ اس کا گاؤں شاہ والی بھی کہیں بہت پیچھے رہ گیا۔ زندگی کا نیا سفر شروع ہو گیا۔ وہ پیسہ کما کر واپس اپنی بستی آنے کے خیال سے نکلا تھا۔

پر ہمیشہ وہی نہیں ہوتا جو انسان سوچتا ہے۔ بہت اوپر ایک ذات بیٹھی ہے جو ہم سب کو اوپر سے

دیکھ رہی ہوتی ہے۔ہماری ایک ایک بات،ایک ایک حرکت حتی کہ ہماری پلکوں کی حرکت بھی۔اور اس ذات کو شاید یہ منظور نہیں تھا کہ سلطان دوبارہ کبھی اس گاؤں واپس آئے۔اور کراچی والی بس کی کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا اور پیچھے کی طرف دوڑتی بھاگتی چیزوں کو دیکھتا سلطان ہرگز یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی آنکھوں نے آج آخری بار گلی، ملوکھاں اور شاہ والی کو دیکھا ہے۔آج کے بعد اسے کبھی یہاں واپس آنا نصیب نہیں ہوگا۔

☆......☆......☆

آٹھواں حصہ

"نانی۔۔۔یہ دریا کی ہمارے خاندان سے کیا دشمنی ہے۔۔۔" صبح ناشتے کے دوران چائے پیتے ہوئے خوشی نے سوال کیا تو نانی چونک گئیں۔ان کا چونکنا بنتا بھی تھا کیونکہ اس سے پہلے تو خوشی نے کبھی اس طرح کا عجیب سوال نہیں پوچھا تھا

"کیا مطلب۔۔۔کس نے کہہ دیا تم کو۔؟" نانی کا حیران ہونا بنتا تھا

"آپ بتائیں نا پہلے۔۔۔کیا دشمنی ہے دریا کی ہمارے خاندان سے۔۔"کلیم چاچا کی باتیں وہ ابھی تک بھلا نہیں پایا تھا۔دماغ میں بیٹھ گئیں تھیں جیسے

"کوئی دشمنی نہیں ہے پگلی۔۔۔دریا تو سچا یار ہے ہم سب گاؤں والوں کا وہ کیوں دشمنی رکھے گا بھلا ہم سے۔۔۔؟" نانی نے چائے ٹھنڈی کرنے کو پرچ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اب بتاؤ۔۔کس نے بہکایا تمہیں دریا کے خلاف۔۔۔"

"کل میں دریا کنارے بیٹھا ہوا تھا تو کلیم چاچا نے کہا۔اور یہ بھی کہا میں جنت کے ساتھ زیادہ میل جول نا رکھوں۔۔۔"خوشی نے کل کا سارا واقعہ دہرا دیا

نانی کو کچھ پل چپ سی لگ گئی

"کلیم چاچا تمہارے باپ کے بچپن کے دوست تھے۔۔۔تمہاری فکر کرتے ہیں اس لیئے بولا ہوگا انہوں نے ایسا۔اور پچھلے دو چار دن سے جو اتنی بارشیں آئی تھیں شاید انہیں کوئی دریا میں طغیانی کا خطرہ ہو۔تم فکر مت پالو اتنی۔۔۔" دوسری جنت والی بات کا جواب ان کے پاس تھا ہی نہیں

"اچھا تو پھر جنت سے زیادہ میل جول نا رکھنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔۔۔؟ وہ جس بات سے

بج رہی تھیں خوشی نے پھر وہی سوال دہرا دیا۔نانی نے کے پاس اس بار بھی خوشی کو مطمئن کرنے کیلئے کوئی مناسب الفاظ نہیں تھے سو انہوں نے بات کا رخ موڑ دینا زیادہ بہتر سمجھا

"تم جانتے ہو خوشی۔۔۔تمہارا باپ اس گاؤں کا سب سے خوبصورت لڑکا تھا۔۔۔پھر خدا جانے انہیں کیا ہو گیا۔۔۔وہ راستے سے ہٹ گئے۔اندھیری راہوں میں گم ہو گیا کہیں۔لوٹ کر ہی نہیں آیا۔" نانی کے لہجے میں اداسی در آئی تھی۔

"نانی۔۔۔کبھی کبھی میرا بھی بہت دل کرتا ہے سب کی طرح میرے بھی ماں باپ ہوں۔نانی نانا، دادا، دادی سب۔لیکن سب نے مجھے چھوڑ دیا ایک ایک کر کے۔کیوں نانی ایسا کیوں کیا انہوں نے میرے ساتھ۔؟" آج سالوں بعد خوشی کے دل میں جمع غبار نکلنے لگا تھا۔

نانی چپ رہیں تو ایک وقفے کے بعد اس نے پھر اپنی محرومیوں کو الفاظ دیئے۔

"میں سوچتا ہوں زندگی نے صرف مجھے ہی ہر خوشی سے کیوں محروم رکھا ہے۔میں تو بے قصور ہوں۔میں نے آخر کسی کا کیا بگاڑا تھا بھلا جو سب نے مجھ سے یوں منہ موڑ لیا جیسے میں کوئی انسان ہی نا ہوں۔۔۔"

"مایوس نہیں ہوتے پتل۔۔۔تمہیں پتا ہے اللہ جس سے سہارے چھین لیتا ہے اسے اپنا سہارا عطاء کر دیتا ھے۔یہی سمجھ لو کہ اس سب میں ہی خدا کی کوئی مصلحت ہو گی۔" نانی اس کا دل رکھنے کو دلاسہ دے رہی تھیں

"خدا کی مصلحت ایسے تو نہیں کہتی نا۔خدا کبھی یہ تو نہیں کہتا کسی کو بے جرم سزائیں دی جائیں۔اور جب لوگ ایسے کرتے ہیں تو پھر ایسی سوچوں کو دل و دماغ میں پلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"تم ایسے خیالات کو دل میں بالکل نا پالا کرو۔دل کی کانٹ چھانٹ اور صفائی لازم ہوتی ہے ورنہ دل کی زمین پر خود رو گھاس اور جڑی بوٹیاں اگنے لگتی ہیں۔۔۔"

"کیا مطلب۔۔۔نانی میں سمجھا نہیں۔۔" خوشی واقعی کچھ نہیں سمجھ پایا

"پتل جیسے خالی برتن کو عرصے تک بغیر صفائی کے یا خالی مکان کو بند کر کے عرصے تک اس کی صفائی نا کی جائے خیال نا رکھا جائے تو وہ بوسیدہ ہو جاتا ہے۔اندر سے جالے لگ جاتے ہیں۔دل بھی ایسے

ہی ہوتا ہے۔اسے اللہ کی یاد سے صاف ستھرا رکھا جاتا ہے ورنہ برے برے خیالات اسے جالوں کی صورت میں چمٹنے لگتے ہیں۔۔۔"

وہ بات سمجھ گیا تھا اسلیئے خاموش ہو گیا۔

"نانی کیا میرا باپ اس دنیا میں زندہ بھی ہے یا۔۔۔" خوشی سوال مکمل نا کر سکا تھا

"اللہ کو بہتر علم ہے پتل ۔۔۔اگر زندہ ہوتا تو کبھی نا کبھی تو لوٹ کے آتا۔کبھی تو اسے اپنے پیچھے والوں کا خیال آتا،ان کی یاد آتی ۔۔خدا جانے اتنی بڑی دنیا میں کہاں کھو گیا۔اس نے کبھی اپنی خیر خبر کی چٹھی بھی نہیں بھیجی تھی۔"

"باپ ایسے بھی ہوتے ہیں بھلا نانی۔۔۔" وہ اداسی سے مسکرایا اور اٹھ کر باہر چل دیا

اور نانی پیچھے سے اس کی پیٹھ کو تکتی رہ گئی

اس کا کوئی قصور بھی تو نہیں تھا۔خدا نے پیدا ہوتے ہی ماں چھین لی۔باپ کی شکل اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔خدا جانے زندہ تھا یا۔۔۔

بچپن سے بس ایک نانی تاج کا آسرا۔۔۔اگر خدا نا کرے کبھی نانی کو بھی کچھ ہو گیا تو پھر وہ کہاں جائے گا۔۔۔

یہ کلیم بھی پاگل ہو گیا ہے پورا۔کیسی باتیں بھر دی پتل کے کچے ذہن میں۔اگلی بار آئے تو خبر لیتی ہوں اسکی۔

نانی سوچتے ہوئے ناشتے کے برتن سمیٹنے لگی

☆......☆......☆

لاہور کے اس آرٹس کونسل میں تصویری نمائش شروع ہو چکی تھی۔۔۔آرٹ گیلری کو رنگا رنگ تصاویر سے سجا دیا گیا تھا۔مختلف سکیچز اپنے اندر کئی طرح کے پیغام لیئے ہوئے تھے۔سٹیج کو خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔سٹیج کے ایک طرف ڈائس رکھا ہوا تھا جس پہ کالے رنگ کا مائیک لگا ہوا تھا۔ہال کی دیواریں دنیا کے مشہور و معروف پینٹرز اور مصوروں کے شاہکاروں سے سجی ہوئی تھیں

آرٹ کے دلدادہ لوگ جوق در جوق کھنچے چلے آ رہے تھے۔۔۔
آرگنائزرز نے لاہور اور لاہور سے باہر کے تمام نئے مصوروں کے فن کو ابھارنے کیلئے ایک اچھا پلیٹ فارم مہیا کیا تھا۔ایسے نوجوان جو کہ غیر معروف تھے۔وہ اپنا فن اس پلیٹ فارم کے زریعے دنیا تک سامنے لا سکتے تھے۔اپنے فن سے اپنے آپ کو گمنامی کی گھاٹیوں سے نکال کر مشہور و معروف کر سکتے تھے۔

"وسیم صاحب۔۔۔نئے اور ابھرتے ہوئے نوجوانوں کے ٹیلنٹ کو باہر لانے کیلیے یہ ایک اچھا قدم اٹھایا ہے آپ نے۔۔۔" وہ اپنی تصویر بنانے میں مگن تھا جب اس کے ساتھ کھڑے دو بڑی عمر کے مردوں کا تبصرہ اس کی سماعتوں تک پہنچا

"جی بالکل عمیر صاحب۔شاید آپ پچھلے دو مقابلوں میں شرکت نہیں کر سکے تھے۔حالانکہ میں نے آپ کی طرف خصوصی شرکت کا دعوت نامہ بھجوایا تھا۔۔" وسیم صاحب نے اپنے چلتے سوٹڈ بوٹڈ آدمی کو جواب دیا جو چشمہ لگا ہے کافی خوبصورت شخصیت کے مالک لگ رہے تھے۔یہ دونوں حضرات آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہر تخلیق کار کے فن پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر ساتھ ساتھ تعریفی و تنقیدی تبصرہ بھی کر رہے تھے۔

"جی ہاں وسیم صاحب مجھے اطلاع دی گئی تھی آپ کے خصوصی دعوت نامے کی۔اور میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل جانا۔اس عزت افزائی کا بہت شکریہ۔بس میری بدقسمتی سمجھیں کہ میں بزنس کے سلسلے میں ملک سے پچھلا پورا ماہ باہر رہا ہوں۔ورنہ میں ضرور شرکت کرتا۔۔"

"ارے اس میں شکریئے کی بات عمیر صاحب۔آپ اس فن سے محبت کرتے ہیں۔اس فن کے قدردان ہیں تو خصوصی دعوت نامہ تو بنتا تھا۔۔"

"اچھا تو پھر کیسے رہے پچھلے دو مقابلے۔۔۔"

"بہت ہی زبردست۔ہماری سوچ سے بھی کہیں زیادہ کامیاب رہے۔مجھے خوشی ہے کہ ہمارے اس ملک میں اتنے گوہر نایاب ہیرے بھی چھپے پڑے ہیں۔جو کہ وسائل کی کمی کے باعث ہمیشہ گمنامی میں ہی رہتے ہیں۔ہم نے انہیں ایک بہترین پلیٹ فارم مہیا کیا ہے خود کو اگلی سطح تک لے جانے کیلئے۔"

"واقعی قابل تعریف ہیں آپ اور آپ کی پوری ٹیم۔اس طرح کے مقابلے نوجوانوں کیلئے انہیں

آگے لانے کے بھرپور مواقع ہیں۔تو پھر آگے کی کیا پلاننگ ہے"

میرا اور میری ٹیم کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ پچھلے دو مقابلوں کے فاتح نوجوان اور اس تیسرے مقابلے کے فاتح کو کچھ عرصے بعد ملکی سطح پر لایا جائے۔ہم ان مقابلوں کو پاکستان کے دوسرے بڑے شہروں میں لے جانے کا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں۔پھر ملکی سطح پر جو فاتح سامنے آئیں گے گورنمنٹ کی مدد سے انہیں دوسرے ممالک کے ساتھ مقابلوں کیلیئے تیار کرنا بھی ہماری منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔دیکھیں آگے پھر جو منظور خدا"

" آپ کا جذبہ قابلِ داد ہے۔ارادے مضبوط ہوں تو خدا کامیابی یقینی بنا دیتا ہے۔اور آپ سب کے ارادے مستحکم ہیں۔واقعی قابل داد"

اس تصویری مقابلے میں حصہ لینے والے نوجوانوں کو اپنی کلیکشن ساتھ لانے کو تو کہا گیا تھا مگر وہاں پہنچتے ہی آرگنائزر نے ایک اور اعلان کر دیا تھا اور وہ اعلان یہ تھا کہ حصہ لینے والے نوجوانوں کو ایک ایک تصویر بنانے کا کہا گیا جس میں "تعلق" کو دکھایا گیا ہو۔

اس مقابلے میں حصہ لینے والے فن کاروں کو پندرہ منٹ کا بہت مختصر وقت دیا گیا۔اب اس مختصر وقت میں فن کاروں نے کچھ نیا اور انوکھا تخلیق کرنا تھا۔کیونکہ آرگنائزر کے خیال کے مطابق کوئی بھی مصور کسی چیز سے بھی متاثر ہو کر اپنی دھن میں کچھ تخلیق کرتا ہے۔لیکن اصل فن تو یہی ہے کہ انہیں ایک غیر متوقع ٹاسک دیا جائے تبھی معلوم ہوتا کہ کسی فن کار کے اندر کتنی صلاحیت ہے اور وہ اس کم وقت میں کتنی مہارت سے اپنی تخلیق مکمل کرتا ہے۔

حصہ لینے والے تمام مصور لاہور آرٹس کونسل کے سرسبز صحن میں کھڑے اپنے کینوس پر رنگوں سے "تعلق" کی تعریف کرنے میں مگن تھے۔ہر کوئی اپنے پورے فن کا مظاہرہ کرنے میں لگا ہوا تھا

وہ بھی سر پر اپنی مخصوص ٹوپی رکھے کینوس پر رنگ بکھیر رہا تھا۔جب وسیم صاحب اپنے دوست کے ہمراہ مختلف تصاویر کو جانچتے اس تک آ پہنچے۔تصویر پر ایک نظر پڑتے ہی اس کے قدم آگے نہیں بڑھ سکے تھے۔اس نوجوان کے فن میں واقعی کچھ تھا جو اس کی تصویر نے وسیم صاحب کے قدموں کو جکڑ لیا تھا۔

تصویر اپنی تکمیل کے آخری مراحل میں تھی۔
سفید کینوس پر ایک درخت بنا ہوا تھا۔ایک گھنا اور پھیلا ہوا پرانا درخت۔مگر درخت میں عجیب بات یہ تھی کہ اس کی آدھی شاخیں، ڈالیاں اور پتے بالکل سوکھ چکے تھے۔جبکہ باقی آدھا حصہ ویسے ہی تروتازہ اور سرسبز تھا جیسے بہار کے موسم میں ایک صحت مند درخت کے ہوتے ہیں۔سرسبز حصے پر پرندے جا بجا بیٹھے ہوئے تھے۔اس حصے کی ڈالیاں اور شاخیں پرندوں سے بھری ہوئی تھیں۔مگر خشک حصے پر سے پرندہ اڑتے جا رہے تھے۔درخت کا خشک حصہ پرندوں سے بالکل خالی ہو چکا تھا۔جو آخری پرندہ بچا تھا وہ بھی اڑان بھرنے کیلئے اپنے پر کھول رہا تھا"
" واہ نوجوان بہت خوبصورتی سے تم نے آجکل کے مطلبی تعلق کو پینٹ کیا ہے۔قابل تعریف ہو تم" وہ آرٹ کو سمجھنے والے انسان تھے سو انہوں نے تعریف میں کسی قسم کی کنجوسی نا کی۔
"شکریہ سر۔۔۔" نوجوان نے بغیر دیکھے ہی شکریہ ادا کیا
" اور تم نے تصویر پر اپنے دستخط کیوں نہیں کیئے؟
وہ اپنی تصویر مکمل کر کے اپنے ہاتھ صاف کر رہا تھا جب وسیم صاحب نے اس سے دوسرا سوال کیا
" میں کچھ بھی شہرت، نمائش یا اپنی ذات کے لیئے نہیں کرتا سر"
جذبات سے عاری لہجے میں نوجوان نے وسیم صاحب کو لاجواب کر دیا۔ساتھ کھڑے ان کے دوست عمیر صاحب نے حیران نظروں سے اس نوجوان کو دیکھا
" میرے لیئے کام کرو گے۔۔۔تمہیں ہر ماہ منہ مانگی رقم دی جائے گی۔۔۔" عمیر صاحب کو اس لڑکے میں کچھ خاص نظر آیا تھا۔
" سر آپ نے شاید میری بات کو اچھی طرح سمجھا ہی نہیں۔میں اپنے لیئے ہی کام نہیں کرتا تو دوسروں کیلئے کیوں کروں گا۔۔۔" اس بار نوجوان نے پوری طرح مڑ کے عمیر صاحب کو جواب دیا۔
وسیم صاحب نے اوپر سے نیچے تک ایک نگاہ میں اس کی شخصیت کو جانچ لیا تھا۔سرمئی رنگ کی

دھاری دار شرٹ کے نیچے ویسی ہی شرٹ سے ملتی جلتی لائٹ کلر کی پینٹ پہنے وہ اسے واقعی امپریسو لگے تھے۔شرٹ کے دونوں بازو کہنیوں تک فولڈ کر رکھے تھے۔ہاتھوں اور انگلیوں پر اب بھی رنگ لگا ہوا تھا۔اپنے حلیئے سے وہ ایک مکمل آرٹسٹ لگ رہا تھا

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں۔نا اپنے لیئے کام کرتے ہو اور نا ہی دوسروں کیلئے۔۔۔تو پھر کس کے لیئے کام کرتے ہو۔؟""" وسیم صاحب واقعی حیران تھے اسے یہ نوجوان دلچسپ لگا تھا

"اس بات کو ادھورا ہی رہنے دیں سر۔کچھ باتیں اور چیزیں مکمل ہو کر اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں۔" نوجوان نے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے جواب دیا۔

"بہر حال۔۔۔تم سے مل کے خوشی ہوئی۔دلچسپ لگے ہو تم مجھے اور منفرد بھی۔یہ میرا کارڈ رکھ لو کبھی بھی دل کرے یا دوسروں کیلئے کام کرنا چاہو تو پہلے سیدھا میرے پاس آجانا۔میری گیلری میں تم جیسے نوجوان مصوروں کی قدر کی جاتی ہے۔۔۔"عمیر صاحب کا دیا جانے والا کارڈ اس نے نا چاہتے ہوئے بھی رکھ لیا

"شکریہ سر آپ نے میرے کام کو سراہا۔لیکن میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں اور مستقبل میں بھی میرا اپنی بات سے پھرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

مقابلے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔تمام تصاویر جمع کر لی گئی۔صرف سات نوجوانوں نے مقررہ وقت سے پہلے اپنی تصویر مکمل کی تھی۔اور ان سات تصاویر میں جن دو تصویریں نے ججز کو متاثر کیا تھا ان میں سے ایک اسی کی تصویر تھی جبکہ دوسری تصویر کسی دوسرے نوجوان کی تھی جس نے کینوس پر سردیوں کی رات میں اپنے مالک کے دروازے پر سردی سے ٹھٹھرتے کتے کی تصویر پینٹ کی تھی۔دونوں تصاویر اپنی جگہہ شاندار بنی تھیں۔مگر ججز کے متفقہ فیصلے کی بنیاد اس کی تصویر پہلا نمبر دیا گیا تھا جب کہ کتے والی تصویر کو دوسرے نمبر پر رکھا گیا تھا۔

اب کونسل میں تمام حصہ لینے والے فنکار نتیجے کے انتظار میں بے چین کھڑے تھے۔جب کہ اس نوجوان کے چہرے پر اب بھی کسی قسم کی بے چینی کے کوئی تاثرات نظر نہیں آرہے تھے۔

کچھ لمحے بعد سٹیج پر اس کا نام فاتح کے طور پر پکارا جا رہا تھا۔وہ سٹیج پر گیا اور ججز سے اپنی انعامی رقم

وصول کی۔اور اپنی تمام کولیکشن وہیں کھڑے کھڑے بیچ دی۔فن کے قدردان وہاں بڑی تعداد میں شرکت کیلیئے آئے ہوئے تھے۔وہ سٹیج پر اپنی بنائی تصویر شو کرتا۔جو بھی پہلی بولی لگتی تصویر بغیر کسی بھاؤ تاؤ کے اس کے حوالے کر دی جاتی۔تھوڑی ہی دیر میں اس کی ساری تصاویر بک گئیں۔۔۔آخر میں اس نوجوان نے ان تصاویر سے جمع ہونے والی ساری آمدنی ایک ٹرسٹ کے نام کرنے کا اعلان کر دیا۔۔۔پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔۔۔اسی تالیوں کی گونج میں اس نوجوان نے آرٹ گیلری کو چھوڑا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

تھوڑی دور آگے چل کر پر ہجوم چوک تھا جہاں ایک عورت اپنے دو سالہ بچے کے ساتھ بھیک مانگ رہی تھی۔اپنے دو سالہ بچے کو اس نے بغل میں اٹھا رکھا تھا جب کہ ایک بچہ اس عوت کے پیٹ میں پل رہا تھا۔

نوجوان کے قدم اس عورت کے پاس جا کر تھم گئیے۔اپنی تصویر کی ساری انعامی رقم اس عورت کے حوالے کی اور دوسری جیب میں پڑا کارڈ اس عورت کے چھوٹے دو سالہ بچے کے ننھے میلے ہاتھوں میں تھما کر خود چل دیا۔۔۔

وہ عورت اس نوجوان کی پیٹھ کو دیکھتے ہوئے حیران تھی ساتھ ساتھ اس کے خشک ہونٹوں سے اس نوجوان کیلئے ان گنت دعائیں قطار سے نکل رہی تھیں۔۔۔

اور نوجوان وہ ہمیشہ کی طرح کچھ نہیں جانتا تھا کہ اس کی اگلی منزل کون سی ہوگی۔۔۔

☆......☆......☆

دروازے پر مسلسل دستک ہو رہی تھی۔گھر میں اس وقت سوائے نوری کے کوئی اور موجود نہیں تھا جو جا کے دروازہ کھول دیتا۔اسکی اپنی طبیعت کل رات سے ناساز تھی۔پچھلے دن ہونے والی بارش کی وجہ سے اسے بخار اور زکام نے آلیا تھا۔ابا نے بخار کا سیرپ اور چند گولیاں لا دی تھی مگر ان سے بھی کچھ افاقہ نا ہوا۔طبیعت میں نقاہت ویسے ہی برقرار تھی۔

مجبوراً اسے خود ہی اٹھ کر بیرونی دروازے تک جانا پڑا۔سر پر چادر سنبھالتی آہستہ آہستہ قدموں سے

چلتی وہ دروازے تک آ پہنچی تھی۔

اس کا عرصہ عدت ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔نانی تاج اس کے پاس پچھلے چند دنوں سے رکی ہوئی تھی مگر پرسوں ہونے والی تیز بارش نے اس کے گھر کی۔ کچی چھت کو چھلنی کر دیا سو مجبوراً اسے چھت کی لپائی کیلیئے واپس جانا پڑا

"کون ہے ۔۔۔" نوری نے دروازے کی اوٹ میں ہو کر آہستہ آواز میں پوچھا کہ باہر کہیں کوئی نامحرم نا ہو

"دروازہ کھولیئے ۔۔۔" باہر سے آنے والی آواز انجانی اور نسوانی تھی

تو نوری نے لکڑی کے کواڑوں میں پھنسی کنڈی گرادی

اندر آنے والی عورت کو دیکھتے ہی نوری وہیں کی وہیں رہ گئی۔ بڑھے ہوئے پیٹ کے ساتھ ایک بڑی سی چادر میں اپنے پورے وجود کو لپیٹے وہ کوئی اور نہیں ملوکھاں تھی

نوری حیران ہی تو رہ گئی۔گو وہ دونوں ایک ہی گاؤں کی تھیں مگر یہ ان کی اس طرح رو برو پہلی ملاقات تھی اور وہ بھی اس حال میں کہ جب نور بانو سلطان کی منکوحہ تھی جبکہ ملوکھاں سلطان کی پہلی بیوی اور اس کے بچے کی ہونے والی ماں تھی۔کیا عجب رشتہ تھا ان دونوں کے بیچ

"ملوکھاں تم ۔۔۔آؤ اندر آجاؤ۔" وہ اندر آئی تو نوری نے جلدی سے پیچھے سے دروازہ واپس بند کر دیا۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ چلتی اسے چارپائی تک لے آئی

"یہاں بیٹھو ۔۔۔کیوں اتنی تکلیف کی تم نے ۔تمہاری طبیعت صحیح نہیں تھی۔" نوری نے بے چینی سے کہا

"تم سے ملنا بہت ضروری تھا نوری" ملوکھاں نے اکھڑی سانس میں اسے جواب دیا۔اس کی آواز سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ پیدل چل کر یہاں تک آئی ہے جبکہ اس حالت میں عورتیں اتنا پیدل چلنے سے گریز کرتی ہیں

"تم بیٹھو میں تمہارے لیئے کچھ بنا کے لاتی ہوں" نوری کے تو پیر زمین پر نہیں پڑ رہے تھے مگر اس کے اٹھنے سے پہلے ہی ملوکھاں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس اسے بٹھا دیا

مگر ملوکھاں کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ سوچ رہی تھی بولے بھی تو کیا الفاظ ساتھ ہی نہیں دے رہے تھے۔ وہ جو سوچ کے آئی تھی کہ نوری اسے بد دعائیں دے گی گالیاں دے گی مگر پھر بھی وہ گالیاں سن کر بھی معافی ضرور مانگے گی۔ مگر یہاں تو منظر ہی کوئی اور تھا اتنی محبت، اپنائیت کا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اب کیا بولتی زبان ہی گونگی ہو گئی۔ یہ اس کی نوری سے پہلی ملاقات تھی

جب الفاظ نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو اس نے نوری کے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے، آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگی ملوکھاں کی آنکھوں سے۔

الفاظ جہاں ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں وہاں آنسوؤں مدد کو آپہنچتے ہیں اسکی مدد کو بھی آنسوؤں آگئے تھے

اور نوری وہ تو ملوکھاں کو روتے دیکھتے ہی ہکا بکا ہو گئی

"ارے تم رو کیوں رہی ہیں۔۔" نوری نے اس کے اپنے آگے بندھے ہاتھوں کو چھڑاتے ہوئے کہا

"نوری میں کچھ کھانے پینے یا اپنی خدمتیں کروانے نہیں آئی ہوں۔ میں تمہاری گالیاں سننے آئی ہوں۔ نوری مجھے گالیاں دے دو، بد دعائیں دے دو، مار لو کچھ تو کہو۔۔۔" ملوکھاں ہچکیوں میں روتے ہوئے بولی۔

"کیوں۔۔۔؟ جھلی ہو گئی ہے تو۔۔۔؟

"نوری مجھے اس کی قسم میں نے کبھی اس طرح نہیں چاہا تھا۔ میں نے ایسا کچھ بھی نہیں چاہا تھا کہ یہ سب ہو یا سلطان اس طرح کرے۔ نوری کیا تمہیں میرا یقین ہے۔۔۔" ملوکھاں اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی

"ملوکھاں تم یہاں نا آتی قسم نا اٹھاتی پھر بھی مجھے تم پر یقین تھا کہ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ کیونکہ

میں جانتی ہوں کہ تم سلطان سے محبت کرتی ہو۔ محبت صرف محبت سکھاتی ہے، محبت کبھی نفرت کا درس دے ہی نہیں سکتی۔" نوری نے ملوکھاں کو لاجواب کر دیا

"کیا واقعی تم مجھ سے ناراض نہیں ہو۔ تم نے مجھے بد دعائیں نہیں دیں۔۔۔؟" ملوکھاں نے حیران لہجے میں پوچھا

"نہیں ملوکھاں میں نے تمہیں کوئی بد دعا نہیں دی۔ وہ پاک ذات گواہ ہے اس بات کی۔" اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی

"نوری جب سلطان کی تم سے شادی ہوئی تھی تو سلطان نے مجھے سب کچھ بتایا تھا میں تمہارے صبر پہ حیران رہ گئی تھی۔ مگر تم تو میری سوچ سے بھی بڑھ کر اعلیٰ ظرف ہو"

"صبر آ ہی جاتا ہے ملوکھاں۔ جب انسان کا کچھ دوش ہی نا ہو نصیب میں۔ تو صبر آ ہی جاتا جب انسان اپنے لیئے چاہ کر بھی کچھ کرنے سے قاصر ہو تو صبر آ ہی جاتا ہے۔ اور جب صبر آ جاتا ہے تو یہی صبر انسان کو اعلیٰ ظرفی بھی سکھا دیتا ہے"

"اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے نوری۔۔۔ دنیا جتنی آوازیں اٹھائے جتنا مجھے برا بھلا کہے مجھے کوئی ڈر نہیں۔ مجھے صرف تمہاری فکر تھی کہ تم اس سب کا ذمہ دار مجھے ٹھہراؤ گی مگر اب دل میں ٹھنڈک اتر گئی ہے"

وہ اس کے ہاتھ پہ بوسہ دیتے ہوئے بولی

"بے فکر رہو ملوکھاں۔۔۔ میرا خدا گواہ ہے میں نے اپنی قسمت کا کبھی بھی تمہیں ذمہ دار نہیں ٹھہرایا یہ تو سارے نصیبوں کے کھیل ہیں۔ تمہاری قسمت اچھی ہے محبت تم پہ مہربان ہے۔ زندگی تم پر مہربان ہے۔ خوش قسمت ہو تم۔ تم جیئو جی بھر کے اپنے پورے دل کے ساتھ۔۔۔" نوری میں جیسے کوئی بوڑھی محبت سے گندھی روح گھس چکی ہو۔

"میرے بس میں ہوتا تو میں اپنی یہ خوش قسمتی تمہارے نام لکھ دیتی۔ مگر میرے ہاتھ میں کچھ بھی تو نہیں ہے نوری۔۔۔ اور یقین کرو تمہاری یہ سفید لباسی مجھے گھائل کر رہی ہے۔"

"ایسا کچھ بھی مت سوچو ملوکھاں۔ میری ایسے ہی لکھی ہو گی میں نے سمجھوتا کر لیا ہے۔ تم اپنی

زندگی بھرپور جیئو۔میرے بارے فکرمند بالکل نا ہونا۔

بس اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔تمہارا اس حالت میں اس طرح آنا تمہارے لیئے اچھا نہیں ہے ۔خود کا خیال رکھا کرو۔"

"""ہاں میں جانتی ہوں اس حالت میں سفر میں مناسب نہیں ہوتا۔اماں نے بھی بہت روکا تھا لیکن میں خود کو تمہاری طرف آنے سے روک نہیں پائی۔کیا خبر زندگی کبھی پھر یہ موقع دیتی بھی ہے یا نہیں۔؟"

" ارے ایسا نہیں بولتے ملوکھاں۔خدا تمہیں لمبی زندگی دے اور تم اپنے بچے کی خوشیاں بھی دیکھو۔یہ بڑا ہو تو کبھی کبھار اسے میرے پاس بھی بھیجنا۔۔۔" نوری نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

ملوکھاں نے شدت جذبات سے اسے خود سے بھینچ لیا۔ممکن ہوتا تو اس وقت وہ نوری کو اپنے کلیجے میں بھی اتار لیتی۔اگر ممکن ہوتا تو نا۔۔۔

" میں چلوں اب۔۔۔" ملوکھاں نے اجازت چاہی

" دل تو نہیں کرتا کہ تمہیں جانے دوں دل کرتا ہے تمہارے ساتھ ایسے ہی باتیں کرتی رہوں۔مگر مجبوری ہے۔۔۔بس دعا کرنا میرے لیئے"

نوری نے اس کے حسین چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

ملوکھاں جب یہاں آئی اور دستک کیلیئے ہاتھ اٹھایا تو اسکے دل میں خدشے تھے وہمات تھے اور جب اس نے واپسی کیلیئے نوری کی چوکھٹ سے باہر قدم رکھا تو اسکا دل اطمینان اور نوری کیلئے احترام سے بھرا ہوا تھا۔دنیا میں اتنی اچھی اور پیاری روحیں بھی موجود بھی ہیں۔بھلے نوری اس سے زیادہ خوبصورت نہیں تھی۔سانولے رنگ کی ایک قبول صورت لڑکی تھی مگر نوری کا دل اس سے ہزار درجے زیادہ خوبصورت تھا۔اس کے ظرف کا پیمانہ اس سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ملوکھاں بھاری قدموں سے آہستہ آہستہ چلتی اپنے وجود کو بڑی چادر میں اوڑھے سوچتے ہوئے جا رہی تھی

☆......☆......☆

گاڑی نے اسے ایک لمبے اور تھکا دینے والے سفر کے بعد رات گئے بس اڈے پر اتارا تو سلطان کے پاس کوئی جائے ٹھکانہ نہیں تھا جہاں وہ رات کے یہ چند گھنٹے بسر کر کے سفر کی تھکاوٹ اتارتا۔۔۔

تھوڑی دور ادھر ادھر پھرنے کے بعد وہ بھی اس فٹ پاتھ پر جا کے سو گیا جہاں اس سے پہلے بھی لاتعداد مسافر دنیا سے بے خبر محو خواب تھے۔ اسے حیرانی ہوئی اور وہ سوچنے لگا کہ کس طرح ان سب کو اتنے سخت بستر پر نیند آجاتی ہے جہاں رات ساری مچھر کاٹتے ہیں اور آس پاس سے گزرتی گاڑیوں کا کان پھاڑ دینے والا شور ایک آرام دہ نیند میں مخل ہوتا ہے مگر وہ لوگ تو ایسے گھوڑے گدھے بیچ کے سو رہے تھے جیسے سالوں سفر کے بعد آج انہیں اپنی تھکن اتارنے کا موقع ملا ہو

اس نے سنا تھا کہ کراچی روشنیوں کا شہر ہے۔ غریب اور بے روگاروں کی ماں ہے۔ بے گھروں کو گھر فراہم کرتا ہے۔ بے امانوں کو امان دیتا ہے بے روزگاروں کو روزگار دیتا ہے۔ تو یہ ہے وہ کراچی جس کے قصے اس نے سنے تھے۔ ماں کی گود تو نرم ہوتی ہے جہاں سر رکھتے ہی انسان آرام وسکون کی وادیوں میں اترتا چلا جاتا ہے مگر اس ماں کی تارکول سے بنی سخت گود اور کھردری گود جانے کیسے اسے نیند آئے گی

خیر یہ وقت اس طرح کی باتیں سوچنے کا نہیں تھا۔ تھکاوٹ اور نیند کی وجہ سے اس کی آنکھیں بار بار بند ہوئی جارہی تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر سوئے ان بے گھروں کو اوپر سے پھلانگتا اپنے سونے کیلیئے ایک جگہہ بنانے میں کامیاب ہو ہی گیا

اور اپنے کپڑوں کی چھوٹی سی گٹھڑی سر تلے رکھ کر سویا تو سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے بہت جلد ہی وہ نیند کی وادیوں میں کہیں دور تک جا پہنچا۔ نا تو مچھروں کی وجہ سے اسکی نیند خراب ہوئی اور نا ہی گاڑیوں کا بے ہنگم شور اس کی سماعتوں کو گراں گزرا۔ اور وہ اس تارکول کے سخت اور کھردرے بستر پر بھی خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگا۔

صبح اس کی آنکھ انسانوں کے بہت زیادہ شور کی وجہ سے کھلی۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا تو آدھا دن چڑھ چکا تھا فٹ پاتھ پر اس کے ساتھ لائن میں سوئے آدھے سے زیادہ مسافر اب کہیں

غائب ہو چکے تھے۔اور اس کے آس پاس لاتعداد لوگ ہاتھوں میں پوسٹر اٹھائے اونچی اونچی آوازوں میں نعرے لگاتے ہوئے جا رہے تھے۔۔۔

سلطان اٹھ کر بیٹھ گیا اس کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کرے اور کیا نا کرے۔نا ہی اس کے پاس فی الوقت کرنے کیلئے کوئی کام تھا۔اتنی دیر میں اسے اتنا تو اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ کسی سیاسی پارٹی کی طرف سے نکالی جانے والی ریلی ہے۔وہ بھی اپنی گٹھڑی اٹھائے ان کے ساتھ ساتھ خراماں خراماں چلنے لگا۔

نعرے لگاتی اور آہستہ آہستہ چلتی ریلی آخر کار اپنے مخصوص مقام تک پہنچ گئی۔لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد وہاں پر پہلے سے ہی موجود تھی انسانوں کی اتنی بھیڑ سے اس نے اندازہ لگایا کہ اتنی تو اس کے گاؤں کی کل آبادی بھی نہیں ہوگی جتنی تعداد میں انسان اس جلسہ گاہ میں موجود تھے۔نعروں کا شور اس قدر بلند تھا کہ کانوں پڑی آواز سنائی نا دیتی۔اونچے بنے سٹیج پر ایک صاحب آئے اور جب انہوں نے بولنا شروع کیا تو لوگوں کا بے ہنگم شور زرا کم ہونے لگا۔

وہاں موجود سٹیج سیکریٹری مختلف نام پکارتا تالیوں کی گونج اٹھتی اور ایک صاحب آتے بڑے زور شور سے تقریر جھاڑتا اور پھر اسی تالیوں کی گونج میں سٹیج چھوڑتا تو دوسرے کی باری آتی اور یہ عمل پھر سے دہرایا جاتا۔سلطان کچھ نہیں جانتا تھا کہ یہ کس سیاسی پارٹی کا جلسہ ہے اور کس بنیاد پر ہو رہا ہے۔اور نا ہی اسے آج تک گاؤں میں رہتے ہوئے کسی سیاسی پارٹی یا ملکی حالات سے آگاہی میسر آئی۔گاؤں میں اخبار تو دور کی بات ابھی تک بجلی کی سہولت تک میسر نہیں تھی تو کیسے وہ لوگ جان پاتے کہ ملکی سطح پر کیا ہو رہا ہے اور سیاست میں کونسی کھچڑیاں پک رہی ہیں

اور سیاست کا قد آور اونٹ کس کروٹ بیٹھ رہا ہے۔وہ لوگ تو بس اپنی ہی دھن میں جیئے جا رہے تھے۔جینے کیلئے دوسرے مسئلے اور دوسری وجوہات بھی تو لاتعداد ہوتے ہیں۔

جلسہ ابھی پورے زور شور سے جاری وساری تھا۔اور آخر کار سٹیج سیکریٹری نے جوش وخروش سے اس خاص شخصیت کا نام پکارا جس کے اعزاز میں یہ سب کچھ سجایا گیا تھا اور پھر انکی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے انہیں سپیکر پر آنے کی دعوت دی تو لوگوں نے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔لوگوں کا شور اتنا

زیادہ تھا کہ سلطان نے اپنا دوسرا ہاتھ جو کہ فری تھا اپنے کان پر رکھ لیا۔

مگر وہ صاحب جو بھی تھے ابھی سپیکر تک نہیں پہنچے تھے کہ آن کی آن میں لوگوں میں بھگدڑ مچنے لگی ۔چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں ۔سلطان کچھ سمجھ نا پایا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے ۔کچھ شرپسندوں نے جو کہ لوگوں کی ۔اس بھیڑ کے اندر ہی چھپے ہوئے تھے قتل و غارت شروع کر دی۔

لوگ بے ترتیب ہو کر بھاگنے لگے سب کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے ۔اسی دھکم پیل میں سلطان کو کسی کے مضبوط ہاتھوں سے ایک زبردست دھکا پڑا اور دھکے کی طاقت سے وہ زمین پر آ گرا ۔گٹھڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں دور جا گری اور اپنی جان بچاتی بھاگتی دوڑتی عوام کے پیروں تلے آ کر رندگئی ۔ان چند شرپسندوں کی طرف سے ابھی تک قتل و غارت جاری تھی ۔زمین پر اب جا بجا خون اور خون میں لت پت پڑے زخمی انسان دکھائی دینے لگے۔

یہ اس کا کراچی سے پہلے دن کا پہلا تعارف تھا۔اور پہلا تاثر ہی اتنا بھیانک اور خونریز ہو گا اس نے سوچا ہی نا تھا۔

اتنے میں پولیس کی گاڑیوں کا مخصوص سائرن سنائی دینے لگا ۔ہتھیاروں سے لیس پولیس شرپسندوں پر ڈنڈے برسانے لگی اور انہیں پکڑ پکڑ کر پولیس کی گاڑیوں میں ڈالا جانے لگا۔

سلطان نے یہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت جانی ۔اور جب وہ وہاں سے بھاگنے لگا تو ایک پولیس والے نے زوردار ڈنڈا اس کے سر پر مارا۔۔سلطان وہیں سر پکڑ کر بیٹھتا چلا گیا اسے جلسہ گاہ گھومتا دکھائی دینے لگا۔سر پہ ہاتھ لگا کر واپس نیچے کیا تو اس کا ہاتھ سرخ سرخ خون سے لت پت تھا

پولیس والے اس بھگدڑ اور خونریز ماحول میں شاید یہ فرق کرنے میں ناکام رہے تھے کہ کون بے قصور ہے اور کون مجرم ۔کون اس تباہی کا شکار ہوا ہے اور کون اس تباہی کو پھیلانے کا ذمہ دار ہے۔

اگلے پل دو پولیس والے آئے اور اسے گھسیٹتے ہوئے پولیس کی گاڑی تک لے گئے ۔وہ چیختا رہا اور اپنی بے گناہی کا واویلا کرتا رہا ۔مگر اس وقت کسی نے بھی اس کی فریاد پر کان نا دھرنے کی ٹھان رکھی تھی

سلطان نے گاڑی میں بیٹھنے میں پس و پیش کی تو پولیس والوں نے دو مزید زوردار ڈنڈے اس

کی پیٹھ پر رسید کیے۔اور ایک زوردار دھکا دے کر اسے گاڑی کے فرش پر لا پٹخا۔جہاں اس سے پہلے بھی دو تین نوجوان پڑے ہوئے تھے۔تھوڑی ہی دیر گاڑی آدمیوں سے بھر گئی اور دو پولیس اہلکار گاڑی کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔کسی کو باہر کودنے کی ہمت نا ہوئی۔گاڑی نے سپیڈ سے موڑ کاٹا اور زن سے جلسہ گاہ سے نکلی۔

سلطان اور دوسرے آدمیوں کو اس پولیس کی گاڑی میں اس طرح بے ہنگم طریقے سے بھر دیا گیا جیسے بھیڑ بکریوں کو مویشی منڈی لے جانے سے پہلے بڑی سی گاڑی میں زبردستی بھرا جاتا ہے۔اور یہاں تو گاڑی بھی پولیس کی مخصوص اور چھوٹی سی تھی جہاں اتنے لوگ پکڑ پکڑ کر بھر دیئے گئے تھے۔گاڑی کے موڑ کاٹ کر جلسہ گاہ سے نکلنے سے پہلے اس نے پیچھے کھڑے دو پولیس والوں کے بیچ سے باہر نظر دوڑائی تو جلسہ گاہ میں اب بھگدڑ رکم ہو چکی تھی۔لوگ زخمی حالت میں پڑے اپنے زخموں کو رو رہے تھے۔جلسہ گاہ کی زمین پر جگہہ جگہہ بڑے بڑے انتخابی اشتہار اور جھنڈیاں بکھری پڑی ہوئی تھی

ان کی اگلی بریک پولیس سٹیشن جا کر لگی تھی۔جس تیزی سے بھیڑ بکریوں کی طرح ان سب کو گاڑی میں ڈالا گیا تھا بالکل اسی طریقے سے انہیں گاڑی سے نکال کر جیل میں پھینکا جانے لگا۔۔۔

سلطان کو بھی ایک پولیس والے نے زور سے دھکا دیا۔اور وہ جیل کے فرش پر منہ کے بل آ گرا۔تھوڑی ہی دیر میں جیل کا سلاخوں والا دروازہ بند کر کے اس کے آگے بڑا سا تالا لگا دیا گیا۔

اور وہ جیل کی کال کوٹھڑی میں سلاخوں کو پکڑے چیخ رہا تھا۔

" صاحب میں اس شہر میں نیا آیا ہوں۔میرا کوئی قصور نہیں ہے۔مجھے چھوڑ دیں۔خدا قسم میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

مگر اگلے ہی پل غصے میں بھنے کسی پولیس والے نے وہیں دور سے کھڑے کھڑے غصے سے اس کی طرف ڈنڈا پھینکا۔ڈنڈا سلاخوں سے ٹکرا کر نیچے جا گرا

" ابے چپ۔۔۔اب تمہاری آواز باہر آئی تو تیری زبان حلق سے کھینچ کر تیرے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ساتھ ہی اس پولیس والے کی طرف سے گالیوں کی ایک بوچھاڑ آئی تھی پھر اس کے بعد سلطان کو ہمت

ناہوئی کہ وہ دوبارہ اپنی بے گناہی کے گن گاتا۔۔۔"

سلطان جیل کی سلاخیں پکڑے وہیں نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ یہ کیا ہو گیا ایک ہی دن میں وہ کہاں سے کہاں آ پہنچا۔ اس کی ساری امیدوں اور سارے خوابوں نے ایک ایک کر کے دم توڑ دیا تھا۔۔ اس کا تو اس اجنبی شہر میں کوئی بھی جاننے والا نہیں تھا۔ تو کیا اب ساری زندگی اسی جیل میں سلاخوں کے پیچھے مار کھاتے ہوئے گزر جائے گی۔ سوچیں لامحدود تھیں۔ دل اندھیروں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ اور زندگی کی ساری امیدیں اس کے ہاتھوں سے ایک ایک کر کے چھوٹتی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

نواں حصہ

جیل کی زندگی کیا ہوتی ہے سلطان کو ایک ہی دن میں سمجھ آگئی تھی ۔رات کے کھانے میں برائے نام پتلی سی شوربے والی دال دی گئی تھی وہ بھی آدھی رات کو جب سب کے پیٹ میں بھوک سے بل پڑنے لگے تھے ۔وہ سوچ رہا تھا کہ ان کو صرف دنگے فساد کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا خدا جانے ان مجرموں سے کیسا سلوک ہوتا ہوگا جو قتل یا دوسرے بڑے جرم میں گرفتار ہوتے ہیں ۔اسے حیرت اپنے ان باقی سترہ ساتھیوں پر بھی تھی جو بالکل بھی فکر مند نہیں تھے اور آرام سے سارا دن خوش گپیاں لگانے کے بعد مزے کی نیند سوئے ہوئے تھے جیسے یہ کوئی جیل نا ہوئی اپنے گھر کا بستر ہو گیا

”اوشہزادے کیا تماشا لگا رکھا ہے ۔خود بھی سو جا اور ہمیں بھی سونے دے ۔۔۔“ رات کے اس پہر وہ نیند نا آنے کے باعث اٹھ کر بیٹھ گیا تو ساتھ سوئے مسٹنڈے نے اسے جھڑکا

دن کو تھانیدار کی طرف سے پڑنے والی مار کا درد ابھی تک جسم میں موجود تھا۔ ننگے فرش کی وجہ سے پیٹھ اور کمر کے درد میں اضافہ ہوا تو سلطان اٹھ بیٹھا اور کراہنے لگا جس سے اس کے ساتھ سوئے مسٹنڈے کی نیند میں خلل آیا تھا

سلطان نے اس کی بات کا کوئی جواب نا دیا البتہ کراہنا بند کر دیا۔ حالانکہ درد میں اب بھی کوئی کمی نہیں آئی تھی ۔

” نئے آئے ہو کیا ۔۔۔ پہلے کبھی دیکھا نہیں تمہیں ۔۔۔“ سلطان کو خاموش دیکھ کر اس نے دوسرا سوال کیا

” ہاں ۔۔۔“ اس بار اس نے یک لفظی جواب پر اکتفا کیا

"تبھی تو بچوں کی طرح رو رہے ہو۔۔۔"

"آپ کو درد نہیں ہوتا کیا۔؟"

"ہم عادی ہو چکے ہیں اب۔ یہ جیل اب دوسرا گھر بن چکی ہے ہمارا۔ ہر تین چار بعد چکر لگ جاتا ہے اپنا۔۔۔" اس نے جواب دے کر اپنا بازو پھر سے آنکھوں پر رکھ کر سونے کی کوشش کی۔ اس کے لہجے میں ایسا بانکپن شامل تھا جیسے جیل میں بند ہونا کوئی عیب نا ہو بلکہ فخر کی بات ہو اس کیلئے۔

سلطان ویسے ہی بیٹھا اس نیم اندھیرے میں اس کے آدھے چہرے کو حیرت سے دیکھنے لگا جبکہ آنکھوں پر بازو رکھے ہونے کی وجہ سے باقی نصف حصہ چھپ چکا تھا

"ابے گھور کیا رہا ہے اتنا۔ معشوقہ نہیں ہوں میں تیری۔ کہا نا بے فکر ہو کر سو جا۔ چوہدری صاحب دو چار روز میں چھڑا لیں گے سب کو۔۔۔" آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر اس نے ایک بار پھر گھرکا تو اس بار سلطان نے سہم کر اس کی بات مان لی۔ اور پھر سے ننگے فرش پر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نیند آنکھوں کی پہنچ سے کوسوں دور تھی۔ تمہیں تو چوہدری صاحب چھڑا لیں گے میرا کیا ہو گا۔۔۔ نیند نا آئی تو اس کی سوچوں کے گھوڑے بے لگام ہو کر دوڑنے لگے تھے یہ اس کی جیل میں زندگی کی پہلی رات تھی

"کیا مجھے بھی چھڑوا دیں گے چوہدری صاحب۔۔۔؟" اگلا سوال اس نے سوئے سوئے ہی کیا

اب کی بار اس مسٹنڈے نے سوئے سوئے ہی کروٹ بدل کر اس کی طرف رخ کر لیا

"ہاں تمہیں بھی۔ اب رو نہیں۔ مرد روتے اچھے نہیں لگتے۔ شکل دیکھی ہے اپنی۔۔۔؟"

"میں رو نہیں رہا۔۔۔ فکر پریشانی بھی کسی چیز کا نام ہوتا ہے۔۔۔" اسے اپنی تضحیک بالکل اچھی نا لگی۔ کس کو اچھی لگتی ہے بھلا

"شکل تو رونے والی بنا رکھی ہے نا۔ اور دن کو جب تھانیدار سے مار پڑی تھی تب بھی تم روئے تھے۔۔۔" مسٹنڈے کو شاید اس کا مذاق اڑا کر مزہ آنے لگا تھا اب

"تو درد ملے پھٹکار ملے اور وہ بھی بے قصور۔ تو پھر رونا تو آتا ہے۔ اور تم کیا اس وقت دانت نکال رہے تھے؟ اپنی شکل دیکھی تھی تب۔۔۔"

"رویا پھر بھی نہیں تھا میں۔مرد ہوں۔"

"کیوں درد نہیں ہوتا تمہیں۔۔۔؟"

"مرد کو درد نہیں ہوتا۔۔۔اور اپنی باڈی عادی ہو چکی ہے اب"

"یہ چوہدری صاحب کون ہیں۔۔۔؟"

"گرو ہیں اپنے۔۔کل پرسوں تک باہر کرا لیں گے سب کو۔"

"تمہیں یقین ہے کل پرسوں تک ہو جائیں گے باہر۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔چوہدری صاحب اپنے بندوں کی خیر خبر رکھتے ہیں ہمیشہ۔ہمارے باہر جانے تک آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔۔۔"

"وہ کیوں باہر کرائیں گے ہم سب کو۔۔۔" اسے تھوڑی امید بندھی تو مسٹنڈے کو کریدنے لگا

"اب کیا میرے دماغ کا دہی بنانے کا موڈ ہے تیرا۔۔؟

سو جا آرام سے۔سب سمجھ آجائے گا تمہیں۔۔۔" اس نے گھر کا تو سلطان اس بار جھینپ گیا اور مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

تین دن تک اسے باقی قیدیوں سمیت صبح شام پھٹکار ملتی رہی۔نا تو کھانے پینے کا ہوش رہا اور نا ہی اپنی بے گناہی کا۔

جسم کا انگ انگ درد سے بلبلا رہا تھا۔بچپن میں وہ اماں سے سنتا تھا کہ اللہ بندے کو ہسپتال اور تھانے سے بچائے رکھے۔دوسرا تجربہ تو سلطان کو ہو گیا تھا۔اور پتا چل گیا کہ اماں ٹھیک ہی کہتی تھی۔مسلسل تین دنوں سے جیل کی خشک دال کھا کھا پیٹ میں اب ورم اٹھنے لگے تھے

رات کو جیل کے ننگے فرش پر سوتا تو کمر الگ سے دہائیاں دیتی اور رات بھر مچھر اس کے کانوں میں الگ سے نئے نئے راگ الاپتے رہتے۔وہ نازوں پلا اپنے ماں باپ کے ہاتھوں کا چھالا کہاں ایسے ماحول میں رہنے کا عادی تھا

پہلے دن چیختا رہا اپنی بے گناہی کا رونا روتا رہا مگر یہاں سلطان کی سننے والا کوئی نا تھا البتہ اسے

شور مچانے پر اور زیادہ مار پڑنے لگی تو سلطان نے باقی قیدیوں کی طرح خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی ۔مگر اسے فکر اس بات کی تھی کہ اسے چھڑانے کون آئے گا ۔ یہاں تو اسے کوئی بھی نہیں جانتا تھا ۔اس مسٹنڈے نے اسے تسلی تو دی تھی مگر دل میں خدشات تھے کہ بھلا چوہدری صاحب اسے کیوں چھڑائیں گے ۔وہ تو اپنے بندوں کو چھڑا کر چلتے بنیں گے ۔ یہ سوچ اس کا دل دہلا دیتی ۔ یہ تین دن اس کی اب تک کی زندگی کے مشکل ترین دن گزرے تھے اسی مایوسی میں ایک ایک سیکنڈ گزارنا ایک سال گزارنے کے برابر تھا ۔خدا خدا کر کے تین دن بعد ان سب کو ضمانت کی خوشخبری دی گئی ۔مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا اللہ نے کس کو فرشتہ بنا کر اسکی مدد کو بھیجا ہے ۔یقیناً چوہدری صاحب کا ہی کارنامہ ہوگا ۔ان دیکھے چوہدری صاحب کیلئے اس کا دل احسان مند ہونے لگا

تھانے سے نکلے تو زندگی کا احساس ہوا تین دن بعد کال کوٹھڑی سے نکل کر باہر نکلا تو سورج کی روشنی آنکھیں چندھیانے لگی ۔تھانے کا گیٹ کراس کرتے ہی ایک بڑی گاڑی ان کے استقبال کو موجود تھی ۔باقی قیدی خوشی خوشی گاڑی میں سوار ہونے لگے تو اسے بھی ان سب کی دیکھا دیکھی چاروناچار گاڑی میں سوار ہونا پڑا ۔ پونے گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد گاڑی ایک بڑے ڈیرے پر جا کے رکی ۔انہیں گاڑی سے اتار دیا گیا ۔سلطان ہونقوں کی طرح اس خوبصورت اور جدید طرز پر بنائے گئے ڈیرے کی اونچی عمارت کو دیکھنے لگا ۔تھوڑی ہی دیر میں وہاں ایک بڑے قد اور بھاری جسامت والے آدمی کی آمد ہوئی جس کے آگے پیچھے چھ سات مزید چمچے پھر رہے تھے ۔

اس کے ساتھ کھڑے قیدیوں کی کھسر پسر سے سلطان کو پتا چلا کہ آنے والی ہستی اس علاقے کی اہم سیاسی شخصیت چوہدری حیدر علی تھے ۔کڑکڑاتے کاٹن کے سفید سوٹ میں ملبوس، پاؤں میں سفید تلے والا کھسا پہنے چوہدری صاحب ڈیرے پر موجود بڑے سے تخت پر براجمان ہوئے تو سارے حواری بھی آہستہ آہستہ بیٹھ گئے ۔چوہدری صاحب کی شخصیت کا رعب اتنا تھا کہ جب سے انہوں نے ڈیرے پر قدم رکھا تب سے کسی دوسرے انسان کو بولنے کی ہمت نا ہوئی ۔

”ضمانت آسانی سے ہوگئی تھی رشید ۔۔۔“ سلطان نے اس دورانیے میں انہیں پہلی بار بولتے سنا

۔جسامت کے ساتھ ساتھ خدا نے انہیں بھاری رعب دار آواز سے بھی نواز اتھا۔

" جی سائیں ۔۔۔ضمانت آرام سے ہوگئی سب کی۔" ساتھ کھڑے پگڑی والے آدمی نے مودب انداز میں جواب دیا جس کا نام غالباًرشید تھا

" سائیں ۔۔۔ایک نیا بندہ بھی ہے کوئی۔ پہچان میں نہیں آرہا اپنے علاقے کا بھی نہیں لگتا۔۔"

رشید نے چوہدری صاحب کو خالص سندھی لہجے میں سلطان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا

" ادھر آؤ بچہ۔۔۔" چوہدری صاحب نے سلطان کو ایک نظر سر سے پیر تک دیکھنے کے بعد اپنی طرف بلایا۔

سلطان آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ان کے پاس پہنچا تو چوہدری صاحب نے اسے ساتھ پڑی خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔اشارہ ملتے ہی سلطان خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔لوہے کی کرسی پر بیٹھنے سے اسے تھوڑا درد محسوس ہوا جو کہ تین دن پولیس کی طرف سے ہونے والی۔ خدمت کی عنایت تھی

"کہاں سے آئے ہو اور کون ہو تم ۔۔۔؟" چوہدری صاحب نے اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے پوچھا

تو سلطان نے اپنی آمد سے لے کر پولیس تھانے میں گزرے تین دن کی داستان ان کے گوش گزار کردی

" جب خشک کھیت میں آگ لگائی جاتی ہے اس وہاں موجود تھوڑا بہت سبزہ بھی لپیٹ میں آجاتا ہے۔تمہارا ساتھ بھی یہی ہوا۔" چوہدری صاحب اس کی ساری رام کہانی سننے کے بعد بولے تھے

" رشیدان سب کو خوش کردینا۔۔۔" چوہدری صاحب نے ایک بار پھر رشید کی طرف متوجہ ہو کر کہا

" جی سائیں جو حکم آپکا۔۔۔"

" کام کرو گے میرے لیئے ۔۔۔؟" چوہدری صاحب نے اگلا سوال سلطان نے سے کیا

" جی صاحب۔۔۔میں کام کرنے اور کچھ بننے کیلئے ہی کراچی آیا ہوں ۔۔" پہلے اسے اپنے بھولپن میں اندازہ ہی نا ہوا کہ چوہدری صاحب کس کام کا بول رہے ہیں

" کام کا مطلب سمجھتے ہو نو جوان ۔۔۔؟"

" جی صاحب جس طرح کا

بھی کام ہو گا میں تیار ہوں" سلطان نے ایک عزم سے جواب دیا

" ایک آخری بار پھر سوچ لے پتر ۔۔۔ ابھی تم بچے ہو ۔نا سمجھ ہو ۔بڑے بڑوں کا بھی تیل نکل جاتا ہے یہاں ۔پلٹنا ہے تو کودنے سے پہلے پلٹ جاؤ ۔بعد میں ناوقت تمہیں مہلت دے گا اور نا پھر میں ۔۔۔"

چوہدری صاحب عجیب سی پہیلیاں بجھوا رہے تھے

" مجھے اب کبھی نہیں پلٹنا صاحب ۔میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر صرف آگے بڑھنے کے خیال سے نکلا ہوں ۔اب راستہ چاہے جتنا بھی کٹھن ہو یا جس طرح کا بھی راستہ اپناؤں مجھے صرف اپنی منزل پر پہنچنا مقصود ھے ۔اور آپ نے بغیر کسی رشتے کے مجھ انجان پر احسان کیا ہے ۔تو میں بھی اب آپ کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا ۔میں ہر کام کیلئے تیار ہوں" سلطان نے اس بار بااعتماد لہجے میں چوہدری صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا

" سلطان ۔۔۔ یہ احسان کی بات مت کرو ۔کیونکہ تم میرے آدمیوں کے ساتھ اندر ہوئے بغیر کسی قصور کے ۔اس لیئے میں نے تمہیں چھڑوا کر کوئی بھی احسان نہیں کیا ۔

دوسرا میں تمہیں سمجھا دوں کیونکہ تم نوجوان ہو گرم خون ہے ۔میرا ساتھ کام کرنے سے مراد کوئی اور طرح کا کام نہیں ہے بلکہ میرے دھندے میں شامل ہونا ہے ۔دھندا سمجھتا ہو گے نا ۔۔"

" چوہدری صاحب بے فکر رہیئے ۔کام جو بھی جیسا بھی ہو سلطان کبھی پیچھے نہیں ہٹے گا ۔وعدہ رہا آپ سے ۔۔۔" وہ پہلی ملاقات میں ہی چوہدری صاحب کی طبیعت جان گیا تھا کہ ایسے لوگ بہت اونچی پہنچ والے ہوتے ہیں ۔بڑے بڑے تعلقات رکھنے والے ۔اور یہی کچھ تو وہ چاہتا تھا ۔جلد سے جلد کچھ بننے کا خواب لے کر تو آیا تھا وہ ۔جلد سے جلد بہت زیادہ پیسہ بنانے کا خواب ۔

" رشید ۔۔لڑکے میں دم تو ہے ۔ابھی تھکا ہوا ہے ۔آرام دے کر اسے کام سمجھا دینا ۔۔" چوہدری صاحب سلطان نے سے متاثر ہو کر رشید کو حکم دیا

سلطان کو سونے کیلئے آرام دہ بستر اور پرسکون کمرہ دے دیا گیا۔اس اگلے پورے ایک ہفتے میں اسے کسی نے بھی کسی قسم کا کام کرنے کا نا کہا۔مگر اس ایک ہفتے میں وہ یہ جان چکا تھا کہ جلسے میں ہونے والے دنگے چوہدری صاحب نے خود اپنے خاص آدمیوں کی مدد سے ہی کروائے تھے۔اسے آہستہ آہستہ چوہدری صاحب کی چوہدراہٹ کی سمجھ آنے لگی تھی

☆......☆......☆

وقت کا کام گزرنا ہے۔یہ گزرتا ہی چلا جاتا ہے بغیر رکے،بغیر تھکے ہمیشہ ایک ہی مخصوص رفتار سے ۔بھلے سے کوئی شاہ زور یا کوئی بڑے سے بڑا سپہ سالار وقت کے راستے میں آ کر اسے روکنے کی کوشش کرے مگر یہ رکنا تو در کنار اپنی رفتار میں ہلکی سی کمی بھی نہیں لاتا۔ہاں مگر وقت کو روکنے والے وقت کی۔آندھیوں اور دھول میں گم ضرور ہو جاتے ہیں۔

بستی شاہ والی میں سب کچھ ویسا ہی تھا۔وہی زندگی تھی وہی صبح شام،وہی دریا اپنی روانی سے بہہ رہا تھا۔مگر اگلے چار مہینوں میں ملوکھاں اور نوری کی زندگی نے بہت پلٹا کھایا۔

یہ چار ماہ ملوکھاں کی زندگی کے مشکل ترین دن تھے۔سلطان سے دوری اسے پل پل مارنے کیلئے کافی تھی۔وہ دن بدن کمزور سے کمزور تر ہونے لگی۔اماں کو اسکی صحت کی بہت فکر رہنے لگی تھی۔اوپر سے ملوکھاں کے پیٹ میں پلتا بچہ۔اسے خوشی درکار تھی،آرام درکار تھا،خوش خوراکی کی اشد ضرورت تھی مگر سلطان کے بغیر اس کے حلق سے لقمہ کہاں اترتا تھا۔وہ دن بدن سوکھ کر کانٹا ہونے لگی۔ماں کے ہزار سمجھانے اور خیال رکھنے باوجود بھی اس کی صحت میں کچھ افاقہ نا ہوا۔

اور آخر وہ دن بھی آن پہنچا جب ملوکھاں نے اپنے بیٹے کو جنم دیا مگر زچگی میں ہونے والی پیچیدگیوں اور کمزوری صحت کی بنا پر وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔سلطان کی ملوکھاں نے اس کے پیچھے جان دے دی۔مگر سلطان کو خبر تک نا تھی۔وہ زمانہ فون کا نہیں تھا اور نا ہی سلطان گھر والوں کو بتا کر گیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے سوائے ملوکھاں اور کلی کے کوئی یہ بات نہیں جانتا تھا کہ سلطان کراچی گیا تھا۔ملوکھاں تو اپنی جان ہار چکی تھی اور کلی کو صرف اتنا معلوم تھا کہ سلطان کراچی گیا مگر وہ کراچی کے کس علاقے یا کس

جگہ کام کر رہا ہے۔؟ یہ اس کے فرشتوں تک کو بھی معلوم نہیں تھا۔سو چٹھی بغیر ایڈریس کے بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔جوان جہان ملوکھاں کی موت پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔دین محمد اور بختاور بھی ساری رنجشیں بھلا کر اس دن اقبال کمہار کے گھر ملوکھاں کے آخری دیدار کیلئے آئے۔اور اپنی ان چاہی بہو کو دین محمد نے اپنے بیٹے کی غیر موجودگی میں قبر میں اتارا تو وہ خود پر قابو نا پاسکے۔اور وہیں پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔زندگی بھی اک عجب پہیلی ہے کیسے کیسے موڑ لاتی ہے انسانی زندگی میں۔انسان بس اپنے ہاتھ ہی ملتا رہ جاتا ہے۔ہاتھ میں آتا کچھ بھی نہیں۔

کیا عجیب اتفاق تھا کہ دین محمد اور بختاور جو رنجش کے باعث اپنی بہو کی شکل تک نا دیکھنے کا خود سے عہد کر چکے تھے ان کو بہو کو دیکھنا تب نصیب ہوا جب اس کا آخری منہ دیکھا جا رہا تھا۔دونوں میاں بیوی کا پہلا دیدار ہی آخری ثابت ہوا تھا۔

یہ نوری کی عدت کے آخری چند دن چل رہے تھے وہ گھر سے باہر قدم نا نکال سکتی تھی۔مگر اس کا دل کس طرح خون کے آنسوؤں رو رہا تھا یہ صرف وہی جانتی تھی۔ابھی دو تین ماہ پہلے کی نوری سے ملاقات ابھی اسکی آنکھوں میں رکی ہوئی تھی اور آج وہ ان سب کو چھوڑ کر اپنے اگلے سفر پر روانہ بھی ہوگئی۔وہ بھی اپنے محبوب سلطان کے بغیر۔۔۔

نوری بے یقین تھی۔کبھی کبھی مرنے والا انسان اپنی موت سے پہلے کوئی ایسی بات کہہ جاتا ہے کوئی ایسا اشارہ دے جاتا ہے جو ہم فی الوقت سمجھ ہی نہیں پاتے۔بعد میں کف افسوس ملتے رہتے ہیں اور پھر اس کی باتوں کو یاد کر کے آنسوؤں بہاتے رہنے کے سوا ہمارے پاس کوئی دوسرا چارہ نہیں ہوتا۔نوری کو بھی اچھی طرح یاد تھا ملوکھاں سے اس کی پہلی اور آخری ملاقات اس کی دل پر لفظ بالفظ نقش تھی۔اور جب اس نے ملوکھاں کو اس حالت میں اتنا پیدل سفر کرنے پر سرزنش کی تھی اور اپنی صحت کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی تو ملوکھاں نے جو جواب دیا تھا وہ اسے ابھی تک یاد تھا۔"ہاں میں جانتی ہوں اس حالت میں سفر کرنا مناسب نہیں۔اماں نے بھی بہت روکا مگر میں اپنے آپ کو تمہاری طرف آنے سے روک ہی نا سکی۔کیا معلوم زندگی پھر کبھی ایسا موقع دے یا نا۔۔۔"ملوکھاں کے لفظ اسے یاد آنے لگے

۔آنکھیں گیلی ہونے لگیں۔واقعی انہیں زندگی نے دوسری ملاقات کا موقع دیا ہی نہیں تھا
انسان کی اوقات یہی کچھ ہے۔
قدرت کا صرف ایک ہلکا سا اشارہ اس کا تعلق اس دنیا سے قطع کرنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔
اور وہ قبر کے اندھیروں میں منوں مٹی تلے جا سوتا ہے۔جہاں سے پھر کبھی کوئی اس دنیا کی رونقوں کی طرف واپس نہیں آیا۔
نوری کے بس میں نہیں تھا کہ وہ اڑ کر ملوکھاں کا آخری منہ دیکھنے پہنچ جائے۔مگر کچھ بندشوں کی وجہ سے مجبور تھی نا جا سکی۔اس کے دل کی حسرت دل میں کہیں دب کر ملوکھاں کے ساتھ ہی مرگئی۔
نوری کی عدت ختم ہوئی تو دو ماہ بعد ہی رمضان زمیندار کی طرف سے اس کیلئے رشتہ آگیا۔رمضان گاؤں میں زمیندار مشہور تھا اس کی اپنی اچھی خاصی زمین تھی ہر سال اپنی گندم، کپاس، چاول، چنے اور گنے کی فصلیں اگاتا۔اپنے مال مویشی تھے۔تین سال پہلے پہلی بیوی فوت ہوگئی اولاد تھی ہی نہیں تو زندگی میں ایک خالی پن سا در آیا تھا۔اس خالی پن کو دور کرنے کیلئے اس نے نوری کیلئے اپنا رشتہ بھجوایا۔وہ نوری سے عمر میں خاصا بڑا تھا مگر شریف تھا کھاتے پیتے لوگ تھے۔زمیندار تھے۔نوری کے ابا کو اور کیا چاہیے تھا اس کی تو خدا نے سن لی تھی۔بھاگے بھاگے دین محمد کو لے کر نوری کے پاس آپہنچے۔جانتے تھے نوری ایسے آسانی سے کبھی نا مانے گی۔
"نہیں بابا مجھے اب کبھی شادی نہیں کرنی۔۔۔مجھے اب ہمیشہ آپ کے ساتھ اسی گھر میں رہنا ہے"۔
نوری نے باپ کے بار بار اسرار پر سنجیدگی سے
جواب دیتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔
"اور جب میں مر جاؤں گا تب کس کے ساتھ رہو گی نوری، بتاؤ پھر کس کے سہارے گزارو گی یہ زندگی۔۔۔"ابا ایموشنل ہو چکے تھے۔جذبات میں آنکھیں گیلی ہونے لگی تھیں
"اللہ نا کرے ابا۔۔آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔؟ نوری کا سچ مچ میں دل دہل گیا تھا
"بیٹا انسان کا کچھ بھروسہ نہیں، سانسوں کی کچی ڈور کب ٹوٹ جائے پتا ہی نہیں چلتا۔ہم آج ہیں

کل نہیں ہوں گے۔۔۔اگر تجھے اسی طرح بے سہارا چھوڑ کر چلا گیا تو مجھے کسی کروٹ چین نہیں پڑے گا۔"
"نہیں ابا اللہ نا کرے آپ کو کچھ بھی ہو۔لیکن میں اب دوبارہ شادی نہیں کر سکتی۔"
"نور پتر۔۔۔ایسے زندگی نہیں گزرتی۔تم سمجھدار ہو پھر میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی۔اور لازم نہیں ہوتا کہ جو تجربہ ایک بار ہو چکا ہو اسے پھر کبھی نا دہرایا جائے۔"
"بابا میں کیسے خود کو تیار کروں۔میرا دل اب ان چیزوں سے اٹھ چکا ہے۔میرا دل مانتا ہی نہیں ہے اب دوسری شادی کیلئے۔۔"وہ بضد تھی
"بیٹا میں تمہاری حالت سے واقف ہوں تمہارا دکھ بڑا ہے۔پتر زمیندار صاحب بھلے انسان ہیں۔عزت دار ہیں عزت و قدر کرنے والے ہیں۔تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے خدا نے تمہارے زخموں کیلئے مرہم بھیجا ہے۔تم بہت خوش رہو گی وہاں۔اس طرح اتنے اچھے رشتے نصیب والوں کے آتے ہیں تم بہت خوش نصیب ہو نور پتر۔۔" ابا اسے قائل کرتے رہے۔وہ خاموش ہو گئی کمزور پڑنے لگی۔ان کی دلیلیں ٹھوس تھیں۔اور نوری کے پاس کوئی مضبوط جواز ہی نہیں تھا
"ہاں نوری۔۔۔تیرے ابا صحیح بول رہے ہیں۔دل میں آس تھی کہ میری بھانجی ہمیشہ میرے گھر کے آنگن میں رہے۔لیکن وہ ناخلف ایسا نہیں چاہتا تھا۔اور شاید قدرت کو بھی یہی منظور ہو گا۔تو ہاں بول دے پتر۔اسی میں ہم سب کی خوشی ہے۔" اس بار دین محمد اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے قائل کر رہے تھے
اور پھر نوری نے روتے ہوئے ہار مان لی تھی۔کیا کرتی بوڑھے باپ کی گیلی آنکھیں اور بھیگا لہجہ اس کا دل چیرنے لگا تھا۔ایک بیٹی کہاں برداشت کر پاتی ہے کہ اس کا بوڑھا باپ اسی کے سامنے اسی کی وجہ سے روئے۔۔۔؟اور وہ اپنی بے جا ضد پر اڑی رہے۔اس نے بھی ہر فرمانبردار بیٹی کی طرح سر جھکا دیا
نوری نے بھی سر اثبات میں ہلا دیا۔نوری کے بابا کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے مگر اب کی بار خوشی کے۔اور دین محمد کے آنسو غم کے تھے یا خوشی کے وہ سمجھنے کرنے میں ناکام رہا۔وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ نوری کے اقرار کرتے ہی وہ پھوٹ کر رو دیا تھا۔
اس بار شادی دھوم دھام سے نہیں ہوئی تھی۔سادہ سی نکاح کی تقریب رکھ کر اس کے سارے

حقوق رمضان زمیندار کے نام کر دیئے گئے۔اپنی زندگی کے دوسرے حجلہ عروسی میں بیٹھی نوری خود کو سوچ رہی تھی،اپنی آنے والی زندگی کو سوچ رہی تھی۔

اس بار اسے پہلی بار کی طرح اتنا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔رمضان خان جسے سب زمیندار صاحب بلاتے تھے جلد ہی تشریف لے آئے۔

"مجھے آپ کی پہلی شادی یا پچھلی زندگی سے کچھ غرض نہیں ہے۔میں بھی ایک شادی پہلے کر چکا ہوں آپ کو علم ضرور ہوگا۔اب دوبارہ شادی کا واحد مقصد صرف دلی سکون اور زندگی کی بے ترتیبی کو ختم کر کے ایک ترتیب میں لانا ہے۔خدا نے کبھی کسی چیز کی کمی نہی دی۔دھن دولت،زمین مال سب کچھ دیا ہے خدا نے۔میری صرف ایک ہی خواہش ہے کہ یہ اب آپ کا گھر ہے اسے آپ دل سے سنواریں۔گھر کو ہمیشہ عورت ہی سنوارتی ہے اور عورت ہی بگاڑ لاتی ہے۔مجھے امید ہے آپ میری خواہش کا احترام کریں گی۔

باقی میری طرف سے آپ کو کبھی کسی قسم کا رنج نہیں پہنچے گا۔کوشش کروں گا کہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھ سکوں۔"

رسمی باتوں کے بعد زمیندار صاحب نے تفصیل سے بات کی تو نوری نے پہلی ہی رات ان کے من کی سچائی کو پہچان لیا تھا۔

"ہم بھی پوری کوشش کریں گے زمیندار صاحب کہ میری وجہ سے آپ کے دل کو کبھی کوئی رنج نا پہنچے۔آپ میرے سرتاج ہیں میں ہمیشہ ہر قدم پر آپ کا ساتھ دوں گی۔کبھی میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں دیکھیں گے آپ۔۔۔"

اسی رات نوری نے خود سے عزم کیا تھا کہ اب وہ کبھی سلطان کو یا اپنی گزری زندگی کو یاد کر کے اپنے آنسوؤں نہیں گرائے گی۔

انسان کے آنسوؤں واقعی ہی اتنے قیمتی ہوتے ہیں کہ انہیں کسی ناقدرے شخص کی خاطر آنکھوں جیسے خوبصورت اور کانچ سے زیادہ نازک محل سے دربدر کرنا ان آنسوؤں کی توہین ہوتی ہے۔اور ہم انسان

مسلسل کسی بے قدرے شخص کیلئے اپنے قیمتی موتی گراتے چلے جاتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ وہ شخص اس قابل ہی نہیں کہ اس کیلئے آنسوؤں ضائع کیئے جائیں

☆......☆......☆

اونچے ستونوں پر اٹھائے گئے اس محل نما ڈیرے میں گھومتے ہوئے سلطان دل ہی دل میں اس کو تعمیر کرنے والے ماہر ہاتھوں کی کاریگری کو داد دے رہا تھا

اونچی اونچی دیواروں کو نیلے آسمانی رنگ کے بیل بوٹوں سے منقش کیا گیا تھا۔مغلیہ طرز پر بنا ہوا یہ ڈیرہ اپنے اندر واقعی چوہدری صاحب جیسی ہی شان وشوکت سموئے ہوئے تھا۔جانے کتنا پیسہ بہا کر چوہدری صاحب نے اسے تعمیر کروایا تھا۔ڈیرے کے احاطے میں ایک طرف بڑے بڑے شیشم کے درخت لگے ہوئے تھے ۔دوسری جانب زیب و آرائش سے مزین کمروں کی ایک لمبی لائن تھی جو اکثر و بیشتر ہی دور و نزدیک کے مہمانوں سے بھرے رہتے ۔چوہدری صاحب کے تعلقات بہت دور دور تک تھے اور کراچی کے بڑے بڑے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔کمروں کی لمبی لائن کے آگے کمروں سے ملحق بڑا سا برآمدہ تھا جس کے وسط میں ایک بڑا سا گول قیمتی شیشے کے کام سے مزین فانوس لٹکا رہا تھا۔رات کو ہر روز جب فانوس جلایا جاتا تو بہت خوبصورت سماں بندھ جاتا جو ڈیرے کی آرائش میں مزید اضافہ کرتا

چوہدری صاحب کے بارے میں اسے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ واقعی پہنچی ہوئی ہستی ہیں ۔کہیں بھی دنگے فساد کروانے ہوں تو کراچی کے بڑے بڑے بزنس پرسنز اور سیاسی لیڈر انہی کے ڈیرے پر ہی حاضری دیتے ۔کسی کو آگے پیچھے کرنا یا کسی کو راستے سے ہٹوانا چوہدری صاحب کے بائیں ہاتھ کا کام تھا ۔پولیس میں ان کے اثر ورسوخ بھی بہت زیادہ تھے سلطان نے کئی باروردی والوں کو چوہدری صاحب کے ہاتھ چومتے دیکھا تھا

”چوہدری صاحب بہت کم لوگوں پر اعتبار کرتے ہیں سلطان ۔مگر یہ میری زندگی کا پہلا موقع ہے کہ میں نے چوہدری صاحب کو بغیر چھان بین کروائے تم پر پہلی نظر پڑتے ہی کام پر رکھنے کا حکم دیتے دیکھا ہے۔“تھوڑی دیر بعد ڈیرے کا راؤنڈ مکمل کر کے وہ باہر لان میں پہنچا تو رشید نے اس سے کہا جو باہر

لگی کرسیوں میں سے ایک پر براجمان تھا۔وہ بھی ساتھ پڑی ایک کرسی پر آبیٹھا
یہی ایک آدمی تھا رشید جو اسی دن سے دل میں سلطان کیلئے پرخاش پالے ہوئے تھا جس دن سے چوہدری صاحب نے سلطان کو رشید کا اسسٹنٹ مقرر کیا تھا۔رشید کو سلطان کی پہلی ہی جست میں اتنی بڑی کامیابی ہضم نا ہوتی تھی اس لیئے وہ اکثر و بیشتر سلطان پر اپنا رعب قائم رکھنے کیلئے طنز کے نشتر چھوڑتا ہی رہتا تھا۔سلطان نے بھی کچھ دن خاموشی اختیار کیئے رکھی مگر رشید اپنی عادت سے بعض نا آیا تو اس نے بھی رشید کو پلٹ کر جواب دینے شروع کر دیئے تھے
"جوہری کو ہیرے کی پرکھ پہلی نظر میں ہی ہو جاتی ہے۔اس لیئے تمہاری حیرانی بیکار ہے" سلطان نے اس ماحول میں آتے ہی اپنے پر کھولنا شروع کر دیئے
"آرام سے آرام سے۔۔ٹھنڈا کر کے کھاؤ گے تو منہ نہیں جلے گا۔جوان اور گرم خون ہے تمہارا۔اس دھندے کے پیچ خم سمجھنے میں وقت لگے گا تمہیں۔ابھی سے اتنا اونچا اڑو گے تو پر تھک جائیں تمہارے۔۔۔پھر اتنی ہی بلندی سے نیچے گرو گے کہیں گہرائیوں میں۔جہاں سے پھر بندے کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔" رشید نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے طنزیہ انداز میں سمجھایا
"اگر پرواز بھرنی ہی ہے تو پھر گرنے اور تھکنے کا کیا سوال۔۔۔؟ جو اپنا نشانہ اونچائیوں کو بناتے ہیں وہ گہرائیوں سے کبھی نہیں ڈرتے رشید میاں۔۔" وہ بھی سلطان تھا۔اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والا
"یہاں میں سالوں سے کام کر رہا ہوں۔۔۔اس کام میں ہر قدم پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔چوہدری صاحب نے تمہیں میرا اسسٹنٹ رکھنے کا کہا ہے۔یاد رکھنا اسسٹنٹ کا مطلب نائب ہوتا ہے۔یعنی میرے آرڈر کے مطابق چلنا ہے۔یعنی مجھ سے ایک قدم پیچھے چلنا ہے۔میرے برابر یا مجھ سے آگے بالکل قدم نہیں رکھنا۔۔" رشید نے اس پر اپنی اہمیت واضح کرنا چاہی
"جی جانتا ہوں میں اچھی طرح سے۔۔۔مجھے آپ سے یا کسی اور مقابلے کا کوئی شوق بھی نہیں ہے۔میں صرف اپنا کام ایمانداری سے کرنا جانتا ہوں۔۔" سلطان نے اسے مطمئن کیا
"دھیان رکھنا کبھی کبھی زیادہ ایمانداری بھی گلے پڑ جاتی ہے کسی کے۔۔" رشید نے اس بار اونچا

قہقہہ لگاتے ہوئے مذاق کیا

رشید کا کام باہر سے آنے والے اسلحے کی نگرانی کرنا، اسے چیک کروانا، اور اسے سنبھالنا تھا۔استعمال ہونے والا سارا اسلحہ اور ہتھیار رشید کی پرمیشن سے جاتا۔سلطان کو چند ہی دنوں میں اندازہ ہوگیا کہ چوہدری صاحب کی چوہدراہٹ صرف اس ڈیرے تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ تو صرف دنیا کی نظروں سے اپنے کالے کرتوت چھپانے کیلئے بظاہر ایک پردے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے یہ خوبصورت ڈیرہ چوہدری صاحب کے بھیانک چہرے کو چھپانے کیلئے ایک نقاب کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔اصل اڈے تو کوئی اور تھے جہاں پر رات کی تاریکی میں اسلحہ آتا، اور یہاں سے آگے بھی سپلائی ہوتا۔سلطان کو ابھی اس بات کا علم نہیں ہوسکا تھا کہ یہ اسلحہ آتا کہاں سے آتا ہے باہر ملک سے یا اپنے ہی ملک کے کچھ پیراسائٹ نما انسانوں سے۔۔۔؟ وہ لوگ بس ان خفیہ اڈوں تک ہی محدود رہتے۔اس نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ چوہدری صاحب دہری شخصیت کے مالک تھے۔کچھ لوگ ہوتے ہیں نا ایک سے زیادہ چہروں والے۔جنہیں انسان ایک نشست میں کبھی سمجھ ہی نہیں سکتا۔چوہدری صاحب بھی انہیں انسانوں میں سے ایک تھے۔ایک طرف اتنے خفیہ اڈے چلا رہے تھے۔اسلحے جیسا غیر قانونی کام کر رہے تھے تو دوسری طرف خدا ترس بھی واقع ہوئے تھے۔اپنے ملازموں کا ان کی ضروریات کا خاص خیال رکھتے۔گاہے بگاہے غرباء کو امداد بھی بھجوا دیتے مساجد میں خیرات کی رقم بھی بھجواتے رہتے۔عجیب سے انسان تھے۔خدا جانے ان میں اچھائی زیادہ تھی یا برائی سلطان کبھی سمجھ ہی نہیں پایا

دن گزرنے لگے اور سلطان اس کالے دھندے میں اپنے ہاتھ کالے کرتا رہا۔کبھی کبھی اس کا ضمیر اسے جھنجھوڑتا اسے خیال آتا کہ اس نے پیسہ کمانے کیلئے غلط راستے کا انتخاب کرلیا ہے۔مگر دوسرے پل وہ یہ سوچ کر خود کو تسلی دیتا وہ جان بوجھ کر اس دلدل میں تو نہیں آیا۔زندگی خود اس کی انگلی پکڑ کر اسے اس اڈے تک لے آئی ہے۔زندگی خود اسے اس راستے پر چلانا چاہتی ہے۔اور دوسرا یہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کا سب سے آسان اور مختصر راستہ ہے۔کچھ عرصہ تک پیسہ اکٹھا کرنے کے بعد وہ گاؤں واپس چلا جائے گا چھوڑ دے گا یہ سب۔۔۔

مگر ہم انسان بھول بیٹھتے ہیں کہ اگر کبھی زندگی نے ہمارے قدموں کو غلط راستے کی جانب موڑ دیا ہو تو اس راستے پر چلنے سے روکنے کیلئے اللہ نے انسان کا ضمیر بھی بنایا ہے۔ جو ہر اس وقت ہمارے اندر سے چیخنے لگتا ہے، ہمیں وارن کرتا ہے، ہمیں روکتا ہے جب جب ہم غلط راستے پر قدم رکھنے لگتے ہیں۔

لیکن ضمیر صرف خبردار کرتا ہے۔ یہ آگے انسان پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ ضمیر کی چیخوں پر کان دھرے یا پھر دولت کی روئی کان میں ٹھونس کر اپنے کان ہی بند کر لے۔۔۔ اور جب انسان دولت کی روئی کانوں میں ٹھونس لے یا آنکھوں پر لالچ کی پٹی باندھ لے پھر اسے ضمیر گلا پھاڑ کر چیخ چیخ کر روکے تب بھی اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بھلے اس کا ضمیر اس کے منہ پر طمانچے ہی کیوں نا مارتا رہے

اور سلطان کو جب اس کے ضمیر نے وارن کیا تو اس نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا اپنے کان بند کر لیئے۔ دولت کی پٹی آنکھ پر باندھ لی۔ اور جب لالچ اور دولت کی پٹی آنکھوں پر آجائے تو صرف اندھیرا چھا جاتا ہے اور انسان اندھیروں میں ہی دھنستا چلا جاتا ہے پھر آہستہ آہستہ اسے سیدھا اور روشن راستہ دکھائی دینا بند ہونے لگتا ہے چاہے وہ بعد میں آنکھوں سے پٹی اتار بھی لے تب بھی وہ دلدل میں اتنا دھنس چکا ہوتا ہے کہ وہ چاہ کر بھی خود کو اس دلدل سے آزاد نہیں کر پاتا۔۔۔ پھر کبھی اس دلدل سے نکل نہیں پاتا

☆......☆......☆

"اپنی آنکھیں بند کرو ذرا۔۔" زمینوں پر اسی بیری کے درخت تلے بیٹھے خوشی نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالتے ہوئے پر جوش لہجے میں جنت سے کہا

"وہ کیوں بھلا۔۔ کوئی خاص بات۔۔۔؟"

"جنت۔۔ زندگی میں اہمیت صرف خاص یا عام کی نہیں ہوتی۔ اہمیت احساس کی ہوتی ہے۔"

خوشی کا ہاتھ وہیں جیب میں ہی رہ گیا

"واہ واہ۔۔۔ بڑی سیانی باتیں کرنے لگے ہو۔ کس سے سیکھ لی" جنت حیران ہوئی

"نانی کہتی ہیں زندگی سب سے بڑی استاد ہوتی ہے۔ یہ انسان کو وہ سبق بھی سکھا دیتی ہے جو انسان کسی سکول میں بھی نہیں سیکھ سکتا۔۔ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے استاد سے بھی نہیں" خوشی نے

اپنے تصور میں نانی کا بوڑھا پر نور چہرہ سموتے ہوئے کہا

"اچھا۔۔۔ زرا بتاؤ تو کیسے سبق۔۔۔؟" جنت آج مذاق میں کے موڈ میں تھی

"پتا نہیں یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ زندگی کونسے سبق دیتی ہے" اسے اپنے بھولپن کا احساس ہوا

"اچھا ان باتوں کو چھوڑو۔۔۔ تم بتاؤ اگر کبھی زندگی نے تمہارے سامنے میرا مقابل لا کھڑا کیا تو۔۔۔" وہ دوبارہ اسی پہلے سوال پر واپس آ گیا

"تو یہ تو اس" دوسرے آپشن" پر منحصر ہے۔ اگر تم سے بہتر ہوا تو میں اسی کا انتخاب بھی کر سکتی ہوں۔۔۔" جنت نے سنجیدہ لہجے میں پھر مذاق کیا

"سچ میں۔۔۔؟" خوشی حیران ہوا۔ اسے جنت سے ایسی کوئی امید نہیں تھی

"ہاں تو اور کیا۔۔۔"

"آخر زمیندار صاحب کی بیٹی ہو نا۔ خسارے کی طرف تو نہیں جاؤ گی کبھی" خوشی کا دل ٹوٹا تو دوسری طرف رخ کر کے بولا

"خوشی۔۔۔ ابا کو کیوں بیچ میں لا رہے ہو ایسی باتوں میں۔ مذاق کر رہی تھی میں۔ اور خسارے کی طرف تو کوئی بھی نہیں جاتا۔ تو صرف میرے ابا کیوں"

"کچھ مذاق دل بھی توڑ دیتے ہیں۔۔۔ کسی کا دل توڑنے والے مذاق کرنے ہی نہیں چاہیئں۔" وہ ابھی بھی روٹھا ہوا تھا

"تو مجھے دل جوڑنے کا ہنر بھی آتا ہے۔ اور میں تمہارے سوا کسی اور سے مذاق کرتی بھی نہیں ہوں۔ معلوم ہونا چاہیے تمہیں۔" جنت کھلکھلا کر ہنس دی

خوشی اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا

"جنت۔۔۔ مجھے سچ میں ایسا لگتا ہے کہ کبھی کوئی ہم دونوں کے بیچ میں آ جائے گا۔" خوشی کے لہجے اداسی شامل تھی

"ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ اچھا سوچو گے تو ہمیشہ اچھا ہی ہو گا۔۔ دل میں وہم پالتے رہو گے تو پھر

ایسے ہی خیالات آئیں گے۔۔۔تم خود ہی یہ بات مجھے سمجھاتے تھے اور آج خود ایسے وہم پال رہے ہو" وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی

"اگر کبھی کوئی ہمارے بیچ میں آگیا تو۔۔۔؟ خوشی کی سوئی اسی ایک بات پر اٹک چکی تھی

"تو میں اسے دو تھپڑ مار کر واپس بھیج دوں گی۔۔۔" جنت ایک بار پھر زوردار کھلکھلا کر ہنسی

"تمہیں ابھی تک مذاق سوجھ رہا ہے۔۔۔؟ میں سیریس بات پوچھ رہا ہوں۔۔"

"ہاں تو اور کیا۔جب ایسا ہوگا ہی نہیں۔ایسا موقع کبھی آئے گا بھی نہیں تو ان کے بارے ایسا کیوں سوچا جائے۔؟"

سلطان کا خدشہ ویسے کا ویسا ہی رہ گیا

"جنت۔۔۔یہ میں تمہارے لیئے لونگ لایا ہوں۔آج سے اسے تم پہنا کرو۔مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔" خوشی نے جیب سے ہاتھ نکال کر ہتھیلی اس کے سامنے پھیلائی

"ارے واہ۔۔۔لونگ تو مجھے خود کو بھی بہت پسند ہے۔" جنت نے مسکراتے ہوئے اس کی ہتھیلی پر سے لونگ اٹھالی

اور اسی وقت وہ لونگ پہن لی

"کیسی لگ رہی ہے۔۔۔خوشی؟" اس نے خوشی کی آنکھوں میں جھانک کر آئینہ دیکھنے کی کوشش کی

"اتنی پیاری کہ جیسے یہ بنائی ہی تمہارے لیئے گئی تھی۔جیسے سالوں سے پڑی تمہارے انتظار میں تھی کہ کب جنت مجھے پہنے گی اور میرے بنانے کا مقصد پورا ہوگا اور میں اپنی قسمت پر رشک کروں گی۔۔۔"

"اچھا بس۔۔۔اتنا مکھن لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہے اب۔۔۔سیریس ہو کے بتاؤ نا کیسی لگ رہی ہے۔۔۔؟

میں نے سچ ہی تو بتایا تھا۔۔۔اس لونگ سے خود پوچھ لو بھلے۔۔۔خود کہے گی میں بہت پیاری لگ رہی ہوں۔۔۔"

"ہاں جیسے یہ تو ابھی فر فر بولنے لگ جائے گی نا۔"

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چلا تھا تو جو دونوں کو روح تک سرشار کر گیا

وہ دونوں بڑے ہو رہے تھے۔ باتیں بھی بڑی کرنے لگے تھے۔ اور ان کے ساتھ ساتھ انکی محبت بھی قد نکالنے لگی۔ بڑی ہونے لگی۔ گو کہ محبت کو ھمیشہ سے اقرار کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر ان دونوں کی محبت کو ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں پڑی۔ وہ احساس کی زبان بولتے تھے۔ احساس سمجھتے تھے۔ اور محبت کے اقرار کیلیئے الفاظ سے زیادہ قیمتی احساس ہوتا ہے

☆......☆......☆

نوری زمیندار کے ساتھ خوش تھی یا نہیں مگر اس نے اپنی خوش رہنے کی اداکاری سے سب کو متاثر کر لیا تھا۔ کہیں سے بھی نوری نے ایک پل کیلئے یہ ظاہر نا ہونے دیا کہ اسے سلطان نے جو طلاق کا گھاؤ دیا ہے وہ زخم ابھی تک بھرا نہیں تھا۔ ایسے زخم کبھی بھر ہی نہیں سکتے۔ اور نا ہی نوری نے اپنی آنکھوں پر جو سلطان کیلئے کبھی آنسوؤں نا بہانے کی پابندی لگا رکھی تھی اس سے پیچھے ہٹی۔

زمیندار صاحب اچھے انسان ثابت ہوئے تھے۔ وہ نوری سے عمر میں بڑے سہی مگر انہوں نے نوری کو خوش رکھنے کی ہمیشہ پوری کوشش کی اور اس کوشش میں کامیاب بھی رہے جو وعدہ انہوں نے نوری سے سہاگ رات میں کیا تھا اس پر عمل کر کے بھی دکھایا تھا۔ ہم راہی اگر ہم خیال اور ہم مزاج مل جائے تو سفر بہت جلد کٹ جاتا ہے۔ ان دونوں کا سفر بھی ہواؤں کے گھوڑے پر اڑتے ہوئے کٹنے لگا۔ دن مہینوں میں اور مہینے سال میں کب تبدیل ہوئے پتا ہی نہیں چلا۔

نوری امید سے ہوئی تو زمیندار صاحب کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

"نور مجھے بیٹی کی بہت زیادہ خواہش ہے۔ مجھے اللہ نے بہت عرصہ اولاد سے محروم رکھا ہے تم جانتی ہی نہیں میں کتنا خوش ہوں۔" خوشی سے زمیندار صاحب کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے

"آپ کو بیٹی کی خواہش ہے؟"

"ہاں نور بانو۔ مجھے تم جیسی ہی ایک بیٹی کی خواہش ہے۔ بہت زیادہ خواہش ہے۔ ہمیں اللہ

نے بیٹی دی تو ہم مل کے اسکی بہت اچھی تربیت کریں گے اس کی انگلی پکڑ کر کھیتوں میں لے جائیں گے پیپل کے درخت تلے اس کے لیئے جھولا بنائیں گے اس کے ساتھ مل کے کھیلیں گے۔بڑی ہو گی تو اسے سکول بھیجیں گے۔کچھ اور بڑی ہو گی تو اس کے لیئے جہیز اکٹھا کریں گے۔اس کا اچھے سے لڑکے سے رشتہ کریں گے جو ہمیشہ ہماری بیٹی کا خیال رکھے پھر اس کے ساتھ بیاہ دیں گے" زمیندار صاحب ایک ہی سانس میں شادی تک بھی جا پہنچے

"ارے بس بس بس۔۔۔آپ نے تو ایک ہی سانس میں اسکی شادی بھی کروادی" نور بانو حیرت سے مسکرانے لگی

"کیا کریں بیٹیاں ہوتی ہی پرائی امانت ہیں۔ورنہ کون پتھر دل اپنا کلیجے کا ٹکڑا یوں کسی کے حوالے کرتا۔۔؟

بس شریعت ہے،خدا کا حکم ہے ہر حال میں ماننا ہے۔اسی میں اجر ہے۔"

وہ بولنے پہ آئے تو نور بانو ان کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

"اور اگر بیٹا ہوا تو۔۔۔؟" نوری نے دوسرا آپشن سامنے کیا

"تو بھی بہت خوشی ہو گی بیٹا بڑا ہو کے میرے ساتھ زمینیں سنبھالے گا تو میرا سینہ فخر سے بھر جائے گا۔"

"تو کیا بیٹے کیلئے پیپل کے درخت تلے جھولا نہیں بنائیں گے آپ۔۔۔؟" نور بانو مسکرائی

"ضرور بنائیں گے۔کیوں نہیں بنائیں گے۔وہ بھی تو ہماری ہی اولاد ہو گی۔"

"اور تمہاری کیا خواہش ہے۔۔۔بیٹا یا بیٹی؟"

اگلے پل انہوں نے نور بانو سے سوال کیا

"میری خواہش ہے کہ بیٹا یا بیٹی جو بھی ہو بس اللہ اس کے نصیب اچھے بنائے،اسے نیک اور فرمابردار بنائے۔۔۔" زمیندار صاحب اس خوبصورت سوچ پہ اپنی بیوی کے چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے تھے

اور ٹھیک شادی کے ایک سال بعد نوری اور زمیندار صاحب پر خدا نے اپنی رحمت کی بارش

برسا دی ۔نوری کو شادی کے پہلے ہی سال خدا نے بیٹی دی ۔سارا گھر خوشیوں سے بھر گیا۔زمیندار صاحب نے پورے گاؤں میں مٹھائیاں بانٹیں ۔اللہ کے نام پر تین خیراتی دیگیں پکوائی

" نور اس کا نام کیا رکھیں ہم ۔۔۔؟ وہ بہت خوش تھے

" آپ کو بیٹی کی بہت خواہش تھی نام بھی آپ رکھیں ۔۔۔" نوری نے نام کی ذمہ داری شوہر کو سونپ دی

" نہیں نور ۔۔۔میری یہ خوشی اللہ نے آپکے زریعے پوری کی ہے ۔اس لیئے نام بھی آپ نے ہی رکھنا ہے ۔۔۔کوئی اچھا سا نام رکھو میری بیٹی کا ۔۔۔"

" اچھا ۔۔۔میں نے ایک نام نام سوچا تھا ۔میری بیٹی میرے لیئے میری جنت ہے ۔اسلیئے میں چاہتی ہوں اس کا نام" جنت" ہونا چاہیے ۔"

زمیندار صاحب کو یہ نام بہت پسند آیا ۔سونئی جنم لینے والی زندگی کا نام جنت رکھ دیا گیا ۔

۔خوشی ان کے انگ انگ سے چھلکنے لگی ۔وہ اپنی ننھی سی بیٹی کو اٹھائے پورے گھر میں یہاں سے وہاں ،وہاں سے یہاں سارا دن لورے پھرتے

اس کے لیئے چھوٹے بڑے کھلونوں کا ڈھیر لگائے رکھتے ۔اپنا وقت نکال کر گھر میں سارا دن ۔جنت کے ساتھ بچہ بنے کھیلتے رہتے ۔

اور نور بانو ان دونوں کو دیکھ کر مسکراتی رہتی ۔خدا نے ان کے چھوٹے سے گھر کو خوشیوں سے بھر دیا تھا ۔ان کے گھر کو مکمل کر دیا تھا ۔انہیں اور کیا چاہیئے تھا؟

یہی بہت تھا ۔کبھی کبھی وہ سوچتی کہ ابا نے اس سے کہا تھا کہ اللہ اسے اس کے صبر کا اجر ضرور دیں گے ۔نور بانو کو لگتا اسے اجر مل گیا ہے اب ۔ایک پیار کرنے والا شوہر ،گاؤں کے اونچے زمیندار گھرانے میں شادی ،اور شادی کے پہلے ہی سال اولاد ۔۔۔اس کے صبر کا اس سے میٹھا پھل بھلا اور کیا ہو سکتا تھا

مٹھائیاں بانٹی گئیں ،دیگیں پکائی گئیں ۔پورے گاؤں کو خبر ہو گئی تھی کہ زمیندار صاحب کے گھر اللہ نے بیٹی دی ہے ۔

مٹھائی اور چاول باقی سب کی طرح اقبال کمہار کے گھر بھی بلا تفریق بھجوائے گئے۔زاہدہ کو مٹھائی ملی تو ملوکھاں کو یاد کر کے اسکی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگی۔

زاہدہ نے زمین پر کھیلتے ہوئے خوش بخت کی طرف دیکھتے ہوئے آہ بھری۔

کتنی خوش نصیب ہوتی ہے وہ اولاد جن کو ماں کی گود نصیب ہوتی ہے۔خوشی اللہ نے تم سے یہ خوشی تو چھین لی۔اللہ تمہاری باقی زندگی خوشیوں سے بھر کے اس محرومی کا ازالہ کر دے۔

انہوں نے مٹھائی کا چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر ایک سالہ خوش بخت کے منہ میں دیا جو ابھی سے نئے دانت نکالنے لگا تھا۔

زندگی کی کہانی آگے بڑھتی رہتی ہے۔اور اس کہانی میں سارے کردار اپنے حصے کا کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔اور زندگی کی اس کہانی کے دو کرداروں کی کہانی بھی بہت آگے لکھی جا چکی تھی۔اور بڑے ہو کر ان دونوں نے اپنے حصے کے کردار ادا کرنے تھے

☆......☆......☆

رنگا رنگ کہانیوں سے سجا، خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اُردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ) کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجئے۔نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ابھی sohnidigest@gmai.com پر ای میل کریں۔

دسواں حصہ

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ سلطان نے چوہدری کے دھندے کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔شروع کے ایک ہفتے کو چھوڑ کر پچھلے دو ماہ سے رشید کی نگرانی میں وہ اپنی ڈیوٹی سنبھال رہا تھا۔رشید کا کام اسلحہ سنبھالنا،اسکی جانچ پڑتال کروانا اور نئے گاہکوں تک ڈیلیوری کروانا ہوتا۔جبکہ سلطان سارے مال کی دوبارہ جانچ پڑتال کرتا۔اور نچلے ملازمین کو سنبھالنا ان کی ڈیوٹی کب کہاں اور کیسے لگانی ہے یہ سب رشید کے فرمان کے مطابق سلطان انجام دیتا۔اور یہ سب کام رات کی تاریکی میں چوہدری صاحب کے ایک مخصوص خفیہ اڈے پر انجام دیئے جاتے۔اسلحہ کو چھپا کے رکھنے کیلئے زیرزمین تہہ خانے تیار کیئے گئے تھے۔

چوہدری صاحب کا تعلق کسی دہشت گرد تنظیم سے ہرگز نہیں تھا بلکہ یہ صرف سیاسی پارٹیوں میں دنگے فساد تک محدود تھے۔چوہدری صاحب بھلے بذات خود ابھی سیاسی میدان میں داخل نہیں ہوئے تھے مگر ان کی پہنچ کراچی کے بڑے بڑے سیاسی لیڈروں تک تھی۔اور اکثر و بیشتر بہت سی خاص خاص ہستیاں انکے ڈیرے پر ماتھا ٹیکنے ضرور حاضر ہوتیں۔اور چوہدری صاحب کے تعلقات نا صرف اندرون ملک بڑی بڑی ہستیوں سے تھے بلکہ باہر کے بھی کافی مما لک میں انہوں نے تعلق استوار کر رکھے تھے

وہ بھی ایک عام سی معمول کی رات تھی جب سلطان کی آنکھ ہلکے سے شور کے ساتھ کھلی۔ادھ کھلی آنکھوں اور سوئی جاگی کیفیت کے باعث اسے کچھ سمجھ نا آیا کہ آوازیں کس طرف سے آرہی ہیں۔مگر اسے ماحول کے سے مطابقت لانے میں زیادہ دیر نا لگی۔تھوڑی ہی دیر میں اسکی سماعتوں نے رشید کے سندھی لہجے کی با آسانی شناخت کرلی۔جو کسی دوسرے شخص کے ساتھ اسلحے کے بارے ہی معاملات طے کر رہا تھا۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا وہ صحیح طرح سمجھ نا پایا کیونکہ دو گھنٹے پہلے ہی تو وہ لوگ اسلحہ اتروا کے ڈیوٹی ٹائم کے بعد سوئے تھے ۔ یہ انکا معمول تھا کہ رات کے تین بجے کے بعد وہ لوگ اپنی ساری سرگرمیاں ختم کر دیتے ۔ چھوٹے ملازمین وہیں گودام میں اور رشید اور سلطان ڈیرے پر واپس آجاتے ۔ اس رات خلاف معمول سلطان کو روز سے زیادہ تھکاوٹ محسوس ہوئی تو وہ ڈیرے پر جانے کی بجائے وہیں گودام میں ہی سو گیا۔ اور شاید رشید اس بات سے بے خبر تھا کہ آج سلطان ڈیرے پر نہیں بلکہ گودام میں ہی سو گیا تھا۔

دراصل رشید پر چوہدری صاحب بہت زیادہ اعتبار کرتے اور انکے ہر جائز اور ناجائز دھندے کا چارج رشید کے پاس ہی ہوتا۔ چوہدری صاحب نے رشید پر اندھے اعتبار کے باعث نا تو کبھی اس سے حساب کتاب مانگا اور نہ ہی کبھی اس کی ایمانداری پر شک کیا۔ مگر یہ چوہدری صاحب کا بھولپن تھا۔ رشید لمبے عرصے سے اس دھندے میں ڈنڈی مارتا آرہا تھا اس کام میں اس کے ساتھ چند اور بھی عملے کے بندے شامل تھے ۔ وہ چوہدری صاحب کے " مال " میں سے کچھ حصہ اوپر ہی اوپر سے نکلوا کر ڈیوٹی ٹائم کے بعد آگے سپلائی کر کے اپنی جیبیں بھر لیتے۔

جس طرح سمندر میں سے ایک بالٹی پانی نکال لینے سے سمندر پر کوئی فرق نہیں پڑتا بالکل اسی طرح چودھری صاحب کو بھی ایسے چھوٹے موٹے غبن سے کچھ بھی فرق نا پڑتا تھا۔ ہاں البتہ رشید اور اس کے تلے کام کرنے والے چار پانچ آدمیوں کی جیبیں ضرور گرم ہو جاتی تھیں ۔ مگر جھوٹ اور خیانت جلد ہی ظاہر ہو کر رہتی ہیں زیادہ دیر اپنا آپ نہیں چھپا سکتیں ۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

" کیا ہو رہا ہے یہ سب ۔۔ رشید میاں ۔۔؟ " تھوڑی ہی دیر میں سلطان انکے سر پر پہنچ چکا تھا۔

" سلطان ۔۔۔ تم ۔۔۔ تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو ۔۔۔؟ " رشید اسے ایسے یوں اچانک سر پر پہنچا دیکھ کر ہڑبڑا گیا

" یہ کس کا مال جا رہا ہے ۔؟ کیونکہ ڈیوٹی ٹائم تو کب کا ختم ہو چکا ہے رشید ۔۔۔ "

" ایک کلائنٹ آ گیا تھا ۔ اسے ایمرجنسی میں کچھ مال بھجوانا تھا اس لیئے ڈیلوری ابھی کروانی پڑی مجھے ۔۔ " اس نے اب تک بات کو سنبھال لیا تھا

" اچھا ایسی کون سی ایمرجنسی اور کونسا کلائنٹ ۔۔۔کس کو بھیجا جا رہا ہے یہ مال ۔۔۔"

" سلطان جاؤ سو جاؤ تمہارا کام ختم ہو چکا ہے ۔تمہاری ڈیوٹی کا ٹائم گزر چکا ہے ۔اس لیئے جاؤ اور کام کرنے دو ۔۔۔" اسے سلطان کی پوچھ تاچھ سے الجھن ہونے لگی

" ڈیوٹی ٹائم تو آپ کا بھی ختم ہو چکا ہے ۔اور میں نے ایسا کیا غلط پوچھ لیا جو آپ برہم ہو رہے ہیں ۔۔؟" اسے سمجھ ہی نا آسکی کہ رشید اس طرح کیوں اکھڑ رہا ہے

" ابھی کام کرنے دو صبح اس معاملے پر بات کریں گے ۔سب سمجھا دوں گا تمہیں ۔" وہ کچھ نا سمجھتے ہوئے واپس جا کے سو تو گیا مگر اس کے دل میں شک کا ناگ پھن مارنے لگا ۔

اگلے دن سلطان نے رشید کی غیر موجودگی میں عملے کے ایک دو ملازم سے رات ہونے والی اسلحے کی ڈیلوری کی بابت سن گن لی تو اسی عملے کے آدمے اختر نے جو اپنا نام مخفی رکھنے کی شرط پر جو انکشاف سلطان کے سامنے کیئے وہ اسے حیران کر دینے کیلئے کافی تھے ۔اس نے سلطان کو بتایا کہ رشید کافی لمبے عرصے سے اسی طرح غبن کر رہا ہے چوہدری صاحب کو دھوکہ دے رہا اور چوہدری صاحب کا سب سے خاص اور انچارج ہونے کی وجہ سے کوئی اس کے خلاف قدم بھی نہیں اٹھا سکتا ۔سلطان اسے بے خوف رہنے کی تسلی دے کر واپس آ گیا ۔

اس کے بعد اس نے رشید پر نظر رکھنی شروع کر دی وہ اسے ایک بار پھر رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا ۔اور اس موقعے کیلئے اسے زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑا ۔ایک ہفتے بعد جب وہ دونوں ڈیوٹی مکمل کر کے ڈیرے پر سوئے ہوئے تھے تو سلطان نے رشید کو اذانوں سے بھی پہلے اٹھ کر گودام اور کی طرف جاتے دیکھا ۔وہ حیران ضرور ہوا کیونکہ وہ لوگ رات گئے تک ڈیوٹی کرتے تھے تو ان کی صبح ہمیشہ دن چڑھے ہی ہوتی تھی ۔

سلطان تھوڑی دیر بعد اس کے پیچھے اٹھ کر سیدھا گوداموں کی طرف آ گیا جہاں وہ لوگ اپنے رشید کی نگرانی میں معمول کے غبن میں مصروف تھے ۔۔۔

" رشید میاں آج پھر تو کوئی ایمرجنسی نہیں پڑ گئی تھی ؟ خیریت آج پھر یہ کس کا مال جا رہا ہے اور وہ

بھی ڈیوٹی ٹائم کے بعد۔۔۔؟"

" سلطان اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ یہ مت بھولو کہ تم میرے انڈر ہو۔ میرے ماتحت ۔۔۔ جاؤ سو جاؤ۔۔" وہ جان چکا تھا کہ ہر بار کوئی بہانہ کام نہیں آتا اس لیئے اپنی انچارج کی دھاک بٹھانا لازم سمجھا

" میں آپکے انڈر ضرور ہوں رشید صاحب۔ مگر دھوکے میں آپکا ساتھی ہر گز نہیں۔ میں نے اس غلط کام میں قدم رکھنے سے پہلے خود سے اور چوہدری صاحب سے ایمانداری کا عہد کیا تھا"" سلطان نڈر تھا وہ بالکل خوفزدہ نا ہوا

" سلطان تم ابھی نئے ہو۔ ایسا

کچھ نا کرنا کہ بعد میں تمہیں اس نوکری کے چھن جانے پر پچھتانا پڑے۔ سوچ لینا اگر یہ بات یہاں سے باہر نکلی تو انجام بہت برا ہوگا۔ بہت نقصان اٹھاؤ گے۔" رشید نے سلطان کو اپنے سندھی لہجے میں وارن کیا

" میں نے چوہدری صاحب کا نمک کھایا ہے آپ کا نہیں۔ اور میں اپنے نمک کے ساتھ کبھی دھوکہ نہیں کر سکتا۔" کہنے کے بعد وہ رکا نہیں بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گودام سے نکلتا چلا گیا۔

پیچھے گودام میں ایک ڈری سہمی کیفیت نے رشید سمیت اسکے ساتھیوں کو گھیر لیا تھا۔ وہ حقیقتاً سہم ضرور گئے تھے

مگر رشید چوہدری صاحب کے پاس سالوں سے کام کرتا آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح کے معاملات سے کس طرح نمٹتا ہے۔ ایسے کیس کو کئی بار پہلے بھی انجام دے کر ان کی زبانوں پر تالے لگوا چکا تھا۔ یا پھر چوہدری صاحب کے سامنے کوئی جھوٹ رکھ کر انہیں نوکری سے ہی فارغ کروا دیتا

۔وہ یہ سب دیکھتے تو تھے مگر بول کچھ نا سکتے۔ چلو ایک سلطان اور سہی۔۔۔

" اب کیا ہوگا رشید سائیں۔۔۔" ساتھ کھڑے مکھنڑ نے رشید سے سہم کر سوال کیا

" کچھ بھی نہیں ہوگا۔۔۔ وہی ہوگا جو عبدل کا حال ہوا تھا۔۔۔ یہ لڑکا بھی نوکری سے جائے گا ۔چوہدری صاحب سے سزا الگ۔۔۔" رشید نے مسکرا کر اسے تسلی دی

" پر سائیں، سلطان پر تو چوہدری صاحب بہت اعتبار کرتے ہیں ۔۔۔"

" مجھ سے زیادہ تو نہیں کرتے نا ۔۔۔؟"

" نا سائیں یہ کل کا چھوکرا اس کی کیا مجال آپ کا مقابلہ کرے ۔۔۔"

" تو سمجھ لو کہ اس کے پر کاٹنے کا وقت نزدیک آگیا ہے ۔۔۔ بہت پھڑ پھڑانے لگا تھا یہ لڑکا" وہ زہر خند لہجے میں بولا

" بس سائیں دھیان رہے ۔۔۔ ہم غریب تو آپ کے سہارے ہی یہ بے ایمانی کرتے ہیں نا ۔۔۔ آپ ہی نے کرنا ہے اس کا بندوبست ۔۔ بس دھیان سے زرا"

" کچھ نہیں ہو گا مکھنڑ ۔۔۔ دل بڑا رکھو اور تم لوگ جلدی سے یہ مال بجھوا کر صفائی کروا دو ۔۔۔ آگے میرا کام ہے میں دیکھ لوں گا ۔۔" وہ واقعی سوچنے لگا سلطان کا بندوبست اب لازم ہو گیا تھا

انسان کے بھی کتنے چہرے ہوتے ہیں کتنے رخ ہوتے ہیں کتنے فیز ہوتے ہیں ۔ اور انسان وقت کے ساتھ کس طرح اور کتنی جلدی چہرہ بدلتا ہے یہ شاید اسے خود بھی اندازہ نا ہو کہ وہ اپنے معاملات میں کس درجے بے ایمان ہے ۔ یہاں دنیا بہت سے رشیدوں سے بھری پڑی ہے جو جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں ۔ یہ دنیا بہت سے ایسے چوہدری صاحبان سے بھری پڑی ہے جو اپنی آنکھوں پر اعتبار کی پٹی باندھ کر اپنا سب کچھ (بھلے وہ جائز ہو یا ناجائز) اپنوں پر بھروسہ کر کے انہیں دان دیتے ہیں ۔ ساری ذمہ داریاں ان کو سونپ دیتے ہیں ۔ بھلے وہ انکی ناک کے نیچے انہی کی ہونٹ کاٹتے رہیں

یہ دنیا ایسے کئی سلطانوں سے بھی بھری پڑی ہے جو اپنے مالک سے وفاداری کا عہد تو کرتے ہیں مگر یہ بھول بیٹھتے ہیں کہ وہ اپنے پیچھے کتنی ذمہ داریوں سے نظریں چرائے بیٹھے ہیں ۔ کتنے رشتوں کتنے جیتے جاگتے انسانوں اور کتنے مدفن لوگوں کے قرض ان پر باقی ہیں ۔۔۔ یہ ہم انسان شاید کبھی نہیں سوچتے ۔

☆......☆......☆

" نانی جو لوگ برے کام کرتے ہیں ہیں کیا انہیں ان کا ضمیر ملامت نہیں کرتا ہو گا ۔ انہیں برائی کرنے سے روکتا نہیں ہو گا ۔۔۔" دو دن پہلے نزدیکی شہر میں مچھلی منڈی میں کسی بات کو لے کر دو

دکانداروں میں جھگڑا شروع ہوا تو اس جھگڑے کا اختتام ایک دکاندار کے قتل پر جا کے ہوا تھا۔قاتل دکاندار نے مچھلی صاف کرنے والا تیز چھرا مقتول کے پیٹ میں گھونپ دیا تھا۔موقع پر تو وہ دکاندار وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا لیکن بعد میں پولیس نے اسے دھر ہی لیا۔یہ بات مچھلی لے جانے والے گاؤں کے ملاحوں کے ذریعے گاؤں میں بھی آ پہنچی تھی

"پتر انسان کو اللہ نے اپنا نائب اور خلیفہ صرف اس کی عقل کی بنیاد پر ہی بنایا ہے۔اور غصے کو حرام اس لیئے قرار دیا ہے کہ غصہ عقل کا دشمن ہے عقل کو کھا جاتا ہے۔جب انسان کو غصہ آتا ہے تو اس کا عقل، دماغ مفلوج ہو جاتا ہے۔غصہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر پردہ ڈال دیتا ہے اور پھر نتیجہ ہمیشہ بھیانک ہی نکلتا ہے تب پھر بندے کو افسوس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا" نانی نے اسے تفصیل سے سمجھایا

"یہ جو لوگ قتل اور چوری یا دوسرے بڑے جرائم میں ملوث ہوتے ہیں ان کو ضمیر ملامت نہیں کرتا ہو گا؟"

"بالکل کرتا ہے۔ضمیر تو انسان کو ہمیشہ برائی سے روکتا رہتا ہے۔پتر اللہ تعالیٰ بے شمار صفات کا مالک ہے اس نے انسان کی تخلیق محبت سے کی ہے۔اور دنیا کے ہر انسان میں اپنی صفات میں کوئی نا کوئی صفت اس میں بھی رکھ دی ہے۔اب ضرورت صرف اس خوبی کو تلاش کرنے کی ہوتی ہے۔چاہے انسان جتنا بھی گناہگار ہو اس میں کوئی نا کوئی اچھائی بھی ضرور ہوتی ہے مگر وہ اپنے اندر کی اچھائی کو پہچان نہیں پاتا۔برائی نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہوتی ہے"

"جو لوگ ساری زندگی گناہ کرتے رہتے ہیں قتل و غارت کرتے ہیں۔بم دھماکے کرتے ہیں سینکڑوں بے گناہ انسانوں کی جانیں لیتے ہیں ان کے اندر تو کوئی اچھائی نہیں ہوتی نا ہی ان کا ضمیر انہیں روکتا ہے۔میرا دل تو اس بات سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ ان کا ضمیر ہوتا ہی نہیں ہے۔"

"نہیں خوشی ایسا نہیں ہوتا۔کہتے ہیں کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک کالا چھوٹا سا نکتہ لگا دیا جاتا ہے۔پھر دوسرے گناہ پر دوسرا کالا نکتہ۔جب وہ مسلسل گناہ کرتا چلا جاتا ہے تو اس کا دل ان کالے دھبوں سے بھر کر بالکل کالا سیاہ ہو جاتا ہے۔اس کے دل میں چھپی وہ نیکی اس کالک تلے کہیں دب جاتی ہے۔پھر انسان کو گناہ کرتے وقت احساس نہیں ہوتا کہ یہ غلط ہے اسے نہیں کرنا چاہیے

یہ گناہ ہے۔جب بندہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو پھر وہاں سے واپسی بہت مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ تب وہ گناہ کو گناہ سمجھتا ہی نہیں۔اسے احساس ہی نہیں ہوتا۔بس احساس کبھی نہیں مرنا چاہیئے۔جب تک گناہ کا احساس باقی رہے انسان کی نیکی کی طرف واپسی ممکن رہے گی۔احساس مرنے کے بعد بالکل نہیں۔"

خوشی تھوڑی دیر کیلیئے خاموش ہو گیا۔اس کے سوالوں میں وقفہ آ گیا تھا

"نانی۔۔۔پتا نہیں کیوں۔کبھی کبھی میں بھی اپنے خیالات کی آندھیوں میں اڑتا بہت دور پہنچ جاتا ہوں۔کبھی کبھی مجھے بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں تیز آندھی میں اڑتا ہوا کوئی تنکا ہوں۔جو ہواؤں کے رحم وکرم پر اڑتا ہی جا رہا ہے۔۔۔" خوشی نے مٹی کے چولہے میں جلتی تیز سرخ آگ پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔اگلے لمحے اس نے سوال کیا تو بھی اتنا عجیب

"کیوں۔۔۔ایسا کیوں لگتا ہے تمہیں۔۔۔؟" چائے کے چھوٹے سے پتیلے میں چینی مکس کرتے ہوئے نانی نے حیرت سے اسے دیکھا

"پتا نہیں کیوں۔۔۔مجھے اکثر عجیب سے خیالات آتے رہتے ہیں۔" نظریں ابھی تک آگ پر گڑی تھیں۔

نانی کا دل دھڑکا۔سینہ بھاری ہونے لگا۔سالوں سے دل میں چھپائے راز کی امانت اس نے اچھی طرح نبھائی تھی۔

کہیں یہ پھر تو اپنی پیدائش کو لے نہیں سوچتا رہتا کہیں پھر اپنے وجود اور اپنی محرومیوں کو تو نہیں سوچتا رہتا

"تم نماز نہیں پڑھتے نا۔۔۔کتنا سمجھاتی ہوں تمہیں کہ نماز پڑھا کرو مگر تم کبھی خود سے نماز نہیں پڑھتے۔۔۔اس لیئے ایسے خیال بھرے رہتے ہیں تمہارے دل و دماغ میں۔نماز ایسے عجیب وغریب خیالات کے آگے بند باندھ دیتی ہے۔" نانی کو تو اسے مطمئن کرنے کا یہی ایک ہی راستہ سوجھتا تھا بس

"نانی اب اس میں نماز کہاں سے آ گئی بیچ میں۔۔۔میں اپنے عجیب عجیب خیالوں کا بتا رہا ہوں اور آپ نماز کو بیچ میں لے آئی ہیں۔" وہ جھنجھلا کر بولا۔۔نانی اکثر ہی ایسا کرتی ہر مسئلے کا حل انہیں ایک نماز میں ہی نظر آتا تھا۔۔۔

" نماز بیچ میں کبھی نہیں آسکتی خوشی ۔۔۔نماز کو تو اولیت حاصل ہے ۔ دنیا کی ہر چیز سے پہلے نماز آتی ہے ۔کعبہ کا طواف بھی رک جاتا ہے نماز کیلئے ۔نماز کی اس سے بڑھ کر اولیت اور کیا ہو گی ۔ یاد رکھنا نماز کبھی بیچ میں نہیں آتی ۔نماز کو ہمیشہ پہلے رکھنا پڑتا ہے ۔"

"لیکن میں اپنے خیالوں کی بات کر رہا تھا نانی ۔۔۔"

" تو اسی لیئے تو آتے ہیں نا عجیب خیالات ۔۔۔جب نماز میں دل لگاؤ گے تو دل صرف اللہ کی یاد سے بھر جائے گا ۔دل میں اور کسی خیال کے آنے کی گنجائش ہی نہیں بچے گی

نماز لازم ہے پتر ۔۔۔اگر اگلی زندگی میں اونچا مقام حاصل کرنا ہے تو اس دنیا میں خود کو جھکانا پڑے گا ۔ناک کو زمین پر ٹیکنا پڑے گا ،پیشانی کو زمین تک لے جانا پڑے گا ۔"

" اور جس کا نماز میں دل نا لگے وہ کیا کرے ۔۔۔؟

اسے نماز پڑھنے کی خواہش ہو مگر وہ پھر بھی نا پڑھ سکے تو ایسا بندہ کیا کرے ۔۔۔؟"

" تو وہ جان لے کہ ضرور اللہ اس سے ناراض ہیں جو اسے سجدے کی توفیق بھی نہیں مل رہی ۔۔۔شیطان اس کے دل میں گھر کرنے لگا ہے ۔۔۔

خوشی ۔۔۔دل میں تو اللہ رہتا ہے دل تو اللہ کا گھر ہے ۔اسے شیطان یا شیطانی خیالوں کا مسکن نہیں بننے دینا چاہیئے ۔

اور جسے سجدے کی توفیق نا مل رہی ہو وہ فوراً اپنے اللہ کو راضی کر لے ۔سجدے کرے دعا مانگے اس کے در پر دستک دے ۔تو دروازے کھل جائیں گے ۔اللہ بہت جلد مان جاتا ہے خوشی ۔۔۔اللہ کبھی اپنے بندوں سے زیادہ دیر نہیں روٹھتا "

وہ چپ ہو گیا ۔مزید کوئی بات کرنے کو اس کے دماغ میں بچی بھی نہیں تھی ۔

" خوشی بس تم صرف نماز میں دل لگایا کرو اور تم اتنا مت سوچا کرو ۔ورنہ ابھی سے بوڑھے ہو جاؤ گے ۔پھر تمہارے ساتھ شادی بھی کوئی نہیں کرے گا ۔"

پیالوں میں چائے بھرتے ہوئے نانی اس کے دھیان کو دوسری طرف پھیرنے میں کامیاب رہی تھی

خوشی ہلکا سا مسکرایا۔سفید دانتوں کی ایک لائن سی نظر آئی
" کیوں نہیں کرے گی کوئی شادی ۔۔۔میں چھین کے لے جاؤں گا اپنی پسند کی دلہن ۔بھگا کے لے جاؤں گا۔چوری چھپے نکاح پڑھوالوں گا۔پھر کون روکے گا مجھے؟" خوشی نے مسکراتے ہوئے نانی کے مذاق کا جواب دیا
" نہیں خوشی تم ایسا کچھ نہیں کروگے ۔تم ایسا کچھ بھی نہیں کروگے ۔سمجھ رہے ہو نا تم ۔۔۔؟" نانی ایکدم سنجیدہ ہوگئیں ۔چہرے کی مسکراہٹ جانے کہاں جا چھپی ۔
خوشی حیران رہ گیا۔یہ ایکدم سے نانی کو جانے کیا ہوگیا۔ابھی تو مذاق کر رہی تھیں اب اچانک اتنی سنجیدہ ۔وہ کچھ سمجھ نا پایا۔اور خاموشی سے آگے رکھی چائے پینے لگا
نانی نے بھی کچھ سوچتے ہوئے چائے کا کپ ہونٹوں
سے لگا لیا۔دماغ کے پردے پر سالوں پہلے کا ایک دھندلا سا منظر کسی بلیک اینڈ وائٹ فلم کی طرح چلنے لگا۔
سالوں پہلے خوشی کے باپ نے شادی شدہ ہونے کے باوجود بھی ملوکھاں سے چوری چھپے نکاح کرلیا۔اس کے بعد انجام کیا ہوا تھا۔گھر اجڑ گیا تھا ایک بے قصور نئی نویلی دلہن کا۔نانی تو سب جانتی تھی نا ۔ہر راز سے واقف ۔سب کچھ اپنے سینے میں دفن کیئے ہوئے جیئے چلی جا رہی تھی ۔
خوشی بڑا ہو رہا تھا۔اپنی ذات کو کھوجنے لگا۔اپنا محور تلاش کرنے لگا۔اپنی جڑیں ڈھونڈھنے لگا ۔نانی کا بوڑھا دل اب اندیشوں کی نظر ہونے لگا۔انہوں نے دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگی تھی کہ جس راز کی امانت اسے سالوں پہلے سونپی گئی تھی خدا اسے آخری سانس تک اس کی حفاظت میں کامیاب رکھے

☆......☆......☆

" دین محمد۔۔۔کیا اب بھی تمہارا دل نہیں تھکا۔۔۔میں تو اب تھک چکی ہوں ۔میرا دل کمزور ہو چکا ہے ۔" بختاور نے ایک آس سے سوال کیا
دین محمد کچھ پل خاموش بیٹھے حقہ پیتے رہے ۔کمرے میں حقے کا دھواں پھیلتا رہا بختاور کی

سماعتیں دین محمد کے جواب کا انتظار کرنے لگیں

"بختو میں تو اسی دن خود سے تھک گیا تھا جس دن سلطان کو اس گھر سے باہر نکالا تھا۔ میں تو اسی دن ایک دم سے بوڑھا ہو گیا تھا۔ میرا دل تو اسی پل میں کمزور ہو گیا تھا۔ مگر چپ رہا، انتظار کرتا رہا کہ کب دروازے پر دستک ہو گی اور میں کھولوں گا تو باہر سلطان کھڑا ہو گا۔ وہ ہم سے معافی مانگے گا اپنے کیئے کی اور ہم اسے معاف کر دیں گے۔ مگر سالوں بعد بھی میری حسرت، حسرت ہی رہی۔ میں باپ تھا اس کا، پیار کرتا تھا سلطان سے، اگر وہ ایک بار بھی معافی مانگنے آجاتا تو میں سارے دروازے اس پر کھول دیتا۔ مگر میری بوڑھی آنکھیں راستہ دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی ہیں وہ مڑ کے ہی نہیں آیا۔" دین محمد کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھتے ہوئے بولتے چلے گئے۔ دل میں سالوں کا غبار جمع تھا۔ نکلنے کا تھوڑا سا راستہ میسر آیا تو دین محمد نے بھی روکنے کی کوئی کوشش نا کی۔

روکتے بھی کیسے؟ اب بوڑھے ہو چکے تھے، کمزور ہو گئے تھے، سینے میں وہی طاقت باقی نا رہی، سالوں کا جمع غبار اب دل میں گھٹن پیدا کرنے لگا۔ اور اس بڑھاپے میں وہ اتنی گھٹن برداشت نہیں کر سکتے تھے

"سلطان نے ہمارا مان نہیں رکھا۔ لوٹ کے نہیں آیا مگر ہم بھی تو سالوں اکڑے رہے کوئی لچک نا دکھائی، نا ہی اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی کہ آخر وہ گیا تو گیا کہاں۔۔۔؟ قصور تو ہمارا بھی برابر کا ہوا نا۔۔؟"

"ہاں بختو۔۔۔ صحیح کہتی ہو تم۔ قصوروار میں بھی ہوں میں نے اسے ڈھونڈنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ اور میں اتنی بڑی دنیا میں اسے ڈھونڈتا بھی کیسے؟ نا کوئی اتا پتا نا کوئی اس کا ٹھکانہ معلوم۔ میں نے نہیں ڈھونڈا کیونکہ مجھے سلطان پر یقین تھا وہ واپس آئے گا اپنے کیئے کی معافی مانگے گا تو میں معاف کر دوں گا اسے۔ مگر وہ پلٹ کے آیا ہی نہیں۔۔۔" دین محمد کے الفاظ و لہجہ ٹوٹ پھوٹ چکے تھے نظریں بے اختیار گھر کے بیرونی لکڑی کے دروازے پر جا ٹھہری تھیں جو اب خستہ اور پرانا ہو چکا تھا۔

"واہ میرے خدایا۔۔۔ کیا نصیب دیئے ہیں تم نے مجھے۔ ایک معصوم بیٹا دریا نے لے لیا لاشہ تک واپس نہیں کیا۔ دوسرا جوان بیٹا دنیا میں کہیں کھو گیا۔۔۔ کس طرح کی آزمائشیں لے رہے ہو ہم سے

۔میں بوڑھی ہوں آزمائشیں نہیں سہار سکتی ۔مجھ میں اب امتحانوں سے گزرنے کی ہمت نہیں رہی تھک چکی ہوں ۔" بختاور اب اپنا سفید دوپٹا اپنے بوڑھے چہرے پر رکھے رو رہی تھی دہائیاں دے رہی تھیں ۔سالوں سے خاموشی سے آنسوؤں بہاتی چلی آ رہی تھی آج موقع ملا تھا جی بھر کے رونے کو

دین محمد کی آنکھیں بھی زیادہ دیر خشک نا رہ سکیں گیلی ہونے لگیں دو آنسوؤں ان کی آنکھوں سے نکل کر جھریوں والے چہرے سے سفر کرتے گردن تک پہنچ گئے

"مگر خوش بخت تو تھا نا۔آپ خوشی کو تو واپس لا سکتے تھے ۔وہ سالوں سے بی بی تاج کے گھر میں بغیر ماں باپ کے پل رہا ہے ۔وہ بھی تو سلطان کا خون ہے ۔ہمارا خون ہے ۔اولاد کی اولاد ہے ۔جو ہوا جیسے ہوا ملوکھاں تو قبر میں جا سوئی ۔اس سب میں خوشی کا تو کوئی قصور نا تھا۔" بختاور اب پوتے کو رونے لگیں

" جانتا ہوں بختو ۔۔۔جانتا ہوں خوشی کا کوئی قصور نہیں مگر میں ڈرتا تھا وہ سوال کرے گا تو ہم کیا جواب دیں گے پھر؟ کہاں منہ چھپائیں گے ہم ۔۔کبھی کبھی گلیوں میں یا بازار میں اس سے سامنا ہو جائے تو میں اس کی آنکھوں میں دیکھ ہی نہیں سکتا۔منہ پھیر کر گزرنا پڑتا ہے مجھے خوشی سے ۔۔؟"

" بس صرف سوالوں سے آپ ڈرتے رہے؟ صرف سوالوں کی وجہ سے وہ اتنے سالوں تک اپنے حق سے اپنے گھر سے محروم رہا۔کیا یہ نا انصافی نہیں ہے اس معصوم کے ساتھ ۔۔۔؟"

بختو کی ساری باتیں سچ تھی سارے سوال حق تھے ۔دونوں جانتے تھے ۔

" ہاں بختو خوشی کا کوئی قصور نہیں ہے ۔مجھے شروع میں ملوکھاں کا غصہ تھا۔اس کی وجہ سے نوری بے گھر ہوئی ۔پھر جب ملوکھاں کو میں نے قبر میں اتارا تو اپنے سارے دکھ اور شکوے اسکے ساتھ دفن کر دیئے ۔کوئی رنج دل میں باقی نا رہا۔مگر خوشی نانی کے پاس تھا دل تو میرا بھی کھنچتا تھا ہمیشہ پر ایک اطمینان تھا دل میں کہ وہ نانی کے پاس خوش ہے مطمئن ہے ۔بس یہی سوچ کے دل کو ہمیشہ تسلی دے دی"

بختاور کے سارے سوال ختم ہونے لگے ۔ان دونوں کے بیچ اس کچے کمرے میں خاموشی آ کے ٹھہر گئی

" اور اس کے سوالوں کے جواب کہاں سے لاؤ گے ۔۔۔؟ اس کی سوال کرتی آنکھوں کو کیسے

سمجھاؤ گے۔۔۔" بختاور نے طنزیہ سوال کیا
"کبھی نا کبھی تو سامنا کرنا ہے نا۔کبھی نا کبھی تو اس کے سارے سوالوں کے جواب دینے ہوں گے۔۔۔تو پھر اب ہی۔۔۔"
"تو یہ پہلے کیوں نا سوچا۔۔۔؟"
"میں آزما رہا تھا خود کو اور تمہیں۔۔۔دیکھ رہا تھا کہ ہم کب تک سہار پاتے ہیں کب تک جھیل سکتے ہیں۔۔۔؟"
"زندگی ایک ہی بار ملتی ہے دین محمد۔۔۔اسے انا کی قبا نا پہنائی جائے تو بہتر ہوگا۔ورنہ انا کی یہ قبا بظاہر تو سب کچھ چھپا دے گی مگر جو اندر توڑ پھوڑ ہو گی اس سے نہیں بچا سکے"
"صحیح کہتی ہو تم بختو۔۔۔ہم جائیں گے اپنے خوشی کے پاس۔ضرور جائیں گے اسے منانے۔اسے واپس لے آئیں گے اسی گھر میں اسی آنگن میں ہم جائیں گے خوشی کے پاس۔
معافی مانگوں گا اس سے اس کو ملنے والی محرومیوں کی"
بختاور کے کانوں کے پردوں
تک جیسے ہی بات پہنچی اس کے دل میں سکون کی لہر سی دوڑ گئی۔اس کے حصے میں خوشیاں تھوڑی سی سہی اب واپس لوٹنے کو تھیں۔

☆......☆......☆

"سائیں یہ جو نیا لڑکا رکھا ہے آپ نے کام پر۔۔۔مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔"
یہ اس واقعے کے تین بعد کی بات تھی جب سلطان اور رشید آپس میں رات کو الجھے تھے
"کون سا نیا لڑکا رشید۔۔۔کس کی بات کر رہے ہو۔؟" چوہدری صاحب نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا
"سائیں وہ سلطان۔۔۔جو اپنے کچھ قیدیوں کے ساتھ آیا تھا۔اور آپ نے اسے کام پر لگانے کا کہہ دیا تھا۔۔" رشید نے یاد دہانی کروائی

" او ۔۔اچھا سلطان ۔۔وہ اب نیا تو نہیں رہا رشید ۔دو ماہ سے اوپر ہو گئے اسے ۔اب تو وہ ہمارے کام کو بھی اچھی طرح سمجھ چکا ہے۔"

"مگر سائیں ۔خدا جانے وہ کہاں سے آیا کون ہے ۔آپ نے بغیر چھان بین کروائے اسے رکھ لیا ۔خدا نا کرے کہیں ہمارے کسی مخالف گروپ کا بندہ نکلا تو ۔۔۔؟" رشید نے چوہدری صاحب کو سلطان بارے ورغلانے کی اپنی پوری کوشش کی

" رشید ۔۔۔میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتی ۔زندگی گزاری ہے میں نے اس دھندے میں ۔لوگوں کی آنکھوں میں ایک نظر دیکھ کہ ان کی پہچان ہو جاتی ہے مجھے ۔بے فکر رہو تم ۔وہ لڑکا کبھی دھوکہ نہیں گا۔" چوہدری صاحب نے اپنے ازلی اعتماد سے رشید کو مطمئن کیا

مگر وہ دل میں سلطان سے بیر پالے بیٹھا تھا۔اور اگر انسان کے دل میں کسی دوسرے انسان کے لیئے بال آجائے تو پھر وہ آٹے میں بال جیسے کبھی آسانی سے نہیں نکلتا

" پھر بھی سائیں ۔۔۔آپ ایک بار پھر تفتیش کروالیں تو بہتر ہو گا۔مجھے تو وہ لڑکا بڑا کھٹکتا ہے ۔اوپر سے آپ نے اسے میرا اسسٹنٹ رکھ دیا۔اتنی جلدی کبھی دوسرے بندے اس مقام تک نہیں پہنچتے جیسے وہ پہلی چھلانگ میں آگیا۔مجھے ہر وقت اس کی طرف سے کھٹکا لگا رہتا ہے سائیں ۔آپ میری عرضی پہ ایک بار دل سے غور ضرور کرنا سائیں ۔یا تو اسے دوسرے ملازموں کی لائن پہ لگا دیں یا پھر اس کے آگے پیچھے کا سارا پتا کروائیں ۔۔" رشید نے ایک اور آخری بار کوشش کی

"ٹھیک ہے رشید ۔۔۔مطمئن رہو تم ۔مجھے اس لڑکے پہ پہلی نظر میں بھروسہ ہو گیا تھا مگر تمہارے اطمینان کو میں پھر بھی ساری تفتیش کراتا ہوں ۔اب سکون سے جاؤ اور مطمئن ہو کے کام کرو ۔اور کا ہے بگاہے مجھے سب کی رپورٹ کرتے رہا کرو ۔۔۔" چوہدری صاحب نے اسے دلاسہ دیا۔آخر وہ سالوں سے کام کر رہا تھا۔چوہدری صاحب کا سب سے بھروسے والا آدمی ۔

"بھلی ہو سائیں ۔۔۔چلتا ہوں ۔" رشید اجازت لے کر چلا گیا

مگر چوہدری صاحب تکیے کی ٹیک لگ کر سوچ میں ڈوب گئے ۔ایک ماہ پہلے جب سلطان

دوسرے قیدیوں کے ساتھ لایا گیا تھا تو میں نے اس کی آنکھیں دیکھی تھی۔اور اکثر لوگوں کے من میں چاہے جتنا کھوٹ بھرا ہو ان کی آنکھیں ان کے من کے کھوٹ کا ساتھ نہیں دیتیں۔آنکھیں اکثر سچ اگل دیتی ہیں۔اور اس لڑکے کی آنکھیں میں نے اچھی طرح پڑھی تھیں۔ان میں کہیں میل کھوٹ، جھوٹ کچھ بھی نہیں تھا۔پھر رشید کو کیوں اتنا کھٹکا محسوس ہو رہا ہے۔؟

چوہدری صاحب سوچ میں ڈوبے دور کہیں پیچھے پہنچ چکے تھے۔

چوہدری صاحب نے اسی شام سلطان کو بلوا بھیجا۔شام کو گودام میں کام کرتے ہوئے جب چوہدری صاحب کی طرف حاضری کا پیغام آیا تو وہ دل میں کھٹکا ضرور تھا اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ سب کارستانی رشید کی ہی ہوگی۔خیر دل بڑا کر کے وہ چوہدری صاحب کے پاس پہنچ گیا۔۔۔

چوہدری صاحب ڈیرے پر اپنے مخصوص تخت پر براجمان تھے۔سردیوں کی آمد آمد تھی رات میں ہلکی ہلکی خنکی بھی در آئی تھی مگر ابھی اتنی بھی سردی نہیں آئی تھی کہ بندہ باہر بیٹھ ہی نا سکے۔

چوہدری صاحب کندھوں پر شال ڈالے اپنے ازلی اعتماد سے تخت پر براجمان تھے۔جیسے کوئی سپہ سالار قلعہ فتح کر کے شان و شوکت سے بیٹھا ہوتا ہے۔سلطان کے پہنچتے ہی اسے چوھدری صاحب نے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ وہیں حکم سنتے ہی کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا اور چوہدری صاحب کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

"آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا چوہدری صاحب۔۔۔"

کچھ پل یونہی خاموشی میں گزرے تو سلطان نے ہی ابتداء کر کے انہیں یاد دہانی کروائی۔

"ہاں سلطان کچھ باتیں کرنی تھی تم سے۔سکون سے بیٹھو" چوہدری صاحب نے اسے جواب دیتے ہی ساتھ کھڑے دو تین حواریوں کو وہاں سے جانے کا اشارہ دیا جو اشارہ پاتے ہی وہاں سے خاموشی سے کھسک گئے۔

"سلطان۔۔۔جانتے ہو میں بہت کم لوگوں پر اعتبار کرتا ہوں۔پہلے انہیں اعتبار کی بھٹی پر جلنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر وہ میری نظروں میں اپنی جگہہ بنا پاتے ہیں۔" تھوڑی دیر بعد جب وہاں سوائے

صرف ان دونوں کے سب چلے گئے تو چوہدری صاحب گویا ہوئے ۔لہجے میں وہی ہمیشہ والا ٹھہراؤ اور کروفر شامل تھا

" جی چوہدری صاحب جانتا ہوں میں ۔۔۔"

" اور تم وہ پہلے انسان ہو جسے میں نے بغیر پرکھے ،بغیر جانچے اسٹنٹ بنا دیا ۔صرف ایک نظر دیکھ کر ۔جانتے ہو کیوں ۔۔۔؟

کیونکہ پہلے ہی دن میں نے تمہاری آنکھیں پڑھ لیں تھیں ۔۔۔"

" میں آپ کا احسان مند ہوں چوہدری صاحب ۔آپ نے مجھ پردیسی کو سہارا دیا ۔جیل سے چھڑوایا اور روزگار فراہم کیا ۔میں بہت نیاز مند ہوں آپ کا ۔۔۔"

" سلطان مجھے کسی کی احسان مندی یا نیاز مندی کی کبھی ضرورت نہیں رہی ہے ۔مجھے صرف ایمانداری کی ضرورت ہے کام سے ایمانداری کی ،مجھ سے ایمانداری کی ۔۔"

" چوہدری صاحب میں نے جو وعدہ پہلے دن کیا تھا ۔جو ایمانداری کی قسم پہلے دن سے کھائی تھی ۔آج بھی اس پر قائم ہوں اور ہمیشہ رہوں گا ۔۔۔!"

" مگر مجھے کچھ شکایتیں موصول ہو رہی ہیں سلطان ۔۔۔قدم پھونک پھونک کر رکھنا خیال رہے ۔"

" جی ہاں چوہدری صاحب میں جانتا ہوں جو شکایتیں آپ تک پہنچی ہیں اور وجہ بھی جانتا ہوں کہ کیوں پہنچی ہیں ۔۔۔"

" اچھا تو بتاؤ پھر کیا وجہ ہے ۔اور کیوں یہ نوبت آئی ہے ۔؟"

" چوہدری صاحب مجھے آپ کچھ دن دے دیں ۔میں آپ کے سامنے .بہت کچھ حاضر کر دوں گا ۔ایسا کہ آپ نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا ۔۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا ۔۔۔کھل کر بتاؤ ۔۔؟" چوہدری صاحب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا

" چوہدری صاحب آپ نے جہاں اتنا اعتبار کیا کچھ دن مزید سہی ۔آپ مجھے تھوڑا وقت دیں ۔میں سب کچھ ثابت کر دوں گا ۔۔کہ کون غلط تھا اور کون سہی ۔کون آپ کے ساتھ ایماندار ہے اور کون نہیں"

" سلطان تم نے ابھی صرف میرا یہی ایک روپ دیکھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میرا دوسرا روپ بھی دیکھو۔ اگر تم غلط ثابت ہوئے اور یہ سب جھوٹ ثابت ہوا تو اس کا انجام تم بھی جانتے ہو۔ بہت برا ہوگا۔۔۔"

" جی چوہدری صاحب۔۔۔ اچھی طرح جانتا ہوں۔ بس کچھ دن مزید دے دیں مجھے۔۔۔"

" ٹھیک ہے۔ سلطان تمہارے آگے پیچھے کا کچھ بھی معلوم نہیں کسی کو۔ بجائے اس کے کہ میں دوسرے ذرائع سے معلوم کرواؤں آج اگر باتیں کھل ہی گئی ہیں تو خود سب کچھ بتادو کون ہو تم کہاں سے آئے ہو اس سے پہلے کیا کرتے تھے۔ سب کچھ سچ سچ۔۔۔"

سلطان نے بھی کچھ نا چھپایا سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ ایک بھی جھوٹ نہیں بولا۔ اپنے ماں باپ، ملوکھاں، نوری کی طلاق اور پھر گھر چھوڑنے کی وجہ، جیل تک پہنچنے کی کہانی سب من وعن بیان کر دی۔ چوہدری صاحب اس سے مطمئن ہو گئے تھے۔ تین چار گھنٹوں کی اس لمبی نشست کا خاتمہ ہوا تو سلطان نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ چوہدری صاحب کو مطمئن کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

مگر اسے رشید پر غصہ بھی تھا کہ خود ہی وہ چوہدری صاحب کی جڑیں کاٹ رہا ہے اور پھر سلطان کے خلاف چوہدری صاحب کا دماغ بھرنے پر بھی لگ چکا تھا

اس کے جانے کے بعد اسی رات چوہدری صاحب نے رشید کو بھی بلوا بھیجا اور سلطان کی کہانی دہرا کر اسے مطمئن کر دیا کہ یہ لڑکا کبھی دھوکہ نہیں دے سکتا۔

رشید جانتا تھا کہ سلطان چوہدری صاحب سے اسی ایک ملاقات کے بعد اب سیدھا ہو جائے گا اسے اپنی حیثیت اور میری حیثیت کا فرق بھی معلوم ہو چکا ہوگا۔ اس لیئے وہ اب سلطان کی طرف سے بے فکر ہو گیا۔

اور سلطان۔۔۔ اس نے رشید کے دھوکے کی خبر ڈائریکٹ جا کے چوہدری صاحب کو نہیں بتائی تھی وہ جانتا تھا کہ وہ ابھی نیا ہے اور رشید سالوں سے چوہدری صاحب کے ہاں کام کر رہا ہے۔ اسکی بات مانی جاتی ہے۔ سو سلطان نے مزید ثبوت اکٹھے کرنے کا سوچا۔

وہ نچلے عملے سے گھلنے ملنے لگا ان کے ساتھ مراسم بڑھا لیئے ان کو اعتماد میں لے آیا تو کچھ ہی دن کی محنت کے بعد وہ یہ جان چکا تھا کہ اس سے پہلے بھی نچلے عملے میں کافی سارے لوگ رشید کے اس غبن

سے واقف ہیں مگر انہوں نے چوہدری صاحب کے رعب اور رشید کی اجارہ داری کے سبب اپنی زبانیں بند کر رکھی ہیں۔

سلطان نے عملے میں سے جو اس بات سے واقف تھے کافی سارے لوگوں کو اعتماد دلایا۔ بڑی محنت کے بعد وہ لوگ چوہدری صاحب کے پاس چلنے پر آمادہ ہوئے تھے اور آج ایک ماہ بعد وہ سب سلطان ۔کی سربراہی میں چوہدری صاحب کے سامنے لائن میں کھڑے تھے۔

سلطان نے اس رات کی ساری کہانی من وعن بلاخوف وخطر چوہدری صاحب کے گوش گزار کر دی۔ چوہدری صاحب حیران تھے، بے یقین تھے

" اگر یہ الزام جھوٹ ثابت ہوا تو اس کا انجام جانتے ہو لڑکے ۔۔۔؟" چوہدری صاحب سخت غصیلے لہجے میں پھنکارے۔

" جی صاحب اچھی طرح جانتا ہوں۔آپ کا نمک کھایا ہے اس اجنبی شہر میں آپ نے پناہ دی میں آپ کے ساتھ دھوکہ کیسے برداشت کروں گا۔؟" سلطان کی ٹانگیں باقی ملازموں کی طرح بالکل نا کانپیں اور نا ہی زبان کانپی

" لڑکے ۔۔۔رشید یہاں سب سے پرانا اور با اعتماد بندہ ہے میرا۔ وہ ایک عرصے سے میرے ساتھ ہے۔ میرے سارے دھندے کی دیکھ بھال سب کچھ وہی کرتا ہے اور آج تم الزام لگا رہے ہو مجھے رشید دھوکہ دے رہا ہے۔۔غبن کر رہا ہے۔؟؟؟" چوہدری صاحب غیر یقین تھے

" میں جانتا تھا چوہدری صاحب کہ میری بات پر اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اسلئیے یہ سارے ملازم بطور گواہ حاضر ہیں۔" سلطان نے اپنے ساتھ کھڑے ملازموں کی طرف اشارہ کیا۔

اور چوہدری صاحب کو باری باری سب نے سچ بتا دیا کہ رشید کتنے عرصے سے چوہدری صاحب کے مال پر رات کی تاریکی میں ہاتھ صاف کرتا آرہا ہے مگر چوہدری صاحب نے اپنی آنکھوں پر اعتبار کی پٹی باندھ رکھی تھی۔

رشید کو حاضر کیا گیا تھا وہ حیران رہ گیا کہ سلطان اس طرح بھی کر سکتا ہے۔ کل کا لونڈا اس کیلئے اس

حد تک خطرناک ثابت ہو گا رشید نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

سب گواہان کی گواہی اسے جھوٹا ثابت کرنے کیلئے کافی تھی ۔مگر چوہدری صاحب نے ایک بار پھر ساری جانچ پڑتال اپنی نگرانی میں کروائی تھی ۔رشید کا غبن اور دھوکہ سامنے آچکا تھا۔چوہدری صاحب جان گئے تھے کہ وہ کس طرح اتنے عرصے اندر ہی اندر اپنے مالک کے مال پر ہاتھ صاف کر رہا ہے

چوہدری صاحب حیران تھے ۔غیر یقین تھے کہ ان کی آنکھوں نے کس طرح اتنا بڑا دھوکہ نا پہچانا ۔؟وہ اتنا عرصہ کس طرح رشید پر ساری ذمہ داری ڈالے مطمئن رہے۔

چوہدری صاحب نے اسی وقت ڈیرے پر رشید کو سخت سے سخت سزا دینے کا حکم سنایا۔اور اعلان کیا

" آج سے ہر وہ ذمہ داری جو رشید کے ذمہ تھی وہ سلطان سنبھالے گا۔۔آج سے سلطان میرے کام کا میرے دھندے کا انچارج ہے۔آج سے رشید کی جگہہ سلطان کام کرے گا۔"

☆......☆......☆

رنگا رنگ کہانیوں سے سجا، خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اُردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ) کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجیے۔نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ابھی sohnidigest@gmai.com پر ای میل کریں۔

گیارھواں حصہ

چوہدری صاحب نے رشید کو بے حد عبرتناک سزا دی تھی ۔اس دن چوہدری صاحب بہت جلال میں تھے ۔غصے سے ان کی آواز کانپ رہی تھی ۔سلطان نے چوہدری صاحب کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا ۔اسے ڈیرے کے ایک مخصوص اور تاریک کمرے میں الٹا لٹکا کر چھتر ول کی گئی ۔مسلسل ایک ہفتہ تک رشید کو یہی سزا ملتی رہی ۔وہ چیختا رہتا معافیاں مانگتا رہتا مگر چوہدری صاحب کے بندوں کے دل زم نا ہوتے ۔نرم ہوتے بھی کیسے وہ سب چوہدری صاحب کا کھاتے تھے ۔اس کے حکم کے بغیر ان کے ہاتھ بھلا کیسے رک سکتے تھے ۔

یہ آٹھواں روز تھا جب سلطان چوہدری صاحب کی غیر موجودگی میں رشید سے ملنے آیا تھا ۔اس مخصوص تاریک کمرے میں رشید مار کھانے کے بعد اپنے زخموں پر کراہ رہا تھا جب سلطان اس کمرے میں داخل ہوا ۔۔رشید سلطان کو دیکھتے ہی کسی بپھرے شیر کی طرح اٹھا تھا اور اس کے گریبان سے پکڑ لیا ۔اس نے اپنے زخموں کی پرواہ بھی نہیں کی تھی یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ سلطان کو بھی غصہ آگیا تو وہ اس پر بھاری پڑ سکتا ہے کیونکہ رشید زخمی بھی تھا اور سلطان اس کے مقابلے میں تندرست اور توانا تھا ۔مگر سلطان نے خود پر قابو رکھا اس نے رشید پر بالکل ہاتھ نا اٹھایا ۔

"تم میری جگہ لینا چاہتے تھے نا ۔یہی چاہتے تھے نا تم ۔اسی لیئے یہ ساری گیم کھیلی نا تم نے ۔۔۔؟

" وہ اسے گریبان سے جھنجھوڑتے ہوئے پھنکار کر پوچھ رہا تھا

"نہیں میں ایسا کچھ بھی نہیں چاہتا تھا رشید ۔لیکن میں چوہدری صاحب سے غبن بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا ۔تم جو کچھ اتنے عرصے سے کر رہے تھے اس کی آخر کبھی سزا ملنی ہی تھی تمہیں ۔" اس نے اپنا گریبان رشید کے ہاتھوں سے آزاد کراتے ہوئے متحمل لہجے میں کہا

" مجھے ایک بار نکلنے دو یہاں سے۔سارے بدلے لوں گا تم سے۔۔۔"

" رشید تم غلط کر رہے تھے۔میں نے ایسا عہدے کیلئے بالکل نہیں کیا۔اور نا ہی مجھے یہ معلوم تھا کہ چوہدری صاحب تمہیں ایسی سزا دیں گے۔۔۔"

" بکواس بند کرو اپنی۔جانتا ہوں میں تمہیں۔تم ابھی بچے ہو۔تمہاری عمر سے زیادہ عرصہ دیا ہے میں نے اس دھندے کو۔اگر تھوڑا بہت غبن کیا بھی تو میرا حق بنتا تھا۔میں نے بھی زندگی دی ہے اس دھندے کو۔۔۔"

"نہیں رشید ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا تمہیں۔اور نا ہی ایسا کرنے کا حق بنتا تھا تمہارا۔۔۔

خیر میں چوہدری صاحب سے تمہاری رہائی کی بات کروں گا۔یہ سزا تمہیں میں نے دلوائی ہے تو اسے ختم بھی میں ہی کرواؤں گا۔۔۔"

" اپنی ہمدریاں اپنے پاس رکھو۔اور دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔مجھے تمہاری کسی ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں ہے سمجھے۔۔۔اور ہاں ایک بات یاد رکھنا اگر میں باہر آگیا تو تم سکون کی سانس نہیں لے پاؤ گے کبھی۔یاد رکھنا۔۔۔"

" رسی جل گئی مگر بل نہیں گئیے۔۔۔" سلطان افسوس کرتا ھوا اس تاریک کمرے سے نکل آیا تھا ۔اس نے سچ میں دل میں سوچ لیا تھا کہ چوہدری صاحب سے رشید کیلئے ضرور بات کرے گا وہ

" بل تو میں تمہارے نکالوں گا یہاں سے نکلنے کے بعد۔یاد رکھنا سلطان" اس نے پیچھے سے اونچی آواز میں جواب دینا لازم سمجھا تھا

چوہدری صاحب نے رشید کو عبرتناک سزا دینے کے بعد سلطان کو رشید کی جگہہ دے دی۔اب وہ چوہدری صاحب کے ہر کالے دھندے کا انچارج تھا۔سارا کنٹرول اور مال کا حساب کتاب اسی کے ہاتھ آیا تو ایک بار تو سلطان کی ٹانگیں کانپ گئیں۔اسے یہ برداشت نہیں تھا کہ کوئی چوہدری صاحب سے دھوکہ کرے اسلئیے سلطان نے رشید کو سزا دلوانے کیلئے یہ ساری گیم کھیلی مگر اس نے یہ بالکل نہیں سوچا تھا کہ چوہدری صاحب اسے رشید کی جگہہ دے دیں گے۔اس کی وجہ یہ کہ وہ یہاں مستقل کام نہیں کرنا چاہتا تھا

۔جانتا تھا یہ کام نہیں گناہوں کی دلدل ہے ۔اور وہ جلد از جلد بہت سا پیسہ کما کر اس دلدل سے ہمیشہ کیلیئے نکل جانے کا پروگرام بنائے بیٹھا تھا۔اسے واپس پیچھے اپنے گاؤں شاہ والی جانا تھا۔جہاں ملوکھاں اسکی راہ دیکھ رہی ہوگی ،اس کا بچہ اس دنیا میں آچکا ہوگا ،اسے اپنے چھوٹے سے خاندان کیلئے ابا کے اینٹوں والے اڈے پر گھر بنانا تھا۔پھر اماں ابا سے معافی بھی تو مانگنی تھی ۔جانتا تھا کہ اس کے ماں باپ اسے بے حد چاہتے ہیں وہ ان سے معافی مانگے گا گڑگڑائے گا ان کے پاؤں پکڑے گا تو وہ اسے معاف کردیں گے مگر وہ یہ بھول بیٹھا تھا کہ جس کا پاؤں ایک بار کسی دلدل میں پڑ جائے تو وہ اس میں دھنستا ہی چلا جاتا ہے ۔ہزار ہاتھ پاؤں مارے چیخے چلائے مدد کو پکارے مگر اسے باہر آنا نصیب نہیں ہوتا۔

کیونکہ دلدل صرف اپنے اندر کیطرف کھینچتی ہے وہ بھی دھنسنے لگا ۔ذمہ داریاں بڑھنے لگیں تو اس دھندے میں مزید الجھتا چلا گیا۔چوہدری صاحب اس پر بہت زیادہ اعتبار کرنے لگے ۔کہ ایک شخص جو سالوں سے میرا نمک کھاتا رہا اسی نے دھوکہ دیا اور سلطان جسے آئے تین ماہ نہیں ہوئے اسے چوہدری صاحب سے بے ایمانی برداشت نا ہوئی ۔اب چوہدری صاحب کیلئے سب کچھ وہی تھے ۔وہ ہر روز رات کو کھانا کھانے سے پہلے سلطان کو ڈیرے پر بلوا بھیجتے اور اسے اپنے ساتھ تخت پر بٹھا کر کھانا کھاتے ۔چوہدری صاحب بے اولاد تھے سلطان کی شکل میں اسے بیٹا مل گیا جو اس کا کاروبار پوری ایمانداری سے سنبھال رہا تھا۔ایسا نہیں تھا کہ چوہدری صاحب نے ایک بار دھوکہ کھانے کے بعد پھر وہی اعتبار کی کالی پٹی آنکھوں پر باندھ لی ہو انہوں نے کئی بار سلطان کو آزمایا اور وہ ہر آزمائش میں پورا اترا۔

تبھی چوہدری صاحب کو بھی سلطان پر مکمل یقین آگیا اور وہ اسے اپنا بیٹا سمجھنے لگے ۔انہی دنوں رات کو ڈیرے پر کھانا کھاتے ہوئے سلطان نے چوہدری صاحب سے رشید کی سزا ختم کرنے کی درخواست کی تھی ۔چوہدری صاحب نے اسے بتایا کہ وہ دھندے میں بے ایمانی کبھی برداشت نہیں کر سکتے ۔وہ اگر اچھوں کیلیئے اچھے ہیں تو بروں کیلئے بہت برے بھی ثابت ہوتے ہیں ۔پھر بھی سلطان کی سفارش پر اس کی سزا کم کر کے دو ہفتوں بعد رشید کو چھوڑ دیا تھا۔مگر اسے ڈیرے پر کبھی واپس نا آنے کا حکم بھی چوہدری صاحب نے صادر کر دیا تھا

وقت پر لگائے اڑنے لگا۔دن مہینوں میں تبدیل ہوئے ایک سال مزید گزر گیا۔

اس تمام عرصے میں چوہدری صاحب نے سلطان سے اسی کی زبانی وہ تمام حالات جان لیئے جس کیلئے اس نے گھر اور گاؤں چھوڑا تھا۔اور انہوں نے سلطان کو وعدہ دیا کہ وہ ایک دن اسے اس کے گاؤں ضرور واپس لے جائیں گے

چوہدری صاحب کا دھندا برا سہی مگر وہ دل کے اچھے انسان بھی تھے۔دنگے فساد کرواتے تھے مگر کئی بار غریبوں کی ان دیکھی مدد بھی

کرتے۔دیگیں پکوا کر کسی انجان کے نام سے مسجد بجھواتے۔خیراتیں کرتے عیدین پر غرباء کے گھروں میں کپڑے اور پیسے بجھواتے۔ان کے اندر بھی کہیں نا کہیں ایک نیک انسان ضرور چھپا ہوا تھا برے دھندے انسان کو برا ضرور کر دیتے ہیں مگر ہر انسان کے دل میں کہیں نا کہیں تھوڑی سی نیکی بھی ضرور موجود ہوتی ہے۔ضرورت اس نیکی کو تلاش کرنے کی ہوتی ہے۔مگر ہم انسان گناہ پر گناہ کرتے چلے جاتے اور ہمارے دل میں موجود اس تھوڑی سی نیکی پر گناہوں کی پرتیں آجاتیں ہیں۔وہ تھوڑی سی نیکی وہیں گناہوں کی ان گنت پرتوں کے بیچ کہیں گم ہو جاتی ہے مگر انسان جو سوچتا ہے ضروری نہیں ہوتا کہ ہمیشہ وہی ہو۔

چوہدری صاحب سے سزا پانے اور اڈے سے ہمیشہ کیلیئے دھتکارے جانے کے رشید آرام سے نہیں بیٹھا تھا۔وہ دل میں بدلہ پال رہا تھا مگر اس کے پاس کوئی ایسے وسائل نہیں تھے جس کی بنیاد پر وہ چوہدری صاحب سے ٹکر لیتے یا سلطان سے بدلہ لیتے کیونکہ جب تک چوہدری صاحب کا ہاتھ اس کے سر پر تھا وہ اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا تھا۔وہ کسی اچھے موقعے کے انتظار میں سلگنے لگا۔کوئی ایسا موقع جس کے ذریعے وہ اپنا بدلہ بھی لے سکتا اور کسی کی نظروں میں بھی نا آتا۔

سال بعد ملک میں حکومت تبدیل ہوئی تو ملک کے حالات تبدیل ہونے لگے۔فوجی حکومت آگئی جگہہ جگہہ چھاپے پڑنے لگے۔گرفتاریاں ہونے لگیں۔چوہدری صاحب جیسے کئی اور لوگوں کے دھندے ہمیشہ کیلئے ٹھپ ہونے لگے۔ایسے لوگوں کی پناہ گاہ جیل کی کال کوٹھڑی بننے لگی۔یہی وہ دن تھے

جب رشید کو لگا اس کے بدلہ لینے کا وقت آپہنچا ہے۔اب وہ اپنے پورے حساب گن گن کر لے سکتا تھا۔اور یہی وہ رشید ہی تھا جس نے انجان ذرائع بن کر او پر تک چوہدری صاحب کے خفیہ اڈوں کی مخبری کی تھی۔

اور پھر وہ وقت بھی آگیا جب چوہدری صاحب اور اسکے دھندے پر بھی خطرات منڈلانے لگے

۔ان کے تین اڈوں میں سے

ایک چھوٹے اڈے پر دو دن پہلے چھاپہ پڑ چکا تھا

وہاں پر موجود تمام ملازمین کو گرفتار کر کے سارا اسلحہ ضبط کرلیا گیا تھا۔اب اگلا چھاپہ کسی وقت بھی مرکزی اڈے پر پڑ سکتا تھا۔چوہدری صاحب سمیت سب کو اپنی زندگیوں پر خطرے کے بادل منڈلاتے نظر آنے لگے ۔چوہدری صاحب کے ڈیرے پر ان دنوں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی ۔اچانک کسی وقت بھی پڑنے والا چھاپہ ان سب کو ہمیشہ کیلئے جیل میں دھکیل سکتا تھا۔اس سے پہلے ہی کچھ کرنا تھا۔انہیں اب اپنا بچاؤ کرنا تھا۔چوہدری صاحب نے اسی دن تمام اسلحہ زیر زمین دفن کروانے کے بعد تمام ملازمین کو غیر معینہ مدت کیلئے چھٹی دے دی جب تک حالات دھندے کیلیئے دوبارہ سازگار نہیں ہوتے۔

" سلطان ۔۔۔وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ہمیں اب یہاں سے نکلنا ہوگا۔۔۔" اس دن رات کو ڈیرے کی بجائے چوہدری صاحب نے سلطان کو اپنے گھر بلوایا تھا

" مگر ہم جائیں گے کہاں چوہدری صاحب۔جگہہ جگہہ چھاپے پڑ رہے ہیں۔ہمارا بچنا ناممکن ہے ۔مگر میں آپ کے ساتھ ہوں آخری وقت تک۔" سلطان نے آخری وقت تک اپنی وفاداری کا یقین دلایا

" جانتا ہوں سلطان تم مجھے کبھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتے ۔اور نا ہی میں تمہیں اکیلا ہونے دوں گا ۔ہمارے پاس بچ نکلنے کا ایک آخری راستہ اس ملک سے فرار ہے۔ہمیں کچھ سالوں کیلئے باہر جانا ہوگا۔"

" مگر کیسے چوہدری صاحب۔" سلطان کی سٹی گم ہو چکی تھی ۔حالات کیسے بھی سہی مگر وہ چوہدری صاحب کو کسی صورت اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

" وہ سب میں سنبھال لوں گا سلطان ۔ایسے ہی کسی برے وقت کیلئے میں نے کافی سارا پیسہ لندن بنک میں جمع کرا رکھا تھا۔اب وہ وقت آگیا ہے۔ہمیں جلد از جلد پاکستان چھوڑ کر لندن نکلنا ہوگا۔اور تم

میرے لئیے میری فیملی ممبر میری اولاد کی طرح ہو۔میں تمہیں یہاں ہمیشہ کیلئے جیل نہیں جانے دوں گا ۔جب حالات سازگار ہوئے ہم واپس وطن لوٹ آئیں گے۔تم تیار ہونا۔۔؟؟؟"

سلطان کشمکش میں مبتلا ہوگیا۔ایک طرف چوہدری صاحب اور ان سے آخری دم تک وفاداری کا وعدہ۔دوسری طرف گاؤں ،ماں باپ ،ملوکھاں اور اس کا بچہ۔اس کی آنکھوں کے سامنے باری باری سب کے چہرے گھومنے لگے۔ملک چھوڑنے کا مطلب وہ واپس بھی پلٹ پائیں گے یا نہیں

" سوچ کیا رہے ہو سلطان ۔وقت کم ہے۔میں تمہیں یہاں نہیں چھوڑنا چاہتا تم اپنا فیصلہ بتاؤ جلدی ۔وقت بہت کم ہے۔" اس بار چوہدری صاحب کچھ اونچی آواز میں بولے

" میں تیار ہوں چوہدری صاحب ۔آپکے ساتھ ہر جگہہ ۔ہر میدان میں اپنے آخری سانس تک آپ کے ساتھ رہے گا سلطان۔" آواز جانے کتنے گہرے کنویں سے نکلی مگر وہ خود کو بولتے سن رہا تھا۔چوہدری صاحب نے فرط جذبات سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور وہ گم صم بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا

☆......☆......☆

وقت اپنی اسی ازلی رفتار سے بھاگتا رہا۔دن، مہینے ،سال ایک دوسرے کا پیراہن بدلتے رہے ۔جنت نے بچپن سے نکل کر لڑکپن میں قدم رکھا۔وہ بچپن سے ہی پڑھنے میں بہت اچھی تھی۔بہت جلد اس نے اپنا ناظرہ قرآن ختم کرلیا۔مولوی صاحب کی کبھی کبھار جنت کے ابا سے ملاقات ہوتی تو وہ انہیں جنت کی قرآن پڑھنے میں روانی کا ضرور بتاتے۔زمیندار صاحب کا دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا۔

قرآن شریف ختم کیا تو ابا نے جنت کو گاؤں کے واحد پرائیویٹ مڈل سکول میں عابد صاحب کے پاس داخل کروا دیا۔تھوڑی سی محنت اور لگن اور اساتذہ کی بھرپور توجہ کے باعث اس نے مڈل کلاس بھی اچھے نمبروں سے عبور کرلی۔

مگر آگے وہ خواہش کے باوجود بھی نا پڑھ سکی۔کیونکہ گاؤں میں ہائی سکول کی سہولت ابھی تک میسر نہیں تھی۔اور زمیندار صاحب اسے اکیلے نزدیکی شہر میں پڑھانے کے حق میں نہیں تھے۔ہاں اگر باقی گاؤں کی بچیاں بھی نزدیکی شہر پڑھ رہی ہوتی تو وہ بھی ضرور حامی بھرتے اور ہر حال میں بیٹی کی

تعلیمی خواہش پوری کرتے ۔مگر گاؤں بہت پسماندہ تھا لوگ اپنی بیٹیوں کو دوسرے شہر پڑھنے بھیجنے کے حق میں نا تھے ۔یہیں گاؤں کے سکول میں ان کی بیٹیوں نے پرائمری، مڈل پاس کرلیا ان سب کیلئے یہی غنیمت تھی ۔سو جنت کی آگے پڑھنے کی خواہش دل میں ہی رہ گئی ۔اور اسی خواہش کو دل میں رکھے وہ روز بروز عمر کی سیڑھیاں پھلانگتے بڑی ہونے لگی

اس کا بچپن، لڑکپن بھی پر لگائے کب اڑ گیا اسے پتا ہی نا چلا ۔اور اب وہ اٹھارہ انیس سالہ نوجوان لڑکی کا روپ دھار چکی تھی ۔ماں سے سانولا دل میں اترنے والا رنگ اور باپ سے اونچا قد کاٹھ اسے وراثت میں ملا تھا ۔لمبے لمبے بالوں کو اکثر پراندہ ڈال کے پیٹھ پر ڈالتی تو کسی کالے ناگ کی طرح پراندہ اس کی پیٹھ پر یہاں سے وہاں لٹکتا رہتا ۔باوجود اس کے کہ وہ بہت زیادہ گوری چٹی نہیں تھی مگر پھر بھی خدا نے اسے ایسی شخصیت نواز دی تھی کہ وہ پہلی ہی نظر میں کسی کے دل میں اتر سکتی تھی ۔وہ ایک گاؤں کی سنجیدہ الہڑ مٹیار کی جیتی جاگتی تصویر تھی ۔

جنت کا حلقہ احباب زیادہ نہیں تھا صرف اپنے محلے کی لڑکیوں تک محدود تھا اور ان پانچ سات سہیلیوں میں وہ ہمیشہ سب سے نمایاں لگتی تھی اپنی چال ڈھال سے، اپنے اٹھنے بیٹھنے بات کرنے کے سلیقے اور پہناوے سے وہ ہمیشہ سب سہیلیوں میں ممتاز رہتی ۔

" نور بانو ۔۔۔وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے نا ۔مجھے وہ دن بالکل کل کی یاد ہے جب اللہ نے ہماری جھولی میں جنت کو ڈالا تھا ۔اور دیکھو اب اس کیلئے رشتے آنا بھی شروع ہو گئے ۔" زمیندار صاحب نے دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہا جیسے کوئی پرانی بات یاد کر رہے ہوں

ان کے ساتھ ہی نور بانو لسی بنا رہی تھیں ۔خاوند کو کہیں کھویا دیکھ کر چونک گئی

" صحیح کہتے ہیں آپ ۔۔۔بڑے بڑوں سے سنا تھا کہ" سال چکی کے پھیر جیسا ہوتا ہے" سچ کہتے تھے پتا ہی نہیں چلتا کس طرح اور کتنی جلدی اتنے سال گزر بھی گئے ۔"

وہ اب شوہر کیلئے گلاس میں لسی انڈیل رہی تھی ۔گھر کے مویشی اپنے تھے دو گائیں اور ایک بھینس پال رکھی تھی ۔دودھ، مکھن، ملائی سب گھر میں ہمیشہ وافر مقدار میں ہی ہوتا تھا بلکہ لسی تو اتنی زیادہ ہوتی کہ

محلے کی سب عورتیں بھی لسی نور بانو سے ہی آ کے لیتی تھیں۔

زمیندار صاحب بھی لسی شوق سے پیتے تھے۔ہر روز دن کے کھانے کے وقت انہیں لسی کی لازمی طلب رہتی تھی۔

"یہ لیجیے۔خیالوں سے ذرا باہر آ کر ایک گلاس لسی پی لیں۔دل کو ٹھنڈک مل جائے گی۔"لسی کا گلاس پکڑاتے ہوئے اسے مذاق سوجھا

زمیندار صاحب مسکرا دیئے۔اور گلاس لے لیا

اگلے پل نور بانو دوبارہ لسی بنانے کے خیال سے مڑی تو وہ اگلا قدم نا اٹھا سکی

زمیندار صاحب نے ان کے لمبے جھولتے رنگے برنگے پراندے سے ہلکا سا پکڑ کر واپس کھینچا۔

"یہاں بیٹھو بھلی جہان کی۔اور بتاؤ کیسا لگا ہے تمہیں رشتہ۔اپنی جنت کیلئے۔۔۔" اب کی بار مذاق زمیندار صاحب نے کیا تو نور بانو ان کے ساتھ وہیں چار پائی پر بیٹھ گئی

"دل سے بتاؤں تو میرا دل نہیں مان رہا اس رشتے کیلئے۔" انہوں نے دروغ گوئی سے بالکل کام نہیں لیا۔دل کا سچ بتا دیا

"کیوں ایسی کیا وجہ ہے۔؟ اکرم اچھا لڑکا ہے۔عزت دار اور کھاتے پیتے گھرانے سے ہے۔اپنی جنت خوش رہے گی وہاں۔اور جنت خوش ہو گی تو ہمیں بھی خوشی ہو گی کہ اکلوتی بیٹی کا ہاتھ کسی اچھی جگہہ دیا ہے۔" زمیندار صاحب اکرم والے رشتے کے حق میں تھے اور دیکھا جائے تو رشتہ مناسب بھی تھا۔اکرم کے والد زمیندار صاحب کی طرح بستی کے گنے چنے زمینداروں میں سے تھے۔

"آپ کی ساری باتیں صحیح ہیں۔رشتہ ہر لحاظ سے مناسب ہے۔مگر جانے کیوں میرا دل نہیں مان رہا۔" نور بانو ابھی تک وہیں اٹکی بیٹھی تھی

"مگر کیوں ایسی کیا وجہ ہے۔ایسی بات کیا ہے آخر پتا تو چلے۔۔۔؟" اس بار چوہدری صاحب کے لہجے میں کچھ تشویش شامل تھیں

"پتا نہیں کیوں زمیندار صاحب۔وجہ شاید مجھے خود بھی نہیں معلوم۔اور ابھی جنت اتنی بھی بڑی تو

نہیں ہوئی نا کہ پہلا رشتہ آیا اور ہم اس کے پلو سے بیٹی باندھ دیں ۔" نور بانو کو اور کوئی دلیل نا سوجھی تو جنت کی کم عمری کا جواز رکھ دیا

" جنت اتنی بڑی تو نہیں ہوگئی مگر رشتہ اتنا اچھا ہے ۔اچھے رشتے بار بار دستک نہیں دیتے ۔ہم پلہ لوگ ہیں ۔حالانکہ اکرم کے چچا کی بیٹی بھی اسی کی ہم عمر ہے اور کنواری بیٹھی ہے ۔مگر اکرم کے والد نے ہمیں عزت دی ۔رشتے کیلئے سب سے پہلے ہمارا در کھٹکھٹایا۔"

" اس کی بھی وجہ ہے زمیندار صاحب ۔۔۔صدیق میاں جانتے ہیں کہ پچھلے کچھ سالوں سے ان کے بھائی کے حالات کچھ اچھے نہیں ہیں ۔نا ہی اس کی زمینیں کچھ خاص اگل رہی ہیں ۔ہماری ایک ہی بیٹی ہے وہ جانتے ہیں سب کچھ ہم نے اپنی بیٹی کو ہی دینا ہے ۔ان کی نظر آپ سے زیادہ آپ کی زمینوں پر ہے ۔۔۔"

" بات تو تمہاری سولہ آنے درست ہے ۔لیکن آج کے دور میں ہر کوئی اچھی جگہ ہاتھ مارتا ہے ۔اگر اس نے ایسا سوچا بھی تو کچھ غلط نہیں کیا۔اور اس بات سے ہٹ کر مجھے اکرم اپنی جنت کیلئے مناسب بھی لگتا ہے۔"

نور بانو کے پاس اب کوئی جواز باقی نا رہا تھا۔اور اس پل جنت کمرے سے باہر نکلی تو ان کی گفتگو کو بھی بریک لگ گئی ۔نور بانو نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔وہ اٹھ کے واپس چلی گئی تو جنت نے اس کی جگہ باپ کے ساتھ سنبھال لی ۔

" جنت پتر ۔۔۔ایک بات کرنی ہے تم سے ۔دیکھو پتر میں تمہارا باپ ہوں اور جو پوچھنے لگا ہوں وہ تمہارا حق ہے۔ مطلب کہ پوچھ کر تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا" وہ ان کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولے

" جی ابا بولیں ۔ایسی کیا خاص بات ہے۔" وہ حیران ہوئی پہلے تو ابا نے کبھی اس طرح بات نا کی تھی

" بیٹا تمہارے لیئے رشتہ آیا ہے صدیق زمیندار کے بیٹے اکرم کا۔کھاتے پیتے لوگ ہیں ۔تم خوش رہو گی ۔مجھے تو یہ رشتہ بہت پسند ہے ۔تم بتاؤ اب تم خوش ہو اس رشتے پر؟"

وہ ہکا بکا رہ گئی۔اسے کچھ سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا بولے

"اور بیٹی ہم کبھی تمہارے ساتھ کوئی زبردستی بالکل نہیں کریں گے تم ہماری اکلوتی پیٹی ہو۔یہ تمہارا حق ہے اور اپنا حق تم استعمال کر سکتی ہے۔اور آخری فیصلہ بھی وہی ہوگا جو تمہارا ہوگا۔۔" زمیندار صاحب نے ساری ذمہ داری سارا اختیار جنت کو سونپ دیا

جنت تو بس ابا کا منہ تکتی رہ گئی۔پھر اماں کو دیکھا شاید وہ مدد کو آجائیں۔مگر وہ بھی دو میٹر کے فاصلے پر بیٹھی ان کی طرف دیکھتی ہمہ تن گوش تھی۔کیا جواب دیتی وہ۔لفظ زبان سے نکل ہی نہیں رہے تھے۔جنت کی نظریں ایک بار پھر ابا کے چہرے پر آٹکیں جو متواتر اسی کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔جنت کے لب ہلکے سے کھلے۔اس سے پہلے کہ اس کے لبوں سے کچھ باہر نکلتا اسکی آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ آیا۔وہ پھر سے کھو گئیں اس چہرے میں

"جنت بولو بیٹا۔بتاؤ کیا چاہتی ہو تم۔۔؟" زمیندار صاحب نے آہستہ سے بیٹی کا شانہ ہلا کر ایک بار پھر پوچھا تو وہ چونک گئی جیسے کسی خیال سے ابھی ابھی باہر نکلی ہو۔اور اس نے ایک بار پھر باپ کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا اور اگلے ہی پل ایک جھٹکے سے وہ چارپائی سے اٹھی۔اور لمبے لمبے قدم اٹھاتی واپس اندر کمرے میں چلی گئی۔زمیندار صاحب وہیں حیران پریشان بیٹھے رہ گئے۔اور تھوڑے فاصلے پر بیٹھی نور بانو نے اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی۔سینہ ہلکا ہو گیا تھا جیسے کافی سارا بوجھ ہٹ گیا ہو

تھوڑی دیر خاموش بیٹھنے کے بعد چوہدری صاحب بازار کی طرف چل دیئے تو نور بانو لسی کا گلاس بنا کر اندر جنت کے پاس آگئی اور اسے لسی کا گلاس پکڑایا جو اس نے چپکے سے تھام لیا تھا۔

"تم اس رشتے پر خوش نہیں ہو نا جنت۔۔؟" یہ جنت کا پہلی بار کوئی رشتہ آرہا تھا وہ بھی اتنے اچھے زمیندار کھاتے پیتے گھرانے سے

"آپ خوش ہیں کیا۔۔؟" اس نے سوال کا جواب دینے کی بجائے الٹا ماں سے سوال کر دیا

"نہیں جنت۔۔۔میں دل سے خوش نہیں ہوں۔۔۔"

" تو بھلا میں کیسے خوش ہو سکتی ہوں اماں۔۔۔؟
یہ کیسے سوچ لیا آپ نے۔۔۔؟"
" مجھے اپنی بیٹی سے یہی امید تھی۔" اس نے جنت کی پیشانی چومتے ہوئے اسے لسی پی لینے کا اشارہ کیا اور خود باہر آ گئی۔

☆......☆......☆

" اوئے اتنی اداس کیوں ہو تم۔۔" خوشی نے اوپر سے ہی آواز لگائی وہ بیری کے درخت کے اوپر بیٹھا پتے توڑ توڑ کر درخت کے نیچے بیٹھی جنت کے اوپر پھینک رہا تھا۔مگر جواب ندارد۔
بیری کے پتے اس کے بالوں پر گر رہے تھے ایک دو پتہ اس کے بالوں میں کہیں اڑ گیا تھا باقی سرک کر نیچے گر رہے تھے۔
مگر جنت نے انہیں بالوں سے ہٹانا لازمی نہیں سمجھا۔عجیب سوگواری کیفیت تھی دل کی
خوشی کو جنت کی خاموشی سے الجھن ہونے لگی۔ایسا تو کبھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اتنی خاموشی اوڑھے بیٹھی رہے۔
" دیکھو کتنا اچھا موسم ہے آج
اور تم اداس بیٹھی ہو۔تم پر اس پیارے سے موسم کا کچھ اثر نہیں ہو رہا؟؟؟"
وہ جنت کو بولنے پر اکسانے لگا
وہ دونوں جنت کی زمینوں پر آئے ہوئے تھے موسم آج صبح سے خوشگوار تھا اسی موسم کی خوشگواریت کو اپنے اندر اتارنے کیلیئے وہ دونوں زمینوں پر نکل آئے۔یہاں گھر نہیں تھے۔ہر طرف فصلیں ہی فصلیں۔جہاں تک نگاہ جائے ہوا میں لہلہاتے کھیت۔گنے کے کھیت،سورج مکھی کے بڑے بڑے پیلے پھولوں والے کھیت۔سورج کو آج بادلوں نے مات دے رکھی تھی وہ اپنی حرارت روز کی طرح زمین پر پہنچانے میں ناکام تھا۔بادلوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ہر طرف سے سورج کو گھیر لیا تھا۔
" جنت۔۔۔تم سے بات کر رہا

ہوں میں۔ بتاؤ کیوں چپ ہو؟" اس نے ایک بار پھر اوپر سے ہانک لگائی۔
" کبھی کبھی کسی لمحے میں انسان کی زبان سے نکلنے والی بات سچ بھی ہو جاتی ہے۔" وہ بولی تو لہجا اداس تھا
"کیا مطلب۔۔۔" خوشی الجھا
" تم نے ایک بار پوچھا تھا نا کہ اگر کبھی ہمارے بیچ کوئی آگیا تو۔۔۔"
" ہاں۔۔۔ تو پھر۔۔۔؟؟؟" خوشی اوپر بیٹھا ہمہ تن گوش ہو چکا تھا۔ درخت کی ڈال پر بیٹھے اس کا سارا جسم کان بن کر جنت کی اگلی بات سننے کے انتظار میں تھا۔
اور وہ نیچے بیٹھی اداسی کی تصویر بنی سرمی کے پیلے پھولوں کو محویت سے دیکھ رہی تھی مگر آنکھیں کہیں اور رہی اسکی سماعتیں خوشی کی طرف تھیں۔
" تو وہ وقت آگیا ہے۔ اب ہمارے بیچ کوئی تیسرا آنے والا ہے۔" جنت اسی پہلے اداس لہجے میں بولی۔ آواز جیسے کسی ساکت مجسمے کے اندر سے نکل رہی ہو۔
دھڑام کی آواز کے ساتھ خوشی نے اوپر سے چھلانگ لگائی اور اگلے لمحے وہ جنت کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔
" آرام سے اترا کرو نا۔ ٹانگ زخمی ہو جاتی یا ہڈی مڑ جاتی تو۔۔۔" وہ اس کے اچانک اس طرح چھلانگ لگا کر نیچے کودنے سے پہلے تو ڈر گئی پھر اسے ڈانٹنے لگی۔
" مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ تم جلدی پوری بات بتاؤ۔۔۔" وہ بے صبرا ہونے لگا اپنی فکر نہیں تھی اسے
"کون۔۔۔ ایسا کون ہے وہ؟"
چھلانگ لگانے سے سارا وزن ٹانگوں پر آیا تو بائیں ٹانگ میں درد کی ایک لہر اٹھی۔ مگر اسے درد یاد نا رہا
" صدیق چچا کے بیٹے اکرم کا رشتہ آیا ہے میرے لیے۔۔۔" اسی مجسمے سے ایک بار پھر آواز نکلی

" اور ابا بھی خوش ہیں اس رشتے ہیں۔۔۔"

اب کی بار مجسمہ ایک نہیں تھا سامنے بیٹھا لڑکا بھی مجسمہ بن گیا۔جانتا تھا صدیق چچا بھی بڑے زمیندار ہیں۔بڑے لوگ اپنے رشتے بڑوں میں ہی کریں گے۔اپنے جیسے ہم پلہ لوگوں میں۔

خوشی کو چپ سی لگ گئی۔جامد چپ۔تھوڑی دیر

پہلے کا چلبلا پن ہوا میں اڑ گیا۔اب دونوں کی حالت ایک سی تھی۔دور سے دیکھو تو جیسے کسی مصور نے کھیت کھلیانوں کو اپنے کینوس پر پینٹ کر کے وہاں بیری کے درخت تلے دو انسانوں کے مبہم ہیولے سے بنا دیئے ہوں

" اب تم بتاؤ خوشی۔۔۔یہ سہانا موسم اب تمہیں کیوں نہیں لبھا رہا۔۔؟اب یہ خوبصورت موسم اپنا اثر کیوں نہیں دکھا رہا تم پر۔۔۔یہی وجہ تھی۔۔۔" اب کی بار جنت نے سامنے بیٹھے مجسمے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

مگر اب خوشی کے پاس کوئی جواب نا تھا۔وہ اسی طرح چپ بیٹھا رہا

باہر کا موسم کتنا پیارا سہی اگر انسان کے اندر ویرانی چھا جائے،اگر اندر خزاں کا ڈیرہ ہو اور مایوسی نے خیمے گاڑے ہوں تو باہر کی موسمی بہاریں اسے لبھانے میں ناکام ہی رہتیں ہیں بھلے سارے جہاں کی رونقیں اکٹھی کر لو۔یہاں بھی کچھ ایسا ہی تھا

" اب بولو بھی کچھ۔۔۔اتنے چپ کیوں ہو گئے ہو خوشی۔۔؟" جنت کو خوشی کی خاموشی کھلنے لگی

"کیا بولوں۔۔۔؟

" کچھ تو بولو۔۔۔"

" اور پھپھو بھی راضی ہوگئی ہیں۔۔۔؟" ایک آخری امید نے سر اٹھایا تھا

"نہیں وہ دل سے راضی نہیں ہیں۔اور ابا نے سارا اختیار مجھے سونپا ہے۔"

" پھر تم نے کیا کہا۔۔۔؟"

"میں کیا کہتی بھلا۔خاموشی سے اٹھ کے وہاں سے چلی گئی۔مجھ سے کچھ بھی بولا نہیں گیا اس وقت۔۔۔"

وہ اس کا جواب سن کر خاموش ہو گیا تھا۔جانے کیوں

"میں چلوں۔۔۔؟"

"آج اتنا جلدی کیوں۔۔۔؟"

"بس دل نہیں لگ رہا اب کسی چیز میں۔۔۔میں چلتا ہوں۔تم پھپھو کے ساتھ آجانا۔۔۔"

وہ اسے روک نا سکی۔جانے دیا

خوشی اسی خاموشی سے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلتا واپس جانے لگا۔اندر سے ایک عجیب سے احساس نے وہاں کنڈلی مار کر پھن پھیلا لیا تھا جیسے اس کا کچھ گم ہو گیا اور یاد بھی نا آرہا ہو۔

تھوڑا فاصلہ طے کر کے آگے صدیق چچا کی زمینیں شروع ہو گئی تھی۔کھیت میں ایک طرف چچا اپنے بیٹے اکرم اور دو تین مردوں کے ساتھ کھڑے باتوں میں مشغول تھے۔پورا کھیت آونچے اونچے کماد سے بھرا کھڑا تھا۔اس کی نظر صرف اکرم پر ہی جا کے ٹک گئی تھی۔جانے کیوں اس پل اسے اکرم بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

حالانکہ اسی اکرم کے ساتھ اس کی اچھی گپ شپ تھی وہ دونوں ہم عمر تھے سکول بھی مڈل تک ساتھ ہی پڑھا تھا۔مگر جانے اس لمحے اس سے کیوں عجیب سی پرخاش سی ہونے لگی تھی

وہ تھوڑی دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد پھر سے پگڈنڈیوں پر چلنا شروع کر چکا تھا۔

اسے لگنے لگا کہ وہ شاید لا حاصل خواب دیکھ رہا تھا۔ایسے شخص کو پانے کی سوچ رہا تھا جو اس کی دسترس سے شاید بہت دور تھا

☆......☆......☆

چوہدری صاحب کیلئے ویزا، پاسپورٹ یا کاغذات بنوانا کوئی بڑی بات نہیں تھیں۔سو انہوں نے جلد از جلد یہ کام مکمل کروا لیا۔اور انہوں نے شکر بھی ادا کیا تھا کہ دوبارہ کوئی بھی چھاپہ ابھی تک نہیں پڑا تھا۔مگر وہ غفلت برتنے والے انسان نہیں تھے۔جانتے تھے کہ تھوڑی سی غفلت بھی انہیں بہت مہنگی پڑ سکتی تھی۔اور وہ چاہتے بھی یہی تھے کہ اگلی ساری زندگی سلاخوں کے پیچھے گزارنے سے بہتر ہے کسی ایسی جگہ پناہ لی جائے جہاں تک پاکستانی پولیس کے ہاتھ باآسانی نا پہنچ سکیں۔سو انہوں نے لندن کا انتخاب کیا۔

یہاں چوہدری صاحب کے ہمدردوں اور دوست احباب کی کمی نہیں تھی اور نا ہی انہیں پیسے کیلئے کسی قسم کی تنگی کا اندیشہ تھا۔اولاد کی نعمت سے خدا نے شروع سے ہی محروم رکھا تھا۔اگر پیسے سے اولاد مل سکتی تو شاید وہ اپنی ساری دولت بھی لگا دیتے مگر کچھ خوشیاں اور نعمتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں ہم زمین کے تمام خزانے لٹانے کے بعد بھی

حاصل نہیں کر پاتے۔چوہدری صاحب کیلئے اولاد

ایسی ہی ایک نعمت ثابت ہوئی تھی جسے وہ چاہ کے بھی حاصل نہیں کر پائے۔ان کے اندر کہیں کوئی خالی پن سا رہ گیا ایک ادھوراپن جس کی شاید تکمیل کبھی ممکن نا ہوتی اگر ان کے پاس سلطان نا آتا۔

انسان اپنے کسی ایک عمل سے بھی کسی دوسرے انسان کے دل میں اتر سکتا ہے۔۔یا پھر ایک عمل سے کسی کے دل سے بھی اتر سکتا تھا۔یہی معاملہ یہاں بھی کارفرما رہا۔دھندا بھلے برا ہی مگر اس برے دھندے میں بھی سلطان اپنی ایمانداری کے باعث چوہدری صاحب کے دل میں اتر گئے۔وہ اسے اپنے بیٹے کی طرح چاہنے لگے۔سلطان جن حالات میں گھر چھوڑ کر آیا تھا اسے واپس بھیجنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا اور نا ہی مناسب۔انہیں سلطان کی زندگی کی فکر خود سے زیادہ تھی وہ کل کا نوجوان لڑکا تھا ابھی اس نے دنیا دیکھی ہی کہاں تھی جو چوہدری صاحب اسے یہاں پولیس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود کوئی محفوظ ٹھکانہ ڈھونڈ لیتے۔یہی سوچ اسے سلطان کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے کا باعث بنی

ملک چھوڑنے سے چند دن پہلے انہوں نے تمام ملازمین کو کچھ اضافی رقمیں دے کر ہمیشہ کیلئے فارغ کر دیا۔مگر سلطان کے دل کا حال صرف سلطان ہی جانتا تھا۔وہ یہ سب سوچ کر کراچی نہیں آیا تھا ۔اسے تو واپس لوٹنا تھا اپنے بچے کیلئے جس کے نام سے بھی وہ انجان تھا۔ملوکھاں سے کیئے گئے وعدے کیلئے ایک گھر کے وعدے کیلئے۔مگر وہ بے خبر جانتا ہی نا تھا کہ جس کو وہ گھر بنانے کا عہد دے کر نکلا تھا وہ اب دنیاوی گھروں کی فکرات سے ہمیشہ کیلئے اپنی جان چھڑا کے منوں مٹی تلے جا سوئی ہے۔وہ دو گز بھر کی زمین لے کر اپنا گھر بنا چکی ہے

جیسے جیسے وطن چھوڑنے کی گھڑیاں قریب آتی گئیں اس کا دل بیٹھنے لگا۔اسے لگا جیسے دل کو کسی نے اس کے سینے سے نکال کر اپنی دونوں مٹھیوں میں بند کر دیا ہو یا پھر جیسے دل کو نکال کے کسی

صندوق میں ڈال کر اس پر ایک بڑا سا تالا لگا دیا ہو۔
وہ گھبرا رہا تھا۔اور چوہدری صاحب کی دنیا شناس آنکھوں سے یہ گھبراہٹ زیادہ دیر مخفی نا رہی۔
"سلطان۔۔۔اداس ہو۔۔۔؟" جانے سے ایک رات پہلے چوہدری صاحب نے اسے اپنے پاس بلا کر پوچھا
"جی صاحب۔۔۔وطن چھوڑ رہے ہیں اداسی تو ہوگی۔" اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔مضبوط بننے کی جھوٹی اداکاری نہیں کی تھی۔جھوٹ بولتا بھی تو اس کا اداس چہرہ ساری پول کھول دیتا
"سلطان یاد ہے جب تم جیل سے باہر آ کر پہلی بار ڈیرے پر آئے تھے تو تم نے مجھے کہا تھا کہ تم ساری کشتیاں جلا کر آئے ہو۔۔۔یاد ہے تمہیں۔۔؟" چوہدری صاحب نے ہوا میں ایک لمبی سانس خارج کرنے کے بعد کہا
"جی یاد ہے۔۔۔مگر میں کچھ وعدوں کی رسیوں سے بھی بندھا ہوا ہوں جو مجھے پورے کرنے ہیں آپ کو بھی معلوم ہے۔۔۔مجھے یہ بھی دیکھنا ہے کہ وہ کشتیاں مکمل جل گئی ہیں یا کچھ باقیات باقی ہیں"
"سلطان۔۔۔جو لوگ اپنی کشتیاں جلاتے ہیں وہ ایسی باتیں کبھی نہیں سوچتے یہ ملک چھوڑنے کا فیصلہ میرے لئے بھی آسان نہیں ہے۔یہاں میرے کاروبار ہیں،ایک نام ہے،دھندا ہے،میرا اثرورسوخ ہے۔مگر کبھی کبھی زندگی میں ایسے موڑ بھی آتے ہیں جب ہمیں نا چاہتے ہوئے بھی اپنی زندگی کے مشکل ترین فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔اور ہم اس موڑ سے پیچھے نہیں لوٹ سکتے صرف آگے بڑھنا ہوتا ہے ہمیں۔آگے کا راستہ چاہے کتنا بھی دشوار ہی۔"
"اور اگر دل پھر بھی آمادہ نا ہو تو۔۔؟" سلطان نے مایوسی سے سوال کیا
"ہر بار دل کی نہیں سنتے سلطان۔ایسے موقع پر صرف دماغ کی سنتے ہیں۔دل کی سنو گے تو گھاٹے میں رہو گے۔یہاں رہنا اب ہمارے لیئے سودمند نہیں رہا"
"چوہدری صاحب میرے پیچھے میرا بچہ ہے،بیوی ہے ماں باپ ہیں۔۔۔"
"جانتا ہوں۔سب جانتا ہوں سلطان۔یہاں اگر تمہیں چھوڑ کر گیا تو تم کبھی نا کبھی پکڑے جاؤ گے پھر ساری زندگی جیل میں سڑنے سے بہتر ہے ہم کچھ سالوں کیلئے یہاں سے چلے جائیں۔جب حالات

سازگار ہوں گے تو ہم لوٹ آئیں گے ۔ میرا وعدہ ہے تم سے ۔" میں تمہیں یوں خطرے میں چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا ۔میری اولاد کی طرح عزیز ہو گئے ہو مجھے تم ۔تمہارے لیئے اچھا ہی سوچوں گا میں ۔" چوہدری صاحب نے اسے تسلی دی

اور وہ مان گیا ۔دل اداس سہی مگر چوہدری صاحب کا فیصلہ درست تھا ۔یہاں رہ کر وہ کتنا عرصہ چھپ سکتا تھا آخر ایک نا ایک دن اسے لازمی پکڑے جانا تھا ۔سو یہی بہتر تھا جو چوہدری صاحب کرنے جا رہے تھے ۔سلطان نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا ۔اب وقت کی آندھی اسے جس سمت اڑا لے جائے وہ مزاحمت نہیں کرے گا ۔اور آندھیوں کی مخالف سمت میں سفر کرنے والا ہمیشہ گھاٹے میں ہی رہتا ہے ۔آنکھیں مٹی سے بھر جاتی ہیں پھر کھل نہیں پاتی اور وہ اپنی سمت کھو بیٹھتا ہے ۔

سلطان نے خود کو ہلکا پھلکا کر لیا ۔جیسے وہ ایک تنکا ہو ۔بھلے آندھیاں جس طرف چاہے اڑا لے جائیں ۔کیونکہ سمتیں تو سالوں پہلے کھو چکا تھا ۔اب سمتوں سے اسے کوئی سروکار نہیں رہا تھا ۔

رات کو تیاری مکمل کر لی گئی ۔اگلے دن انہوں نے چند سال بعد وطن لوٹنے کی امید کے ساتھ انہوں نے ملک کو الوداع کہا ۔

جہاز کی کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا سلطان اوپر ہی اوپر اڑتا چلا جا رہا تھا ۔بہت اوپر ۔گورے چٹے پانیوں سے بھرے بادلوں سے بھی اوپر ۔یہ اس کی زندگی میں جہاز کا پہلا سفر تھا اور شاید آخری بھی ۔

جہاز اپنی تیز رفتاری کے باعث بہت کچھ پیچھے چھوڑتا جا رہا تھا ۔اس کا وطن پاکستان بھی ۔تھوڑی دیر بعد اس نے سیٹ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لی ۔وہ سونے کی کوشش کرنے لگا ۔لاشعوری طور پر آج ایک حسرت دل میں جاگی کہ وہ تھوڑی دیر کیلئے سو جائے اور اس کی آنکھیں خواب دیکھیں ۔اس کی وطن واپسی کا خواب ۔اس کے گاؤں شاہ والی میں واپسی کا خواب ۔مگر انسان نہیں جانتا کہ ہمیشہ سارے خواب ساری خواہشیں پوری نہیں ہوتیں ۔کچھ خواب ادھورے بھی رہ جاتے ہیں ۔اور سلطان کے اس خواب کے نصیب میں پورا ہونا لکھا ہی نہیں تھا ۔وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ یہ چند گھنٹے اس کے وطن پاکستان میں آخری گھنٹے ہیں اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اسے یہاں پھر کبھی لوٹنا نصیب ہی نہیں ہو گا

☆......☆......☆

بارھواں حصہ

صبح کے پھیلتے ہوئے اجالے میں سلطان نے چوہدری صاحب کی ہمراہی میں لندن کی سرزمین میں ہیتھرو ائیر پورٹ پر قدم رکھا تو وہ کچھ لمحوں کیلئے تو حیران رہ گیا۔ یہ دنیا اس دنیا سے بالکل الگ اور جدید تھی جہاں پر سلطان نے اپنی ساری زندگی گزاری تھی۔ اگرچہ دو سال سے وہ کراچی جیسے پاکستان کے بڑے شہر میں مقیم رہا تھا مگر اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے اس کے صبح شام وہیں اڈے پر ہی گزرتے۔ باہر جا کر گھومنے اور دنیا کو دیکھنے کی ضرورت اسے بہت کم نصیب ہوئی مگر یہاں پر تو ایک الگ ہی دنیا تھی۔ الگ نظارے اور الگ ہی لوگ۔

رات ساری تین بجے تک اڈے پر گوداموں میں کام سنبھالتے گزر جاتی۔ صبح دن چڑھے اٹھنا۔ پھر تھوڑی بہت ریفریشمنٹ کیلئے چوہدری صاحب کے پاس ڈیرے پر آجانا۔ وہاں چوہدری صاحب کے علاوہ بھی بہت سے "عقیدت مند" ہمہ وقت موجود رہتے تھے یوں سارا دن اسی طرح ان سے باتوں اور گپ شپ میں گزر جاتا۔ اس کے کراچی میں شب و روز اسی طرح گزرے تھے۔ کراچی کیسا شہر ہے، کتنا بڑا شہر ہے۔ کتنا خوبصورت ہے وہ جان ہی نہیں پایا۔ اور اب اتنی چھوٹی سی دنیا سے نکل کر اتنی بڑی دنیا میں قدم رکھتے ہی وہ حیرتوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

یہ ہیتھرو ائیر پورٹ تھا۔ یورپ کا سب سے بڑا اور مصروف ترین ائیر پورٹ۔ ہر طرف لوگ ہی لوگ۔ ہر قسم ہر رنگ اور ہر ملک کے لوگ۔ ائیر پورٹ سے باہر بھی وہ قدم قدم چلتا اس حیران کن دنیا کی حیرتوں میں غوطے کھانے لگا۔

"ارے یار ابھی سے منہ میں انگلیاں مت ڈالو۔ ابھی تو شروعات ہے ابھی بہت کچھ دیکھنا باقی

ہے۔۔۔"

چوہدری صاحب اس کی حیرانگی سے خوب لطف اندوز ہورہے تھے۔یہاں چوہدری صاحب کا آنا جانالگا ہی رہتا تھا

"چوہدری صاحب یہ ہم کس دنیا میں آگئے ہیں۔۔۔؟؟؟"

"دنیا ایک ہی ہے سلطان۔بس سوچنے، سمجھنے، آگے بڑھنے کے سب کے اپنے انداز ہیں۔ہم اپنی آپ کو کھاتے ہیں، اپنے ملک کو کھاتے ہیں۔یہ لوگ بناتے ہیں۔بس یہی فرق ہے ہم میں اور ان لوگوں میں"

جس علاقے میں ان کا اپارٹمنٹ بک ہوا تھا یہاں زیادہ تر مسلم کمیونٹی آباد تھی۔انہیں یہاں رہائش اور سیٹلمینٹ میں زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔سامان شفٹنگ اور تزئین وآرائش میں کچھ ہی دن لگے تھے۔جو سامان میسر نہیں تھا دوسرے دن مارکیٹ سے منگوا لیا گیا۔فرنیچر ڈیکوریشن پیس چوہدری صاحب نے اپنی پسند کے منگوائے تھے۔سلطان کو ان چیزوں کا زیادہ تجربہ بھی نہیں تھا۔

اس پوری سوسائٹی میں زیادہ تر ایشیائی لوگ ہی آباد تھے جن میں اکثریت پاکستانیوں اور انڈین لوگوں کی تھی۔یہاں چوہدری صاحب کے پرانے وفادار احباب اور کچھ جاننے والے بھی اسی سوسائٹی میں پہلے سے مقیم تھے۔سو جان پہچان میں زیادہ دن نہیں لگے۔لوگ اچھے تھے جلد ہی گھل مل گئے۔

اب سب سے پہلا کام یہاں پر چوہدری صاحب نے اپنے چھوٹے موٹے بزنس کا کرنا تھا۔سو انہوں نے اپنے دوستوں کے باہمی مشورے سے اسی سوسائٹی سے ذرا ہٹ کے ایک اچھا خاصا چلتا ڈیپارٹمنٹل سٹور کرایے پر لے لیا۔یہاں اس بڑے سٹور کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دوسرے حصے میں بیکری کے تمام ایٹم رکھ دیئے گئے۔ہوم ڈلیوری کی سروس بھی بہترین اور وقت پر لوگوں کو مہیا ہونے لگی۔کچھ ہی دن میں یہ سٹور خاصا مصروف ہو گیا۔اور اس ڈیپارٹمنٹل سٹور کو چلانے کی ساری ذمہ داری چوہدری صاحب نے سلطان کو بالکل نہیں سونپی۔کیونکہ ابھی سلطان نیا نیا تھا اسے اس ماحول کو سمجھنے میں وقت درکار تھا اور سب سے بڑا مسئلہ اس کیلیئے انگلش زبان کا تھا۔سو چوہدری صاحب نے اسے سٹور پر

کاؤنٹر سنبھالنے کی ذمہ داری دے کر ڈیلنگ کیلئے کچھ ملازمین ہائر کر لیئے۔ایک دو ماہ میں ہی ان کا سٹور چل پڑا۔سلطان کو انگلش زبان سکھانے کیلئے انہوں نے ایک ٹیوٹر بھی ہائر کر لیا۔چار چھے ماہ کی محنت کے بعد وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ کسی بھی انگریز سے با آسانی ڈیلنگ کرنے لگا۔چوہدری صاحب خوش تھے ان کی پچھلی زندگی پر ایک پردہ سا پڑ گیا۔

اب انہیں یہاں ایک نئی شناخت بنانی تھی۔ایک شریف اور باعزت شہری کی شناخت سو وہ آہستہ آہستہ اس میں کامیاب بھی ہو رہے تھے۔یہاں ان کی آمد کا اصل مقصد بھی یہی تھا جس سے انہوں نے سلطان کو بھی بے خبر رکھا تھا۔بظاہر وہ گرفتاری کے ڈر سے پاکستان چھوڑ کر آئے مگر اندر ہی اندر وہ کافی عرصے سے اپنی گناہوں سے بھری زندگی سے تھک سے گئے تھے۔اب وہ سکون چاہتے تھے،اپنی زندگی میں ٹھہراؤ اور طمانیت لانا چاہتے تھے۔کب سے وہ خود سے بھاگتے بھاگتے تھک چکے تھے۔اپنے ضمیر کے طمانچے کھاتے کھاتے ان کے گال سرخ ہو چکے تھے

وہ اس اندھیر نگری سے بھاگنا چاہتے تھے۔مگر دھندے نے ان کے پاؤں کچھ اس طرح سے جکڑے ہوئے تھے کہ وہ چاہ کر بھی اس دلدل سے نکل نہیں سکتے تھے۔انہوں نے اس موقعے کو غنیمت جانا۔اور برائی کے اس دھندے سے ہمیشہ کیلئے جان چھڑانے کا سوچا۔وہیں اگر پاکستان میں چھپتے تو ہر وقت پکڑے جانے کا خوف بھی ساتھ رہتا اور ایک نا ایک دن وہ ضرور پکڑے بھی جاتے اور اتنے گناہوں کے بعد ان کی معافی ممکن ہی نا ہوتی۔ان کا دار پر لٹکنا لازمی ہوتا۔یہی ایک راستہ تھا کہ ملک سے باہر نکل کے پناہ ڈھونڈی جائے اور ایک نئی زندگی شروع کی جائے ایک نئی شناخت کے ساتھ۔

اس کیلئے انہوں نے لندن کا انتخاب کیا۔یہاں ان کا کافی سارا پیسہ جمع تھا دوست احباب تھے۔جن کی بدولت وہ جلد ہی یہاں پیر جمانے میں کامیاب ہو گئے۔

اور سلطان وہ تو شروع سے ہی اس دلدل سے بھاگ جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ملک غیر ہی پر اس گناہوں کے کاروبار سے تو جان چھوٹی تھی۔اسے اب یہ خوف تو نہیں تھا کہ انہیں کسی وقت بھی دھر لیا جائے گا۔

اور یہاں لندن آ کر وہ اس شہر کی خوبصورتی اور جدت میں کھونے لگا۔ یہاں کا ٹھنڈا اور یخ کر دینے والا موسم، لوگ، مختلف کلچر، وسیع، کشادہ اور صاف ستھری سڑکیں، اونچی اونچی اور خوبصورت طرزِ تعمیر کی حامل عمارتیں، یہاں کا طرز زندگی غرض ہر ایک چیز کے سحر میں کھونے لگا۔ وقت پر لگائے اڑنے لگا۔ کب چھے ماہ گزرے پتا ہی نہیں چلا۔ اور ساتویں ماہ ہی وہ حسن کا دلدادہ اپنی کمیونٹی کی ایک انڈین مسلم لڑکی فاخرہ حسین پر فدا ہو بیٹھا۔ سلطان نوجوان تھا، خوبصورت تھا مگر فاخرہ کی خوبصورتی کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی دل ہار بیٹھا۔ زندگی مزید حسین لگنے لگی۔ یہاں پاکستان والی رکاوٹیں بالکل نہیں تھی۔ آزاد ماحول کی فضاؤں میں پلی بڑھی فاخرہ نے بھی جلد ہی گورے چٹے پٹھانوں جیسے نقوش کے مالک سلطان کے ساتھ محبت کی شاہراہ پر قدم رکھ دیا۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے لگے۔ سلطان کو اب پتا چلا تھا کہ محبت کس کو کہتے ہیں۔ فاخرہ کی ہمراہی میں اسے اور کچھ نظر ہی نا آتا۔ ذہن کے پردے پر ہر وقت فاخرہ کی بڑی سی نمایاں تصویر بنی رہتی۔ خوابوں کی انگلی پکڑ کر نیند کی وادیوں میں اترتا تو بھی فاخرہ ان وادیوں کے سبزہ زاروں میں سلطان کے ہمقدم چل رہی ہوتی۔ جتنا وقت دن کو سٹور پر گزارتا خیالوں میں کہیں فاخرہ کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ اسے ہر جگہہ فاخرہ دکھائی دینے لگی۔ ہر جگہ فاخرہ سنائی دینے لگی۔

فاخرہ سے پہلی ملاقات اس کی اپنے سٹور پر ہی ہوئی جب وہ سیلز مین سے کسی بات پر بحث کر رہی تھی۔ کاؤنٹر پر بیٹھے سلطان نے پہلی ہی نظر میں ایشیائی نقوش والی اس خوبصورت ساحرہ کو دونوں ہاتھ سے اپنا دل پیش کر دیا۔

"جی کوئی مسئلہ ہے۔۔۔؟ میں کوئی مدد کر سکتا ہوں آپ کی۔۔۔؟"

وہ معاملے کی نوعیت کو سمجھنے کیلیئے ان کی جانب آ گیا تھا اور نظریں اسی ایک چہرے کا طواف کرنے لگیں

"جی ہاں۔۔۔ یہ ہم نے پیزا آرڈر اور دو کیک آرڈر کیئے تھے۔ مگر آدھے گھنٹے بعد ڈیلوری ہوئی بھی تو صرف ایک کیک کی۔ یہ کیسی سروس ہے آپ کی۔۔۔؟"

" معذرت خواہ ہیں میڈم ۔مجھے لگتا ہے ڈیلوری بوائے کو شاید آرڈر میں کوئی کنفیوژن ہوئی ہے ۔میں دوبارہ بھجوادیتا ہوں ابھی ۔۔۔" اس نے معاملے کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے نرم لہجہ اپنایا

" اسی کنفیوژن کی وجہ سے میری دوست کی برتھ ڈے کا سارا مزہ کرکرا کر دیا ہے ۔جبکہ میں نے خود یہی سٹور ریکومنڈ کیا تھا پیزہ اور کیک کیلئے ۔اب کیا فائدہ ۔۔۔"

وہ خاصی تپی ہوئی تھی ۔غصے کی وجہ سے اس کے چہرے کی سرخی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔

" میں بہت زیادہ معذرت خواہ ہوں میڈم ۔ہماری وجہ سے آپ لوگوں کی پارٹی خراب ہوئی ۔اس کے ازالے کے طور پر میں آپ کے مطلوبہ دو کیک اور پیزہ دوبارہ بھجوادیتا ہوں ابھی بغیر کسی چارجز کے ۔۔۔"

" نو تھینکس ہمیں اب کسی قسم کے تعاون کی ضرورت نہیں ہے ۔۔۔" فاخرہ نے بالوں کی لٹ کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے جواب دیا

" آپ نے ہم پر بھروسہ کیا ۔آرڈر ہم سے کروایا ۔اتنا تو اب ہمارا حق بھی بنتا ہے ۔پلیز انکار نہیں کیجیئے گا ۔۔۔تھوڑی دیر بعد ہی لیکن اس طرح آپ کی پارٹی کا مزہ پھر سے دوبالا ہو جائے گا ۔۔۔" سلطان نے اسے مطمئن کرتے ہوئے کہا

اور وہ بھی نرم پڑ گئی چلو گھنٹہ دیر سے ہی پارٹی تو ہو جائے گی ۔وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے سٹور سے چلی تو گئی مگر سلطان ان آٹھ دس منٹوں کے مباحثے میں مفتوح ہو چکا تھا ۔دونوں چاہنے چت ۔

وہ اپنی روزمرہ کی ضروریات زندگی کی چیزیں خریدنے تقریباً روز ہی آتی تھی ۔سلطان سارا دن سٹور پر بیٹھا اسی چند منٹوں کا انتظار کرتا رہتا جب فاخرہ سٹور پر آتی تھی ۔بات چیت بڑھنے لگی ۔مسکراہٹوں کے تبادلے ہونے لگے ۔اور پھر ملاقاتوں کے سلسلے بھی چل نکلے ۔فاخرہ انڈین ہونے کی وجہ سے اردو روانی سے بول سکتی تھی ۔سو سلطان کو اپنے جذبوں کے اظہار کرنے میں بھی زیادہ وقت نا لگا ۔۔۔

فاخرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ زمین پر نہیں بلکہ لندن کی فضاؤں میں اوپر ہی اوپر اڑ رہا ہے ۔اور جب فاخرہ دور ہوتی تو کچھ بھی اچھا

نالگتا، نالندن، نالندن کے لوگ اور ناہی لندن کا موسم کچھ بھی نہیں۔

وہ فاخرہ کی محبت میں سب کچھ بھلا بیٹھا سب کچھ۔ ملوکھاں کو بھی۔ اپنے معصوم بیٹے کو بھی۔ اپنے ماں باپ اپنے گاؤں شاہ والی کو بھی۔ اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا اگر کچھ یاد تھا تو صرف فاخرہ، اگر کچھ دکھائی دیتا تو صرف فاخرہ۔ محبت کس کو کہتے ہیں محبت میں تڑپنا کس کو کہتے ہیں یہ اسے فاخرہ کی غیر موجودگی میں پتا چلتا یا پھر جب وہ سلطان سے ناراض ہوتی تب۔۔۔

" میں اب تمہارے بغیر نہیں جی سکتا۔ فاخرہ میں اب تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔"

اس دن سلطان نے اپنے ساتھ پارک میں بیٹھی فاخرہ کو شادی کی آفر کر دی۔

وہ خاموش رہی چپ چاپ بیٹھی رہی۔ کوئی جواب نا آیا تو سلطان کو اچنبھا ہوا

" فاخرہ کوئی مسئلہ ہے کیا تم یہ سب نہیں چاہتی؟"

" چاہتی تو میں بھی ہوں سلطان۔۔۔ پر امی ابو نہیں مانیں گے۔ وہ راضی نہیں ہوں گے اس شادی پر"

"لیکن کیوں ایسا کیا مسئلہ ہے آخر وہ کیوں نہیں مانیں گے۔؟" سلطان حیران ہوا

" سلطان تم پاکستان سے ہو اور ہم انڈین۔۔۔ کل کو تم واپس چلے جاؤ گے پاکستان۔ پھر اگلی زندگی مشکل ہو جائے گی۔" فاخرہ کے لہجے سے اداسی عیاں تھی

" کیوں ایسا کیوں سوچنے لگی ہو تم۔ یہاں اور بھی تو کئی شادی شدہ جوڑے ہیں جو مختلف ممالک سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔" وہ اس کی سوچ پر پیچ میں حیران ہوا

" وہ بات نہیں ہے سلطان۔ تم میری بات کو سمجھ ہی نہیں رہے۔ ہم دونوں مخالف ممالک سے ہیں۔ امی کبھی نہیں چاہتیں یہ سب ہو۔"

" تو کیا ہوا پھر۔ ہمارے ملک آپس میں مخالفت رکھتے ہیں مگر ہم تو نہیں۔ ہم تو ایک دوسرے کو چاہتے ہیں نا۔۔؟"

" ہاں۔۔۔ مگر موم ڈیڈ کو کون سمجھائے۔ انہیں خدشہ ہے کہ شادی کے بعد حالات بہت مختلف ہو

جائیں گے۔ کچھ عرصے بعد تم چلے جاؤ گے اور وہ پھر ہم سب سے ملنے کو ترس جائیں گے۔"

"میں نہیں جاؤں گا فاخرہ تمہاری قسم۔۔۔میں تمہارے لیئے اپنی ساری زندگی یہیں گزار دوں گا۔"

"سلطان میرے پیرنٹس پھر بھی نہیں مانیں گے۔ہمارا ملنا ان سے پوشیدہ نہیں رہا وہ جانتے ہیں۔دو دن پہلے امی سے مجھے اسی بات پر ڈانٹ بھی پڑی ہے۔میں بہت پریشان ہوں سلطان۔"

فاخرہ سچ مچ اداس تھی۔سچوایشن ہی ایسی تھی اور وہ اپنے پیرنٹس کی طبیعت سے اچھی طرح واقف بھی تھی جانتی تھی وہ نہیں مانیں گے

سلطان کے دل پر ایک پتھر سا آپڑا۔اداسی نے چاروں سمتوں سے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔اس کے لیئے تو فاخرہ کے بغیر ایک منٹ گزارنا بھی مشکل تھا اور یہاں بات پوری زندگی کی تھی۔کیسے گزرے گی یہ ساری زندگی یہی حال فاخرہ کا بھی تھا آگ تو دونوں طرف سے لگی ہوئی تھی بلکہ شعلوں میں بھڑکی ہوئی تھی۔مگر ان دونوں کے بیچ سرحدیں آ کھڑی تھیں۔اونچی اونچی دیواریں تھیں جنھیں پاٹنا یا عبور کرنا یا ان دیواروں کو سرے سے ہی ڈھا دینا بہت مشکل دکھائی دینے لگا۔

یہی سوچتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچے بغیر وہ دونوں بوجھل قدموں سے چلتے اپنی کمیونٹی واپس آگئے۔

"فاخرہ تم پھر اسی سے ملنے گئی تھی نا۔۔۔؟" وہ واپس گھر پہنچی تو امی کی شعلہ بار نظروں نے اس کا استقبال کیا

اس کے پاس سوائے خاموش رہنے کے اور کوئی بھی جواب نہیں تھا۔

"کیا تم پاگل ہو چکی ہو فاخرہ۔۔۔تمہیں اپنے مستقبل کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔۔۔؟" امی نے اس کی خاموشی کا مطلب سمجھ لیا تھا

"امی وہ شادی کرنا چاہتا ہے مجھ سے۔۔"

"فاخرہ وہ ایک چھوٹے سے سٹور کا سیلز مین۔۔۔تم اس سے شادی کرو گی تم یہاں کی نیشنلٹی ہولڈر ہو ایک بزنس مین کی بیٹی۔یہی تمہاری سوچ کا معیار ہے۔؟

اور اسے آئے تین ماہ نہیں ہوئے۔تمہاری عقل گھاس چرنے تو نہیں چلی گئی۔بجائے اس کے

کہ تم کسی اچھے،، ایجوکیٹڈ، ویل سیٹلڈ اور سدھرے ہوئے لڑکے سے شادی کرو تم ایک سیلز مین پر مری جا رہی ہو۔۔۔؟"

مما اس پر چیخ رہی تھیں۔انہیں فاخرہ کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا تھا۔

"مما زندگی گزارنے کے لیئے صرف یہی سب کچھ تو لازم نہیں ہے نا۔دلی خوشی اور پسند بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔۔۔"

فاخرہ تم ابھی تک امیچور ہی ہو۔میں سمجھتی تھی میری بیٹی میچور ہو گئی ہے۔خوشحال زندگی گزارنے کیلئے سٹیٹس چاہیئے ہوتا ہے۔اور یہ تم دلی خوشی پسند اور محبت کے راگ الاپ رہی ہو نا شادی کے دوسرے سال ہی اڑن چھوڑ ہو جائیں گے۔

کل کو وہ کچھ پیسہ بنا کے چلا جائے گا واپس پاکستان تو ساری زندگی ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کو ترس جائیں گے ہم۔جانتی نہیں ہو تم کیا حالات ہیں دونوں ملکوں کے۔۔۔" ان کو پاس فاخرہ کو سمجھانے کیلئے بہت سی دلیلیں تھیں۔مگر محبت تو بندے کی مت مار دیتی ہے وہ کسی کی بات نہیں سمجھتی صرف اپنی بات سمجھاتی بھی ہے اور زبردستی منواتی بھی ہے۔

" امی وہ سب کچھ چھوڑنے پر تیار ہے میرے لیئے۔اس نے وعدہ کیا ہے وہ کبھی پاکستان نہیں جائے گا۔شادی کے بعد نہیں رہے گا ساری زندگی۔میرے لیئے سب کچھ چھوڑ دے گا سلطان۔۔۔" فاخرہ نے ماں کو تسلی دینی چاہی تو وہ بھڑک اٹھیں

" ڈرامے ہیں سب۔۔۔لڑکیوں کو بہلانے کے،انہیں پھانسنے کے جال ہیں سب۔کل کو شادی کر کے وہ چوتھے دن واپس بھاگ جائے گا پھر کیا کرلیں گے ہم اس کا۔کیا بگاڑ لیں گے ہم پھر۔؟؟؟

تم آج کے بعد اس لڑکے سے کبھی نہیں ملو گی۔۔۔میں پھر برداشت نہیں کروں گی۔سمجھ رہی ہو نا تم۔۔۔؟؟؟" وہ تن فن کرتی پیر پٹختی اندر کمرے میں چلی گئی اور فاخرہ وہاں بے بسی سے کھڑی انگلیاں مرور رہی تھی۔اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔بے بسی ہی بے بسی تھی ہر طرف

☆......☆......☆

شام ڈھل رہی تھی اور شاہ والی پر اندھیرا اپنی کالی چادر آہستہ آہستہ پھیلانے لگا تھا۔ یہاں رات مغرب کے بعد ہی شروع ہو جاتی اسی طرح یہاں کے واسیوں کی صبح بھی منہ اندھیرے اور پو پھٹنے کے ساتھ ہی ہو جاتی۔ یہ لوگ شہروں کی طرزِ زندگی سے ابھی بہت دور تھے جہاں ساری ساری رات جاگ کر گزاری جاتیں اور ان کی صبح دن چڑھے ہوتی تھی۔ ایسے لوگ صبح صادق کے پر نور منظر کی چاشنی اپنے اندر اتارنے کی نعمت سے محروم رہتے ہیں

اور خوشی اندر کمرے میں بلب بجھائے اندھ اندھیرے میں اپنے بازوں کا تکیہ بنائے اپنی سوچوں میں گم جانے کہاں تک جا پہنچا تھا۔

تین دن پہلے جنت نے اپنے رشتے کی بات بتائی تو تب سے ہی یہی حال تھا۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اپنا موازنہ زمیندار کے بیٹے اکرم سے کرنے لگا تو اسے اپنا ہی پلڑا جھکا ہوا نظر آیا۔ اس کے پاس تھا بھی تو کچھ نہیں۔ نا دھن نا دولت نا زمین جائیداد اور نا ہی ماں باپ۔ ایک بوڑھی نانی جس کی زندگی کا بھی کچھ بھروسہ نا تھا۔ اور زندگی گزارنے کیلیئے آج کل دنیا دھن دیکھتی ہے۔ اپنی بیٹی مفت میں کوئی تھوڑی دے دیتا ہے؟

آج ابا ہوتے تو شاید کچھ نا کچھ دھن، زمین اس کے پاس بھی تو ہوتی۔ مگر ابا واپس آتے تب نا۔۔۔ وہ تو خدا جانے کہاں کھو گئے۔ شاید ہم لوگ ابا کیلیئے کوئی معنی ہی نہیں رکھتے ہوں گے ان کیلئے خونی رشتوں شاید کسی بھی کشش کا باعث نہیں تھے۔ جو وہ واپس ہی نہیں آئے۔۔۔ آج اسے ابا کی بہت زیادہ یاد آنے لگی۔ ابا ہوتے تو شاید زندگی ایسی نا ہوتی جیسی اب ہے

"ایک بار اگر ابا واپس آجاتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ دھن دولت نا سہی کم از کم دل میں ایک سکون تو اتر آتا کہ ہاں میرے ابا کو میرا خیال ہے۔ اسے بھی اپنی اولاد سے پیار ہے۔ مجھے یہ آسرا تو مل جاتا کہ میرے اوپر بھی ایک چھت ہے جو ہر سرد گرم میں میری حفاظت کرے گی مجھے ڈھانپے گی۔ مجھے پناہ دے گی۔۔" آج سوچوں کے اداس پنچھی کہیں دور پرواز پے تھے

باپ کا ہونا بھی کس قدر خوش کن احساس ہوتا ہے۔ باپ چھت ہی تو ہوتے ہیں اور جن کے باپ

اس دنیا کو دنیا چھوڑ کے جاتے ہیں گویا ان کے سر سے چھت ہی تو چھن جاتی ہے۔وہ کھلے آسمان تلے آجاتے ہیں یا پھر چار دیواروں والے ایسے کمرے میں آجاتے ہیں جس کی چھت نہیں ہوتی۔اولاد چاہے کتنی ہی بڑی کیوں نا ہو جائے، یا پھر اپنے قدموں پر کھڑی کیوں نا ہو جائے، انہیں دنیا کا سامنا کرنا آجائے تب بھی باپ کے بغیر وہ خود کو کھلے آسمان تلے محسوس کرتے ہیں اور وہ تو ابھی نوجوانی کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔اسے تو آنکھ کھولنے سے لے کر ابھی تک باپ کے احساس اور اس کے پیار بھرے لمس سے زندگی نے محروم رکھا تھا۔بڑا ہوا تو سوچیں بھی بڑی ہونے لگیں۔۔۔اداسیاں تو بنتی تھیں

سوچوں کے گھوڑے خدا جانے ابھی مزید کہاں تک پہنچتے کہ اچانک کمرہ روشنی سے بھر گیا۔اچانک ہونے والی روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں تو یکدم سے اپنا بازو اس نے آنکھوں پر رکھ لیا۔اگلے لمحے تھوڑی سی آنکھ کھول کے جھروکے سے دیکھا تو نانی بورڈ کے نیچے کھڑی اسی کو ہی دیکھ رہی تھی۔چند سیکنڈ میں ہی آنکھوں نے اس روشن ماحول سے مطابقت حاصل کر لی اس کی آنکھیں اب پوری کھل چکی تھیں۔۔۔

نانی قدم قدم چلتی اس کی چارپائی کے نزدیک آ کر اس کے ساتھ ہی وہیں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئیں۔خوشی تھوڑا سا پیچھے ہو گیا تو نانی آسانی سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔وہ چپ چاپ سامنے دیوار پر نظریں جمائے سویا پڑا رہا اور نانی مسلسل اس بجھے بجھے چہرے

کو دیکھتی رہیں۔کچھ پل یونہی خاموشی سے سرک گئے۔کوئی کچھ نا بولا۔

"اتنا اندھیرا کیوں کر رکھا ہے۔۔؟" آخر نانی نے ہی اس خاموشی کو توڑنے میں پہل کی

"ایسے ہی بس۔۔۔"

"مغرب کے وقت گھر میں یوں اندھیرا نہیں کرتے پتل۔اچھی بات نہیں ہوتی۔۔۔"

"جب زندگی اندھیروں سے بھری ہو تو پھر یہ تھوڑی سی روشنی کر کے کیا حاصل۔۔۔؟" خوشی نے اداس لہجے میں جواب دیا۔نظریں ابھی بھی دیوار پر گڑی ہوئی تھی

"آج میرا پتل اتنا اداس کیوں ہے۔۔؟" نانی نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے

ہوئے مسکرا کر پوچھا

" نانی ۔۔۔ایسا کیوں ہوتا ہے جب بندہ کسی چیز کو چاہنے لگے اس کی خواہش کرنے لگے تو وہ اس کی دسترس سے دور ہونے لگتی ہے ۔ایسا کیوں ہوتا ہے ۔۔۔؟" اب کی بار اس نے سیدھا نانی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال پوچھا

" تاکہ اس چیز کی یا اس انسان کی قدر برقرار رہ سکے ۔اگر ایسے بار ہی کوئی خواہش کرنے سے وہ فوراً پوری ہو جائے ہمارے ہاتھ آجائے تو ہماری نظروں میں اس کی کیا قدر باقی رہے گی ۔"

وہ ویسے ہی خاموش پڑا دیوار کو تکتا رہا ۔کوئی جواب بھی نا دیا

" یہ سب تو خدا کی مرضی کے کام ہیں پتل ۔۔۔اور خدا کی مرضی کے آگے انسان کا زور نہیں چلتا ۔اور کیا پتا خدا نے انسان کے حصے میں اس کی خواہش سے بھی اچھا نعم البدل لکھا ہو ۔۔۔"

" اور اگر انسان کو کسی دوسرے نعم البدل کی کوئی ضرورت نا ہو اسے اپنی وہی خواہش چاہیے ہو تب ۔۔۔؟"

نانی سوچ میں ڈوب گئی ۔خاموشی پھر سے بیچ میں آنے لگی

" تو پھر اس انسان کو دعا کا سہارا لینا چاہیے ۔سچے دل سے سچے رب سے مانگا جائے تو دعائیں قسمت پھیر دیتی ہیں" چند لمحے خاموشی کے بعد نانی نے اسے جواب دیا تو وہ قدرے مطمئن ہو گیا ۔

" دعاؤں سے مل جاتا ہے سب کچھ ۔۔۔؟"

" ہاں سچے دل سے اور جائز مانگا جائے تو ضرور مل جاتا ہے ۔۔۔

اور کبھی کوئی چیز بار بار مانگی دعاؤں سے بھی نا ملے تو یقیناً اسی میں کچھ بہتری ہو گی ۔کیونکہ اللہ اپنے بندے کو کبھی مایوس نہیں ہونے دیتے ۔ہمیشہ اس کی خیر ہی چاہتا ہے ۔۔۔"

" نانی ۔۔۔آج اگر ابا ہوتے تو ہماری زندگی مختلف ہوتی نا ۔؟" تھوڑی دیر بعد خوشی نے اپنی محرومی ظاہر کی

" کیا تم اپنی زندگی سے خوش نہیں ہو پتل ۔۔۔؟" اس بار نانی نے جواب نہیں دیا الٹا سوال کر دیا

”خوش تو ہوں نانی۔۔۔مگر ابا ہوتے تو شاید زندگی مزید اچھی ہوتی اور میں اپنی وہ تمام خواہشیں بھی پوری کر لیتا جو اب نہیں کر سکتا۔۔۔“

”پتل۔۔۔ایسا نہیں سوچا کرو۔خواہشیں انسان کو مار دیتی ہیں۔انسان خدائی تقسیم سے بہت کم خوش ہوتا ہے۔ایک خواہش پوری ہوگی تو دوسری جاگ اٹھے گی۔دوسری پوری ہوگی تو تیسری۔۔پتر۔۔خواہشیں در در رول دیتی ہیں بادشاہوں کو بھی کاسہ پکڑا دیتی ہیں۔خواہشوں کے پیچھے کبھی مت بھاگنا پتل۔۔۔“

نانی اسے سمجھانے لگی۔اور وہ چپ چاپ پڑا سننے لگا۔

”اور تم نہیں جانتے پتل۔۔۔تمہارا باپ بھی ایسے ہی خواہشوں کے پیچھے بھاگنے لگا تھا۔اس کیلئے اپنی خواہشات اپنے خونی رشتوں سے افضل ہو گئیں۔تبھی تو لوٹ کر نہیں آیا۔۔اگر اسے اپنے سے منسلک رشتوں کی قدر ہوتی اس کے دل میں تھوڑا سا بھی احساس ہوتا تو وہ یوں اپنی حاملہ بیوی کو کبھی چھوڑ کر نہیں بھاگتا۔تم جانتے ہو جب تم پیدا ہوئے تمہاری ماں کتنا تڑپی تھی۔کتنا یاد کرتی تھی تمہارے باپ کو۔وہیں ملوکھاں اللہ کو پیاری ہو گئی مگر سلطان اس کی میت کو کندھا دینے تک نا آیا۔۔“

نانی بولنے پر آئی تو بولتے ہی چلی گئی۔اور وہ حیرتوں میں ڈوبا صرف سن رہا تھا اس میں جیسے بولنے کی طاقت ہی نا رہی ہو

”پتل ایسے نا بولا کرو۔اللہ نے جو زندگی دی ہے وہی لاکھ ہے۔اور لاکھوں لوگوں سے بہتر بھی ہے۔ناشکری خدا کو پسند نہیں ہے پتر۔۔۔شکر کیا کرو گے تو وہ خواہشیں بھی پوری ہو جائیں گی جو ابھی نہیں ہوئی“

نانی ہانپ رہی تھی تیز تیز سانس لینے لگی۔اس کی سانس پھول چکی تھی۔وہ خاموش ہوئی تو کمرے میں پھر سے خاموشی آ ٹھہری۔کچھ لمحے توقف کے بعد وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ قدموں سے کمرے کی دہلیز پار کر گئیں۔اور وہ وہیں دیوار پر نظریں جمائے سو یا رہا۔اس وقت خوشی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ نانی کی باتوں سے وہ مطمئن ہوا ہے یا اس کی اداسی نے مزید گھیر لیا۔اسے کچھ سمجھ نہیں آئی۔اپنے ابا کا ایسا تعارف تو اس نے آج تک نہیں سنا تھا۔اندر ہی اندر بہت کچھ ٹوٹنے لگا تھا

☆......☆......☆

اس دن صبح کا آغاز معمول کے مطابق ہوا تھا۔ناشتہ کر کے خوشی نانی کو کچھ بتائے بغیر باہر چلا گیا تو نانی تاج بھی آہستہ آہستہ اپنے معمول کے کاموں میں لگ گئی۔اب وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکی تھیں جب انسان کو آرام ضرورت ہوتا ہے۔مگر ان کے حصے میں آرام نہیں لکھا تھا۔کوئی اولاد ہوتی تو شاید کچھ سکون مل جاتا۔اس ضعیف عمری میں کبھی کسی کام کو ہاتھ تک نا لگانے دیتے۔چارپائی پر بٹھا کر کھلاتے مگر ہوتی تب نا۔۔۔

ہمسایوں نے انہیں کئی بار کہا کہ وہ کھانا مت بنایا کریں وقت پر ان کے گھر تین وقت کا کھانا پہنچا دیا جائے گا۔مگر اس ضعف عمری میں بھی نانی تاج کو کسی پر بوجھ بننا گوارا نا تھا۔اگر ایک اپنا دم ہوتا تب شاید وہ مان بھی جاتی مگر ان کے ساتھ خوشی بھی تھا اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ کسی کیلئے بھی تکلیف کا باعث بنیں۔کسی کو تکلیف دینا ان کی فطرت میں تھا ہی نہیں۔وہ تو ہمیشہ سے لوگوں کی تکلیفیں بانٹتی آئی تھی پھر اپنی ذات کی وجہ سے وہ کسی کو تکلیف پہنچانا بھلا کب گوارا کرتی۔۔۔؟

سو وہ اپنا سب کچھ خود کرتی۔وقت کچھ زیادہ لگ جاتا ایک گھنٹے کا کام دو گھنٹوں میں ہوتا۔تھکان زیادہ ہو جاتی پر سب کچھ ہو جاتا۔آج بھی ناشتے کے برتن اکٹھے کرتے کرتے دن چڑھ آیا تھا۔اکثر خوشی بھی ہاتھ بٹا دیتا مگر کچھ دنوں سے وہ کچھ اداس اور چپ چپ سا تھا۔نانی جانتی تھی کہ وہ بڑا ہو رہا ہے ذہن اب پختہ ہونے لگا ہے تو اپنے اندر کی محرومیاں اسے بے کل کرنے لگی تھی۔رشتوں کی محرومی وہ محسوس کرنے لگا تھا۔آج صبح بھی ناشتے کے بعد بغیر کچھ بولے باہر چل دیا۔نانی تاج جان بوجھ کے چپ رہی جانتی تھی اس کا دل بوجھل ہے۔روکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

اور آج جب وہ برتن اندر رکھ چکی اور تھوڑی بہت صفائی کا سوچنے لگی تھی بیرونی دروازہ کھلا اور تاج کی بوڑھی آنکھوں نے دین محمد اور بختاور کو اپنی دہلیز کے اندر قدم رکھتے دیکھا۔ایک پل کو وہ ششدر رہ گئی

وہ دونوں بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے آنگن پار کر کے دیوار کے ساتھ بنے چولہے تک آ پہنچے۔یہاں مٹی کے ساتھ زمین پر قریب ایک فٹ اونچا تھلہ نما سا بنایا گیا تھا۔دیوار ساتھ ہونے کے باعث

یہاں سایہ رہتا اور ناشتے کے بعد برتن بھی اکثر نانی تاج اسی دیوار کے سائے میں بیٹھ کر ہی دھو لیتی۔

" آؤ دین محمد۔۔۔آج کیسے راستہ بھول گئے؟ یاد آ گئی آج بوڑھی کی۔۔۔؟" دین محمد اور بختاور ایک عرصے بعد نانی تاج کے گھر آئے تھے سو تاج نے میٹھا میٹھا طعنہ مارا

نانی تاج۔۔۔دین محمد اور بختاور سے پانچ سات عمر میں بڑی تھیں۔ دنیا تاج کو نانی تاج کے نام سے جانتی تھی مگر دین محمد کیلئے ان کا مقام ہمیشہ بڑی بہن کے مترادف تھا۔ وہ شروع سے ہی نانی تاج کو بہن کا مقام دیتے اور بی بی کہہ کر ہی پکارتے آئے تھے

شروع میں ان دونوں میں بہت زیادہ پیار اور احترام کا رشتہ چلا آ رہا تھا اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا معمول تھا مگ ایک لمبے عرصے سے دین محمد نے جو سلطان اور اس کی نسل سے لا تعلقی کی قسم کھائی تھی وہ اسی قسم کو نبھانے کیلئے اس گھر کا راستہ بھول چکے تھے۔ اتنا عرصہ بیچ میں گزر گیا مگر دین محمد نے کبھی اس گھر میں سلطان کی اولاد کی وجہ سے قدم نہیں رکھا تھا۔ ہاں اگر کبھی کبھار نانی تاج خود چلی جاتی ان کے گھر تو خیریت دریافت ہو جاتی ورنہ نہیں۔۔۔

خیر اب وہ بھی اپنے گھٹنوں کے درد اور ضعف عمری کی وجہ سے کہیں بھی آنا جانا ترک کر چکی تھی

" جن راستوں پر انگلی پکڑ کے چلنا سیکھا ہو وہ راستے کب بھولتے ہیں بی بی۔ بس زندگی نے کچھ اس طرح سے پٹخا ہے کہ اپنا بھی ہوش نہیں رہا۔۔"

وہ دونوں چولہے تک آ پہنچے۔ دیوار کے ساتھ ایک پرانی چارپائی رکھی تھی نانی نے اشارہ کیا تو وہ دونوں وہیں چارپائی پر آ بیٹھے

" زندگی کو کیوں قصوروار ٹھہراتے ہو دین محمد۔۔ جس جانور کی مہار ہی ہاتھ میں نا ہو اس کے اندھا دھند اور بے سمت بھاگنے کا رونا نہیں روتے۔۔۔" نانی چارپائی کے ساتھ نیچے زمین پر بچھی ہاتھوں سے بنائی گئی تڈی (چٹائی کی طرح کی ایک قسم جو اکثر دیہاتوں میں عورتیں ہاتھوں سے بناتی ہیں) پر بیٹھتے ہوئے بولی

" بی بی۔۔۔آپ اوپر آ جائیں نا۔ یہاں اوپر چارپائی پر بیٹھیں" بختاور کو ان کا نیچے بیٹھنا مناسب نا

لگا تو انہوں نے خود اٹھ کر اپنی جگہہ نانی کیلئے چھوڑ دی

" میں نیچے ٹھیک ہوں بختو تم اوپر بیٹھی رہو۔۔۔" نانی نے ہاتھ کے اشارے سے بختو کو وہیں بیٹھے رہنے کا کہا مگر وہ مناسب خیال نا کرتے ہوئے ان کے ساتھ نیچے تڈی پر آ بیٹھی

"کیسی طبیعت ہے بوا آپ کی۔۔۔؟" اب کی بار بختاور نے سوال کیا

"ٹھیک ہوں بختو۔۔۔بس اب تو دن ہی گننے ہیں۔الٹی گنتی تو کب کی شروع ہو چکی ہے"

" ایسے کیوں بول رہی ہیں خدا آپ کو اور لمبی زندگی دے" بختاور ایک بار پھر گویا ہوئی

" اور جی کے کیا کرنا ہے پتر۔۔۔؟ بس ایک پنل کی فکر رہتی ہے وہ بڑا ہو جائے سمجھدار ہو جائے۔اپنے آپ کو سنبھالنے لائق بن جائے تو سکون سے قبر اوڑھ لوں گی۔خیر تم لوگ سناؤ آج کیسے آنا ہوا۔۔۔؟"

" ہم بھی خوشی کیلئے ہی آئے ہیں بی بی۔۔۔اب تھک گئے ہیں ہم۔بارمان لی میں نے اپنی انا سے۔اسے واپس لینے آئے ہیں آپ کی اجازت سے وہ نظر نہیں آرہا۔ہے کہاں۔۔۔؟" دین محمد نے اپنا سفید صافہ اتارتے ہوئے آنے کا اصل مدعا بیان کیا

" باہر چلا گیا ہے کہیں بتائے بغیر۔۔۔دین محمد۔۔۔اگر خدا لگتی کہوں تو تمہیں اب یاد آیا پنل؟ اب جب وہ سہاروں کے بغیر رہنا سیکھ چکا ہے اب خیال آیا۔جب اسے ضرورت تھی اپنوں کی ،رشتوں کی،تب کہاں تھے تم لوگ۔۔۔؟؟؟"

"کیا کہوں بی بی۔۔۔کوئی جواب ہی نہیں میرے پاس۔سلطان کا غصہ تھا۔ارمان تھا میرے دل میں۔نوری کی طلاق کے بعد خود سے عہد کر لیا تھا کہ سلطان اور اس کی نسل سے اب کوئی تعلق نہیں رکھنا۔۔۔سالوں تک خود کو نا چاہتے ہوئے بھی اس عہد پر قائم رکھا۔مگر اب ہم تھک چکے ہیں بی بی۔"

" واہ دین محمد۔۔۔تمہیں بہت سمجھدار سمجھتی تھی میں۔مگر میری امیدوں پر پورے نہیں اترے تم۔ سلطان کے عمل کی سزا اس کی اولاد کو کیوں ملی۔۔۔؟ یہ کیسا انصاف ہوا بھلا۔اور سلطان کو تو سزا بھی دے دی خدا نے۔اسے ہمیشہ کیلئے اپنوں سے جدا کر کے۔تو پنل کو کس گناہ کی دی گئی۔۔۔؟"

" سزا ہم نے بھی تو کاٹی ہے بی بی ۔۔۔اپنی اولاد سے جدائی کی ۔اپنے خون سے جدائی کی ۔"
اب کی بار بختاور نے اپنے آنسوؤں دوپٹے سے پونچھتے ہوئے جواب دیا
" یہ سزا تم لوگوں نے خود اپنے لیئے لکھی تھی ۔اگر آگ بھڑک رہی ہو تو اس پر تیل نہیں ڈالتے پانی ڈال کے بجھا دیتے ہیں بختاور ۔۔۔رشتوں کو پیار سے گندھا جاتا ہے ۔محبت سے سنوارا جاتا ہے ۔انائیں بیچ میں آجائیں تو پھر رشتے آندھیوں میں تنکوں کی طرح بکھر جاتے ہیں ۔تم لوگ خود سمجھدار ہو سمجھ سکتے ہو اچھی طرح ۔۔۔"
" ہاں بی بی ۔۔۔آپ کی ساری باتیں سچی ہیں ۔بس ہم اب اپنی اسی غلطی کا مداوا کرنا چاہتے ہیں ۔ہم خوشی کو لینے آئے ہیں ۔آپ دل سے ہمیں اجازت دے دیں ۔۔۔" دین محمد نے ہار مان لی ۔
" میری اجازت سے کچھ نہیں ہوگا دین محمد ۔اور میں بھلا ہوتی بھی کون ہوں اجازت دینے یا نا دینے والی ۔۔۔تمہارا خون ہے تمہارا اپنا مال ہے ۔مجھے تو صرف امانت سونپی گئی تھی ۔اور خدا جانتا ہے میں نے اس امانت کو اچھے سے سنبھالا ۔
مگر اصل بات چنل کی ہے ۔کیا سمجھتے ہو وہ اتنی آسانی سے مان جائے گا ۔وہ ٹوٹا ہوا ہے اسے رشتوں کی محرومیوں نے ویران کر دیا ہے ۔وقت لگے گا اسے سمجھانے میں ۔اسے قبول کرنے میں وقت درکار ہوگا"
" آپ منائیں گی تو خوشی مان جائے گا وہ آپ کی بات کبھی نہیں ٹال سکتا ۔" بختاور نے نانی تاج کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک آس سے درخواست کی
" میں کوشش کروں گی بختو ۔سمجھاؤں گی چنل کو ۔۔۔مگر کچھ وقت لگے گا ۔وہ بڑا ہو چکا ہے ۔اپنا بھلا برا بھی سمجھتا ہے ۔اس کے جذبات کا بھی خیال رکھنا ہے ۔اتنا آسان نہیں ہوگا اسے اب اس بات کیلیئے راضی کرنا ۔تم لوگ دعا کرو وہ جلدی مان جائے ۔۔۔"
" ہاں بی بی واقعی اتنا آسان نہیں ہوگا ۔وقت تو لگے اسے خود کو منانے میں ۔پر آپ ہی اسے راضی کر سکتی ہیں ۔اور آپ اپنے چھوٹے بھائی کو ہمیشہ کی کبھی مایوس نہیں کریں گے ۔" دین محمد کو اپنی بی بی

تاج پر ناز تھا۔

"ہاں دین محمد۔۔۔میں راضی کروں گی اسے۔ضرور کروں گی۔میں کب چاہتی ہوں میرا بھائی اپنے خون کو تڑپتا رہے۔جانتی ہوں تم لوگ پہلے بھی کافی سزائیں کاٹ چکے ہو۔اور پھر میرا اپنا بھی تو کچھ بھروسہ نہیں ہے۔کب آنکھیں بند ہمیشہ کیلئے ہو جائیں کسے معلوم۔۔۔میرے بعد خوشی کو آپ کے پاس ہی تو آنا ہے۔"

" خدا آپ کو کچھ نا کرے بی بی۔اللہ آپ کی ڈور کو اور لمبا کر دے اور خوشی کی خوشیاں بھی دکھائے۔"

دین محمد نے اسے لمبی زندگی کی دعا دی تھی۔ان کے بوڑھے جھریوں بھرے چہرے پر ایک طمانیت بھری مسکان آٹھہری تھی۔

☆......☆......☆

صبح کا ناشتہ ان کی کل وقتی ملازمہ حاجرہ خالہ نے ٹیبل پر لگا دیا تھا۔سلطان کی گزری ساری رات سوچتے اور منصوبے بناتے گزر گئی تھی وہ اپنے بارے میں سوچتا رہا،فاخرہ کے بارے میں سوچتا رہا،فاخرہ کو اپنانے اور اپنے مستقبل کی زندگی کے بارے سوچتا۔آدھی سے زیادہ رات اس طرح سوچتے سوچتے آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔۔۔

اب ناشتے کے دوران بھی چوہدری صاحب اس کے کھانا کھانے کے انداز سے دل ہی دل میں اندازے لگا رہے تھے کہ کچھ نا کچھ ایسا ہے جو سلطان کو بے چین کر رہا۔

"سلطان کوئی مسئلہ یا پریشانی ہے۔۔۔؟" چوہدری صاحب کو ان کی خاموشی اور الجھا انداز کھلنے لگا تو خود ہی پوچھ لیا

"نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں ہے" وہ جھینپ سا گیا جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو اس کی

"تم کھانا بھی صحیح طرح نہیں کھا رہے ہو۔کچھ تو ایسا ضرور ہے جو تمہیں بے چین کر رہا ہے اندر ہی اندر۔بتا دو گے تو ہو سکتا ہے تمہاری الجھن سلجھ جائے" اتنے سال ایک دوسرے کے ساتھ گزارنے کے

بعد وہ ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہو چکے تھے اب

" چوہدری صاحب ۔۔۔میں ۔۔"

" سلطان ۔۔۔کتنی بار سمجھایا ہے

تمہیں یہاں مجھے چوہدری صاحب مت بلایا کرو ۔۔۔اب ہم فیملی ممبر ہیں ۔اور میں تمہیں اپنا بیٹا سمجھتا ہوں ۔۔۔" چوہدری صاحب نے اس کی بات بیچ سے اچک کر سلطان کو ڈانٹا

جانے کیوں وہ ابھی تک اس رشتے کو قبول نا کر پایا ۔۔

" اصل میں بس وہ زبان پر سے ۔۔۔

" اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے بیٹا ۔۔؟" ان کے لہجے میں نرمی اور شفقت عیاں تھی

" میں شادی کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔"

چوہدری صاحب حیران رہ گئے

" مگر کس سے ۔۔۔؟"

" فاخرہ سے ۔۔۔مگر کچھ مسئلے بھی ہیں ۔"

" فاخرہ کون ۔۔۔؟"

" یہ جو انڈین فیملی رہتی ہے اپنی کمیونٹی میں ۔۔۔اسد صاحب کی بیٹی ۔۔۔"

" اچھا ۔۔۔تو مسئلے کیا ہیں؟"

" اس کے گھر والے نہیں مان رہے ۔آپ بات کریں گے تو شاید وہ لوگ مان جائیں ۔۔۔"

" اچھا پہلے تو یہ فیصلہ کر لو کہ تم مجھ سے صرف مسئلہ شیئر کر رہے ہو یا اجازت لے رہے ہو ۔۔۔؟" ان کے لبوں پر مسکان آ بکھری تھی

" دونوں ۔۔۔مشورہ بھی اور اجازت بھی ۔کیونکہ میرے لیئے تو سب کچھ یہاں آپ ہی ہیں ۔۔۔"

چوہدری صاحب کچھ پل کو خاموش ہو گئے ناشتے کی ٹیبل پر ان دونوں کے بیچ میں پڑی کرسی پر خاموشی

چپکے سے آبیٹھی تھی سلطان کو بے چینی ہونے لگی جانے چوہدری صاحب کیا کہتے ہیں۔

"سلطان۔۔۔چاہتا تو میں بھی ہوں اور ہمارے گھر میں عورت کی ضرورت بھی ہے جو پورے گھر کو سنبھال سکے۔۔۔مگر یہ بھی یاد رکھو سلطان کہ تم پہلے سے شادی شدہ ہو۔ایک بچے کے باپ بھی۔اگر اسے معلوم ہوگیا تو پھر کیا کروگے؟کیا وہ پھر بھی شادی پر مان جائے گی۔۔۔؟"

چوہدری صاحب نے ایک تلخ حقیقت اس کے سامنے رکھی

ایک لمحے کو وہ چپ ہوگیا۔یہ ایسی حقیقت تھی جس سے وہ کبھی بھی دامن نہیں چھڑا سکتا تھا۔۔۔مگر فاخرہ کے بغیر رہنا بھی تو اب ناممکن ہو چکا تھا۔کیا کرتا اس دل کا جو سارا دن فاخرہ کے نام کی مالا جپتا رہتا۔

"میں ساری رات اسی مسئلے پر سوچتا رہا ہوں اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں فاخرہ اور اس کے خاندان سے اپنی پہلی شادی ہمیشہ چھپا کر رکھوں گا۔کبھی فاخرہ پر ظاہر نہیں ہونے دوں گا۔۔۔" سلطان بھی عزم کیئے بیٹھا تھا

"فاخرہ خود کیا کہتی ہے اور کیا وہ بھی تمہارے ساتھ تمہاری طرح ہی مخلص ہے؟"

"فاخرہ بہت اچھی ہے مجھ سے بہت پیار بھی کرتی ہے مگر مسئلہ اس کے ماں باپ کا ہے انہیں خدشہ ہے کہ میں کل کو وطن واپس چلا جاؤں گا اور وہ اپنی بیٹی کیلیئے ترس جائیں گے" سلطان نے ایک ہی سانس میں ساری بات مکمل کردی

"وہ ماں باپ ہیں ان کا خدشہ تو بجا بھی ہے۔۔۔"

"میں نے یہ بھی فیصلہ کرلیا ہے کہ میں اب کبھی پاکستان نہیں جاؤں گا میں اب ساری زندگی یہیں لندن میں گزار دوں گا مگر مجھے فاخرہ کو حاصل کرنا ہے ہر حالت میں میں اب اس کے بغیر نہیں رہ سکتا ہم دونوں بہت محبت کرتے ہیں ایک دوسرے سے اس کا بھی حال مجھ سے مختلف نہیں ہے" وہ تو سب کچھ خود سے سوچے بیٹھا تھا۔

"بیٹا اتنے بڑے فیصلے لینا بہت آسان ہوتا ہے مگر ان پر قائم رہنا انہیں نبھانا بہت مشکل۔ایسا کوئی بھی قدم مت اٹھاؤ جس پر کل افسوس کرنا پڑے۔ساری زندگی یہیں نہیں گزاری جا سکتی۔ہم اپنا

دل جتنا بھی پتھر کرلے آخر کبھی نا کبھی تو اسے وطن کی مٹی اور اپنا خون، خونی رشتے اپنی جانب کھینچیں گے۔تم اپنے فیصلوں پر قائم نہیں رہ سکو گے سلطان۔یہ بے حد مشکل ہے"

"میں اپنے ہر فیصلے پر عمل کر کے دکھاؤں گا۔چاہے کچھ بھی ہو جائے۔مجھے فاخرہ کو اب ہر حال میں پانا۔صرف اس کے ماں باپ کی طرف سے رکاوٹ ہے۔آپ ایک بار بات کرلیں گے تو وہ لوگ مان جائیں گے۔۔۔" دل سے مجبور اس نے دوبارہ درخواست کی

"میں بات ضرور کروں گا اور تمہارے لیئے انہیں ہر شرط پر راضی بھی کرلوں گا۔۔۔مگر تم صرف آج کی نا سوچو سلطان۔یہ ساری زندگی کا معاملہ ہے۔انسان کو کچھ بھی کرنے سے پہلے اس چیز کے نیگیٹو پہلو ضرور سامنے رکھنے چاہییں۔۔تم یہ سوچو کہ اگر کبھی بھی اسے تمہاری پچھلی زندگی کے بارے میں معلوم ہو گیا تو پھر کیا ہو گا۔۔۔؟"

"کچھ بھی نہیں ہو گا۔۔۔آپ اچھا سوچیں صرف۔۔میں سب سنبھال لوں گا۔کبھی بھی فاخرہ کو اپنی پچھلی زندگی کی بھنک نہیں پڑنے دوں گا۔۔۔"

"ٹھیک ہے اب تم جاؤ سٹور پر کافی دیر ہو چکی ہے پہلے بھی اور میں سوچتا ہوں کچھ نا کچھ کرتے ہیں" چوہدری صاحب نے اس کی توجہ وقت کی جانب دلائی

"جی میں بس نکل رہا ہوں ابھی ابھی" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سٹور پر جانے کی غرض سے نکلنے لگا

اس کے جانے کے بعد چوہدری صاحب اسی مسئلے پر سوچتے رہے سلطان کے فیصلے بے حد مشکل تھے لیکن انہیں سلطان کیلیئے راضی ہونا ہی پڑا

چوہدری صاحب نا چاہتے ہوئے بھی مان گئے۔وہ زمانہ شناس تجربہ کار انسان۔۔۔زندگی کے بہت سے چہرے دیکھ چکے تھے اور اسے مستقبل میں زندگی کا یہ چہرہ بہت بھیانک دکھائی دینے لگا۔۔۔وہ اس شادی کے انجام سے ڈرنے لگے۔مگر سلطان دل ہار چکا تھا۔وہ ہر شرط پر شادی کیلئے تیار تھا

☆......☆......☆

"ہاں نائلہ۔۔۔فاخرہ سے پھر بات ہوئی تھی آپ کی۔۔۔؟

" اسد میں نے کل آپ سے فاخرہ کے متعلق ڈسکس کیا تھا۔میری آج بھی اس سے اسی لڑکے والے معاملے کو لے کر خاصی طویل بحث ہوئی ہے۔پر نتیجہ وہی ہے۔۔۔" رات کو اپنے سلیپنگ بیڈ پر نائلہ حسین نے اپنے شوہر اسد حسین کو آج فاخرہ سے ہونے والی بحث کا سارا خلاصہ بتا دیا۔

اسد حسین صاحب جن کا تعلق ممبئی انڈیا سے تھا۔یہاں لندن میں ان کا اپنا بزنس تھا۔وہ ہمیشہ مصروف رہنے والے انسان تھے۔

پچھلی رات انہیں اپنی بیوی نے فاخرہ کے متعلق بتایا تو انہوں نے دوبارہ فاخرہ کو پیار سے سمجھانے کی تلقین تھی

" آپ نے اسے پیار سے سمجھایا تھا۔۔؟"

" جی۔۔۔میں نے پیار سے،غصے سے ہر طریقے سے سمجھایا مگر اس کے سر پر وہی ایک ہی بھوت سوار ہے۔پانی سر سے اوپر نا پہنچ جائے کہیں۔۔۔"

" جب اولاد اس مقام تک آجائے تو پھر غصہ نہیں کیا جاتا۔صرف پیار سے سمجھایا جاتا ہے۔غصہ کرنے سے معاملات مزید بگڑ جاتے ہیں۔۔۔"

" میں تو اس لڑکی کے فیوچر کو لے بہت فکر مند ہو رہی ہوں۔کیا بنے گا فاخرہ کا۔۔؟؟؟" نائلہ حسین اب باقاعدہ سر پکڑے بیٹھی تھیں

" کچھ نہیں ہوگا۔آپ بلاؤ فاخرہ کو میں خود اس سے بات کرتا ہوں۔"

تھوڑی دیر ہی بعد فاخرہ ان کے سامنے پڑے صوفے پر دوپٹہ سر پر جمائے موجود تھی۔

پھر سے وہی باتیں دہرائی گئیں۔فاخرہ نے پھر سے اپنے ماں باپ کو قائل کرنا شروع کر دیا۔اس کے باپ نے اس کے سامنے سارے خدشات رکھ کر معاملہ اسی پر چھوڑ دیا تھا

" ڈیڈ۔۔۔وہ میرے لیئے سب کچھ چھوڑنے پر تیار ہے۔مجھے اس پر خود سے زیادہ یقین ہے وہ کبھی میرے ساتھ دھوکہ نہیں کرے۔۔۔" فاخرہ اپنے پیار کی جنگ لڑ رہی تھی

" ٹھیک ہے بیٹا۔۔۔آپ جاؤ سو جاؤ۔جو ہوگا اچھا ہی ہوگا میری بیٹی مایوس نہیں ہوگی۔" ایک

طویل بحث کے بعد اسد صاحب نے اس معاملے کو سمیٹا تھا۔وہ نتیجے پر پہنچ چکے تھے

فاخرہ اپنے روم میں چلی گئی۔

"ہمیں فاخرہ کی بات ماننی ہی ہوگی۔اسے اپنی مرضی کا لڑکا منتخب کرنے دیتے ہیں۔۔۔"

"لیکن اسد صاحب۔۔۔یہ سب بہت مشکل ہو جائے گا بعد میں۔آپ بھی اسی کی طرف داری کر رہے ہیں۔"

" کچھ بھی مشکل نہیں ہوگا۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔"

" آپ اسے ایک سٹور کے مالک لڑکے سے شادی کرنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں جبکہ ہمارے پاس اس سے پہلے کئی بہترین آپشنز موجود ہیں۔۔۔"

"نہیں نائلہ۔۔۔ہمیں یہ رسک لینا ہی پڑے گا۔اب وہ سب بہترین آپشنز کسی کام کے نہیں ہیں۔مجھے فاخرہ کی آنکھوں اور لہجے میں اس لڑکے کیلئے محبت دکھائی دے رہی ہے۔ہمارا کوئی بھی دوسرا فیصلہ ہماری بیٹی کو ہم سے متنفر کر سکتا ہے۔اور میں کبھی نہیں چاہتا فاخرہ ساری زندگی ہم سے دل میں رنجش پالے جیتی رہے۔۔۔"

" آپ اس لڑکے کے سٹیٹس کو جانتے ہیں۔پھر بھی راضی ہو گئے اتنی آسانی سے۔۔۔؟"

" نائلہ۔۔۔جب ہماری شادی ہوئی تھی تب میں کیا تھا اور اب کیا ہوں۔۔۔ایسی باتوں کو بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔اگر وہ دونوں بغاوت پر اتر آئیں تب ہم کیا کریں گے۔۔۔؟

ہمیں ماننا ہی پڑے گا۔جھکنا ہی پڑے گا۔اپنی اولاد کیلیئے۔۔۔اور اگر کل کو وہ لوگ معاشی طور پر کسی پریشانی کا شکار ہوتے ہیں تو میں خود انہیں سپورٹ کروں گا۔آخر ہمارا سب کچھ بھی تو ہماری اولاد ہی کا ہے۔۔۔"

اس رات کو سونے سے قبل دونوں میاں بیوی فیصلہ کر کے سوئے تھے۔

☆......☆......☆

دو دن بعد چوہدری صاحب اپنے دو چار معزز احباب کے ساتھ اسد صاحب سے فاخرہ کا ہاتھ سلطان کیلئے مانگنے چلے آئے تھے۔اسد صاحب نے ان سب کا استقبال بہت گرمجوشی سے کیا تھا اور

ڈرائنگ روم میں ان کو بٹھا کر اچھے سے تواضع بھی کی
رسمی دعا سلام اور حال احوال کے بعد چوہدری صاحب نے اپنی آمد کا مقصد ان کے سامنے رکھ دیا تھا
اسد صاحب نے پہلے تو بہت پس و پیش کی مگر یہ لوگ ٹھان کے آئے تھے کہ رشتہ لے کے ہی جانا ہے۔تو کافی دیر کی کوششوں کے بعد وہ لوگ چند شرائط پر رشتہ دینے پر راضی ہو گئے جن میں سے پہلی اور سب سے بڑی شرط یہ تھی کہ فاخرہ کبھی پاکستان نہیں جائے گی۔۔۔ساری زندگی سلطان اسے لندن میں رکھے گا چاہے حالات کچھ بھی ہو جائیں۔۔۔
چوہدری صاحب نے سلطان کی خوشی کیلیئے ان کی ہر شرط مان لی۔ایک ماہ بعد شادی طئے کر دی گئی۔۔۔
ایک ماہ پلک جھپکنے میں خوشیوں اور خوابوں کے تیز رفتار گھوڑے پر سفر کرتے کس طرح تیزی سے گزر گیا پتا بھی نہیں چلا
اور ایک ماہ بعد فاخرہ سلطان کے کمرے میں حجلہ عروسی میں بیٹھی تھی۔یہ اس کی تیسری شادی تھی مگر جو خوشی سلطان کو اس بار محسوس ہوئی وہ پہلی دو شادیوں پر بالکل محسوس نا ہوئی۔
پہلی شادی نوری کے ساتھ۔۔۔وہ سلطان کیلئے ان چاہی شادی تھی اس کے ماں باپ کی خواہش۔۔۔
دوسری شادی ملوکھاں کے ساتھ۔۔۔وہ بھی عجیب اور مجبوری کے حالات کے ساتھ اسے شادی کرنا پڑی۔ایک قرض نبھانے کیلئے۔۔۔
اور اب جو احساسات اسے فاخرہ کیلئے اپنے دل میں محسوس ہوئے وہ پہلے کبھی محسوس نہیں کر پایا تھا۔شاید یہی محبت تھی۔شاید پہلی بار اسے سچ میں محبت ہوئی تھی اور اس سے زیادہ خوشی کا احساس اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس نے اپنی محبت کو پا لیا تھا وہ بھی اتنی جلدی۔۔۔بغیر کسی پہاڑ سے ندی نکالے۔۔۔کسی صحراء کو پاٹے بغیر۔۔۔پتھر کھائے بغیر۔۔۔
"جانتی ہو فاخرہ آج میں کتنا خوش ہوں؟"
"آپ خود ہی بتا دیں۔۔۔" اپنے حجلہ عروسی میں سفید دلہنوں والے مخصوص لباس میں سجی بیٹھی فاخرہ نے سلطان کو جواب دیا۔وہ خود بھی تو آج بے انتہا خوش تھی

" مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آج ساری دنیا میری ان دونوں بانہوں میں سمٹ آئی ہو" سلطان نے اپنی بانہیں کھولتے ہوئے مسکرا کر جواب تو وہ بدلے میں وہ حسن کا پیکر بھی مسکرا اٹھی۔۔۔

" سلطان آج ہم اپنی شادی شدہ زندگی کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں اس رشتے کی بنیاد رکھتے ہوئے آج ہم کچھ باتیں طے کرلیں۔۔۔" اس بار فاخرہ سنجیدہ تھی

" ہاں فاخرہ بولو۔۔۔ کھل کر بتاؤ"

" سلطان میں چاہتی ہو ہمارے اس پیار کی عمارت میں کبھی جھوٹ کی آمیزش نا ہونے پائے۔ کبھی دھوکے اور فریب کی دراڑیں نا آئیں۔ ہم نے اس عمارت کو سچ اور اعتماد کے سہارے کھڑا کرنا ہے۔

میں وعدہ کرتی ہوں میں ہمیشہ آپ کا ہر مشکل میں ساتھ نبھاؤں گی۔ ہر مقام پر آپ کے ساتھ کھڑی ہوں گی۔ آپ مجھے ہر قدم پر ایک سچا اور مخلص ساتھی پائیں گے۔ بدلے میں صرف یہی چاہتی ہوں کہ میرا جیون ساتھی بھی میرے ساتھ مخلص اور سچا ہو۔ وہ مجھ سے کبھی جھوٹ نا بولے، کبھی میرے اعتماد کو ٹھیس نا پہنچائے، کبھی بے ایمانی سے میرا دل نا توڑے۔۔۔

تاکہ ممی پاپا کے دل میں اس رشتے اور آپ کیلئے خدشات تھے وہ سب غلط ثابت ہوجائیں۔۔۔"

" نہیں فاخرہ ایسا کچھ بھی مت سوچو۔ ایسے کوئی بھی وہم مت پالو۔ جتنی تم میرے ساتھ مخلص ہو مجھے خود سے زیادہ مخلص پاؤ گی۔ میں کبھی آپ کو زندگی بھر دھوکہ نہیں دوں گا۔ میرا وعدہ ہے آپ سے۔۔۔" سلطان نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا

" مجھے آپ پر مکمل بھروسہ ہے"

اس رات کچھ وعدے طے ہوئے تھے کچھ قسمیں کھائی گئی تھیں۔ اور وہ رات بھی اتنی ہی حسین تھی جتنا کہ ایک محبت کرنے والے شادی شدہ جوڑے کی ہوسکتی ہے۔

چوہدری صاحب نے اسے دو ہفتوں کیلیئے سٹور سے مکمل چھٹی دے کر خود اس کی جگہہ سنبھال لی تھی تاکہ سلطان اپنی زندگی کے یہ خوبصورت پل بھرپور طریقے سے جی لے

اور انسان کو خوشی میسر ہو محبوب کی ہمراہی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے وقت اپنی مخصوص رفتار سے بھی تیز

بھاگنے لگا ہو۔کرہ ارض اپنی رفتار سے بھی زیادہ تیز بھاگنے لگا ہو۔۔یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔کب دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے سلطان دیکھتا ہی رہ گیا۔شادی کے پہلے ہی سال خدا نے ان کی گود میں ایک خوبصورت بیٹے کو ڈال دیا تو زندگی اور حسین ہوگئی۔چوہدری صاحب کی ہی خواہش پر اس بچے کا نام ارحم سلطان رکھا گیا اب تو ہر وقت سارے گھر میں ارحم کی ہی کلکاریاں سنائی دیتی۔۔۔چوہدری صاحب، ارحم کے ساتھ کھیلتے نا تھکتے۔۔

وقت پانچ سال مزید آگے سرک گیا۔۔۔ان پانچ سالوں میں سلطان کی زندگی میں آنے والا پہلا اور بڑا حادثہ چوہدری صاحب کی اچانک موت کا تھا۔انہیں کچھ بھی نا تھا۔کوئی ایسی بڑی بیماری بھی نہیں جو جان لیوا ثابت ہوتی۔وہ صحت مند تھے۔ایک رات خاموشی سے انہوں نے اس جہان سے اگلے جہان کا سفر شروع کر دیا۔بغیر کسی کو بتائے خاموش۔۔۔چپ چاپ۔۔۔

چوہدری صاحب کا آگے پیچھے سوائے سلطان کے اور کوئی بھی نا تھا۔سو وہ اپنی وصیت میں سب کچھ سلطان اور ارحم کے نام لکھ گئے تھے۔کافی عرصے تک سلطان اس صدمے سے باہر نا آپایا۔۔چار سالہ ارحم کا بوڑھا ساتھی جو سارا دن اسے کندھے پہ اٹھاتا اس کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا جانے وہ کہاں چلا گیا۔۔۔وہ بھی سارا دن گھر میں یہاں سے وہاں اداس اداس سا گھومتا رہتا۔۔۔

مگر کوئی کتنا اہم اور عزیز سہی زندگی کبھی کسی کیلئے نہیں رکتی۔یہ ہمیشہ اپنی ہی لے میں چلتی جاتی ہے۔اپنے ساتھ زندوں کو بھی چلائے جاتی ہے۔سو سلطان اور اس کی چھوٹی سی فیملی بھی چند ماہ بعد اس حادثے کو قبول کر کے پھر سے وہی زندگی جینے میں کامیاب ہو گئے۔۔

مگر وہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ زندگی سہانے خواب دکھاتی ہے۔تو گہرے گھاؤ بھی دیتی ہے۔اور اس نے ابھی مزید گہرے گھاؤ کھانے تھے۔یہ تو شروعات تھی۔کیونکہ زندگی مکافات عمل کا نام ہے۔اور یہ اس خدا کا وعدہ ہے کہ وہ انسان کے کیئے کی سزا اسے لازمی دیتا ہے۔کسی کو اس دنیا میں مزا چکھا دیتا ہے اور جو یہاں اس کی مخلوق کے ساتھ نا انصافیاں کر کے خوشگوار زندگی گزار جاتے ہیں ان کیلئے ایک جہان اور بھی ہے اور وہاں صرف انصاف ہوگا۔۔۔طاقتور اور کمزور کے فرق کے بغیر، صاحب اختیار اور بے

اختیار کی تفریق کے بغیر۔۔۔

سلطان کو بھی کئی دلوں کے حساب چکانے تھے۔نوری کو بے گناہ طلاق دینے کا حساب، ملوکھاں کی محبت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر محبت کو ناپاک کرنے کا حساب، خوشی کو باپ کے حصے کی شفقت سے محروم رکھنے کا حساب، دین محمد اور بختاور کا دل دکھانے ان کی نافرمانی کا حساب، اور کئی ایسے بے گناہوں کی زندگی کا حساب جو اس کے دھندے کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔۔۔

سلطان تو بہت زیادہ مقروض تھا۔اسے تو بہت سے دلوں کو دکھانے کا حساب دینا تھا۔اور خدا کبھی اپنے بندے کے دل کے دکھانے والے کو معاف نہیں فرماتا جب تک وہ بندے خود نا معاف کر دیں۔یہ اس خدا کا وعدہ ہے اور وہ خدا ہمیشہ اپنے وعدے پورے کرتا ہے۔۔۔

☆......☆......☆

تیرھواں حصہ

نانی کی باتوں نے دل پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ بظاہر خوشی نے کوئی لمبے لمبے سجدے نہیں کیئے۔ مگر دل ہی دل میں اس کی دعاؤں میں شدت آنے لگی۔ رات کو سونے سے پہلے، تنہائی میں، ہر وقت اس کے دل سے یہی دعا نکلتی کہ اے اللہ کسی نا کسی طرح جنت کیلئے صدیق زمیندار کے بیٹے اکرم کا رشتہ پھیر دے۔ اور اس کی دعائیں رنگ لے آئی۔۔۔

پچھلے دو چار دن سے اس نے مسجد میں جانا بھی شروع کر دیا تھا۔

انسان بھی تو انتہا درجے کا مقصد پرست واقع ہوا ہے اسے خدا یاد آتا بھی تب ہے جب اسے خدا کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب وہ کسی مشکل میں گھرا ہوا، جب بے بس ہو جاتا ہے تب پھر یہ بے بس انسان جب اس خدا کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے جس کے بس میں تمام جہانوں کی حاجات ہیں تو باوجود انسان کی مقصدیت پرستی کے وہ خدا انسان کو کبھی مایوس نہیں لوٹاتا۔ اس خدا کو یہ منظور ہی نہیں کہ اس کا بندہ اس کے در پر جھولی پھیلائے، سوالی بن کر آئے اور وہ اپنے بندے کو مایوس لوٹا دے اس کی خالی جھولی نا بھر دے۔

خوشی کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ اللہ نے اس کی سن لی خوشی نے جو مانگا اسے عنایت کر دیا۔

نانی ٹھیک ہی تو کہتی تھی کہ دعائیں قسمت پھیر بھی دیتی ہیں۔ اور واقعی قسمت بدل گئی تھی شاید۔۔۔

زمیندار صاحب سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ آخر نور بانو کیوں اتنے اچھے رشتے کو قبول کرنے پر راضی نہیں۔۔۔ اور جب انہوں نے جنت سے اس کی مرضی پوچھی تو وہ بھی خالی آنکھوں سے ماں باپ کو تکنے لگی۔۔۔ زمیندار صاحب نے اس وقت بیٹی کی آنکھوں میں غور سے دیکھا مگر وہ سمجھ ہی نہیں پائے، وہ جنت کی آنکھیں پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ اٹھ کر چل دی تھی۔۔۔

انہوں نے سمجھ لیا بچی ہے گھبرا گئی ہوگی شرما گئی ہوگی۔۔۔مگر نور بانو کو کیا ہوا وہ کیوں پس وپیش سے کام لے رہی ہیں۔حالانکہ ایسا زندگی میں کبھی نہیں ہوا تھا کہ نور بانو نے کسی بات میں اپنی مرضی مسلط کی ہو وہ ہمیشہ زمیندار صاحب کے فرمان کی پابند رہتی۔۔۔بس جو وہ بول دیتے وہی اچھا۔۔نور بانو کیلیئے ہمیشہ زمیندار صاحب کی بات حرف آخر کا درجہ رکھتی ان کیلیئے حکم کا درجہ رکھتی۔

زمیندار صاحب کو کئی ایسے معاملات یاد تھے کہ انہوں نے جب بھی گھریلو معاملات اور دوسرے مسائل میں نور بانو کی صلاح مانگی وہ بول دیتی جیسے آپ کی مرضی آپ بہتر فیصلہ کریں گے۔وہ اسے اکساتے رہتے کہ تم بھی اس گھر میں اور گھر کے تمام معاملات میں برابر کی شریک ہو اور یہ تمہارا حق بھی ہے مگر نور بانو نے اپنی روایت برقرار رکھی کبھی اپنا حق استعمال نہیں کیا ہمیشہ شوہر کی ہر بات کو اولیت دی ۔۔۔وہ ایک سلیقہ شعار اور شوہر کی فرمانبردار بیوی ثابت ہوئی تھی۔خدا جانے اب یہ فرمانبرداری تھی یا اپنی ذات کی منفی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ زمیندار صاحب اس رشتے کو لے کے اتنے خوش تھے مگر نور بانو نے اس بار ان کی حمایت نہیں کی۔۔۔ایسا نہیں تھا کہ انہوں نے سراسر مخالفت کی ہو مگر زمیندار صاحب نے اچھی طرح محسوس کرلیا کہ وہ اس رشتے پر خوش بھی نہیں ہے۔۔۔اور دل سے وہ یہ رشتہ قبول کرنا ہی نہیں چاہتی۔

"نور بانو۔۔۔میں سمجھ ہی نہیں پا رہا کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔۔اتنا اچھا رشتہ ہے مگر تم مجھے خوش نہیں لگ رہی۔۔" انہوں نے دس دن بعد رات کو ایک بار پھر رشتے کی بات چھیڑ دی وہ دراصل جاننا چاہتے تھے کہ آخر وجہ کیا ہے

"آپ کا اندازہ صحیح ہے۔میرا دل نہیں مان رہا اس رشتے کیلئے۔۔۔"

"لیکن کیوں نہیں مان رہا۔۔۔آخر کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔۔۔"

"میں خود بھی سمجھنے میں ناکام ہوں۔۔۔۔مگر جب سے یہ رشتہ جنت کیلئے آیا ہے میرا دل اداس ہوگیا ہے۔۔وجہ کوئی بھی نہیں ہے۔یقین جانیے۔"

"حیرت ہے پھر تو تم بے وجہ یہ رشتہ ٹھکرا رہی ہو۔"

"کبھی کبھی کچھ چیزیں بے وجہ بھی تو ہو جاتی ہیں۔انہیں واقع ہونے کیلئے کسی خاص وجہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔۔۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو نور بانو۔۔۔میں کچھ بھی نہیں سمجھ پارہا۔۔۔" زمیندار صاحب حیران رہ گئے

"میں خود بھی کچھ نہیں سمجھ پارہی۔۔۔مگر دل نہیں مان رہا۔جانے کیوں۔۔۔"

"کیا تمہاری نظر میں جنت کیلئے کوئی اور اچھا رشتہ ہے؟" زمیندار صاحب کو شک گزرا کہ شاید وہ جنت کیلئے کسی اور کو سوچے بیٹھی ہوں

"نہیں نہیں۔۔۔ایسی کوئی بات نہیں ہے۔میں نے تو ابھی جنت کیلئے کسی کو بھی نہیں سوچا۔وہ ابھی چھوٹی ہے جو نصیب میں لکھا ہو گا مل جائے گا۔۔۔ابھی میں نے ایسا کچھ بھی نہیں سوچا۔۔"

"تو میرا نہیں خیال کہ ہمیں جنت کیلئے اس سے بہتر کوئی اور رشتہ بھی ملے گا۔۔۔دھن دولت زمین کی بھی کوئی کمی نہیں ہے ان کے پاس"

"کیوں نہیں ملے گا۔ضرور ملے گا میری جنت کیلئے اللہ جنت جیسا جوڑ دے گا۔اور سب کچھ دھن دولت تو نہیں ہوتی نا۔۔۔کبھی کبھی انسان کو دل کی خوشی بھی تو درکار ہوتی ہے۔کیا پتا اللہ نے ہماری جنت کیلئے کوئی اور اس سے بھی اچھا لکھا ہو"

زمیندار صاحب خاموش ہو گئے۔اور انہوں نے وہیں دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اکرم کے رشتے کیلئے انکار کر دیں گے۔وہ ایسے انسان نہیں تھے کہ بس صرف اپنی مرضی اور خوشی کو دیکھتے ہوئے اپنا فیصلہ سب پر مسلط کر دیتے۔بھلے رشتہ اچھا تھا برابری کا تھا۔صدیق بھی اچھا خاصا زمیندار تھا ظاہر ہے باپ کی جائیداد اولاد میں تقسیم ہوئی تھی۔مگر ایسی دولت کا کیا کرنا جب گھر والے ہی دل سے خوش نا ہوں۔وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر وہ اس رشتے کیلئے ہاں بھی بول دیں تو بانو دل سے نا سہی بظاہر خوش رہنے کی اداکاری کر لے گی۔مگر انہیں اپنی بیوی کی خوش رہنے کی اداکاری نہیں اس کی دل سے خوشی درکار تھی۔آنکھیں بند ہونے سے پہلے وہ فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔

اور اگلی صبح انہوں نے صدیق زمیندار سے زمینوں پر بات چیت کے دوران اس رشتے سے

معذرت کرلی ۔صدیق حیران تھے انہیں ایسی امید ہرگز نہیں تھی وہ تو سوچ بیٹھے تھے کہ زمیندار صاحب فرضی کارروائی کیلئے فیصلے کیلئے کچھ دن لے رہے ہیں بلا آخرانہوں نے میرے بیٹے کا رشتہ قبول ہی کرنا ہے مگر زمیندار صاحب کی طرف سے ہونے والی معذرت اسے چونکا گئی ۔وہ حیرت زدہ رہ گئے ۔خیر دو دن بعد انہوں نے اپنے بھائی کے گھر بھتیجی کیلئے رشتہ مانگا تو وہاں جھٹ ہاں ہوگئی ۔تبھی وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے کہ کیوں اپنوں کو چھوڑ کر صرف زمین کیلئے غیروں سے سوالی بن بیٹھا ۔۔اپنے تھوڑے کم زمیندار سہی پھر بھی اپنے تو ہیں نا۔

اور یہاں نور بانو نے دل ہی دل میں خدا کا شکرادا کیا۔وہ اپنے مجازی خدا کی دل سے مشکور ہوگئی ان کے دل میں شوہر کیلئے تکریم مزید بڑھ گئی کہ انہوں نے اپنی مرضی ہوتے ہوئے بھی بیوی کی رائے کو اہمیت دی تھی ۔۔

خوش صرف نور بانو نہیں تھی ۔جنت بھی تھی ۔ایک انسان اور بھی تھا خوش بخت عرف خوشی ۔۔۔دعائیں اتنی جلدی پوری ہوجائیں تو دل کو کتنی خوشی حاصل ہوتی ہے اس خوشی کا ادراک خوشی کو آج ہوا تھا

☆......☆......☆

چوہدری صاحب کے صدمے کے بعد زندگی پھر سے معمول پر آگئی تھی ۔اب سارے کاروبار کا مالک سلطان تھا وہی سب کچھ سنبھالنے لگا۔

ہر ذی روح کی یہی فطرت ہے کہ وہ جس ماحول میں رہتا ہے اسی ماحول کو ایڈاپٹ کرلیتا ہے ۔انگلینڈ میں اتنا عرصہ گزارنے کے بعد وہ اسی زندگی میں رچ بس گیا۔کوئی بھی انجان آدمی اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں ناکام ہوسکتا تھا کہ یہ وہی شاہ والی کی گلیوں میں کھیلنے والا بچہ سلطان ہے جواب اپنے چال ڈھال اور رویے سے ایک یہیں کا پروردہ محسوس ہوتا۔

سلطان کا طرزِ زندگی ، رہن سہن ،کھانا پینا سب کچھ بدل چکا تھا۔چوہدری صاحب کے بعد انہوں نے دن رات کی محنت اور لگن سے کاروبار کو بھی کافی وسعت دے دی تھی ۔وہ پورا سال محنت سے کام کرتے اور سال میں دس دن اپنے دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ پر چلے جاتے ۔وہ اپنی زندگی سے خوش

تھے، مطمئن تھے۔

زندگی خوش تھی بھرپور تھی کسی چیز کی کوئی تنگی کوئی کمی نہیں تھی۔ان کا چھوٹا سا گھر مکمل تھا۔سلطان، فاخرہ اور ارحم۔تین افراد کا یہ چھوٹا سا گھرانہ ایک خوشحال زندگی گزارنے لگا۔اولاد ہوئی تو سلطان اور فاخرہ کے پاؤں محبت کی بیڑیوں نے کچھ اور مضبوطی سے جکڑ لیئے۔لیکن پھر بھی کہیں نا کہیں ایک خلش باقی تھی ایک کمی سی لگتی تھی۔فاخرہ کو جیسے حلق میں کوئی تنکا اٹکا رہتا ہو۔اور وجہ وہی تھی شادی میں اس کے والدین کی طرف سے رکھی جانے والی پہلی شرط کہ سلطان کبھی واپس پاکستان نہیں جائے گا اور فاخرہ کو ہمیشہ یہیں لندن میں رکھے گا۔سلطان اس آزمائش پر پورے اترے تھے۔اس نے سب کچھ بھلا دیا۔فاخرہ کیلئے سب کو چھوڑ دیا۔کبھی پاکستان جانے کا نام تک نہیں لیا۔کبھی اپنے والدین سے ملنے کی خواہش کا اظہار تک نا کیا۔اور وہ جانتی تھی اس سب کی قصوروار صرف وہی خود ہے۔وہ اندر ہی اندر خود کو سلطان کا مجرم سمجھنے لگی تھی۔گلٹی فیل کرتی رہتی

زندگی کچھ سال مزید آگے سرک گئی ارحم اب ہائی سٹینڈرڈ میں آچکا تھا۔بچپن سے ہی اسے رنگوں سے محبت تھی وہ رنگوں سے کھیلنے لگا۔سلطان نے بیٹے کے شوق کو دیکھتے ہوئے پچھلے ماہ اسے ایک آرٹ اینڈ میوزک ایوننگ کوچنگ سنٹر میں ایڈمشن دلا دیا۔اس کوچنگ سنٹر میں آرٹ،میوزک کے علاوہ بچوں کی اخلاقی تربیت پر بھی خصوصی لیکچرز دیئے تھے۔سلطان کو ارحم کیلئے اس ادارے سے زیادہ مناسب کوئی اور ادارہ نظر نہیں آیا۔سو وہ ارحم کو لیئے یہیں پہنچ گئے۔

صبح اپنے کالج کی کلاسز کے بعد وہ شام کو تین گھنٹے کی ایوننگ کلاسز لینے یہاں آجاتا۔یہی اس کا شوق تھا ایک بہترین آرٹسٹ بننا،ایک بہترین مصور بننا اور سارے دن میں یہی وہ تین گھنٹے ہوتے جس کا ارحم کو شدت سے انتظار رہتا۔۔

اسے کے اندر چھپا ایک ماہر آرٹسٹ آہستہ آہستہ باہر آنے لگا۔کوچنگ سنٹر میں اس کی صلاحیتیں مزید نکھرنے لگی۔رات کے وقت بھی وہ فری ٹائم میں اپنے گھر میں بنی اپنی چھوٹی سی گیلری میں آجاتا تصویریں بناتا۔۔ساز وں کو چھیڑتا۔۔سازوں سے کھیلتا۔کوچنگ سنٹر میں ہر طرح کی سہولیات میسر

تھیں ۔ارحم کی انگلیاں اسٹرومنٹس پر پڑتی تو مدھر سروں سے کوچنگ سنٹر میں ایک عجب سا سماں پیدا ہو جاتا۔۔۔پھر چاہے وہ پیانو ہو، گٹار ہو، بانسری ہو یا کوئی اور میوزیکل انسٹرومنٹ۔۔وہ سب کچھ بہت جلد سیکھ گیا اس کے کوچ اس کی صلاحیتوں سے حیران تھے اور خوش بھی ۔اس ایک سال میں وہ اپنے سنٹر کا سب سے ماہر آرٹسٹ بن چکا تھا

ارحم کے کوچ اس کے موسیقی کی دنیا میں تابناک مستقبل بارے پر امید تھے ۔انہیں یقین تھا کہ یہ لڑکا ایک دن اس فیلڈ میں بہت بڑا نام کمائے گا۔بہت آگے تک جائے گا۔

سلطان اور فاخرہ نے اس کے شوق میں کبھی ٹانگ نہیں اڑائی بلکہ ہمیشہ اسے سپورٹ کیا۔حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ارحم کی تعلیمی کارگردگی اتنی اچھی نہیں ہے جس قدر وہ اپنے آرٹ میں ماہر ہے ۔پھر بھی وہ خوش تھے کیوں کہ ارحم خوش تھا۔انہیں اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی عزیز تھی ۔ان کی خوشی سے وہ خوش تھے۔

ارحم کی زندگی کچھ الگ سی تھی اس کی طبیعت اس کا مزاج سب سے الگ ۔کوئی بندہ اتنی آسانی سے اسے تسخیر ہی نا کر پاتا۔کسی کو اسے مکمل جاننے کیلیئے اس کی قربت درکار ہوتی ۔ارحم کے شب و روز میں اترنا پڑتا تب جا کے وہ اس کی ذات میں چھپے راز پا سکتا تھا۔جیسے کسی گہرے سمندر کی گہرائی ماپنے کیلیئے اس کے اندر اترنا پڑتا ہے کناروں پر کھڑے ہو کر گہرائی کا پتا نہیں چلتا ویسے ہی یہ سولہ سالہ لڑکا تھا۔گہرا، گھنا ،خاموش اور چپ چاپ ۔ بالکل کسی سمندر کے جیسے۔

جوں جوں ارحم بڑا ہوتا گیا اس کی شخصیت میں مزید تبدیلیاں آنے لگیں ۔جس قدر وہ آرٹ کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا مزید فن سیکھتا چلا گیا اسی قدر وہ خاموش ہوتا گیا۔اس میں بولنے کی عادت بہت کم تھی۔ جیسے اس نے اپنی ذات کو بہت سے پردوں میں اوڑھ رکھا ہو۔اور لندن کی اس مصروف زندگی میں کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ اس گہرے لڑکے کی گہرائیوں کو ماپتا یا اس کی ذات کو ان گنت پردوں سے باہر نکالتا۔

کوکب کبیر وہ پہلی لڑکی تھی جو ارحم کی زندگی میں آئی نہیں بلکہ زبردستی گھسی ۔کوکب کبیر اسی مسلم کمیونٹی میں ان کی پڑوسن تھی جس کی ارحم سے باقاعدہ پہلی ملاقات کالج میں ہوئی ۔حالانکہ ایک ہی کمیونٹی

کے ایک ہی بلاک میں رہتے ہوئے وہ دونوں لاتعداد بار ایک دوسرے کو دیکھ چکے تھے۔ایک دوسرے کے نام سے واقف تھے۔مگر دونوں کے سکول الگ ہونے کے باعث کھل کے ملاقات کبھی نا ہو سکی۔حالانکہ کبیر صاحب جو ایک بزنس پرسن تھے سلطان کے دوستوں میں سے تھے۔کئی بار سلطان اور کبیر صاحب اپنے مشترکہ دوستوں کے ہاں پارٹیوں پر وقت ساتھ گزار چکے تھے۔مگر ابھی تک ارحم اور کوکب کی باقاعدہ ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔

کالج کے پہلے ہی دن کلاس انٹروڈکشن میں چلبلی کوکب کھل کر سامنے آچکی تھی۔اس کی طبیعت اور مزاج میں چھپے شوخ رنگ نے پہلے ہی دن سب کو اس کے قریب کر دیا تھا۔

ان دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے کو پہچان تو پہلے سے ہی چکی تھیں۔کلاس انٹرو کے بعد جب باقاعدہ ملاقات ہو گئی تو بیچ کے ساری تکلفات کے پردے ایک ایک کر کے سرکتے گئے۔

وہ دونوں کلاس کے باہر تمام وقت ایک ساتھ گزارتے۔ان کا چار پانچ دوستوں پر مشتمل ایک گروپ بن چکا تھا۔جو ہر وقت اور ہمیشہ ساتھ دکھائی دیتے۔چاہے وہ کالج کی کوئی اندرونی سرگرمی ہو یا کالج سے باہر کوئی بڑا اور مشہور ایونٹ۔۔۔

کالج میں ہونے والی ملاقاتوں سے قربتیں بڑھنے لگی۔اور کوکب کبیر وہ پہلی اور واحد لڑکی تھی جو ارحم کے گنے چنے دوستوں میں شمار ہونے لگی۔دونوں کے مزاج یکسر مختلف تھے۔سلطان جس قدر چپ چاپ اور اپنے آپ میں رہنے والا لڑکا تھا کوکب اسی قدر ہنس مکھ،شوخ اور چلبلی لڑکی تھی۔مزاجوں کے اختلاف کے باوجود بھی کوکب اسے ہر وقت کالج میں اپنے ساتھ تھی کیئے رکھتی۔کلاس میں،کینٹین میں، پلے گراؤنڈ میں اپنے دوستوں کے حلقے میں۔ارحم کو نا چاہتے ہوئے بھی اس کا ساتھ دینا پڑتا۔کیونکہ

ارحم کا حلقہ احباب بہت محدود تھا اور کوکب پورے کالج کی مشہور چلبلی لڑکی۔اپنی خوش مزاجی کے باعث ہر کسی کی دوست۔کالج کے ہر فنکشن ہر ایونٹ کی روح رواں۔نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں ہمیشہ سب سے آگے رہنے والی لڑکی۔

وہ ان لوگوں میں سے تھی جن کے بغیر کالج کا کوئی بھی ایونٹ نامکمل سمجھا تھا۔کسی بھی محفل میں

اس کی کمی لازمی محسوس کی جاسکتی تھی۔وہ ہمیشہ محسوس کیئے جانے والے لوگوں میں سے ایک تھی۔
اور وہ کوکب بھی سدا کی باتونی لڑکی سارا دن اس چپ چپ رہنے والے گونگے لڑکے کو اکساتی رہتی بولنے پر، اپنے ساتھ شرارتوں پر۔اپنے ساتھ ہر غیر نصابی سرگرمی میں ارحم کے ناچاہنے کے باوجود بھی اسے گھسیٹے رکھتی اگر ارحم خوش ہوتا تو کوکب کو بھی زندگی سہانی محسوس ہوتی اور اگر وہ کبھی اداس ہوتا تو کوکب کا دل بھی رونقیں قبول نا کرتا
کیونکہ وہ جانتی ہی نہیں تھی کہ کب یہ خاموش رہنے والا لڑکا اس باتونی اور چلبلی چنچل لڑکی کے دل میں اتر گیا۔کوکب کی طرح وہ بھی بے خبر تھا کہ کب وہ اس کے دل کی دھڑکن بن گیا۔خوبصورتی تو اسے ماں باپ سے ورثے میں ملی تھی مگر خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ارحم کی خاموش مزاجی بھی اسے گھائل کیئے رکھتی مگر خدا جانے کب وہ دنیا کا سب بورنگ لڑکا اس کے دل کی حالت جان پاتا۔دن گزرنے لگے ان کی محبت بڑھنے لگی ارحم کی فنون سے اور کوکب کی ارحم سے۔۔۔
کوکب کی سب سے کلوز فرینڈ کرسٹی جو کوکب کے ذریعے ہی دوستوں کے اس گروپ میں شامل ہوئی تھی۔وہ ہی اکیلی کوکب کے دل میں چھپی ارحم کی محبت سے واقف تھی۔وہ دونوں ایک دوسرے کی ہمرازتھیں ان کا ایک دوسرے سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں تھا۔تو کوکب کے دل کا حال بھلا کیسے چھپ سکتا تھا۔
کرسٹی ایک سٹریٹ فارورڈ لڑکی تھی۔زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرنے والی۔سچائی اور فیکٹس کو سامنے رکھ کے چلنے والی لڑکی۔وہ خواب نہیں دیکھتی تھی نا ہی اسے خوابوں میں رہنا پسند تھا۔
بچپن سے ہی اس کے گھر کا ماحول کچھ کھنچا کھنچا سا تھا۔ماں باپ کے مابین آئے روز ہونے والے جھگڑوں نے گھر میں ایک تناؤ کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔اس کی ماں جانتی تھی کہ کرسٹی کا باپ کسی دوسری عورت میں ملوث ہے۔وہ چاہتی تھی کہ اس کا شوہر بیرونی سرگرمیاں ترک کر کے اپنی پوری محبت اور توجہ صرف اور صرف اپنے گھر اور اولاد پر مرکوز رکھے۔کیونکہ اولاد جوان ہو چکی تھی کرسٹی کے بعد اس کی دوسری بہن ایلی بھی اب کالج میں داخلہ لے چکی تھی۔وہ دونوں بہنیں بھی جانتی تھیں کہ ان کے والد کے تعلقات باہر کسی عورت سے بھی ہیں اور یہی وجہ گھر میں جھگڑے کا باعث بنتی ہے۔

مگر اس کے بے حس باپ کو اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں اب اسے اپنے افیئرز ترک کر دینے چاہئیں زندگی میں کچھ سدھار لانا چاہیئے۔

کرسٹی ذرا بڑی ہوئی تو اس کی زندگی میں ایڈم آیا مگر وہ جلد ہی اسے چھوڑ کر کسی اور کی بانہوں میں جھولنے لگا۔تو کرسٹی کو مرد ذات سے بھی الجھن سی ہونے لگی۔اس کی زندگی میں آنے والے دو مرد تھے ایک اس کا باپ دوسرا بوائے فرینڈ ایڈم دونوں کے ساتھ کرسٹی کی یادیں ناخوشگوار تھیں۔چھوٹی عمر میں ہونے والے ان تلخ تجربات نے کرسٹی کو بھی حقیقت پسند بنا دیا اور وہ اپنی سہیلی کوکب کو بھی ہر وقت یہی سمجھاتی رہتی کہ مرد ذات اعتبار کی قابل نہیں ہے کسی کیلئے اپنی نیندیں گنوانا محض بچپنا ہے۔یا اگر انسان کسی کے ساتھ انوالو ہو بھی ہی تو کسی ایسے انسان کے ساتھ جو اس کے ساتھ بھی مخلص ہو۔اسی ایک بات کو لے کر دونوں سہیلیوں میں کئی بار بحث ہو چکی تھی مگر نتیجہ کوئی بھی نہیں نکل سکا تھا

☆......☆......☆

”زندگی ایک سادہ اور بے رنگ کینوس کی طرح ہوتی ہے۔اس بے رنگ سکیچ میں ہم انسان ہی رنگ بھرتے ہیں۔اپنے اخلاق سے،اپنے بول چال سے،اپنے رویئے سے،اپنے پہننے اوڑھنے سے، اپنے اعمال سے اور اپنے افعال سے

زندگی میں ہمارے اعضاء سے ہونے والی ہر حرکت اور ہمارے منہ سے نکلے ہر بول سے ہم اس سادہ کینوس پر ایک انمٹ رنگ بکھیرتے ہیں۔ہمیشہ رہ جانے والا رنگ،ایسا رنگ جو پھر مشقتوں سے بھی صاف نہیں ہو سکتا۔اور پھر یہ رنگ ہماری

زندگی میں ہمیشہ کیلیئے ہماری پہچان بن جاتا ہے۔یہی وہ رنگ ہوتا ہے جو ہماری شخصیت کا عکاس ہوتا ہے،ہماری امیج بنتا ہے،معاشرے میں ہماری پہچان بنتا ہے۔

اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اس کینوس پر کس طرح کے رنگ بکھیرتے ہیں۔۔۔“

ایوننگ آرٹ سنٹر میں سر جانسن کا لیکچر ابھی جاری تھا جب ارحم کی جینز کی جیب میں پڑا موبائل تھرتھرانے لگا اس نے کوئی توجہ نا دی اور اپنی پوری توجہ سے لیکچر سننے کی کوشش کرنے لگا

مگر موبائل کی مسلسل تھرتھراہٹ اس کی توجہ بٹا رہی تھی۔

"دنیا میں اس طرح کی ہزاروں مثالیں مل سکتی ہیں۔مگر چونکہ اس وقت ہم آرٹ کلاس میں ہیں تو میں آپکو آرٹ سے وابستہ لوگوں کی ہی مثال دینا پسند کروں گا"

لیکچر جاری تھا مگر یہ موبائل اس نے جیب سے ہلکا سا موبائل نکال کر نمبر چیک کیا تو تیرہ مسڈ کالز آچکی تھیں اور ارحم موبائل دوبارہ پاکٹ میں رکھنے ہی والا تھا کہ تھرتھراہٹ کے ساتھ ایک بار پھر موبائل سکرین جگمگانے لگی سکرین پر "کوکب کالنگ" لکھا آ رہا تھا۔۔۔

"اف یہ لڑکی۔۔۔" اس نے خود کو کوسا۔اسے اٹھنا ہی ہوگا کلاس سے نکل کر بات کرنا ہی ہوگی ورنہ جب تک بات نہیں ہوگی وہ لڑکی کالز کرتی ہی رہے گی۔۔

موبائل ایک بار پھر تھرتھرانے لگا

"کیا میں باہر جا سکتا ہوں سر۔۔۔؟" ارحم کو اپنی سیٹ سے اٹھ کر بولنا ہی پڑا

"کیا کوئی مسئلہ ہے۔۔۔؟" سر جانسن نے حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا کیوں کہ وہ ہمیشہ پورا لیکچر انتہائی توجہ سے سننے والا سٹوڈنٹ تھا

"یس سر۔۔۔سب ٹھیک ہے۔کیا میں جاؤں سر؟"

سر جانسن کا اشارہ پاتے ہی وہ کلاس سے باہر آگیا ہے اور موبائل جیب سے نکالا ۔۔۔سترہ مسڈ کالز۔۔۔

اگلی بیل پر اس نے موبائل کان سے لگا لیا

"کہاں تھے تم اب تک۔۔۔" دوسری جانب سے تشویش سے پوچھا گیا

"کیا تم پاگل ہو کوکب۔تم جانتی بھی ہو اس وقت میں کوچنگ سنٹر میں ہوتا ہوں۔۔۔"

اب ارحم اس سے اردو میں بات کر رہا تھا۔

"پاگل تم ہو یا میں۔۔۔؟

یار میں کتنی دیر سے کالز کر رہی ہوں بندہ کم از کم کال ہی اٹھا لیتا ہے۔خود تو تم یاد کرنے سے رہے"

" جب بندہ کال اٹینڈ نا کر رہا ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ یا تو فون سے وہ دور ہے یا پھر بہت زیادہ مصروف۔۔۔مگر موصوفہ آپ کو کون سمجھائے۔۔۔"

" یار کم از کم آج تو چھٹی کر لیتے۔کیا تم نہیں جانتے آج کون سی تاریخ ہے۔۔۔؟"

وہ سوچنے لگا۔آج کونسی تاریخ ہے۔

" سات جولائی ہے آج۔۔۔" اسے

تاریخ یاد آ گئی

" اور سات جولائی کو کیا ہوتا ہے؟"

ارحم کو ایک بار پھر سوچنا پڑا

مگر ذہن پر زور دینے کے بعد بھی اسے کچھ یاد نہیں آیا

"تمہاری برتھ ڈے ہے۔۔۔؟" اس نے تکا مارنے کی کوشش کی

"نہیں ڈفررر۔۔۔میری برتھ ڈے ابھی دور ہے۔سوچو جلدی جلدی"

"کیا ہوتا ہے مجھے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا"

"تمہیں سچ میں کچھ یاد نہیں یا بن رہے ہو۔۔۔؟

" میں نے پچھلے ہفتے کلاس میں تمہیں کیا بتایا تھا کہ ہم سب اکٹھے چلیں گے۔ یاد کرو۔۔۔"

" مجھے پچھلی باتیں یاد نہیں رہتی کوکب سچ میں۔۔۔"

" تو پھر ایسا کرو تم کسی مینٹل ہسپیٹل میں ایڈمٹ ہو جاؤ۔۔۔" دوسری طرف وہ کھلکھلا اٹھی۔غصہ بھی تھی مگر کیا کرتی ایک یہی لڑکا تو تھا جس پر چاہنے کے باوجود بھی وہ غصہ نہیں کر سکتی تھی

" اب بتا بھی دو۔اتنا سسپینس کیوں پیدا کر رہی ہو۔۔۔؟

مجھے سچ میں کچھ بھی یاد نہیں۔۔۔اب جلدی بتاؤ کلاس مس ہو رہی ہے میری۔۔۔"

" پاگل۔۔۔آج رات ایونٹ ہو رہا ہے ہائیڈ پارک میں اور ہم دونوں چل رہے ہیں۔۔۔" کوکب کی پر جوش آواز سنائی دی۔اس نے بلا خر بتا ہی دیا

"کوکب تم جانتی ہو نا مجھے بھیڑ سے اور اس طرح کے ایونٹس سے الجھن ہوتی ہے۔اور تم مجھے یہ بات آج صبح کالج میں بھی بتا سکتی تھی نا۔سوری میں نہیں چل رہا"

ارحم نے معذرت کر لی

"کیوں نہیں چل رہے تم۔۔۔وجہ؟"

"یار کلاس لینی ہے مجھے۔سمجھا کرو۔۔۔"

"تو چھوڑ دو ایک دن کلاس کیا ہو جائے گا ارحم۔کم آن یار تم ہم سب کیلئے اتنا سا بھی نہیں کر سکتے؟"

"کوکب تم باقی گروپ کے ساتھ چلی جاؤ نا۔کیوں میری کلاس کے پیچھے پڑ گئی ہو۔لازمی مس کروانا ہے۔۔۔؟" وہ آخر ڈھیلا پڑنے لگا

"تم جانتے ہو اگر دنیا میں بورنگ انسانوں کی فہرست جاری کی جائے تو ٹاپ آف دی لسٹ تم ہی ہو گے۔۔"

"اور اگر فارغ انسانوں کی فہرست بنائی جائے تو سر فہرست تم ہو گی۔۔۔"

"تو اچھا ہے نا مجھے فخر ہے۔زندگی جینے کا نام ہے زندہ دلی کا نام ہے۔اور میں اپنی زندگی پورے دل سے جیتی ہوں۔۔۔"

"سنجیدگی بھی کسی چیز کا نام ہوتا ہے۔جو تمہارے اندر نام کو بھی نہیں۔۔۔"

"سنجیدہ ہونے کیلئے ابھی بہت سے زندگی پڑی ہے۔میں اپنی زندگی کھل کر جینا چاہتی ہوں بھرپور طریقے سے۔۔۔"

"اچھا ٹھیک ہے فون رکھو مجھے کلاس لینی ہے۔" ارحم کو جلدی تھی

"جی نہیں۔۔۔میں بیس منٹ میں سنٹر پہنچ رہی ہوں۔تم نے آنا ہے۔ڈینیئل، کرسٹی، زاہد، الینا، سٹوارٹ سب لوگ چل رہے ہیں"کوکب نے ایک ہی سانس میں اپنے کلاس میٹس گروپ کے نام گنوائے

"تو تم ان لوگوں کے ساتھ چلی جاؤ نا۔۔۔مجھے نہیں چلنا کوکب۔۔۔سوری"

"میں ڈیڈ کی گاڑی لے کے نکلنے لگی ہوں۔تمہارے پاس صرف بیس منٹ ہیں۔اور یہ سوری

اپنے پاس رکھو مجھے نہیں چاہیے۔۔۔" کوکب کب اس کی ماننے والی تھی

"کوکب میں۔۔۔"

"تمہارا ٹائم شروع ہو چکا ہے۔صرف بیس منٹ۔۔" ارحم کی بات اس نے بیچ میں کاٹ دی

کال بند ہو چکی تھی۔اس نے مایوسی سے ہاتھ نیچے گرایا۔ایک لمبی سانس ہوا میں خارج کی۔

اسے جانا ہی ہوگا۔وہ جانتا تھا کوکب کی طبیعت کو وہ اپنی منوا کر ہی رہتی تھی ہمیشہ۔ارحم نے کلاس کی طرف دیکھا تو دروازے سے اب لڑکے اور لڑکیاں باتیں کرتے ہوئے باہر آرہے تھے۔اکثریت گوری چمڑی والوں کی تھی بیچ بیچ میں کہیں کوئی ایشین یا افریقن چہرہ بھی نظر آجاتا۔

کوکب گاڑی لے کے نکل چکی ہوگی۔آج ساری رات ہلہ گلہ ہوگا۔ہائیڈ پارک لوگوں سے بھرا ہوگا۔انگلینڈ میں ہر دوسرے ماہ اس طرح کے ایونٹ، میلے، شو، وغیرہ ہوتے ہی رہتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی مگر ارحم نے کبھی اس طرح کے مشغلوں کی طرف توجہ نا دی۔لیکن آج اس ضدی لڑکی کی وجہ سے اسے نا چاہتے ہوئے بھی شرکت کرنا تھی۔یہی سوچتے ہوئے وہ اپنا حلیہ درست کرنے کی غرض سے واش رومز کی طرف چل دیا

ابھی ڈیڈ کو کال کر کے انہیں گھر دیر سے آنے کی اطلاع بھی دینی تھی کیونکہ وہ تینوں افراد ناشتہ اور رات کا کھانا ایک ساتھ بیٹھ کر ہی کھاتے تھے۔اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے موم ڈیڈ کو انتظار کرنا پڑے۔۔۔

☆......☆......☆

آج کافی عرصے بعد بلقیس آئی ہوئی تھی اپنے میکے۔اپنے چچا زاد سے شادی کے بعد تو وہ جیسے اپنے اس گاؤں کو ہی بھول گئی تھی۔شوہر پوسٹ آفس میں ملازم تھا۔شادی کے بعد ساتھ والے شہر جا بسے تو پہلے تین چار سال تک بلقیس ہر دوسرے تیسرے ماہ اپنے میکے منہ دکھانے آجاتی۔کچھ دن گزار جاتی سب کے احوال سے واقف بھی ہو جاتی اپنا حال بھی سنا دیتی۔مگر شادی کے پانچویں سال اس کے شوہر ابراہیم کا تبادلہ اٹک ہوا تو وہ پھر جیسے گاؤں کو بھول ہی گئی۔سال دو بعد کبھی کبھار ہفتہ آٹھ دن رہنے آجاتی۔نوری کو اس کی یاد آتی تو بلقیس کی ماں سے اپنی سہیلی کی خیریت دریافت کر لیتی۔وہ زمانہ فون کا نہیں تھا

۔اگر کہیں بڑے شہروں میں فون کی سہولت تھی تو شاہ والی کے باسی اس سہولت سے ابھی تک محروم تھے ۔چھٹی تاروں کی نوبت بھی کبھی نہیں آئی ۔پھر سب اپنی اپنی زندگی کی پر پیچ الجھنوں میں کچھ ایسے الجھے کہ یہ الجھنیں سلجھاتے سلجھاتے سالوں گزر جاتے کسی کو ایک دوسرے کی زندگی اور ایک دوسرے کے حالات جاننے کو وقت ہی میسر نا آتا ۔اب تین سالوں بعد بلقیس میکے رہنے آئی تو نوری خود کو بلقیس سے ملنے جانے سے روک ہی نا پائی ۔۔۔

"بلقیس کیا ہو گیا ہے تمہیں ۔۔۔؟ تم ایسی تو نہیں تھی" نوری کے گلے لگی بلقیس اپنی سہیلی سے سالوں بعد ملتے ہوئے آبدیدہ تھی ۔

یہ وہی بلقیس تو نہیں تھی ۔گوری چٹی صحتمند بلقیس ۔اب جو نوری کے گلے لگی کھڑی تھی یہ تو ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا ۔گال اندر کو پچکے ہوئے ، بال روکھے پھیکے ۔اسے تو جیسے مہینوں سے اپنے حال کی کچھ پرواہ ہی نا ہو

"کیسی باتیں کرتی ہو جھلی ۔۔۔غور سے دیکھو نا مجھے ۔میں وہی بلقیس تو ہوں تمہاری سہیلی ۔۔۔" بلقیس نے اداس پھیکی مسکراہٹ لبوں پر زبردستی سجاتے ہوئے اسے خود سے الگ کرتے جواب دیا

"ہاں وہی تو ہو تم ۔مگر یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں ۔۔۔تم اتنی بے رونق کیوں ہو گئی ہو ۔۔۔؟"

"اب وہ زمانے تو چلے گئے نا جب صرف اپنی فکر ہوتی تھی ۔خود کو سنوارنا نکھارنا ، بے وجہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مسکرانا ۔۔۔اب تو ہم بڑے ہو چکے ہیں اب ہم اپنے لیئے نہیں دوسروں کیلیئے جیتے ہیں نوری "بلقیس کہیں پیچھے چلی گئی تھی بہت سال پیچھے ۔

"تم خوش نہیں ہو نا بلقیس ۔۔۔؟"

"تم اپنا سناؤ ۔جنت کو ساتھ نہیں لائی اب تو جوان ہو چکی ہو گی نا اور زمیندار صاحب کیسے ہیں ؟"

"لگتا ہے تمہیں بھی اب باتیں بدلنا آ گیا ہے بلقیس ۔میں نے کچھ اور پوچھا ہے تم سے ۔۔۔"

"پتا نہیں نوری ۔مجھے یہ کچھ پتا نہیں اپنا ۔میں خوش ہوں بھی سہی یا نہیں ۔۔۔بس کوشش تو کرتی ہوں خوش رہنے کی ۔"

" ابراہیم خیال نہیں رکھتے تمہارا۔۔؟"

"کیا فرق پڑتا ہے ان باتوں سے۔کوئی خیال رکھے یا نا۔زندگی تو پھر بھی گزر جاتی ہے نا۔۔بھلے خوشی خوشی بھاگتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچو یا خود کو گھسیٹتے ہوئے لکیر کو ہاتھ لگاؤ۔کیا فرق پڑتا ہے؟"

" میں نے "کوئی" کا نہیں پوچھا۔ابراہیم کا پوچھا ہے۔تمہارے شوہر ابراہیم کا۔۔" نوری نے ایک بار پھر اسے باور کروایا

" چھوڑو نوری ان باتوں کو۔اب کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔مجھے اب سہنا آگیا ہے۔۔۔جیسے تم سہتی تھی۔۔۔"

"بلقیس میرا دل کٹ رہا ہے۔مجھے بتاؤ کیا مسئلہ ہے اور کہاں مسئلہ ہے۔۔۔؟"

"کیا بتاؤں نوری۔۔۔سارے مسئلے ہی مسئلے ہیں۔ختم ہی نہیں ہوتے۔

اوپر تلے چار بیٹیوں نے میری اہمیت ان کی نظر میں ختم ہی کر دی تھی۔ابراہیم کو اور میری ساس کو بیٹے کی خواہش تھی۔میری ساس میری سگی چچی مجھے بیٹیاں پیدا کرنے والی مشین کہتی ہے۔ابراہیم کھنچا کھنچا رہتا ہے۔سارا سارا دن گھر نہیں آتا۔۔۔وہ اب پہلے والے ابراہیم نہیں رہے بدل چکے ہیں وہ

سنا ہے وہیں اپنے آفس میں کسی ملازمہ سے دوسری شادی رچانے کا سوچ رہا ہے۔جو پہلے سے ہی مطلقہ ہے۔میری ساس بھی ساتھ شامل ہے ابراہیم کے۔

ٹھیک ہے نوری۔وہ کریں شادی۔ان کا حق ہے کرلیں اپنا حق پورا۔مرد کو تو بیک وقت چار کی اجازت ہوتی ہے نا۔وہ بھی کرلیں میں نہیں روکتی۔ٹھیک ہے میرا خیال بھی نا رکھیں میرا حال تک نا پوچھیں۔مگر اپنی چار بیٹیوں کا دھیان تو رکھیں نا،ان پر توجہ تو دیں نا۔جوان ہو چکی ہیں ان کی شادیاں کرنے کی عمر ہونے لگی ہے مگر ابراہیم کو کچھ فکر ہی نہیں ہے اگر فکر ہے تو صرف اپنی دوسری شادی کی۔۔۔

ان کا جہیز جوڑنا ہے،ان کیلئے رشتے تلاش کرنے ہیں۔مگر انہیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔یہ ان کی بیٹیاں بھی تو ہیں نا۔میں یہاں میکے سے اٹھا کے تو نہیں لے گئی تھی نا۔۔۔یہ اسی کا خون ہیں نا۔تو پھر کیوں اسے خیال نہیں آتا جوان اپنی بیٹیوں کا۔؟" بات ختم کرنے تک بلقیس پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

" پھر تم نے کبھی احتجاج کیا۔ان کو احساس دلایا۔۔۔؟"
"کیا تھا احتجاج ۔انہوں نے دھمکی
دی کہ دوبارہ ایسی کوئی بات کی تو طلاق دے کر ہمیشہ کیلئے میکے بھیج دے گا۔اب تم بتاؤ میں ان سے لڑوں گی تو چار جوان بیٹیوں کو کیسے پالوں گی۔کون انہیں اپنائے گا بھلا۔۔۔؟"

نوری نے اسے اپنے سینے میں چھپالیا۔

اسے آج بھی وہ دن یاد جب بلقیس زندگی سے خوشیاں کشید کر لیتی تھی۔

" نوری تمہیں یاد ہے نا جب ہماری شادی نہیں ہوئی تھی تو میں کہتی تھی کہ میں اپنا حق زندگی سے خود چھین لوں گی ، اپنے حصے کی خوشیاں حاصل کر کے رہوں گی ۔تمہیں کوستی تھی تمہارے چپ رہنے پر ۔میں تمہیں کہتی تھی کہ میں اپنے لیئے لڑوں گی ۔دیکھو آج میرے ہاتھ پاؤں بھی بندھے ہیں ۔میں تو اپنے لیئے لڑ بھی نہیں سکتی اپنی جوان بیٹیوں کے سوالوں کے جواب بھی نہیں دے سکتی ۔دیکھو میرا دامن خالی ہے نا۔میری جھولی میں تو کچھ بھی نہیں ہے نا۔۔۔"بلقیس نے خود کو نوری سے الگ کر کے اپنی قمیض کا دامن پھیلاتے ہوئے کہا۔اس کا چہرہ آنسوؤں سے دھل چکا تھا۔۔۔

نوری اسے خود سے لگائے تسلیاں دینے لگی ، دلاسے دینے لگی ۔جانتی تھی کہ یہ تسلیاں دلاسے بلقیس کے زخموں کا مرہم نہیں ہیں مگر اور کیا کر سکتی تھی کچھ بھی تو نہیں ۔

وہ سارا دن اپنی سہیلی کے پاس گزار کے اسے اگلے دن اپنے گھر کھانے پر دعوت دے کر واپس آگئی تھی ۔بلقیس سے مل کر اس کا دل جانے کیوں اداس اور بوجھل سا ہو چلا تھا

☆......☆......☆

اس رات ارحم ہائیڈ پارک میں ہونے والے ایونٹ سے اتنا بھی مایوس نہیں ہوا جس طرح اس نے سوچا تھا۔پارک میں ہر طرف کی گئی مصنوعی لائٹنگ سے دن کا سا سماں تھا۔ہر طرف لوگ ہی لوگ بچے ، بوڑھے ، جوان ، عورتیں ، لڑکیاں ہر عمر کے لوگوں کے محظوظ ہونے کیلئے سامان میسر تھا۔

یہ ایک بہت بڑا پارک تھا۔ پیدل چلنے والی روشوں کے دونوں اطراف خوبصورت پھولوں کی

آرائش دل کو لبھا رہی تھی۔اس کے علاوہ بھی دنیا کے مختلف کونوں سے لائے گئے پھول بھی اس عظیم پارک کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہے تھے

سائیکلنگ ٹریک، سومنگ پولز، ایکسر سائز ایکوا پمپنٹس، ونڈر لینڈز، غرض ہر طرح کی اور ہر عمر کے لوگوں کی ریفریشمنٹ اور تفریح کیلئے سامان میسر تھا

پارک کے ایک طرف ایک بڑی لائبریری بنائی گئی تھی جس میں دنیا بھر کے محققین اور دانشوروں کی لکھی گئی تصانیف جمع تھیں۔عام حالات میں کتب بینی کے شوقین حضرات شام کے اوقات میں ھاتھوں میں اپنی پسندیدہ کتاب پکڑے محوِ مطالعہ ہوتے ہیں۔مگر ان رونقوں کی وجہ سے لائبریری کی طرف لوگوں کا دھیان بالکل ہی نا ہونے کے برابر تھا۔میلے کی رنگینیوں سے سب کی توجہ اپنی جانب مرکوز کر رکھی تھی

اور وہاں جس چیز نے اس کی توجہ سب سے زیادہ کھینچی وہ ایک نوجوان لڑکے کے دکھائے جانے والے کرتب تھے۔اس کے ہاتھوں میں جادو تھا کوئی۔اپنے حاضرین کو ہاتھوں کی صفائی سے اس نوجوان لڑکے نے خوب محظوظ کیا اور داد سمیٹی۔۔۔

لوگ اس کے ہر کرتب پر تالیاں اور سیٹیاں بجا کر اس کے فن کو دل کھول کر داد دے رہے تھے۔

"آپ کمال ہیں ینگ مین۔۔۔" جادوگر لڑکا کرتب دکھانے کے بعد اپنا سامان سمیٹنے لگا تو ارحم نے اس کے پاس جا کر اس کے فن کی تعریف کی

نیلی آنکھوں والے لڑکے نے سر اٹھا کر اپنی تعریف کرنے والے خود سے کچھ برس چھوٹے لڑکے کو دیکھا تو مسکرا دیا۔

"کمال حاصل کرنے کیلئے محنت کرنا پڑتی ہے۔۔۔" دوبارہ سامان سمیٹتے ہوئے اس نے مصروف لہجے میں جواب دیا

"میں محنت سے نہیں کتراتا۔" ارحم نے اسے اپنی خوبی گنوائی

"یہاں بات میرے فن کی ہو رہی تھی شاید۔۔۔" جادوگر لڑکے نے مسکرا کر اسے جواب دیا

" میں یہ سب سیکھ سکتا ہوں اگر آپ میری تھوڑی سی ہیلپ کر دیں تو۔۔۔"

" یہ اتنا بھی آسان نہیں ہے جتنا تم آسان سمجھ رہے ہو۔۔۔لوگوں کی کھلی آنکھوں کے سامنے انہیں دھوکہ دینا پڑتا ہے۔"

" جی جانتا ہوں۔۔۔مگر مجھے خود پر بھروسہ ہے میں بہت جلد یہ کرتب سیکھ سکتا ہوں اگر آپ چاہیں تو۔۔۔"

" اور تمہیں یقین ہے کہ میں تمہاری بات مان کر تمہیں سکھا دوں گا۔۔۔؟" اس لڑکے نے حیرت سے ارحم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

" جی مجھے یقین ہے آپ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے مجھے ضرور سکھائیں گے۔۔۔"

" تو تمہارا یقین غلط ہے۔میں ایسا کچھ نہیں کرنے والا "

" نیک روحیں کسی کو مایوس نہیں لوٹاتیں۔اور فن تو ہمیشہ سکھانے سے مزید ترقی کرتا ہے۔مجھے یقین ہے کہ ایک سچا آرٹسٹ اپنے فن کو ضرور آگے منتقل کرنا چاہے گا۔۔۔"

" تم بہت چھوٹے ہو ابھی اس کام کو سیکھنے کیلئے۔۔۔" وہ سامان سمیٹ کر بیرونی دروازے کی سمت قدم اٹھاتا چلتا گیا

" آپ نے ابھی میرا ٹیلنٹ دیکھا ہی کہاں ہے۔۔۔میں بہت جلد سیکھ سکتا ہوں" ارحم بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا قدم سے قدم ملا کر

" تم جاؤ تمہارے فرینڈز انتظار کر رہے ہوں گے۔۔۔مجھے جانا ہے۔" نیلی آنکھوں والے لڑکے نے پیچھا چھڑانا چاہا

" اور مجھے آپ کی ہاں کا انتظار ہے۔۔۔تو میں کب سے آؤں سیکھنے۔۔۔؟"

جادوگر لڑکا حیران رہ گیا۔

" میں نے تمہیں سکھانے کیلئے ابھی خود کو راضی نہیں کیا۔۔۔"

" آپ ضرور کریں گے۔اور مجھے ضرور سکھائیں گے۔۔۔" ارحم ابھی بھی پر یقین تھا

" تم بہت عجیب لڑکے ہو۔کیا نام ہے تمہارا۔۔۔؟"

" جی ہاں۔۔۔عجیب کے ساتھ ساتھ زرا مختلف بھی۔اور میں ارحم سلطان ہوں۔۔۔آپ؟"

" لوگوں کو ان کے سامنے دھوکہ دے سکو گے؟" اس لڑکے نے نام بتانے سے گریز کیا

" میں کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔۔۔"

" تو پھر یہ فن تم نہیں سیکھ سکو گے۔یہ خیال دل سے نکال دو اب"

" مجھے صرف چند کرتب سیکھنے ہیں اور جو ٹرک صرف ہاتھوں کی صفائی سے ہوتے ہیں۔۔۔آپ کا ایڈریس؟"

" وہ سب بھی دھوکے میں شمار ہوتے ہیں۔۔۔" لڑکا مسلسل چلتا جا رہا تھا اور ارحم ساتھ ساتھ

۔۔۔دروازہ اب قریب آپہنچا

" آپ کا ایڈریس۔۔۔؟" اس سے پہلے کہ وہ دروازہ عبور کر جاتا ارحم نے دوبارہ پوچھا

" میرا کوئی ایڈریس نہیں۔۔۔" پارک کا بیرونی گیٹ آچکا تھا ارحم رک گیا

" تو میں آپ کو کہاں ڈھونڈوں پھر۔۔۔" ارحم نے پیچھے سے آواز دی

" یہ تمہارا کام ہے بچے۔۔۔اگر واقعی سیکھنا چاہتے ہو تو اور ہاں اگر تم نے مجھے دوبارہ ڈھونڈ لیا تو میں تمہیں کرتب سکھا دوں گا" نیلی آنکھوں والے لڑکے نے گیٹ کے پار سے اسے مسکراتے ہوئے ارحم کو مڑ کر جواب دیا۔۔۔اور اگلے لمحے تیز تیز قدم اٹھاتا اندھیروں میں گم ہو گیا۔۔

" میں آپ کو ضرور ڈھونڈ لوں گا۔۔۔ایک نا ایک دن۔۔۔مجھے یقین ہے۔" اس نے خود سے عہد کیا اور واپس لوگوں کی بھیڑ کی طرف قدم بڑھا دیئے جہاں کوکب باقی دوستوں کے ساتھ اس کا انتظار کر رہی تھی

" اسے گھر تک چھوڑنے چلے جاتے نا۔۔۔" واپس آیا تو کوکب اسے ناراض نظروں سے گھورنے لگی

" نہیں بس بات ہی تو کرنی تھی۔ہو گئی ہے۔۔۔"

" ارحم یار تم ہمارے ساتھ آئے ہوئے ہو۔ہمارے ساتھ رہو، گھومو پھرو، انجوائے کرو۔۔۔"

" وہی تو کر رہا ہوں یار۔۔۔"

" تم کبھی نہیں سدھرو گے۔۔"

" میں آلریڈی سدھرا ہوا ہوں۔مزید گنجائش نہیں ہے۔" ارحم بھی مزاق کے موڈ میں واپس آگیا آخرکوکب کی ناراضگی بھی تو ختم کرنی تھی۔

" حد ہے ویسے۔۔۔الٹا چور کوتوال کو ڈانٹ رہا ہے۔۔۔آخری بار چھوڑ رہی ہوں"

" یہاں کوتوال میں ہوں نا۔۔۔؟"

" نہیں تم غلطی پر ہو اس لیئے۔۔۔" کوکب نے مسکراتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی

" سر خم ہے میڈم۔۔۔اگلی بار شکایت کا موقع ہی نہیں ملے گا۔۔" اس نے کمر جھکا کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا

کوکب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

" اوکے لاسٹ چانس ہاں۔۔؟

اس بار معاف کیا"

اور وہ ایسی ہی تو تھی۔ہر بار لاسٹ چانس کہہ کر ارحم کو چھوڑ دیتی۔وہ اس سے زیادہ دیر کب ناراض رہ سکتی تھی۔بھلے وہ اس کا جتنا بھی دل جلاتا پھرے۔۔۔اپنے کالج کی سب سے پاپولر لڑکی کوکب۔جانے کتنے اس پر فدا تھے اور وہ خدا جانے کیوں اس سڑو پر مرتی تھی۔جانے کیا تھا اس لڑکے میں۔کیوں وہ خود کو اس سے روک کر نہیں رکھ سکتی تھی۔وہ اکثر ایسی ہی سوچیں سوچتی رہتی۔۔

" کیوں نا اب کوئی پرینک کھیلا جائے۔۔۔" سٹیورٹ نے آتے ہی مشورہ دیا۔

اب کرسٹی،الینا اور زاہد بھی ان لوگوں کے پاس پہنچ چکے تھے

" کیا مطلب۔۔۔کیسا پرینک۔کیا سوچ رہے ہو تم۔۔۔؟" یہ کرسٹی تھی

" کوئی بھی۔۔۔سب اپنا اپنا پرینک بتاؤ جس کا اچھا ہوا وہی کھیلا جائے گا۔آج کچھ عجیب سا کرنے کو دل چاہ رہا ہے میرا۔۔۔" وہ بہت ایکسائیٹڈ ہونے لگا تھا

" نہیں میرا خیال ہے کہ ایسا کچھ نہیں کرنا چاہیئے۔۔۔یہ فضول کام ہے۔۔۔" ارحم نے ان کے ارادوں پر منفی کا کمنٹ دیا

"فضول کیسا یار۔۔۔ یہ جسٹ ایک مذاق ہی ہوگا اور تھوڑی دیر میں ہی لوگوں کو بتا دیا جائے گا اس مذاق کے بارے میں۔۔۔"

"پھر بھی یار یہ سب بچپنے والے کام ہیں۔۔۔ کچھ اور سوچو۔۔۔"

"اور کیا۔۔۔؟"

"ایسا کرتے ہیں تھیٹر کی طرف چلتے ہیں وہاں ایک مزاحیہ ڈرامہ پیش کیا جا رہا ہے۔۔۔ تھوڑا فن بھی ہو جائے گا۔۔۔" کوکب نے ہاتھ کے اشارے سے تھوڑے فاصلے پر بنے ایک سٹیج کی طرف اشارہ کیا جس کے آگے کافی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ ان کی ہنسی کے فوارے ہی یہی ثابت کرنے کیلئے کافی تھے کہ پیش کیا جائے والا ڈرامہ مزاح سے بھرپور ہے۔

سارا گروپ اس تجویز پر متفق نظر آیا تو سب نے اس سٹیج کی طرف رخ کر لیا۔

☆......☆......☆

اور اگلے دن سلطان خان جب اپنے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور سے کھانے کے وقفے کے دوران جب نزدیکی ہوٹل میں کھانا کھانے آئے تو وہ اپنے کھانے کا آرڈر کر چکے تھے جب کونے والی ٹیبل پر کھانا کھاتے ہوئے اس اپنے سامنے والی ٹیبل پر بیٹھے اس پکی عمر کے آدمی پر شناسائی کا گماں گزرا تھا۔۔۔

اس کی نظروں نے اس پکی عمر کے آدمی کو ضرور کہیں دیکھا تھا۔۔۔ مگر کہاں وہ یاد کرنے میں ناکام رہا

سامنے بیٹھا شخص بھی بار بار سلطان کو دیکھنے لگا اس کی آنکھوں میں بھی شناسائی کی لہر تھی۔۔۔ تبھی سلطان کے دماغ میں اچانک کچھ یادیں فلم کی طرح چلنے لگی اور اسے سب یاد آگیا وہ اٹھ کر اس آدمی کی ٹیبل پر آگیا۔۔۔

"رشید۔۔۔ اگر میں نہیں بھول رہا تو آپ یقیناً رشید ہیں نا۔۔۔؟"

"جی۔۔۔ اور آپ سلطان۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔۔۔ رشید نے کرسی سے اٹھ کر سلطان کو گلے لگایا

سلطان کو خوشگوار حیرت ہوئی
" تم تو بہت بدل گئے ہو سلطان ۔۔۔" رشید نے اس کے حلیئے اور بولنے کے انداز کو دیکھتے ہوئے کہا
" اور آپ بالکل بھی نہیں بدلے ۔۔۔ بالکل ویسے کے ویسے لندن آ کر بھی وہی سندھی شناخت ۔۔"
" اپنی شناخت کو تو کبھی نہیں بھولنا چاہیئے سلطان ۔ چاہے دنیا کے کسی کونے بھی جا پہنچو ۔۔۔"
" ہاں یہ بھی صحیح کہا آپ نے ۔ مگر کچھ ماحول سے مطابقت بھی لازمی ہوتی ہے آگے موو کرنے کیلئے" سلطان نے اپنے ڈریس کو دیکھتے ہوئے وضاحت دی ۔ وہ دونوں اب اکھٹے بیٹھ چکے تھے
" چوہدری صاحب کیسے ہیں ۔۔۔ اب تو بوڑھے ہو چکے ہوں گے ۔؟"
رشید نے سوالیہ نظروں سے سلطان کی طرف دیکھا آنکھوں میں انہیں آخری دنوں کی یادیں گھومنے لگیں جب چوہدری صاحب نے اسے سب کے سامنے بے عزت کروا کر اپنے دھندے اور ڈیرے سے الگ کیا تھا اسے سخت ترین سزا دی تھی وہ بھی صرف سلطان کی وجہ سے رشید یہ سب بھلا کیسے بھول سکتا تھا بھلے بیس سال نا بیس صدیاں ہی کیوں نا گزر جاتی بیچ میں اسے آج بھی سب کچھ شیشے کی طرح یاد تھا
" چوہدری صاحب کو گزرے تو بارہ تیرہ سال ہو گئے ہیں ۔۔۔ اللہ ان کی منزلیں آسان کرے"
" اووہ ۔۔۔ اور ساری دولت جائیداد ۔ کام دھندہ ۔۔۔؟"
رشید کا لالچی دماغ اب بھی سیدھا صرف دولت کو سوچنے لگا بجائے اسکے کہ وہ چوہدری صاحب کا افسوس کرتا
" چوہدری صاحب اپنا سب کچھ میرے لیئے چھوڑ گئے ہیں ۔۔۔ جانے سے پہلے سب کچھ میرے نام کر گئے" سلطان کا لہجہ ذرا مدھم اور ناگوار سا ہوا
رشید کے چہرے پر ایک رنگ آ کر چلا گیا ۔۔۔
" اچھا بتایا نہیں آپ نے رشید ۔ یہاں لندن کس سلسلے میں آنا ہوا ۔؟" اس نے اپنا لہجہ درست کرتے ہوئے پوچھا اتنے عرصے بعد کی ملاقات کو وہ ناخوشگوار نہیں بنانا چاہتے تھے

" کام کے سلسلے میں آنا ہوا تھا کچھ دن کیلئے ۔۔۔ اور تم سناؤ دھندا کیسا چل رہا ہے ۔۔۔؟"

" ہم نے چوھدری صاحب کی زندگی میں ہی سارے برے دھندے چھوڑ دیئے تھے ۔۔"

" اوووہ ۔۔۔ مگر میں اب بھی اسی دھندے میں ہوں ۔ اب خود اپنا مال سپلائی کرتا ہوں میں ۔"

" اچھا بات سنو رشید ۔۔۔ ابھی تو مجھے جانا ہے مگر یہ میرا کارڈ رکھ لو اور آپ نے شام کا کھانا میرے گھر ہی کھانا ہے ۔۔۔ اب چلتا ہوں بہت ضروری کام کے سلسلے میں مجھے جانا ہے ۔ شام کو کھانے پر ہم آپ کا انتظار کریں گے ۔۔۔ آنا مت بھولیئے گا ۔۔"

سلطان نے اسے اپنا کارڈ تھماتے ہوئے اجازت چاہی

رشید نے کارڈ پکڑ لیا ۔۔۔ دل میں مروڑیں سی اٹھنے لگی ۔۔۔ یہی وہ انسان تھا جس نے مجھے چوہدری صاحب کی نظروں میں ذلیل کروا کے خود کو معتبر کر لیا ۔ میری جگہہ لے لی ۔۔۔ مجھے اسی کی وجہ سے ایسی سزائیں دی گئی ۔ چوہدری صاحب کا اعتبار ہمیشہ کیلئے مجھ سے اٹھ گیا انہوں نے مجھے خود سے الگ کر لیا ۔

اگر یہ نا ہوتا تو آج اس کی جگہہ میں یہ سارے عیش کر رہا ہوتا ۔ یہ شان و شوکت اور چوہدری صاحب کی ساری دولت ، نقدی اور پراپرٹی صرف اور صرف میرے حصے میں آتیں

اور سلطان اب دیکھو تمہیں کیسے تباہ کرتا ہوں میں تمہیں ۔۔۔ سارے بدلے لینے ہیں تم سے میں نے ۔ بہت پرانے حساب باقی ہیں

بہت عیش کر لی تم نے چوہدری صاحب کی دولت پر ۔۔"

رشید کرسی پر بیٹھا اندر سے جل رہا تھا ۔ کھانا وہیں پڑا رہ گیا اب نوالہ حلق سے کہاں اترنا تھا ۔ کھانا تو اب زہر ہو چکا تھا رشید کا ۔ اٹھارہ بیس سال پہلے کے زخم ادھڑنے لگے تھے ۔۔۔

اور سلطان ۔۔۔ وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ اس نے رشید کو نہیں ایک آفت کو گھر میں دعوت دی ہے ۔۔۔ اس کی زندگی نے اب اس پر سے اپنے قرض اتارنے کا فیصلہ کر لیا تھا ۔۔۔ کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو چکا تھا

☆......☆......☆

چودھواں حصہ

صبح کے اجالے آہستہ آہستہ سارے گاؤں کو روشن کرنے میں مگن تھے۔دریا کی لہریں آج بھی اسی روانی سے اپنی منزل کی طرف گامزن تھیں۔۔۔دریا سے اوپر لاکھوں کروڑوں میل پھیلے آسمان پر آہستہ آہستہ اب صبح کی پرنور شفق پھیل رہی تھی۔۔۔گاؤں کی گلیوں اور بازار میں مکمل خاموشی کا راج تھا ۔ہر گھر کے چولہے کے اوپر سے دھوئیں کے بادل بلند ہو کے آسمان کی جانب محوِسفر تھے خدا جانے یہ دھوئیں کے مرغولے اپنی ان دیکھی منزل تک پہنچ بھی پاتے ہیں یا بیچ راستوں میں اس دھوئیں کے بادلوں سفر تمام ہو جاتا ہے۔۔۔

نانی نماز سے فارغ ہو کر ناشتہ بنانے کی غرض سے چولہے پر برتن اکھٹے کرنے لگی تو چار پائی پر سوئے خوشی کو بھی اٹھ کر ان کی مدد کرنے کا خیال آگیا۔۔نانی کی ضعیف العمری کا تقاضہ اب کام کا نہیں بلکہ آرام کرنے کا

تھا مگر وہ آرام کرنے بیٹھ جاتیں تو پھر کام کون کرتا؟ کرنے تو پھر بھی تھے سو وہ لگی رہتی آہستہ آہستہ

" نانی آپ آگ جلائیں۔۔میں برتن اکھٹے کرتا ہوں سارے۔۔"

نانی اس کی بات سن کر اپنے بوڑھے جھریوں سے بھرے چہرے کے ساتھ مسکرائی اور آگ جلانے بیٹھ گئی۔۔۔تھوڑی ہی دیر میں خوشی نے سارے ضروری برتن چولہے میں لا جمع کر دیئے۔۔۔

ابھی تک نانی سے آگ نا جل پائی تھی اور مسلسل پھونکیں مارنے کے سبب وہ کھانس رہی تھیں اور ان کی آنکھوں کے کناروں سے پانی بہنے لگا تھا تو خوشی نے نانی کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے ان کو آگ بھی جلا کر دے دی تبھی نانی نے چائے کے لیئے پتیلا چڑھا دیا

"اب مشکل ہوتی ہے نا آپ کو۔" وہ ان کے سامنے چولہے میں ہی بیٹھ گیا

" ہاں پتر۔۔۔ہوتی تو ہے۔اب تو ہاتھ بھی کانپنے لگے ہیں اور کمر بھی جھکنے لگی ہے۔۔" نانی نے دکھڑا سنایا

" مجھے اندازہ ہے نانی کہ آپ میرے لیئے بہت خواری اٹھاتی ہیں۔پر کیا کروں مجبوری ہے اور کسی سے کہہ بھی تو نہیں سکتے۔۔۔اور مجھے خود بھی روٹی بنانا نہیں آتی ورنہ آپ کو اس قدر تکلیف ہی نہیں دیتا"

وہ جو بات کے شروع میں سنجیدہ لگ رہا تھا بات ختم ہوتے ہوتے اس کے لبوں کو مسکراہٹ نے گھیر لیا

" تو شادی کر لے پھر تیری بیوی آجائے گی تو میری آدھ جلی روٹیوں سے بھی تمہاری جان چھوٹ جائے گی اور مجھے بھی کچھ سکون مل جائے گا۔۔"

" ہاہا۔۔۔مشورہ آپ کا نیک ہے اور شادی تو میں کر لوں۔۔۔پر میری بیوی جھگڑالو نکلی تو۔۔۔؟ پھر تو روز جنگ ہوگی گھر میں۔اور پھر میں نے سپورٹ بھی اپنی بیوی کو ہی کرنا ہے آپ کو نہیں" خوشی کو مذاق سوجھا

" مجھے تم سے امید بھی یہی تھی اور وہ ایسے خوامخواہ کیوں جھگڑے گی بھلا۔۔۔؟ اور تم کوئی شریف لڑکی ڈھونڈنا جھگڑالو سے لازمی شادی کرنی ہے۔۔" نانی نے ہاتھ میں پکڑا چائے والا مگ نچاتے ہوئے جواب دیا

" نانی جھلی ہے تو۔۔۔مجھ سے کون کرے گا بھلا شادی۔۔۔نا آگا نا پیچھا۔۔۔نا دھن دولت۔۔۔نا کوئی زمین کا ٹکڑا۔۔۔ایسے کوئی تھوڑی مجھے اپنی بیٹی پلے باندھ دے گا۔۔۔؟" اب کی بار وہ سنجیدہ تھا

" آگا پیچھا کیوں نہیں۔۔۔میں ہوں تیرے دادا ہیں دادی ہیں۔اور کیا چاہیے بھلا تمہیں۔۔۔"

" ہنہہ۔۔۔دادا دادی۔۔۔بیس سال تک جن کو پوتا یاد نہیں آیا اب میری شادی پر وہ کیا دھمالیں مارنے آئیں گے۔۔۔" خوشی کے لہجے سے طنز واضح تھا

" ایسے نہیں بولتے پتل۔۔۔تو ان کا خون ہے۔۔۔بس کبھی کبھی رشتوں میں ایسے حالات آجاتے ہیں کچھ ایسے موڑ کچھ ایسی کسوٹیاں آجاتی ہیں کہ نا چاہتے ہوئے بھی انہیں خود سے الگ کرنا پڑتا ہے۔۔۔" نانی اسے سمجھانے لگی وہ آہستہ آہستہ بات کا رخ اسی جانب لے آئی تھی جو وہ پتل سے کرنا چاہتی تھی

"کوئی ایسی مجبوری نہیں ہوتی نانی۔۔۔ساری جنگ انا کی ہے بس۔۔۔سب چاہتے ہیں کہ اس کا طرہ اونچا رہے بس، اس کی ناک نیچی نا ہو، اسے نا جھکنا پڑے کبھی۔۔۔سارے اس کے آگے جھک جائیں۔انا کی جنگ میں وہ ہتھیار ڈالنے میں کبھی پہل نا کرے۔۔۔بس سب کی یہی سوچ ہوتی ہے۔بھلے سے کوئی رشتوں سے محروم رہ جائے انہیں کیا۔۔۔انہیں تو زمانے میں اپنی ناک کو اونچا کرنا ہوتا ہے بس۔۔۔"

وہ ایک ہی سانس میں بولتے بولتے رکا تو نانی کو حیرت سے اپنے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پایا۔۔۔

"اب کیا ہو گیا نانی۔۔۔ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں آپ۔۔۔؟"

"تم اتنے تلخ کب سے ہو گئے ہو خوشی۔۔۔تم ایسے تو نہیں تھے۔۔۔؟"

"ہونا پڑتا ہے نانی۔۔۔میں نے کبھی اپنے دکھوں کو نہیں کریدا اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ مجھے کوئی دکھ ہی نہیں ہے۔۔۔میں بھی انسان ہوں سب کی طرح اپنے سینے میں دھڑکتا ہوا گوشت کا ایک لوتھڑا رکھتا ہوں۔۔۔مجھے بھی دکھ ہوتا ہے۔مجھے بھی خوشی ضرورت ہوتی ہے مجھے بھی اپنے اور اپنوں کی چاہتوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔۔۔" وہ ایک بار پھر شروع ہو گیا تھا نان سٹاپ

"نہیں پگل تو خون ہے ان کا۔۔۔بھلے دوریاں سہی پر ان سے زیادہ تیرا اور کوئی بڑا خیر خواہ دنیا میں نہیں ہے۔۔۔تم سمجھ لو کہ وہ مجبور تھے۔تم یہی سمجھ لو کہ ضرور ایسی کوئی خاص بات ہو گی جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے جگر گوشے کو خود سے الگ کیئے رکھا۔۔۔"

"نانی کیسی باتیں کر رہی ہو آج صبح صبح۔میرے سمجھ لینے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔۔۔کیا آپ واقف نہیں سارے حالات سے۔۔۔مان لیا کوئی ایسی مجبوری تھی پر میرا کیا گناہ تھا۔۔۔باپ پیدائش سے پہلے چھوڑ کر چلا گیا تو دادا دادی تھے نا۔۔۔انہوں نے دیا مجھے سہارا۔۔۔؟

آپ جانتی ہیں کچھ سال پہلے تک کسی گلی میں اگر سامنا ہو بھی جاتا تو دادا منہ پھیر کے گزر جاتے تھے۔بات کرنا گوارا نہیں کرتے تھے مجھ سے جیسے میں ان کا پوتا ہی نہیں بلکہ کوئی امر ممنوعہ ہوں۔۔۔جانتی

ہیں آپ مجھے کتنا دکھ ہوتا اس وقت۔۔۔؟" وہ جذباتی ہونے لگا۔رشتوں کا ستایا بیس سالہ لڑکا اس کی آنکھیں پانیوں سے بھرنے لگی

"سب جانتی ہوں پنل۔۔پر تم حقیقت سے واقف نہیں ہوا بھی۔۔ہاں وہ گناہ گار ہیں تیرے۔۔۔مگر اب وہ معافی کے طلبگار بھی ہیں۔۔۔تیرے دادا دادی آئے تھے تین دن پہلے تجھے منانے کیلئے۔۔۔تم سے معافی مانگنے کیلئے۔۔۔"

وہ حیرت زدہ رہ گیا۔بیس سال بعد آخر ان کے دل میں اپنے خون کی محبت جاگ اٹھی۔

"گناہگار ہیں تو پھر گناہگاروں کو اپنے حصے کی سزا بھی بھگتنی پڑتی ہے۔۔۔" وہ کس قدر سفاکی سے بولا تھا

"پنل ساری باتیں بھول کر معاف کر دے ان کو۔۔۔آخر تیرے دادا دادی ہیں۔وہ تمہیں لینے آئے تھے۔۔"

"اور اگر آپ سمجھ رہی ہیں کہ میں ان کے ساتھ چلا جاؤں گا تو آپ غلط سوچ رہی ہیں نانی۔۔"

"پنل خدا کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ غفور ہے،رحیم ہے۔۔۔ہمیشہ ہر بات بھلا کے درگزر کر دیتا ہے اور اس خدا کو معاف کر دینا بہت پسند ہے۔اور اگر انسان اپنے عمل پر معافی کا طلب گار ہو تو خدا بھی ان کو معاف کر دیتا ہے۔وہ تم سے معافی کے طلب گار ہیں۔اب بوڑھے ہونے لگے ہیں انہیں تمہارے سہارے کی ضرورت ہے پنل۔۔۔" نانی نرم لہجے سے اسے سمجھانے لگی

"پھر یہی تو فرق ہے ناخدا اور خدا کے بندوں میں۔جب مجھے سہارے کی ضرورت تھی تب کہاں تھے وہ لوگ۔تب انہیں اپنا خون کیوں یاد نہیں آیا۔۔مجھے تو ان سب نے ایسے لاوارث چھوڑ دیا جیسے میں ان کے خاندان کا حصہ نہیں کوئی ناجائز اولاد ہوں" خوشی کے لہجے میں دکھ بولنے لگا۔نانی اس کے الفاظ پر ششدر رہ گئی۔پتیلے میں چینی مکس کرتے اس کے بوڑھے ہاتھ ایک دم سے رک گئے۔دل کہیں بہت نیچے گرنے لگا۔۔

"کیا اول فول بول رہے ہو صبح صبح۔کس نے سکھائی ہیں تمہیں اس طرح کی باتیں۔کس نے کہا تم

ناجائز ہو۔کس نے کہا تم لاوارث ہو۔۔۔؟۔؟؟" نانی نے سچ مچ میں اسے ڈانٹ دیا
" بچہ نہیں ہوں میں جو مجھے کوئی سکھائے۔ناجائز اولاد کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے نا جو میرے ساتھ سب نے کیا۔انہیں بھی تو پیدا کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔میری طرح لاوارث۔پھر آپ کی طرح خدا کے کسی بندے کو ترس آگیا تو اسے سہارا دے دیا نہیں تو ساری زندگی ٹھوکریں کھاتے گزر جاتی ہے۔۔۔"
" چپ کرو۔۔۔اب کچھ بھی نہیں بولو گے تم۔۔۔ایک لفظ بھی نہیں سمجھے۔۔۔" نانی نے اسے تھپڑ کے اشارے کے ساتھ ڈانٹتے ہوئے کہا
" ہاں ٹھیک ہے۔چپ کر جاتا ہوں مگر آپ یہ میری بات یاد رکھیے گا اور ان تک بھی پہنچا دینا۔نا تو میں کبھی ان کے پاس جاؤں گا اور نا ہی کبھی ان سب کو معاف کروں گا۔۔۔" کہتے ساتھ ہی وہ رکا نہیں ایک جنبش سے اٹھا اور گھر کا چھوٹا سا صحن عبور کرتا گھر کے بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔نانی پیچھے آوازیں دیتی رہ گئی مگر اس نے مڑ کے پیچھے بھی نا دیکھا
اب نانی کو افسوس ہونے لگا۔جوان خون ہے ابلے گا تو ضرور۔ناشتہ بھی نہیں کیا۔مگر وہ دل ہی دل میں ڈرنے بھی لگیں پنل کا ذہن کیا کیا سوچیں سوچتا رہتا ہے۔ناجائز لاوارث۔۔۔نانی کے ذہن میں خوشی کے الفاظ گونجنے لگے
اسے آج بھی وہ دن یاد تھا جب انہوں نے خوشی کی نانی کے انتقال کے بعد پہلی بار اسے پالنے کیلئے اٹھایا تھا۔اسی رات کلی،سلطان کا سب سے قریبی اور گہرا دوست نانی کے گھر آیا تھا۔اور جو باتیں اس رات نانی کے کانوں نے سنی وہ سب سنتے ہی ان کا دل بیٹھ سا گیا تھا۔
" نانی۔۔۔آپ نے خوشی کی پرورش کا ذمہ لیا ہے تو میں آپ کو کچھ لازمی باتیں بتانا چاہتا ہوں۔میرا سینہ اس راز کو اٹھانے سے قاصر ہے دل بوجھل رہتا ہے میرا ہر وقت۔سلطان خود تو چلا گیا مگر مجھے۔۔۔
" کیسا راز۔۔۔کیسا بوجھ۔۔کلیم کھل کے بات کرو۔۔" نانی کو کچھ عجیب سے احساس نے آگھیرا انہوں نے اقبال کی بات پوری نا ہونے دی
" نانی۔۔۔خوشی۔۔سلطان اور ملوکھاں کی ناجائز اولاد ہے ان کے شادی سے پہلے کیئے گئے گناہ کا

نتیجہ۔اسی گناہ کو چھپانے کیلئے سلطان نے ملوکھاں سے مجبوری میں شادی کی۔اس نے اس بات کو راز رکھنے کی قسم دی تھی مگر میں اب مزید اس راز کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔اس لیئے آپ کو یہ راز سونپ رہا ہوں کیونکہ ایک تو خوشی کی پرورش کا بیڑا آپ نے اٹھایا ہے دوسرا مجھے آپ پر مکمل بھروسہ ہے"

نانی سن سی بیٹھی رہ گئیں۔زبان گنگ ہوگئی ان کی

"نانی اس کی اچھے سے پرورش کرنا اور کبھی اسے اس بات کی بھنک نا پڑنے دینا کہ یہ ناجائز ہے۔نانی مجھے پورے گاؤں میں صرف آپ پر یقین تھا اس لیئے یہ راز آپ کے حوالے کر رہا ہوں اسے امانت سمجھیئے گا۔۔"

اقبال بولتا رہا۔مگر نانی کو سنائی دینا بند ہونے لگا۔ناجائز اولاد۔۔۔راز۔۔۔امانت۔۔۔یہی تین لفظ اس کی سماعتوں سے بار بار ٹکرانے لگے۔جانے کب اقبال اجازت لے کے واپس چلا گیا اسے کچھ پتا نا چلا۔۔۔

چائے ابل کر پتیلے سے باہر چھلکی تو نانی ماضی سے بھی باہر آگئیں۔اور جلدی جلدی پتیلے میں مگ پھیرنے لگیں۔کچھ لمحوں میں چائے کا ابال جوش مار کر بیٹھ گیا شاید خوشی کے سینے میں بھی محرومیت کا ایسا ہی کوئی ابال اٹھا ہوا تھا مگر خدا جانے اب وہ ابال کیسے ختم ہوتا۔خوشی کی باتوں نے آج نانی کو پھر سے بیس سال پرانی یادوں میں دھکیل دیا

"یا اللہ۔لاج رکھنا۔۔"انہوں نے دل ہی دل میں اللہ سے دعا مانگی اور دوپٹے سے گرم پتیلہ پکڑ کر نیچے اتار دیا۔

☆......☆......☆

وہ تینوں اپنے گھر کے ڈائننگ ہال میں کھانے کی گول ٹیبل پر بیٹھے رشید کے ہی انتظار میں تھے جب گیٹ کیپر نے سلطان کو باہر کسی کے آنے کی اطلاع پہنچائی۔سلطان سمجھ گئے کہ یہ رشید صاحب ہی ہوں گے اور ان کا اندازہ بالکل درست نکلا تھا۔گیٹ کے باہر رشید ہی کھڑا تھا۔۔لندن میں ہونے والی پہلی ملاقات کے دن کے مقابلے میں آج رشید نے کچھ ڈھنگ کے کپڑے زیب تن کر رکھے تھے مگر سر پر

آج بھی وہی سندھی ٹوپی جمارکھی تھی جو ہمیشہ سے رشید کی پہچان رہی تھی

" آئیے رشید صاحب ۔۔۔ہم سب آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے ۔۔" رشید رات کے کھانے پر سلطان کے گھر پہنچا تو سلطان نے خود گیٹ پر جا کے اسے ویلکم کیا

وہ اسے لیئے ہوئے ڈائننگ ہال میں آگئے جہاں فاخرہ اور ارحم کھانے کی بڑی سی ٹیبل پر پہلے سے ہی موجود تھے ۔

رشید قدم قدم سلطان کے پیچھے چلتا اس کے عالیشان اور نفاست سے تعمیر کیئے گئے گھر کو حیران اور حسد بھری نظروں سے دیکھتا اندر داخل ہوا ۔۔۔

وہ دونوں کھانے کی ٹیبل پر پہنچے تو سلطان نے اسے اپنے ساتھ دائیں طرف والی کرسی پیش کی کرسیاں اور ٹیبل بہترین قسم کے فرنیچر سے تیار کی گئی تھیں ۔ڈائننگ ہال کی سجاوٹ اور ٹیبل پر چنے گئے کھانے بھی گھر کی مالکن کی نفاست کی چیخ چیخ کر گواہی دے رہے تھے ۔رشید اپنی تجربہ کار چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہا تھا

" ان سے ملیئے ۔۔۔ یہ میری بیوی ہیں فاخرہ ۔۔۔اور یہ میرا اکلوتا بیٹا ارحم ۔۔۔" سلطان نے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تعارف کی رسم نبھائی

" اور فاخرہ ۔۔۔میں نے آپ کو بتایا تھا نا صبح اپنے دوست کے بارے میں ۔۔۔تو یہ وہی میرے پرانے دوست رشید صاحب ہیں ۔بڑے لمبے عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے ہماری کل ۔۔۔"

سلطان نے دونوں طرف کا تعادف مکمل کیا ۔

" السلام وعلیکم ۔۔۔کیسے ہیں بھائی صاحب ۔مزاج ٹھیک ہیں ۔" فاخرہ نے ہی سلام میں پہل کی

" جی بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں ۔آپ کیسی ہیں ؟" دل میں اٹھتی مروڑوں پر قابو پاتے ہوئے رشید نے جواب دیا ۔۔۔

" اور بھئی جوان آپ کیا کرتے ہیں ۔۔۔؟" رشید نے ارحم کی طرف چہرے کا رخ موڑتے ہوئے ابرو اٹھا کر اس سے سوال پوچھا

" جی انکل میں فائن آرٹس کا سٹوڈنٹ ہوں بیچلر کر رہا ہوں فائن آرٹس میں ۔۔۔" ارحم نے ان کو اپنی تعلیمی ڈگری کے بارے میں بتایا تو رشید صاحب نے اپنے کندھے اچکا دیئے

یقیناً ان پڑھ رشید کے بھیجے میں اس طرح کی باتیں بالکل نہیں سما سکتی تھیں ۔۔۔

" پاکستان میں آج کل حالات کیسے چل رہے ہیں رشید بھائی سنا ہے آئے روز دہشت گردی کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں"

فاخرہ نے رات آنے والی نیوز کو دماغ میں لاتے ہوئے تشویش سے ان سے سوال پوچھا

" بھابھی حالات اچھے ہوں یا برے ۔اب بندہ صرف حالات کا بہانہ بنا کر اپنا ملک تو نہیں چھوڑ سکتا ۔۔۔" رشید نے سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے طنزیہ لہجے میں چوٹ کی ۔سلطان کروٹ بدل کے رہ گیا

" جی بھائی صاحب آپ نے صحیح فرمایا ۔۔۔لیکن کبھی کبھی انسان کے حالات اس نہج پر پہنچ جاتے ہیں کہ ہجرت لازم ہو جاتی ہے ۔اور پھر ہجرت تو سنتِ نبوی ﷺ بھی ہے ۔۔۔" فاخرہ نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنے شوہر کا دفاع لازمی سمجھا

" اب ہم کہاں سنت سمجھ کر ہجرت یا دوسرے افعال سر انجام دیتے ہیں بھابھی جی ۔۔۔" وہ کھسیانا ہو کر مسکرانے لگا

" میرے خیال میں کھانا شروع کرنا چاہیئے ۔۔۔ٹھنڈا ہو رہا ہے ۔۔۔" سلطان نے ان کی توجہ کھانے کی طرف دلا کر بات کا رخ تبدیل کیا تو سب کھانا کھانے لگ گئے

" بہت خوبصورت گھر بنایا ہے سلطان ۔۔۔کافی پیسہ لگایا ہو گا ۔۔۔" رشید نے کھانے کے دوران ہی گھر کے چاروں سمت نگاہ گھماتے ہوئے تعریف کی

" بس اوپر والے کی مہربانی ہے ۔۔۔اور چوہدری صاحب کے دست شفقت کی بدولت ہی ہے یہ سب ۔۔۔اگر وہ میرے سر پر ہاتھ نا رکھتے تو شاید میں آج کچھ بھی نا ہوتا ۔۔۔"

سلطان نے چوہدری صاحب کی مہربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کیا تھا

" بہت پرانے دوست مل گئے ہیں آج ۔۔۔ارحم مجھے لگتا ہے آج ہم دونوں کو تو فراموش کیا جائے گا۔۔۔" فاخرہ نے ازراہ مذاق ارحم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہلکے سے مسکرا دیا

" بالکل سہی کہا بھابھی جی آپ نے ۔۔۔ہم دونوں پاکستان میں ساتھ ہی کام کرتے تھے ۔۔۔سلطان نے بھی ہمارے ساتھ ہی دھندے کی ابتداء کی تھی تب تو یہ نوجوان لڑکا تھا۔۔۔" رشید نے جھوٹی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا

" کیسا دھندا۔۔۔" فاخرہ نے تشویش سے رشید کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔وہ گڑبڑائے اور کچھ نا سمجھنے والے انداز میں سلطان کی طرف دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ لو جی اب سنبھالو معاملہ۔سلطان کے گلے میں لقمہ اٹکنے لگا

" چوہدری صاحب کا بہت بڑا کاروبار تھا یہ اسی کی بات کر رہے ہیں ۔۔۔آپ سب لوگ کھانے پر توجہ نہیں دے رہے کھانا ٹھنڈا ہوتا جا رہا ہے" سلطان نے بات کو سنبھالا دیا۔

اس کے بعد کھانا خوشگوار گپ شپ میں تناول کیا گیا۔

رشید کو جانے کیوں دل ہی دل میں عجیب سی جلن محسوس ہونے لگی ۔۔۔پرانی باتیں پھر سے یاد آنے لگیں ۔اگر سلطان میری شکایت چوہدری صاحب کو نا لگاتا تو آج اس ساری پراپرٹی کا مالک میں ہوتا۔اس کی توجہ کھانے پر کم گھر پر زیادہ تھی ۔۔۔اسے یہ بات ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی کہ سلطان اکیلا اس ساری جائیداد دولت کا مالک ہے جو کہ مجھے ہونا چاہیے تھا

اگر سلطان میری جگہہ نا لیتا تو آج چوہدری صاحب کی ساری دولت کا حقدار میں اکیلا ہی ٹھہرتا ۔اسی ایک شخص کے آنے سے میری زندگی کتنی بلندیوں سے کس قدر پستیوں میں گر گئی تھی ۔اور یہ لندن میں بیٹھا چوہدری صاحب کی دولت پر عیش کر رہا ہے ۔اسے سب کچھ زہر لگنے لگا۔کھانا حلق سے نیچے ہی نہیں اتر رہا تھا۔اندر بہت کچھ جلنے لگا تھا۔سلطان کا خوبصورتی سے سجایا گیا پورا گھر اسے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا

" رشید۔۔۔میں ماضی کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں ۔اور میں کبھی نہیں چاہتا کہ کوئی دوبارہ میرے

ماضی میں جھانکے یا اسے کریدے یا پھر بجھی چنگاریوں کو پھر سے ہوا دینے کی کوشش کرے ۔۔۔تم سمجھدار ہو۔فیملی کے سامنے اس طرح کی باتیں کرنے سے پہلے تھوڑا سوچنا چاہیئے تھا۔۔۔" کھانے کے بعد وہ دونوں بالکونی میں چائے پینے کی غرض سے اٹھ کر آئے تو سلطان نے اسے تنبیہہ کرتے ہوئے سمجھایا۔

" تو کیا بھابھی اور ارحم اس بات سے انجان ہیں کہ تم کیا کرتے تھے اور کیا دھندا تھا ہم سب کا ۔۔۔؟" رشید نے حیرت سے پوچھا

" ہاں رشید۔۔۔ یہ لوگ بالکل انجان ہیں ۔۔۔اور میں چاہتا بھی نہیں کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی میرے ماضی کی ذراسی بھنک پڑے ۔۔۔ایسی باتیں فیملی سے کبھی شیئر نہیں کی جاتی۔"

" کمال ہے بھائی ۔۔۔بیوی شریک حیات ہوتی ہے ۔کم از کم اسے تو سب معلوم ہونا چاہیے ۔میری بیوی کو بھی تو سب خبر ہے میرے کام کی ۔۔۔" رشید نے چائے کا سپ لیتے ہوئے اپنے ابرو اوپر اٹھا کر حیرت کا اظہار کیا

" ہوگی ضرور ہوگی ۔۔۔مگر میں اپنی فیملی کیلیئے ایسا کبھی نہیں چاہتا ۔۔۔امید ہے تم اچھی طرح سمجھ گئے ہوگے ۔۔۔"

" ہاں سمجھ گیا ہوں ۔۔۔پر ایک بات اور سلطان ۔۔۔تو کیا بھابھی کو تمہاری پہلی شادی کے بارے میں بھی ۔۔۔؟"

" نہیں رشید ۔۔۔کچھ بھی نہیں پتا۔میں اپنا سارا ماضی وہیں پاکستان میں دفن کر آیا ہوں ۔۔۔فاخرہ کو میری پہلی شادی کا علم نہیں ہے اور نا میں ایسا کبھی ہونے دوں گا ۔۔۔"

" تو کیا تم نے پہلی بیوی کو طلاق دے دی ۔۔۔؟"

" نہیں اسے میں نے طلاق نہیں دی ۔۔۔مگر میں زندگی کی الجھنوں میں کچھ ایسا الجھا کہ دوبارہ پاکستان ہی نا جاسکا۔سالوں ارادے بنانے اور توڑنے میں گزر گئے اس سال نہیں اگلے سال ۔اگلے سال نہیں اس سے اگلے سال ۔۔۔اس طرح بیس سال گزر گئے مگر میں واپس نا جاسکا" سلطان نے جھوٹ بول دیا۔یہ نہیں بتایا کہ فاخرہ کی شرط سے مجبور ہوگیا تھا۔

"اوووہ تو یہ بات ہے۔۔۔مگر تمہیں جانا چاہیے تھا آخر وہ بھی تمہاری بیوی ہے۔
باتیں چلتی رہی۔۔۔گھنٹے بعد رشید نے اجازت لی تو جانے سے پہلے اس کا شاطر دماغ بہت کچھ سوچ چکا تھا۔۔دل میں اٹھتی حسد کی آگ پر پانی ڈالنے کا وقت آنے لگا تھا
سلطان بھلے پرانی رنجش بھول چکا ہو مگر رشید کو سب کچھ یاد تھا۔وہ سارے زخم جو اسے سلطان کی وجہ سے ملے تھے۔سلطان کی وجہ سے چوہدری صاحب کی قید میں گزرا ایک ایک پل اسے یاد تھا۔وہ بھلا کیسے بھول سکتا تھا وہ سب کچھ۔؟
انسان کو جب کسی کو نقصان پہنچانا یا بدلہ لینا مقصود ہو تو وہ سب سے پہلے اس کی کمزوریاں ڈھونڈ کر انہیں کمزوریوں کو نشانہ بناتا ہے۔رشید کا شاطر دماغ آج کی۔ملاقات میں جان چکا تھا کہ سلطان کی سب سے بڑی کمزوری اس کی فیملی،اسکا گھر ہے۔اگر سلطان کا گھر ہی توڑ دیا جائے تو سلطان خود بخود ٹوٹ جائے گا۔اونچے ستونوں پر اٹھا اس کا یہ گھر اپنی بنیادوں سمیت ہل جائے گا۔واپس جانے سے پہلے رشید کا انتقامی ذہن بہت کچھ سوچ چکا تھا کہ اسے ان چند دنوں میں کیا کرنا ہے اور سلطان کو کس طرح گھاؤ دینے ہیں۔کچھ ایسے گھاؤ جس کیلئے اسے پھر زندگی بھر کوئی مسیحا کوئی مرہم میسر نا آسکے۔۔۔

☆......☆......☆

"ہم انسان بھی کتنے عجیب ہیں نا خوشی۔۔۔؟"
"کیوں۔۔۔؟"
"جب تک ہمیں کوئی ہماری من پسند چیز میسر نہیں ہوتی ہم اس کیلئے ترستے رہتے ہیں۔۔۔اس کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔اسے حاصل کرنے کی ہر ممکن سعی کرتے ہیں۔اسے پانے کے جتن کرتے ہیں۔اور جب وہ چیز ہماری دسترس میں آجاتی ہیں۔ہم اسکی قدر کھو دیتے ہیں۔وہ ہمارے لیئے بے مول ہو جاتی ہے۔"
وہ دونوں دریا کنارے ٹہل رہے تھے۔شام کو چلنے والی ہوا میں دریا کی نمی بھی شامل تھی۔اور پانی کی ہلکی ہلکی نادیدہ بوندوں سے بوجھل یہ ہوا ان کے جسموں سے ٹکراتی تو ایک فرحت بخش احساس

دیتی تھی۔دریا کنارے اس وقت کہیں کہیں اور بھی لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ایسے لگتا تھا جیسے ہر کوئی اس سہانے موسم کے کچھ سہانے پل گزارنے کیلئے دریا کنارے کی طرف آ گئے ہیں۔اور شاہ والی کے واسیوں کے لیئے اس سے بہتر کوئی پکنک پوائنٹ ہی تھا۔

"ایسا کس لیئے بول رہی ہو جنت۔۔۔کیا مطلب ہے تمہارا۔میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔۔۔؟"

"تمہارے لیئے بول رہی ہوں۔۔۔جب تمہارے پاس رشتے نہیں تھے تو تم رشتوں سے محرومی کا شکوہ کرتے تھے اب جب وہ رشتے خود چل کر تمہارے پاس آ رہے ہیں تو تم مخالف سمت میں دوڑ لگانا چاہتے ہو۔۔۔" اس بار جنت نے ایک پل کو رک کر ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔خوشی نے اسی پل محسوس کیا تھا کیا کچھ نہیں تھا اس کی سانولی کالی آنکھوں میں۔جیسے جنت کی آنکھوں میں پورا جہان سمٹ آیا ہو۔خوشی نے اگلے ہی پل اپنی آنکھوں کا زاویہ تبدیل کر کے اپنا رخ دریا کی سمت کر لیا۔جانتا تھا اگر مسلسل جنت کی آنکھوں میں دیکھتا رہا تو شاید اپنے لفظوں کی روانی کھو دے گا یا پھر سرے سے اپنا مدعا ہی بھول جائے گا۔

"جنت میرے لیئے یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔۔۔تم نہیں سمجھو گی۔"

"میں سب سمجھتی ہوں خوشی آسان تو کسی کیلئے کچھ بھی نہیں ہوتا۔مشکل کو ہمیشہ کوشش سے ہی آسان بنایا جاتا ہے۔۔۔اور میں اگر تمہیں نہیں سمجھتی تو مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے تمہیں۔۔۔" جنت نے دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا جو تیز ہوا سے بار بار اڑنے لگا تھا۔

اور یہ سو فیصد سچ ہی تو تھا۔جتنا وہ دونوں ایک دوسرے کی ذات کو سمجھتے تھے شاید ہی دنیا میں کوئی دوسرا سمجھ سکتا ہو۔

"جنت۔۔۔تمہاری بات ٹھیک ہے مان لیتا ہوں کہ انسان کو اس کی من پسند چیز مل جائے تو وہ اسکی قدر کھو دیتا ہے۔مگر یہاں بات کسی چیز کی نہیں ہے۔یہاں بات رشتوں کی ہے۔انسانوں کی ہے محرومی کی ہے۔وہ رشتے جنہوں نے مجھے ہمیشہ سوائے محرومی کے اور کبھی کچھ نا دیا۔رشتوں اور چیزوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔۔۔"

وہ چپ رہ گئی۔ بات بھی تو صحیح تھی خوشی کی

"خوشی۔۔۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مان جاؤ۔۔۔ مجھے بہت خوشی ہو گی۔ جو کچھ بھی ہو چکا جیسے بھی ہو چکا اس سب کو بھول جاؤ۔ سمجھو تم زندگی کی شروعات نئے سرے سے کر رہے ہو۔ ہر بات، ہر دکھ، ہر محرومی بھول جاؤ" وہ اسے قائل کرنے میں لگی رہی

"کیا زندگی کے بیس سال اتنی آسانی سے بھلائے جا سکتے ہیں۔

میں اگر اپنی زندگی سے یہ بیس سال نکال دوں تو میرے پاس بچے گا کیا؟۔ یہ سب اتنا آسان ہے جتنی آسانی سے تم نے کہہ دیا۔۔۔؟" خوشی نے رک کر جنت کی طرف رخ پھیر کر کہا

"یہ آسان نہیں ہے۔۔۔ مگر سب کی خوشی اسی میں ہے۔ سوچو اگر تمہاری ذات سے اتنے لوگوں کو خوشی حاصل ہو رہی ہے تو کیا یہ تمہارے لیئے کم خوشی کی بات ہے۔۔۔ وہ تمہارے اپنے ہیں۔۔۔ تمہارے سگے دادا دادی۔۔۔ معاف کر دو بس۔۔"

" جنت اگر وہ مجھے اپنا سمجھ کر لینے آتے تو میں شاید مان بھی جاتا۔۔۔ مگر وہ لوگ اسلیئے نہیں آرہے۔ انہیں صرف اپنے بڑھاپے کا سہارا چاہیے بس۔ اپنی غرض کیلئے آئے تھے وہ لوگ بس۔۔۔" اس بار خوشی کے لہجے میں واضح دکھ کی جھلک نمایاں تھی۔

" ایسی بات نہیں ہے خوشی۔۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو آخر۔۔ بڑھاپا ان کا بھی کٹ جاتا ہے جن کا سرے سے کوئی سہارا ہی نہیں ہوتا۔ اور انہیں تمہارے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔۔ وہ لوگ صرف شرمندہ ہیں۔ تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ جو ہو گیا سو گزر گیا۔ اب وہ لوگ مزید اپنے اس رویئے کو نہیں دہرانا چاہتے جو تمہارے ساتھ بچپن سے رکھا گیا۔ وہ صرف تلافی کرنا چاہتے ہیں۔۔۔"

خوشی خاموشی سے چلتا رہا۔۔ شاید الفاظ ختم ہو گئے تھے۔۔۔ وہ اداس تھا

" آؤ۔ واپس چلتے ہیں دیر ہو رہی ہے۔۔۔" خوشی کو اندر سے سب کچھ خالی خالی سا محسوس ہونے لگا تو واپسی کی ٹھانی۔ یوں بھی وہ دونوں ٹہلتے ہوئے کافی دور نکل آئے تھے۔

"خوشی۔۔۔ مان جاؤ گے نا" واپسی کا راستہ خاموشی سے کٹنے لگا تو ایک بار پھر جنت نے اس سے

پوچھا مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔وہ چپ چاپ چلتا رہا۔

"اچھا اب اداس تو نا ہو تم۔۔۔" واپسی کے سفر پر جنت کو اس کی خاموشی کاٹنے لگی

"میں بہت الجھا ہوا ہوں جنت۔میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا کیا کروں۔مجھ سے کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا۔۔۔"

"اپنے لیئے نا سوچو خوشی۔۔۔سب کیلئے سوچو۔۔۔تمہارے مان جانے سے جو سب کو خوشی ہو گی اس کو سوچو۔ایک تمہارے مان جانے جانے باقی کتنے چہروں پر مسکراہٹ واپس لوٹ آئے گی صرف یہ سوچو۔کتنے دل اطمینان سے بھر جائیں گے یہ سوچو۔دادا دادی کو بڑھاپے میں اب کوئی بھی فکر نہیں ستائے گی یہ سب باتیں سوچو۔تبھی تم سے فیصلہ آسان ہو جائے گا۔ساری الجھنیں ہی سلجھ جائیں گی۔"

وہ پھر خاموشی سے چلتا گیا کوئی جواب نا دیا۔

"تمہیں پتا ہے اماں بھی یہی چاہتی ہیں۔ایک بار انہوں نے مجھ سے کہا تھا کتنا اچھا ہوتا کہ ماموں دین محمد خوشی کو منا کر لے جاتے۔۔۔اور اب تو وہ لوگ بھی آ گئے ہیں۔۔" جنت نے اسے ماں کی خواہش بتائی

راستہ کٹتا جا رہا تھا۔۔۔آبادی شروع ہونے لگی تھی۔ان دونوں کو اب اپنے گھروں کی سمت اکیلے سفر کرنا تھا

"اماں اکثر کہتی ہیں کہ اگر کبھی خوشیاں تمہارے دروازے پر دستک دینے آئیں تو اٹھ کر دروازہ کھول دینا چاہیئے۔اس سے پہلے کہ وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ جائیں۔اس سے پہلے کہ دستک دیتے ان کے ہاتھ تھک جائیں اور وہ پھر ہمارے دروازے پر کبھی دستک دینے نا آئیں۔

تم بھی خوشیوں کو راستہ دے دو۔دروازہ کھول دو۔مان جاؤ خوشی۔۔۔" رخصت ہونے سے پہلے ایک بار پھر جنت نے خوشی سے درخواست کی۔

وہ اس کی بات سن کر خاموشی سے چلا گیا۔جنت بھی اب اپنی گلی مڑ کر گھر واپس آ گئی۔گھر کا بیرونی دروازہ عبور کرتے ہی سامنے چولہے میں نور بانو آٹا گوندھتے نظر آئی تو اس نے ماں کی طرف قدم بڑھا دیئے

"جنت۔۔۔ زرا جلدی واپس آیا کرو گھر کتنی بار سمجھایا ہے تمہیں۔۔۔ لڑکیوں کا مغرب تک باہر رہنا اچھا نہیں ہوتا۔۔۔" نور بانو نے آٹا گوندھنے سے ذرا توقف کر کے بیٹی کو تنبیہہ کی

" اماں۔۔۔ خوشی مان جائے گا اب۔۔۔" وہ چولہے کی دیوار پر آ بیٹھی جو ٹانگ برابر تھی۔ اس نے ماں کی ڈانٹ کا جواب بھی پھیر دیا

"تمہیں کیسے یقین ہے وہ مان جائے گا۔۔؟" نور بانو کے لہجے سے خوشی جھلکی

" ہاں اماں مجھے یقین ہے وہ مان جائے گا۔ ابھی اس کی آنکھیں پڑھ کر آ رہی ہوں۔ اس کا چہرہ پڑھ کر آ رہی ہوں۔۔۔ آپ کسی طرح دادا دادی تک پیغام بھجوائیں کہ وہ لوگ ایک بار پھر جائیں نانی تاج کے گھر اسے منانے۔ اب کی بار وہ مان جائے گا۔۔۔" جنت ماں کو بتا کر اندر کمرے کی جانب چل دی

" کبھی کبھی چہروں پر رقم عبارتیں جھوٹ بھی بول دیتی ہیں جنت۔ آنکھیں میں وہ نہیں ہوتا جو کچھ وہ دیکھنے والوں کو دکھاتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ آنکھیں اور چہرے پڑھنے کے سارے ہنر مات کھا جاتے ہیں۔۔۔" نور بانو نے اسے پیچھے سے آواز دی۔ اندر کمرے کی طرف بڑھتی جنت کے قدموں کو بریک لگ گئی۔ ماں کی بات سن کر وہ ایک پل کو رک گئی تھی اور پھر پیچھے مڑ کر ماں سے مخاطب ہوئی

" اماں۔۔۔ ساری دنیا کے چہرے جھوٹ بول سکتے ہیں۔ ساری دنیا دنیا کی آنکھیں فریب دے سکتی ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ خوشی کی آنکھیں اور چہرہ مجھے کبھی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔ مجھے اور دنیا کا کچھ بھی اعتبار نہیں مگر خوشی پر خود سے زیادہ اعتبار ہے۔۔" ماں کو مکمل جواب دے کر رکی نہیں۔ وہ فوراً اندر کمرے کی طرف چلی گئی۔ اور نور بانو اپنی بیٹی کی پیٹھ کو تکتی رہ گئی

نور بانو نے اس پل اپنے اندر خوشی کی ایک لہر اترتی محسوس کی تھی۔ جانے کیوں یہ سارا گھرانا اسے اتنا عزیز تھا۔۔۔ سلطان سے طلاق ملنے کے بعد بھی اس گھرانے سے نور بانو کی محبت کبھی کم نہیں ہوئی تھی۔ یہ اس کے ماموں دین محمد کا گھرانہ تھا جسے زندگی نے بکھیر دیا تھا۔۔۔ اور خوشی۔۔۔ سلطان اور ملوکھاں کی اولاد۔ نور بانو کو کیوں نا عزیز ہوتا۔۔۔

سالوں سے اس کی خواہش تھی کہ ماموں دین محمد ضد اور غصہ چھوڑ کے خوشی کو منالیں اسے واپس

گھر لے آئیں۔مگر دین محمد کو ملوکھاں اور سلطان سے رنج تھا اس کی سزا خوشی بھگتا رہا۔اب نور بانو کی یہ خواہش بھی تکمیل کی طرف بڑھنے لگی تھی۔اسے کہنے میں کوئی عار نہیں تھی کہ سلطان اور ملوکھاں کے ملے جلے نین نقوش کا حامل خوشی اسے پیارا لگتا تھا۔اسے دل سے عزیز تھا خوشی اور دل سے عزیز تھی خوشی کی ہر خوشی بھی۔۔۔

☆......☆......☆

"ایک آرٹسٹ بھی دوسرے انسانوں کی ایک عام انسان ہوتا ہے۔ان کی طرح کھاتا، پیتا، اٹھتا، بیٹھتا، سوتا جاگتا ہے۔اس پر بھی بالکل دوسرے انسانوں کی خوشی، غمی، سردی اور گرمی اثر کرتی ہے۔اس کی ہیئت بھی عام انسانوں کے جیسے ہی ہوتی ہے۔مگر ایک فرق ہوتا ہے ایک آرٹسٹ اور ایک عام انسان میں۔۔۔

اور وہ فرق یہ ہے کہ جس نظر سے یا جس اینگل سے ایک آرٹسٹ دنیا کو دیکھتا ہے یا دنیا میں ہونے والے روزمرہ واقعات کو دیکھتا ہے وہ نظر ایک عام انسان کے پاس نہیں ہوتی۔وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے ایک عام انسان محسوس نہیں کر سکتا۔۔۔وہ جو کچھ دیکھ سکتا ہے وہ عام انسان نہیں دیکھ سکتا وہ جو کچھ سوچ سکتا ہے وہ ایک عام انسان کی سوچ سے کہیں بہت آگے اور بالاتر ہوتا ہے۔۔۔

زندگی میں آنے والے حادثات، تبدیلیاں جس طرح ایک آرٹسٹ پر اثر چھوڑتی ہیں محسوس کرنے کی وہ حس کسی اور کے پاس نہیں ہوتی۔آپ لوگ یوں سمجھ لیں اس کے پاس ایک اضافی حس ہوتی ہے محسوس کرنے کی۔پھر جو کچھ وہ دنیا میں دیکھتا ہے اسے دنیا کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ایک شاعر اپنی شاعری کی صورت میں، ایک مصور اپنی تصویروں اور پینٹنگز کی صورت میں، ایک موسیقار اپنی سروں کی صورت میں ۔۔۔غرضیکہ دنیا کا ہر ایک تخلیق کار جو کچھ دیکھتا ہے، سوچتا ہے، محسوس کرتا ہے یا وہی تخلیق کر دیتا ہے۔۔۔"

سر جانسن اپنے سامنے بیٹھی کلاس کو لیکچر دینے میں محو تھے اور ارحم سمیت ساری کلاس خاموشی سے لیکچر سننے میں۔پوری کلاس پر ایک سکتہ سا طاری تھا سکوت اتنا گہرا تھا کہ ایک سوئی گرنے کی آواز بھی واضح سنی جا سکتی تھی۔

"ایسا نہیں ہوتا کہ ایک آرٹسٹ کے پاس کوئی تیسری آنکھ یا کوئی اضافی اعضاء ہوتے ہیں جس کو استعمال میں لا کر وہ آرٹسٹ بن جاتا ہے جبکہ باقی تمام انسان یہ تیسری آنکھ یا اضافی اعضاء نا ہونے کے باعث آرٹسٹ نہیں بن پاتے

ہم میں سے ہر انسان کے اندر ایک ماہر آرٹسٹ چھپا ہوتا ہے ضرورت اپنے اندر کے ٹیلنٹ کو پہچاننے کی ہوتی ہے اسے باہر لانے کی ہوتی ہے اسے مزید نکھارنے کی ہوتی ہے۔میں یہاں آپ سب کے سامنے سٹیج پر کھڑا بول رہا ہوں یہ بھی ایک آرٹ ہے مجھ میں کچھ کمالات ایسے بھی ہوں گے جن کا مجھے ادراک ہی نہیں ہے میرے سامنے بیٹھے آپ سب لوگوں میں بھی کوئی نا کوئی ہنر ضرور چھپا ہوگا تو اپنے آپ کو پہچانیئے اپنی ذات میں چھپے کمالات کو باہر لائیے انہیں مزید نکھاریئے۔"

سر جانسن نے کچھ لمحے سانس لینے کو توقف کیا

"کیا آپ میں سے کسی نے نصرت فتح علی خان صاحب کو سنا ہے۔۔۔؟"

ارحم سمیت کلاس میں صرف چار لڑکوں نے ہاتھ کھڑا کیا

"گڈ۔۔۔آج ہم نے کچھ سروں اور دھنوں پر کام کرنا ہے تو میں آپ کو موسیقی سے ریلیٹیڈ پاکستان کے ایک مشہور قوال استاد نصرت فتح علی خان صاحب کی مثال دینا چاہوں گا جو چند برس قبل اس دنیا سے گزر گئے ہیں۔

ان کا کہنا تھا کہ" انسان تب تک زندہ رہتا ہے جب تک وہ سیکھتا رہتا ہے۔اور جس دن وہ سیکھنا بند کر دیتا ہے وہ مر جاتا ہے۔۔۔"

تو مطلب ہم نے سیکھنا ہے، ہر کسی سے، ہر جگہہ، ہر سٹیج اور ہر قدم پر۔۔۔کبھی یہ نہیں سوچنا کہ آگے والا ہم سے کمتر ہے اسلیئے یہ ہمیں کیا سکھائے گا

کبھی یہ نہیں سوچنا کہ ہم پرفیکشن تک پہنچ چکے ہیں اب سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔نہیں یہ سوچ بالکل غلط ہے ہمیشہ یاد رکھیے گا کبھی بھی کوئی چیز پرفیکشن کی حد کو نہیں چھو سکتی۔وہ اپنے ایکسٹریم تک ضرور پہنچے گی مگر پرفیکشن تک کبھی نہیں۔ہر چیز میں کہیں نا کہیں کچھ نا کچھ مزید بہتری کی گنجائش ہمیشہ باقی

رہتی ہے۔تو ہمیشہ سیکھنا ہے اور ہر کسی سے سیکھنا ہے۔"

لیکچر ختم ہوا تو ارحم براؤن بالوں والی اپنی کلاس میٹ جینی کے ساتھ کلاس سے باہر آیا تبھی اس کا موبائل تھرتھرانے لگا اس نے موبائل نکال کر دیکھا کوب کی کال آرہی تھی

"کہاں ہو تم۔۔۔" کان موبائل پر لگاتے ہی دوسری طرف سے پوچھا گیا تھا۔

"بس ابھی فری ہوا ہوں کلاس لے کر۔۔۔"

"کبھی تو اس دنیا سے نکل کر باہر کی دنیا کا سوچا کرو ارحم۔۔۔"

"میری یہی دنیا اتنی حسین ہے کہ میں اس کی فینٹسی سے باہر نکل ہی نہیں پاتا اس کی سحر انگیزی اتنی پر اثر ہوتی ہے کہ مجھے اپنے سحر سے باہر نکلنے ہی نہیں دیتی۔۔۔اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ باہر کی دنیا بھی دیکھی جائے۔۔۔"

ارحم نے مسکرا کر جواب دیا

"افففففف۔۔۔ایسا کیا ہے وہاں جو باہر کی دنیا میں نہیں ہے۔۔۔؟"

"یہاں احساسات ہیں۔جو باہر نہیں ہیں۔باہر صرف رنگینیاں ہیں، دھوکے ہیں، فریب ہیں، تیز رفتاری ہے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی سرتوڑ کوشش ہے بس اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔۔۔" ارحم نے رسان سے جواب دیا

"تو تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ باہر کی دنیا کے لوگ بے حس ہیں وہ کچھ بھی محسوس نہیں کرتے۔۔۔؟"

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ بالکل محسوس نہیں کرتے ضرور کرتے ہونگے۔مگر جس طرح ایک آرٹسٹ چیزوں کو دیکھتا ہے، ماحول کو، انسانوں کو جس نظر سے دیکھتا ہے ایک عام انسان نہیں دیکھ سکتا۔۔۔" تازہ تازہ لیکچر کا اثر تھا

"تم کہتے ہو کہ تم اسلیئے زیادہ نہیں بولتے کیونکہ تم محسوس زیادہ کرتے ہو۔۔۔تو کبھی تم نے اپنے آس پاس کچھ محسوس کیا۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ایسا کچھ انوکھا تو نہیں ہوا۔سب کچھ نارمل ہی تو ہے۔۔۔" ارحم نے ایک پل سوچنے

کے بعد جواب دیا

"تم جانتے ہی کہاں ہو ارحم۔۔۔بہت کچھ نارمل نہیں رہا۔۔۔"

"کیا مطلب۔۔۔کیا ہوا ہے۔۔۔؟"

"کچھ نہیں۔۔۔میں بس بتانا چاہ رہی تھی کہ آج رات میں تمہارے گھر آ رہی ہوں امی کے ساتھ۔۔۔"

بدھو پتا نہیں کب سمجھے گا۔کوکب نے دل ہی دل میں خود کو کوسا۔

"ویلکم۔۔۔انتظار رہے گا۔"

"سنو۔۔۔؟"

"بولو۔۔۔" ارحم نے اسی کے انداز کو نقل کیا

"کچھ نہیں۔۔۔" کوکب نے ایک بار پھر بات پوری نہیں کی تھی ہمیشہ کی طرح ادھوری چھوڑ دی

"کوکب یار کیا مسئلہ ہے تمہیں کتنا سمجھاتا ہوں کہ بات کو ادھورا نا چھوڑا کرو۔ہمیشہ مکمل کیا کرو بات۔مجھے الجھن ہوتی ہے ایسی ادھوری باتوں سے" وہ جھنجھلایا

"مجھے خوشی ہوتی ہے تمہیں الجھن میں ڈال کر۔ویسے اچھا ہے نا کبھی تم بھی تو الجھو میری طرح۔ اور ہاں تم آرٹسٹ ہو تو خود سے سمجھو ادھوری باتوں میں چھپے جو پورے مطلب ہوتے ہیں انہیں سمجھونا تم" وہ مسکرائی

"مجھے نہیں سمجھ آتی ایسی الجھی باتیں"

"آجائیں گی جب کبھی تم الجھو گے تو الجھے لوگوں کی الجھی ہوئی باتیں بھی سمجھ میں آجائیں گی تمہاری"

"بس کرو یار پتا نہیں کب تم فلمیں دیکھنا بند کرو گی۔اب فون رکھتا ہوں رات کو بات ہوتی ہے پھر گھر پر"

کال کٹنے کے بعد وہ اپنی جینز کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا رہا پھر جانے کیا سوچتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اور چند دن بعد جب ارحم کالج میں تھا اور سلطان اپنے ڈیپارٹمنٹل سٹور پر۔۔۔تب دن کے وقت

ان کے گھر کی ڈور بیل بجی تھی۔۔۔اندر کام میں مصروف فاخرہ نے ملازمہ کو باہر دروازے پر بھیجا اور خود دوبارہ کام میں مصروف ہوگئیں۔

"میم۔۔۔کوئی رشید صاحب ہیں۔۔۔سلطان صاحب کے دوست بتا رہے ہیں خود کو۔" ملازمہ نے واپس آ کر اطلاع دی

"اوہ۔۔۔اچھا تم انہیں بٹھا کر چائے پانی پوچھو۔۔۔میں آتی ہوں۔۔۔"

☆......☆......☆

پندرہواں حصہ

انسان جب حسد کی آگ میں جلنے لگتا ہے تو اسے کسی پل چین نہیں پڑتا۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتا رہتا ہے جلتا رہتا ہے پل پل سلگتا رہتا ہے۔ حاسد کی مثال بھی تو ماچس کی تیلی کی طرح ہوتی ہے جسے کسی بھی چیز کو راکھ کرنے سے پہلے خود جلنا پڑتا ہے اپنے آپ کو سلگنا پڑتا ہے۔ رشید بھی جل رہا تھا۔ اسے چین ہی نہیں پڑ رہا تھا اس سے سلطان کی شان و شوکت، گھر، کاروبار، فیملی، آرام دہ زندگی برداشت ہی نہیں ہوئی۔ تو وہ واپس پاکستان جانے سے ایک دن پہلے اپنے اندر لگی آگ میں سے ایک چنگاری اس خوبصورت گھر میں پھینکنے پہنچ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت سلطان گھر پر نہیں بلکہ اپنے سٹور پر ہوتے ہیں اور ارحم اپنے کالج۔ یہی وہ کچھ گھنٹے تھے جب وہ فاخرہ سے اکیلے میں مل سکتا تھا۔ سو اپنے اندر کی آگ پر قابو پاتے ہوئے وہ سلطان کے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ فاخرہ کی اجازت سے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا تھا

"بی بی جی۔۔۔ مہمان کو چائے اور کیک بھی پیش کر دی ہے وہ آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔"

فاخرہ اپنا حلیہ تقریباً درست کر چکی تھی جب ملازمہ نے اسے ایک بار پھر اطلاع دی تو وہ رشید سے ملنے ڈرائنگ روم کی سمت بڑھ گئی۔

"السلام و علیکم بھائی صاحب۔۔۔ کیسے مزاج ہیں۔۔۔" انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اندر داخل ہوتے ہی سلام کیا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی مسکراہٹ نے لبوں پر احاطہ کر رکھا تھا

"جی بھابھی جی سب خیریت ہے۔ بس کل میری واپسی تھی تو سوچا سلطان سے مل کے جاؤں۔۔"

رسمی دعا سلام کے بعد فاخرہ کے سوال پر رشید نے اپنی اچانک آمد کا مدعا بتایا۔

" سلطان تو اس وقت سٹور پر ہوتے ہیں ۔۔۔میں کال کرتی ہوں انہیں وہ گھنٹے تک پہنچ جائیں گے تو مل بھی لیجیے گا اور آپ کی پاکستان واپسی سے پہلے ہم لوگ ایک کھانا بھی ساتھ کھالیں گے ۔۔"
" ارے نہیں نہیں بھابھی ۔۔۔بس مجھے تھوڑی دیر میں جانا ہے کچھ ضروری کام نبٹانے ہیں تو آپ مجھے ایڈریس سمجھا دیجیے گا میں وقت نکال کر خود چلا جاؤں گا سٹور پر ۔۔۔"
جب کہ ایڈریس تو رشید کے پاس پہلے سے موجود تھا ۔وہ سلطان سے ابھی ملنا ہی نہیں چاہتا تھا ۔اس گھر میں چنگاری لگانے کیلئے اس نے سوچ سمجھ کر ہی فاخرہ کو اپنا مہرہ بنایا تھا
" جی ضرور میں کارڈ دے دوں گی آپ کو سٹور کا تو آپ کو سٹور ڈھونڈنے میں دشواری نہیں ہو گی ۔۔۔" حالانکہ کارڈ اسے سلطان نے پہلے ہی دن دے دیا تھا
" بھابھی جی ۔۔۔میں نے بہت دنیا چھانی ہے بھانت بھانت کے لوگ دیکھے ہیں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے ۔میں نے اپنی زندگی کے ٹوٹل تجربے کا نچوڑ یہی نکالا ہے کہ اچھے برے لوگ ہر جگہہ پائے جاتے ہیں ۔" چائے پینے کے بعد رشید نے اپنے اصل مقصد کیلیئے تمہید باندھنا شروع کر دی تھی
" جی بالکل بھائی صاحب ۔بجا فرمایا آپ نے ۔۔۔کوئی بھی معاشرہ صرف برے لوگوں پر مشتمل نہیں ہوتا کسی بھی معاشرے میں صرف اچھے لوگ شامل نہیں ہوتے ۔یہ تو بس نظام ہے ایک چلانے والی ذات کا ۔جو ازلوں سے چلتا آرہا ہے ۔"
"لیکن ایک بات یہ بھی میں نے نوٹ کی ہے کہ چاہے مشرق ہو یا مغرب قربانی ہمیشہ عورت کے حصے میں ہی آئی ہے ۔اجارہ داری ہر جگہہ مرد کی ہوتی ہے ۔۔۔"
" اگر مشرق کی بات کی جائے تو آپ کی بات اس نکتے پر صادق آتی ہے جب کہ مغرب میں جہاں تک میرا خیال ہے یہ کلیہ کارگر ثابت نہیں ہوتا ۔یہاں مرد کو وہ حاکمیت حاصل نہیں ہے جو مشرق میں اسے حاصل ہے ۔یہاں تقریباً دونوں کے حقوق ہر پلیٹ فارم پر مساوی تصور کیئے جاتے ہیں ۔۔۔"
فاخرہ نے رشید کے خیال کی درستگی کرنا لازمی سمجھا تھا
" بھابھی جی ویسے کمال ہے آپ کی ۔۔۔آج کل کے دور میں ایسے ظرف والی بیویاں بڑی مشکل

سے اور نصیب والوں کو ملتی ہیں سلطان بہت خوش قسمت ہے اس معاملے میں جو اسے آپ جیسی بیوی ملی ہے۔۔۔" رشید بالآخر اصل مدعے پر آہی گیا۔
" ارے نہیں بھائی صاحب۔۔۔اس میں میرا کیا کمال ہے بس اللہ کی مہربانی ہے سب۔۔۔"
فاخرہ بات کو سمجھ ہی نا پائیں
" نہیں میں ظرف کی بات کر رہا ہوں۔۔۔مطلب کہ بھلے مشرق ہو یا مغرب آج کل کونسی بیوی ہے جو سوکن برداشت کرتی ہے مگر آپ پھر بھی ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہیں۔۔۔اعلیٰ ظرفی تو ہے نا آپ کی۔۔۔"
رشید کے لبوں پر کھسیانی ہنسی تھی تو اس کی بات سنتے ہی فاخرہ کے چہرے پر اسی لمحے سنجیدہ تاثرات آگئے
"کیا مطلب بھائی صاحب۔۔۔آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔۔؟"
" سلطان کی پہلی بیوی ملوکھاں کی۔۔۔جو پاکستان میں ہے۔۔۔"
"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔۔۔میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی۔۔۔"
" ارے۔۔۔تو کیا اس کا مطلب آپ کچھ نہیں جانتی۔۔۔؟ مطلب آپ کو سلطان کی پہلی بیوی کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے۔۔۔؟" رشید نے اپنے چہرے پر مصنوعی حیرت طاری کرتے ہوئے پوچھا
" آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے بھائی صاحب۔۔۔سلطان کی کوئی بیوی نہیں ہے پاکستان میں۔۔۔"
فاخرہ کے لہجے میں واضح تبدیلی آگئی
" پچھلے ہفتے جب میں کھانے پر آیا تو خود سلطان سے میں نے اس کی پہلی بیوی کا پوچھا تو وہ بول رہے تھے کہ فاخرہ سب جانتی ہیں میں نے کچھ بھی نہیں چھپایا ان سے۔۔۔شادی سے پہلے ہی اپنی پہلی بیوی کے بارے میں آپ کو آگاہ کر دیا تھا۔میں تو تب سے آپکی اعلیٰ ظرفی کی داد دینے لگا۔۔اور آپ بولتی ہیں کہ ایسا کچھ بھی نہیں۔۔۔کمال ہے۔۔۔"
" یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔۔۔؟ سلطان اٹھارہ سال سے یہیں ہیں شادی کے بعد ایک بار بھی وہ پاکستان نہیں گئے۔۔۔اور آپ یہ کس طرح کے الزام لگا رہے ہیں۔۔۔؟"
" اٹھارہ سال۔۔۔؟ بھابھی جی

یا تو آپ میرے ساتھ مذاق کر رہی ہیں کیونکہ آپ نے کمال درجے کا ظرف پایا ہے۔ یا تو پھر آپ سرے سے ہی انجان ہیں۔"

" میں کوئی مذاق نہیں کر رہی رشید صاحب۔ بلکہ مذاق تو آپ کر رہے ہیں وہ بھی میرے شوہر کے متعلق۔۔۔ اگر انہیں آپ کے مذاق کا علم ہو جائے تو وہ یقیناً بہت محظوظ ہوں گے۔۔۔" فاخرہ کو اب بھی یہ سب مذاق لگ رہا تھا۔ جانتی تھی یہ مغربی تھا وہ یہیں کی پروردہ تھی۔ یہاں بڑے سے بڑے مذاق کی بھی توقع رکھی جا سکتی تھی۔۔۔

" بھابھی جی میں بھی کوئی مذاق نہیں کر رہا۔۔۔ بالکل سیریس ہوں۔ اور اب تو مجھے لگ رہا ہے کہ جسے میں آپ کی اعلیٰ ظرفی سمجھ رہا تھا وہ کہیں آپ کی کم فہمی نا ہو۔۔۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا رشید صاحب۔۔۔؟ کھل کر بات کریں پلیز۔۔۔"

" بھابی جی ابھی آپ کہہ رہی تھی کہ سلطان پچھلے اٹھارہ بیس سال سے پاکستان نہیں آیا۔۔۔ جبکہ وہ تو ہر سال ایک دو ہفتے کیلئے آتے ہیں پاکستان۔۔۔ اپنے ماں باپ بیوی اور بیٹے سے ملنے۔۔۔ پچھلے سال خود میں نے سلطان کی دعوت بھی کی تھی۔۔۔" وہ جھوٹ میں شروع سے ماہر رہا تھا سو اب بھی پورا پلان بنا کے ہی آیا تھا

"کونسا بیٹا، کونسی بیوی۔۔۔ اور سلطان کبھی نہیں گئے پاکستان۔ شادی سے لے کر آج تک وہ کوئی بھی ایسا کام نہیں کرتے جب تک مجھ سے مشورہ نا کر لیں۔۔۔ اور آپ خدا جانے کیسی باتیں کر رہے ہیں ان کے متعلق۔۔" فاخرہ کیلیئے آج کا دن حیرتوں کا دن تھا۔

" بھابھی جی میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا بھلا۔۔۔ وہ آتے ہیں ہر سال آتے ہیں آخر ہمارا وہاں دھندا ہے۔۔۔ دھندا تو میں سنبھال رہا ہوں مگر سلطان صرف جانچ پڑتال کیلیئے ہر سال آتے ہیں اور انکا حصہ میں ویسے ہی انکے اکاونٹ میں ٹرانسفر کروا دیتا ہوں۔۔۔" وہ جو ایک ہفتے سے جال بننے میں لگا تھا اسے بچھانے میں کامیاب رہا

" کیسا دھندا۔۔۔؟" فاخرہ کے گلے میں کچھ اٹکنے لگا آواز بھی بڑی مشکل سے نکلی

"اپنا دھندا۔۔۔میرا مطلب اسلحے کا دھندا۔۔۔مطلب آپ اس سے بھی انجان ہیں۔۔۔؟" وہ ایک بار پھر حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا

"جھوٹ بول رہے ہیں آپ۔۔۔اپنے شوہر پر آپ کو اس طرح کے الزام لگانے کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتی میں۔۔۔سلطان کے پرانے دوست ہونے کے ناطے میں آپ کی قدر کر رہی ہوں اور آپ ہیں کہ الزام پہ الزام لگائے جا رہے ہیں۔۔۔" وہ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئیں

"ارے بھابھی جی۔۔۔میں کیوں سلطان پر کوئی الزام لگاؤں گا بھلا۔۔۔وہ میرا دوست ہے میرے دھندے کا شریک ہے چوہدری صاحب کے بعد پارٹنر ہے میرا۔چوہدری صاحب کو اللہ بخشے ان کے بعد ان کا دھندا ہم ہی تو سنبھال رہے ہیں۔۔۔اچھا آپ کو میرا یقین نہیں ہے تو آپ شام کو سلطان سے خود تصدیق کر لیں۔اور میرے یہاں لندن آنے کے پیچھے ل ھی ہمارے دھندے کو یہاں لندن تک پھیلانے کا مقصد کارفرما تھا۔"" رشید اس بار لجاجت سے بولا

"شرم آنی چاہیے آپ کو چوہدری صاحب کے بارے میں ایسی بات بولتے ہوئے۔۔۔وہ ایک اچھے اور نیک انسان تھے۔معاف کیجیے گا مجھے آپ سے مل کر آج کچھ اچھا نہیں لگا۔۔۔بہتر ہے آپ چلے جائیں۔۔۔سلطان سے سٹور پر مل لیجیے گا۔۔۔" لہجے میں سختی لیئے ہوئے فاخرہ اٹھ کھڑی ہوئی اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی اور بات نہیں کرنا چاہتی۔۔۔ان کے اٹھتے ہی سلطان بھی کھڑا ہو گیا

"اپنے دھندے میں کیسی شرم۔۔۔اور میں نے آپ کو اعلیٰ ظرف سمجھا تھا مگر اب افسوس ہو رہا ہے مجھے آپ پر بلکہ دکھ ہو رہا ہے آپ کی معصومیت پر، آپ کی بے خبری پر اور سلطان پر اس قدر بھروسے پر۔۔۔میری باتوں میں سو فیصد سچائی ہے۔آپ شام کو سلطان سے تصدیق کر سکتی ہیں کہ آپ سے پہلے اس نے کتنی شادیاں کر رکھی ہیں اور ہر سال پاکستان کس مقصد کیلیئے جاتا ہے وہ۔۔۔چلتا ہوں" اسے جو کچھ بولنا تھا بول چکا تھا۔جو رشید سوچ کر آیا تھا سب کچھ اس کے پلان کے مطابق ہوا تھا۔۔

وہ فاخرہ کے سلگنے اور سوچ سوچ کر پگھلنے کیلئے بہت سے سوالات کی ایک پوری پٹاری کھول کر چلا گیا تھا۔

فاخرہ کو اپنی ٹانگیں کانپتی محسوس ہوئی، سر چکرانے لگا سب کچھ گول گول گھومتا دکھائی دینے لگا۔ تو وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔۔۔سلطان۔۔۔بیوی۔۔۔بیٹا۔۔۔پاکستان۔۔۔اسلحہ۔۔۔دھندا۔۔۔اس کی سماعتوں پر ہر طرف سے ہتھوڑیاں برسنے لگی

وہ بے یقین تھی اسے اپنے شوہر پر مکمل اعتماد تھا۔۔۔لیکن دماغ کے کسی کونے میں شک کنڈلی مارے بیٹھا پھنکار رہا تھا اور پھر رشید کس طرح اتنے دھڑلے سے ان کے گھر میں بیٹھ کر انہی کے متعلق اتنے بڑے جھوٹ گھڑ سکتا تھا۔۔۔

یقیناً کہیں نا کہیں دال کالی ضرور تھی۔ اور پھر فاخرہ کو سلطان کے سال میں ایک بار ہفتے دس دن کیلئے دوستوں کے ساتھ جانے والے ٹرپ اور آؤٹنگ کے پروگرام یاد آنے لگے۔۔۔تو کیا سلطان آؤٹنگ کا بہانہ بنا کر پاکستان چلے جاتے تھے اپنے بیوی بچے سے ملنے۔۔۔؟؟؟ دماغ میں کنڈلی مارے بیٹھے شک کے سانپ کی پھنکاروں میں مسلسل اضافہ ہونے لگا تھا

اگر یہ سب کچھ سچ ہوا تو۔۔۔اس سے آگے وہ کچھ بھی سوچ نا سکی۔ وہ سلگتی رہی اس کا اعتبار ٹوٹا تھا وہ بھی ایسے شخص کے ہاتھوں جس کو وہ برسوں سے چاہتی آرہی تھی۔ ٹھنڈے اور نرم مزاج کی فاخرہ کے اندر لاوا جمع ہونے لگا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ کیا نا کرے۔ اگر یہ سب سچ ہوا تو اس کا انجام کیا ہوگا۔

اسے اپنے پورے بدن میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ یہ سب سچ ہوگا۔ سلطان اسے اتنا بڑا دھوکہ کبھی نہیں دے سکتا۔

مگر رشید کا لہجہ، اس کا اعتماد۔۔۔اس کی باتوں کا انداز اس سے بھی تو اندازہ ہو رہا تھا کوئی اس طرح ٹھوک بجا کر بھلا جھوٹ تو نہیں بول سکتا۔ یقیناً کچھ نا کچھ غلط ضرور ہے۔ بہت کچھ ایسا ہے جو ہم سب کی نظروں سے سلطان نے مخفی رکھا ہوا ہے۔ اور شام ہونے سے پہلے وہ بنا تصدیق کیئے ایک نتیجے پر پہنچ گئی تھی۔ اسے شام کو ایک فیصلہ کرنا تھا اپنی زندگی کا سب سے بڑا اور تلخ ترین فیصلہ

☆......☆......☆

چودہ اگست کے آتے ہی ہمیشہ کی طرح گاؤں کی رونقوں میں بھی اضافہ ہونے لگا تھا۔ ہر بار چودہ اگست یا عیدین پر ایسا ہی ہوتا دور دراز سے لوگ آتے اور اپنی خوشیاں دریا کنارے آ کے مناتے۔ گاؤں سے کوئی ایک دو کلو میٹر اوپر حکومت نے برسوں پہلے ایک بیراج تعمیر کیا تھا تب سے یہ ایک تفریحی مقام کی حیثیت اختیار کر گیا اگرچہ اب بیراج کی حالت اب خاصی خستہ ہو چکی تھی پھر آس پاس کے دیہاتوں اور یہاں کے باشندوں کیلئے یہی تفریح طبع کیلئے استعمال کیا جاتا اور گاؤں والوں کیلئے یہ بیراج کسی غنیمت سے کم نہیں تھا۔۔۔

اگست اور عیدین کے مواقعوں پر یہاں لوگوں کا ایک بہتا ہوا سیلاب امڈ کر آجاتا۔ جانے کتنی دور دور سے بھانت بھانت کے لوگ بیراج پر آتے۔ فیمیلیاں بھی آتی مگر اکثریت ان میں مردوں اور لڑکوں کی ہی ہوتی۔۔۔ ان دنوں ہیڈ پر بنائی گئی مچھلی مارکیٹ میں گاؤں کے باسی خوب کمائی کرتے۔ دھڑا دھڑ مچھلی بکتی۔۔۔ یہ دو چار دن بستی شاہ والی کے مچھیروں اور کشتی بانوں کی عید لگ جاتی۔۔۔ لوگ کشتی پر دریا کی سیر کرتے ان دو چار دنوں میں مچھلی کے بھاؤ بھی بڑھا دیئے جاتے اور کشتی کا کرایہ بھی۔ مگر پھر بھی لوگ ہنسی خوشی یہ سب اخراجات برداشت کرتے۔۔۔ کچھ منچلے دریا پر کنارے کے ساتھ ساتھ نہانے کے بھی مزے اڑاتے تھے جبکہ کچھ منچلے تو بیراج سے آگے گاؤں تک بھی آجاتے تو ان کچھ راتوں میں محفل کا سماں بندھ جاتا۔۔ لڑکے ساری رات گانے گاتے دھمالیں ڈالتے بڑی بڑی مصنوعی روشنیوں کا بندوبست کر کے دریا کنارے خیمے لگا کے رات گزارتے۔۔۔ گاؤں والے بھی خوب محظوظ ہوتے رہتے۔۔۔ کبھی کبھی گاؤں سے کچھ اچھے سروں والے اشخاص کی مدد بھی لے لی جاتی۔ جن سے دور دراز سے آئی یہ پارٹیاں مناسب پیسے دے کر ساری رات موسیقی سنتے رہتے۔

مگر اس بار آنے والا چودہ اگست شاہ والی کیلئے ہولناک ثابت ہوا۔۔۔ ہر سال کی طرح اس بار بھی دریا کنارے اور بیراج پر عوام کی گہما گہمی اور رونقیں عروج پر تھی۔ مچھلی منڈی کی رونقیں بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی دھڑا دھڑ مچھلی بک رہی تھی۔ سارے بازار میں ہر طرف مچھلی کی مخصوص خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دریا اپنی ازلی روانیوں کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ دریا میں دور دور تک کشتیاں اور ان پر لگے پاکستانی

پرچم واضح دکھائی دیتے تھے۔کچھ منچلے کنارے کے ساتھ تیراکی میں بھی مصروف تھے۔۔

تبھی خدا جانے ان میں دو لڑکوں کے دل میں کیا سوجھی وہ اپنے تیراکی کا ہنر آزمانے زرا بڑے اور گہرے پانی کی طرف نکل آئے۔۔۔مگر پچھلے ہفتے سے مسلسل ہونے والی بارشوں نے دریا کی موجوں میں روانی کچھ مزید بڑھا دی تھی۔اور بپھری موجوں کو لڑکوں کا یہ چیلنج بالکل پسند نا آیا۔۔۔دیکھتے ہی دیکھتے کچھ مغرور اور زور آور لہریں آئیں اور مزید گہرے پانی کی طرف بڑھتے دونوں نوجوان لڑکوں کو اپنے ساتھ بہا لے گئیں لڑکے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے مدد کیلئے پکارنے لگے مگر کنارے پر کھڑے ساتھیوں کو بپھری لہروں نے پانی میں پاؤں رکھنے کی ہمت ہی نا کرنے دی۔۔۔ان کے پاس بے بس اور پانی کی مخالف سمت میں مزاحمت کرتے چیختے ہاتھ پاؤں مارتے اپنے ساتھیوں کو ڈوبتے دیکھنے کے سوا اور کوئی چارہ نا تھا۔

کس قدر بے بس لمحہ تھا کہ دو لڑکے ان کے ڈوب رہے تھے اور کنارے پر کھڑے ان کے ساتھ اپنے ڈوبتے ساتھیوں کیلئے کچھ بھی نہیں کر پا رہے تھے۔وہ سوائے بے بسی سے اپنے ہاتھ ملنے کے کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے۔

یہی ہم انسانوں کی حقیقت ہے۔ہم انسان خود کو جانے کیا کچھ نہیں سمجھتے۔انسان سخت سے سخت چٹانیں توڑ دیتا ہے، بڑے سے بڑے دریا کے آگے بند باندھ دیتا ہے مگر جب تقدیر اپنا ہاتھ دکھاتی ہے ہم سوائے ہاتھ ملنے اور افسوس کرنے کے کچھ کر ہی نہیں سکتے۔یہاں بھی یہی معاملہ کارفرما تھا۔

مگر لہروں کا انتقام ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔اسی وقت کلیم اپنی کشتی کا چکر مکمل کر کے کنارے پر کچھ لڑکوں کو اتارنے آئے تو اس سے کنارے پر کھڑے ڈوبنے والوں کے ساتھیوں کا رونا اور بے بسی دیکھی نا گئی۔تیراکی شاہ والی کے نوجوانوں کے خون میں شامل تھی۔سو کلیم۔۔۔اللہ کا نام لے کر کود پڑے۔۔۔تھوڑی ہی دیر میں وہ دریا کی لہروں کو چیرتے ہوئے ایک لڑکے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور اس کے ہاتھ اپنی کمر سے باندھ کر کنارے کی طرف بڑھنے لگے۔۔۔بپھری لہروں کی مخالف سمت میں تیراکی میں اسے کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑا مگر وہ اپنی بھرپور طاقت اور تیراکی میں ماہر ہونے کے باعث آخرکار کنارے تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔۔۔پہلے لڑکے کو جواب نیم بیہوش تھا کنارے پر

رکھنے کے بعد وہاں موجود اس کے ساتھ کلیم کو دوسرے لڑکے کو بچانے کیلئے واسطے دینے لگے۔وہ تھک چکا تھا مگر وہاں موجود سب نم آنکھوں کی جوتیں بھی بجھتے نہیں دیکھ سکتا تھا تو اس نے دوبارہ پانی میں چھلانگ لگائی۔اور لہروں کے ساتھ ڈبکیاں کھاتے لڑکے کی طرف تیرنا شروع کردیا۔۔

جبکہ وہاں کنارے پر موجود کھڑے لڑکے موت کے منہ سے واپس آئے اپنے نیم بے ہوش ساتھی کے پیٹ پر آہستہ آہستہ زور دے کر پیٹ میں بھرا پانی نکالنے لگے۔۔۔

اتنی دیر میں لہریں دوسرے لڑکے کو کافی دور گہرائی کی طرف لے جا چکی تھی۔مگر ڈوبتے لڑکے کی آنکھوں میں کلیم کو دیکھتے ہوئے جو زندگی کی امید تھی وہ اس کے بازوں میں مزید طاقت کا باعث بنی اور اس نے اپنی پوری توانائی سے تیرنا شروع کردیا۔

اس طرف تو شاہ والی کے مچھیرے خود بھی کبھی تیراکی کیلئے نہیں آئے تھے۔مگر خدا جانے اس وقت کلیم کے ذہن و دل میں کون سا دریا کی بپھری لہروں کی طرح ٹاٹھیں مار رہا تھا کہ وہ دریا کی گہرائی جانتے ہوئے بھی واپس نا پلٹا۔۔۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ ڈوبتے لڑکے تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔۔مگر یہاں تک پہنچتے پہنچتے اڑتیس سالہ کلیم کے بازوں میں مسلسل پانی کی لہروں سے لڑنے کے باعث درد ہو چلا تھا اور سانسیں اکھڑنے لگی اس نے لڑکے کے بازو اپنی کمر کے گرد باندھے ہی تھے کہ ایک زوردار اور بڑی موج آئی اور اسے سنبھلنے کا موقع ہی نا ملا۔ایک بار پھر لڑکے کے بازو اسکی کمر سے چھوٹ گئے۔پانی کی لہریں اسے مزید دور کرنے لگی۔اور اکھڑی سانسوں کے ساتھ کلیم اس بے ہوش لڑکے کی مدد کو بڑھتا رہا ۔اس کے شل بازوں میں اب لہروں سے لڑنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

یہی وہ لمحہ تھا جب کلیم کو محسوس ہوا کہ اب اس میں اتنی طاقت اور دم باقی نہیں رہا کہ بپھری لہروں کے شکنجے سے اس بے ہوش لڑکے کو نکال کے واپس لے آئے۔بلکہ اسے محسوس ہونے لگا کہ اب وہ خود کو بھی واپس کنارے کی طرف لے جانے کے قابل رہا۔

خونی موجوں نے اس ماہر تیراک کو چکمہ دے کر گہرائی کی طرف لا پھینکا تھا۔پانی کے شور

کے باعث کنارے پر کھڑے لوگوں کی آوازیں بھی اب اس تک نہیں پہنچ پا رہی تھیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اسے لگا کہ اب وہ بے بس ہو چکا ہے اور اپنے بچاؤ کیلئے بھی ہاتھ پاؤں نہیں مار سکتا

تو اس نے دل ہی دل میں کلمہ پڑھتے ہوئے خدا کا نام لے کر خود کو دریا کی موجوں کے حوالے کر دیا۔۔۔

جانے وہ لمحہ کس قدر کربناک ہوتا ہے جب انسان بے بس ہو کر خود کو اپنی موت کے حوالے کر دیتا ہے

کنارے پر جمع آنکھوں میں آنسوؤں لیئے لوگوں کی دعاؤں کو قبولیت نا مل سکی۔۔۔وہ دن شاہ والی پر بہت بھاری گزرا۔۔ ہر آنکھ اشکبار اور نمدیدہ تھی۔۔۔کلیم۔کے گھر ماتم تھا۔مگر ہونی ہو چکی تھی۔تقدیر کا وار بہت کاری اور گہرا ہوتا ہے۔ساری تدبیروں کو ناکارہ کر دیتا ہے

قدرت اپنی مرضی کر کے ہی رہتی ہے قدرت کے آگے بے بس انسان کو خدا تعالیٰ صبر عطا کر دیتا ہے۔یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا، شاہ والی گاؤں کو دریا کی طرف سے ملنے والے زخموں میں ایک اور زخم کا اضافہ ہو گیا تھا آج دریا نے سلطان کے بچپن کے دوست کلی کی آنکھوں کو ہمیشہ کیلئے بند کر دیا تھا۔دریا کنارے کھڑی کلی کی کشتی آتی جاتی لہروں کے ساتھ آہستہ آہستہ ہل رہی تھی

☆......☆......☆

صبح سے ہونے والی بارش نے موسم کو خاصا ٹھنڈا کر دیا تھا۔قوی امکان تھا کہ اگلی کچھ بارشوں کے ساتھ ہی برف باری کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے گا۔اور پھر لندن کی برف باری تو دنیا بھر میں مشہور تھی۔آج کالج آنے کیلئے ارحم کا بالکل بھی من نہیں تھا مگر پھر وہ نا چاہتے ہوئے بھی کالج آ گیا تھا۔اور اب دو مسلسل پیریڈ کے بعد آنے والی بریک میں کوکب اسے اپنے ساتھ کینٹین میں لے آئی تھی

"ارحم کچھ لوگ اپنے آس پاس سے کس قدر بے خبر ہوتے ہیں۔۔۔ہیں نا۔۔؟" کالج کینٹین میں سموسوں سے انصاف کرتے ہوئے کوکب نے ارحم پر ہلکا پھلکا طنز کیا

"ہاں بے خبری کو نعمتِ خداوندی سمجھا جاتا ہے۔ویسے تم کس کی بات کر رہی ہو۔۔۔؟"

" ایسے ہی بس ۔۔۔کوئی بھی ہو سکتے ہیں وہ ۔۔۔میں نے تو بہت سے ایسے لوگ دیکھے ہیں ۔۔۔"
" ہوسکتا ہے ۔۔۔مگر مجھے تو فی الحال ایسا کوئی بھی تجربہ نہیں ہوا ۔۔۔"
" ہو گا بھی کیسے ۔۔۔تم خود ان لوگوں میں شامل ہو ۔۔"
"کیا مطلب ۔۔۔؟" ارحم چونک گیا
" کچھ نہیں ۔۔۔میں ویسے جنرلی بات کر رہی تھی ۔۔" کوکب نے بات کو پھیرنے کی کوشش کی
" نہیں ۔۔۔مجھے پوری بات بتاؤ ۔کوکب تمہیں معلوم بھی ہے مجھے ادھوری باتوں سے کتنی الجھن ہوتی ہے ۔۔۔" وہ جھنجھلایا
" پوری ہی تو بتائی ہے نا ۔۔تم ہمیشہ اپنے آس پاس سے بے خبر رہتے ہو ۔۔"
" نہیں اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے ۔۔۔میں اپنے آس پاس سے ہمیشہ باخبر رہتا ہوں ۔اپنے ارد گرد ہونے والی ایک ایک حرکت نوٹ کرتا رہتا ہوں ۔"
" ایسا ہے نا میں نے محسوس کیا ہے ۔۔کچھ بہت قریبی لوگ ہیں تمہارے ارد گرد جو تمہاری کس قدر فکر کرتے ہیں ۔۔۔کیا تم نے کبھی محسوس نہیں کیا ۔۔۔"
" دنیا میں سوائے پیرنٹس کے ایسا اور کوئی بھی نہیں ہو سکتا ۔۔۔اور میں اپنے پیرنٹس سے بے پناہ پیار کرتا ہوں ان کے قدر کرتا ہوں ان کا پیار محسوس بھی کرتا ہوں ان کو پیار محبت لوٹاتا بھی ہوں ۔۔۔"
" پیرنٹس کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تو ہو سکتے ہیں ۔۔۔جو تمہیں چاہتے ہوں ،تمہاری پرواہ کرتے ہوں ۔۔" پتا نہیں کب سمجھے گا بدھو ۔۔۔کوکب نے دل ہی دل میں ارحم کو کوسا
" مے بی ۔۔۔یو آر رائٹ ۔۔۔بٹ مجھے ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا ۔۔۔"
" یہ بتاؤ محبت کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا ۔۔۔؟"
" میرے خیال میں وقت کا ضیاع ہے ۔۔۔کسی کے پیچھے اپنی زندگی تیاگ دو اور اسے آپ کی پرواہ بھی نا ہو ۔۔
مگر سر جانسن کی رائے زرا مختلف ہے وہ کہتے ہیں زندگی میں انسان کو ایک بار محبت لازمی ہونی

چاہیے۔وہ کہتے ہیں محبت انسان کی" میں" مارتی ہے۔اسے عاجز بناتی ہے۔اس میں احساس پیدا کرتی ہے۔انسان کا سارا سٹرکچر ہی تبدیل کر دیتی ہے اسے نرم کرتی ہے نا صرف محبوب کیلئے بلکہ محبت کرنے والے کا دل اس ساری کائنات سے محبت کرنے لگتا ہے۔کائنات کی ایک ایک چیز سے، ایک ایک زرے سے" ارحم اپنے فیورٹ ٹیچر کا لیکچر دہرانے لگا بالکل انہی کے جیسے انداز میں "

"بات تو تمہاری بھی سچ ہے کسی کیلئے اپنی زندگی بے ترتیب نہیں کرنی چاہیے" کوکب نے ڈائریکٹ ارحم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

" اور صحیح بولتے ہیں تمہارے سر۔۔۔تمہیں بھی ایک بار تو لازمی کرنی چاہیے محبت" کوکب نے دوبارہ اسے مشورہ دیا

" میں کیوں کروں کسی سے محبت کیوں کسی کیلیئے خود کو تباہ کر دوں۔۔۔؟"

" اور کچھ نہیں تو اپنے فیورٹ سر کا تجربہ آزمانے کیلئے ہی کر لو۔تاکہ تمہیں معلوم بھی ہو جائے کہ انہوں نے محبت پر جو اتنا لمبا بھاشن دیا وہ واقعی سچ ہے یا بس خالی خولی افسانوی باتیں۔۔۔؟"

"تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔۔۔؟" وہ اپنا برگر ختم کرنے کے بعد ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔

" مجھے یہ فائدہ ہوگا کہ تمہیں کم از کم کسی کا احساس ہونے لگے گا۔تمہارا دل بھی نرم پڑ جائے گا۔تمہارے اندر کی سخت چٹانوں میں دراڑیں پڑ جائیں گی۔پھر ان دراڑوں میں سے کوئی محبت کی کلی بھی پھوٹ نکلے گی۔"

"تم کسی سے محبت کرتی ہو۔؟"

" ہاں کرتی ہوں" کوکب نے اعتراف کرلیا

"کس سے" وہ ایک لمحے کو چپ رہ گئی۔کیسے کہہ دیتی کہ اے بے خبر لڑکے میں تم سے محبت کرتی ہوں۔مگر بے وفا الفاظ بھی زبان کا ساتھ دیتے تب کہتی نا۔یہ تو صرف خلوتوں کے خیالات ہوتے ہیں۔محبوب کی غیر موجودگی میں ہزاروں باتیں کرنے والی زبان محبوب کے سامنے آتے ہی گونگی بن جاتی ہے۔

"تم میرے سب سے قریب ترین ہو یہ تمہیں سمجھنا چاہیے کہ کس سے۔۔۔"

"کیا مطلب۔۔۔میں سمجھا نہیں"

"یہی تو سارا مسئلہ ہے۔۔۔تم کچھ سمجھتے ہی نہیں۔۔جبکہ ابھی تم نے خود یہ کہا ہے تم اپنے ارد گرد سے ہمیشہ باخبر رہتے ہو۔جبکہ تمہاری 'باخبری' کا یہ حال ہے۔۔۔"

"کوکب پلیز یاررر۔۔۔پہلیاں نا بجھوایا کرو۔۔۔تمہیں معلوم بھی ہے نا کہ مجھے سیدھی باتیں سمجھ آتی ہیں اور اچھی بھی لگتی ہیں۔پھر بھی تم ہمیشہ پہلیوں میں بات کیوں کرتی ہو۔۔۔؟"

"کلاس کا ٹائم ہوگیا ہے آو چلیں۔" اس نے بات کا رخ ہی موڑ دیا۔جو خود جذبوں کو آنکھوں سے نا پڑھ پائے اس کے سامنے الفاظ کیا اثر قائم کر پائیں گے۔۔۔اسلیئے کوکب نے بات ہی تبدیل کر دی۔

وہ جانتی تھی کہ دیواروں سے سر پھوڑ رہی ہے اور دیواروں سے سر پھوڑنے والا ہمیشہ اپنا سر ہی زخمی کرتا ہے ورنہ دیوار پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

یہ محبت بھی کوئی عجیب چیز ہے نا۔ہمیشہ ایسی جگہہ آ کے چوٹ لگاتی ہے جہاں پر کسی نے کبھی سوچا تک نہیں ہوتا۔اور چوٹ بھی ایسی کہ اس زخم کا کوئی مرہم بھی نہیں ہوتا۔

اس شوخ و چنچل اور زندگی سے بھرپور لڑکی کو محبت ہوئی بھی تو کس سے۔۔۔ایک ایسے لڑکے سے جو کبھی اپنے خول سے باہر ہی نہیں نکلا۔جس نے کبھی کسی کو اپنے دائروں میں گھسنے ہی نہیں دیا۔۔۔

اس کا قصور بھی تو نہیں تھا محبت چیز ہی ایسی ہے۔انسان کو بے دام کرکے چھوڑتی ہے۔ایسی جگہہ چوٹ لگاتی ہے جہاں ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

وہ بھی مجبور تھی۔سدا کی پر اعتماد اور ہر بات ٹھک منہ پر بول دینے والی کوکب کبیر میں اتنی ہمت نا ہوتی کہ وہ ڈائریکٹ ارحم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولتی کہ ہاں میں تم سے محبت کرتی ہوں ۔۔۔تمہیں چاہتی ہوں

مگر جانے کیوں محبت انسانوں سے قوت گویائی ہی چھین لیتی ہے۔خلوت میں محبوب سے ہزاروں باتیں کرنے والی زبان کو محبوب کے مجسم سامنے آتے ہی تالے لگ جاتے ہیں۔گونگی ہو جاتی ہے۔باقی سب کچھ بول دیتی ہے اظہار نہیں کر پاتی۔۔۔جانے کیوں

کوئی محبت کی رمزوں کو آج تک جان بھی تو نا پایا۔
" تمہاری پہیلیاں ہمیشہ میری سمجھ سے تو باہر ہوتی ہیں۔۔۔" کلاس کی طرف بڑھتے قدموں کے ساتھ ارحم نے اسے کہا۔
" سمجھ جاؤ گے۔۔۔کبھی نا کبھی تو ضرور سمجھو گے۔میں دعا کروں گی یہ کرشمہ بہت جلد ظہور پزیر ہو جائے۔۔۔"

☆......☆......☆

" سلطان آج کچھ پوچھنا ہے مجھے آپ سے۔۔۔اور پلیز جو بھی پوچھوں سچ سچ جواب دیجیئے گا۔۔۔" رات کے کھانے کے بعد بیڈ روم میں آتے ہی فاخرہ نے سلطان کو چونکا دیا
" پہلے کبھی میں نے جھوٹ بولا ہے جو اب بولوں گا۔۔۔؟ تم اچھی طرح جانتی ہو مجھے جھوٹ سے کتنی نفرت ہے۔۔۔" وہ جو کروٹ بدلے جانے کن سوچوں میں گم تھا فاخرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا
" جی ہاں جانتی ہوں۔۔۔اور امید ہے آج بھی آپ سچ ہی بولیں گے۔۔۔" وہ خاصی سنجیدہ تھی
" ایسی کیا بات ہے جو تمہیں مجھ پر شک ہو رہا ہے۔۔۔؟"
" آپ نے کتنی زندگیاں اجاڑی ہیں۔۔۔کتنے انسانوں کو روند کر آپ آج اس مقام پر پہنچے ہیں؟"
لفظ تھے کہ تیر۔۔۔سلطان جو مطمئن انداز میں سویا پڑا تھا اٹھ کر بیڈ کراؤن کی ٹیک لگ بیٹھا
" کیسی باتیں کر رہی ہو فاخرہ۔۔۔کیا ہو گیا ہے تمہیں۔؟"
وہ حیران ہی تو رہ گیا
" مجھے میری باتوں کا سچ سچ جواب چاہیئے سلطان۔۔۔اور بطورِ شریک حیات میں یہ حق رکھتی ہوں آپ پر۔۔۔
بتائیے کتنے لوگوں کی زندگیاں برباد کی ہیں آپ نے۔۔۔اور پاکستان میں چوہدری صاحب کے ساتھ آپ کا کونسا بزنس تھا۔۔۔" انہوں نے متحمل لہجے میں کڑوا ترین سوال کیا
" ہم امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتے تھے مگر اس بزنس کو چھوڑے آج اٹھارہ سال بیت چکے

ہیں ۔۔۔وہ سب ختم ہو چکا ہے۔۔۔" سلطان نے بہت خوبصورتی سے جھوٹ بولا

تھوڑی دیر پہلے جو جھوٹ سے نفرت کر رہا تھا اب خود اسی جھوٹ کا سہارا لے کر اپنا بچاؤ کر رہا تھا ۔ورنہ اگر سچ بول دیتا تو پھر شاید بہت کچھ ہاتھوں سے پھسل بھی جاتا۔

ہم انسان بھی اپنے مفاد کیلئے کیا کچھ نہیں کرتے

"کیا آپ سچ بول رہے ہیں۔۔۔؟ میری آنکھوں میں دیکھ کر جواب دیں۔۔۔" فاخرہ کا لہجہ ابھی بھی کسی جذبات سے عاری تھا

" آف کورس۔۔۔میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا فاخرہ۔۔۔کیا ہو گیا ہے؟" سلطان نے کمال مہارت سے اس کی آنکھوں میں ڈائریکٹ دیکھتے ہوئے جواب دیا۔مگر فاخرہ کے چہرے سے واضح پڑھا جاسکتا تھا کہ وہ مطمئن اب بھی نہیں ہوئی تھی

" ارحم بیٹا۔۔۔ارحم زرا یہاں آنا۔۔۔" فاخرہ نے اونچی آواز میں ساتھ والے کمرے میں موجود ارحم کو آواز لگائی جو دو منٹ بعد وہاں روم میں حاضر ہو گیا

"یسس موم۔۔۔آپ نے بلایا۔۔؟"

"ہاں بیٹا۔۔۔دروازہ اندر سے لاک کر کے یہاں ہمارے ساتھ آ کر بیٹھو۔۔۔"

ارحم نے نا سمجھنے والے انداز میں حکم کی تعمیل کی۔سلطان حیرت سے یہ سب کاروائی دیکھنے لگا

"سلطان۔۔۔یہ ارحم ہماری اولاد۔۔۔اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے قسم کھائیں آپ کہ پاکستان میں آپ چوہدری صاحب کے ساتھ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتے تھے۔۔۔" فاخرہ نے باپ بیٹے دونوں کو چونکا کر ہی تو رکھ دیا تھا

"یہ آج کیسی باتیں کر رہی ہو فاخرہ۔۔۔کیا تم مجھ پر شک کر رہی ہو۔۔۔؟" وہ متزلزل ہونے لگا

"سلطان پلیز۔۔۔میں نے جو پوچھا اسی کا جواب دیں صرف"

سلطان بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھنے سے کترانے لگے ۔ارحم بھی کچھ حیرانگی کے ساتھ موم ڈیڈ کے چہروں کو تکنے لگا

"کیا ہوا ہے موم۔۔۔؟" اب کی بار حیران لہجے میں ارحم نے سوال کیا
اگلے لمحے فاخرہ نے ایک جنبش کے ساتھ خود سلطان کا ہاتھ پکڑ کر ارحم کے سر پر رکھ لیا اور اپنے ہاتھ کی گرفت اوپر سے مضبوط کر لی
"قسم کھائیے سلطان۔۔۔کہ آپ کی پاکستان میں کوئی بیوی نہیں ہے۔۔۔قسم کھائیے کہ آپ کا پاکستان میں کوئی بیٹا نہیں ہے۔۔۔قسم کھائیے کہ آج تک آپ نے ہمیں دھوکے میں نہیں رکھا۔کھائیے قسم کیوں چپ ہیں آپ۔۔۔"
دانت پر دانت جمائے فاخرہ نے اس بار بدلے ہوئے لہجے میں ایک ہی سانس میں اتنے سوال کر ڈالے۔ٹھنڈے مزاج کی حامل فاخرہ کو بیٹے اور شوہر دونوں نے آج سے پہلے کبھی اس لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔سلطان نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں
"فاخرہ۔۔۔تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔۔۔میں تم سب سے بہت محبت کرتا ہوں۔تمہیں کسی نے میرے غلاف ورغلایا ہے۔جھوٹ ہے یہ سب۔۔۔" برسوں سے وہ اسی لمحے سے بچتا آرہا تھا اور وہ لمحہ یوں اچانک اس کے سامنے آ کھڑا ہو گا سلطان نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا
"اگر جھوٹ ہے تو پھر قسم کیوں نہیں کھاتے آپ۔۔۔؟" اس بار فاخرہ نے چیخ کر جواب مانگا۔وہ دیوانی ہونے لگی۔آنکھوں میں آنسوؤں اترنے لگے ضبط ٹوٹ کر آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے بہنے لگا دل میں یقین بھرنے لگا کہ رشید کی ساری باتیں واقعی سچ تھیں
"فاخرہ کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے جو مجھے اپنی صفائی کیلئے قسموں کا سہارا لینا پڑے۔۔۔"
"اسی اعتبار کو بحال رکھنے کیلئے ہی میں آپ سے یہ قسم لے رہی ہوں۔آج آپ کو قسم لینا ہو گی۔دوسری صورت میں میرے ساری باتیں سچ ثابت ہو جائیں گی۔پھر بہت کچھ نہیں رہے گا۔" وہ ابھی تک کسی موجِ دریا کی طرح بپھری ہوئی تھی۔
"ہاں میری تم سے پہلے دو بیویاں تھیں۔ایک بچہ بھی ہے۔
ایک بیوی کو میں نے شادی کے پہلے ہی سال طلاق دے دی تھی۔جبکہ دوسری بیوی پاکستان

میں ابھی تک میرے نکاح میں ہے

ہاں میں دو تین سالت کی غلط دھندوں میں بھی ملوث رہا تھا مگر میں تم سے محبت کرتا تھا اسلیئے میں نے اپنا داغدار ماضی ہمیشہ تم دونوں سے چھپا کر رکھا۔نہیں رہ سکتا تھا تمہارے بغیر اس لیئے جھوٹ بولتا رہا ہمیشہ۔۔۔پیار کرتا تھا تم سے ارحم سے اس لیئے تمہاری شرط مان کر آج تک پاکستان نہیں گیا۔اپنے والدین اپنی بیوی بچے سے ملنے نہیں گیا کیونکہ میں تم سے محبت کرتا تھا۔تمہیں چاہتا تھا۔تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔"

اس بار سلطان نے ترکی بات کی جواب دیا اس کا لہجہ اس کی آواز خود بخود فاخرہ سے بھی اونچی ہو گئی بہت کچھ کھل گیا تھا۔بہت کچھ واضح ہو گیا تھا۔بہت سی باتیں سامنے آ گئی تھیں جن پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا تھا۔

ارحم ہونقوں کی طرح باری باری اپنے والدین کے چہرے تک رہا تھا۔کبھی باپ کے کسی ہارے ہوے جواری کے سے چہرے کو تو کبھی ماں کے سفید پڑتے چہرے کو۔جیسے وہ بہت سی اونچائیوں سے گری ہوں۔جیسے بہت کچھ اچانک ٹوٹ سا گیا یا جیسے بہت کچھ ہاتھ میں آ کر پھسل گیا ہو۔

"جھوٹ بولتے ہو تم۔۔۔ہر سال پاکستان جاتے ہو۔۔۔"

"نہیں فاخرہ جو سچ تھا وہ میں نے سب بتا دیا ہے۔کچھ بھی نہیں چھپایا۔یہ جھوٹ ہے۔یہاں لندن آنے کے بعد سے میں پھر کبھی مڑ کر پاکستان نہیں گیا۔۔۔اور اگر میں نے جھوٹ بولے بھی تھے تو کسی مقصد کیلئے،کسی مصلحت کیلئے۔کیونکہ میں تم سے بے حد محبت کرتا تھا۔تمہیں کبھی بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔۔۔"

"اسے سب کچھ سچ بتانے کے بعد بھی اپنی صفائیاں دینی پڑ رہی تھی۔

"بس کرو اب۔۔۔اور کتنے جھوٹ بولو گے ہم سے۔کاش سلطان تم نے کبھی جھوٹ نا بولے نا بولے ہوتے۔۔۔کاش" فاخرہ نے ہاتھ اٹھا کر سلطان کو مزید بات کرنے سے روک دیا۔سلطان حیران تھا۔جس نے کبھی ساری زندگی آپ کہہ کر بلایا تھا وہی فاخرہ اسے آج تم کہہ کر بلا رہی تھی۔اسے بات کرنے سے روک رہی تھی۔اس سے صفائیاں مانگ رہی تھی۔۔۔

ارحم بھی حیرت زدہ خاموش بیٹھا اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا جو اس وقت کسی جنگل کی سی شیرنی کا روپ

دھارے ہوئے تھیں۔

" اور ہاں ۔۔۔ اگر میرے بغیر نہیں رہ سکتے تھے تو اب عادت رہنے کی ڈال لو۔ کیونکہ میں ایک کریمنل کے ساتھ کبھی نہیں رہ سکتی۔ ایک جھوٹے مکار اور فریبی انسان کے ساتھ نہیں جی سکتی جس نے سالوں تک اپنے مکروہ چہرے پر پردہ ڈالے رکھا۔ نہیں رہنا مجھے ایسے انسان کے ساتھ جس کے ہاتھ معصوم انسانوں کے خون سے رنگے ہوں۔ جو اسلحے اور ہتھیاروں کے دھندے میں ملوث ہو ۔۔۔" اکھڑی سانسوں کے ساتھ وہ بولتی ہی چلی گئی۔ سلطان اور ارحم حیرت زدہ آنکھوں کے ساتھ بپھری ہوئی فاخرہ کا یہ روپ دیکھنے لگے جانے اتنی تلخ باتیں اس نے کس طرح اتنی روانی سے کر دی تھیں۔

"کس نے کہا تمہیں یہ سب؟ جھوٹ کہا ہے تمہیں کسی نے میں اٹھارہ سال سے پاکستان کبھی نہیں گیا۔ اور میں نے غلط دھندے سب چھوڑ دیئے ہیں ۔۔۔ تمہیں بہت بڑی غلط فہمی ہوئی فاخرہ ۔۔۔ پلیز ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔۔" سلطان نے ملتجانہ لہجے میں درخواست کی جانتا تھا اب غصے سے معاملہ مزید بگڑ جائے گا

"بس ۔۔۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔ ایک لفظ بھی نہیں۔ مجھے یقین نہیں تھا۔ مگر تمہارے منہ سے اعتراف سن کر ہر بات کا یقین ہو گیا ہے ۔۔۔ تم ایک غنڈے ہو ۔۔۔ اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں ۔۔۔

ہم نے اپنے رشتے کی بنیاد سچ اور اعتبار پر رکھی تھی۔ مگر تم نے اس بنیاد میں جھوٹ کی لا تعداد اینٹیں لگائی ہیں۔ اس جھوٹ اور فریب پر کھڑی کی گئی عمارت میں میں اب ایک منٹ بھی مزید تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔

ہاں جا رہی ہوں میں آج ۔۔۔ ہمیشہ کیلئے ۔۔۔ آج سے ہمارا سفر یہیں پر ختم ۔۔۔ تمہیں خلع کا نوٹس بہت جلد مل جائے گا ۔۔۔ اور ہاں میرے پیچھے پلٹنے کی یا مجھے منانے کی کوئی بھی فضول خواہش مت رکھنا۔ کیونکہ میں پیچھے پلٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی

" ایسے کیسے کر سکتی ہو تم

فاخرہ۔ تم ہمیں چھوڑ کے کیسے جا سکتی ہو ۔۔۔؟" سلطان اور ارحم بھی اس کے ساتھ کھڑے ہو گئے

" جیسے تم ہمیں سالوں تک دھوکے میں رکھ سکتے ہو۔ویسے ہی میں تمہیں چھوڑ رہی ہوں۔۔۔اب ایک بھی لفظ نہیں۔۔۔بہت جلد ڈائیورس نوٹس پہنچ جائیں گے" اس نے انگلی اٹھا کر سلطان کو وارننگ دی

" موم یہ کیا کر رہی ہیں آپ

۔کہاں جا رہی ہیں آپ ہم سب کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی پلیز موم۔۔۔" دروازہ عبور کرنے سے پہلے ارحم نے دوڑ کر ماں کا راستہ روکا

" میرا راستہ مت روکو ارحم۔میرے قدموں کو کمزور نا کرو۔۔۔میں اپنے پیرنٹس کے گھر جا رہی ہوں ہمیشہ کیلیئے۔۔۔اور آپ سے میں بعد میں ملوں گی۔۔۔اپنا خیال رکھنا۔۔۔اللہ حافظ۔۔"

فاخرہ نے دروازہ عبور کر لیا۔وہ دونوں ششش وپنج میں حیرت سے کھڑے اسے دروازہ عبور کرتے دیکھتے رہ گئے۔۔۔اسے لگا جیسے زمین نے ان کے قدموں کو جکڑ لیا ہو۔۔۔سلطان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ فاخرہ سچ میں اسے ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔جس دن سے وہ چھپتا پھرتا تھا وہ دن آ گیا تھا اس کا سب کچھ بہا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا اور سلطان کچھ بھی نا کر سکا۔۔۔

وہ وہیں پڑی سوچنے لگا کہ شاید اس کے ساتھ زندگی نے دو دو ہاتھ کرنے شروع کر دیئے ہیں۔۔۔کچھ لوگوں کے جو اس پر قرض تھے وہ زندگی نے سود سمیت وصولی کا فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔

☆......☆......☆

سولہواں حصہ

فاخرہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے واپس اپنے پیرینٹس کے گھر آگئی۔اس نے والدین سے کچھ بھی نہیں چھپایا سب کچھ سچ سچ من وعن بیان کر دیا۔اس کے والدین نے فاخرہ کے اس فیصلے پر چپ سادھ لی جانے وہ دل سے خوش تھے یا نہیں مگر انہوں نے بیٹی کو نہیں ٹوکا کہ فاخرہ تم نے اتنا بڑا اقدم جو اٹھایا ہے یہ صحیح بھی ہے یا غلط۔یا کل کو اگر ہم بھی نا رہے تو تم کیا کرو گی کس کے پاس جاؤ گی کس کے ساتھ رہو گی۔۔۔؟؟؟

دل سے خوش تو وہ لوگ شروع سے بھی نہیں تھے مگر لاڈلی بیٹی کی ضد کے سامنے ان کا انکار زیادہ دیر تک نہیں پایا تھا۔جوان جہان بیٹی کی خواہش انہوں نے یہ سوچ کر پوری کر دی کہ ہوسکتا ہے کل کو وہ اپنے ماں باپ کے خلاف جا کر بھی اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہے تو بہتر ہے کہ ابھی سے ہی اس کی رضا مندی سے اس کا رشتہ طے کر دیا جائے۔۔۔

اب جو فاخرہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے واپس اپنے ماں باپ کے در پر آئی تو انہوں نے بس ایک چپ سادھ لی۔جیسے وہ خاموش پیغام فاخرہ کو دے رہے ہوں کہ دیکھو ماں باپ کی سوچ اولاد کیلئے ہمیشہ سود مند ثابت ہوتی ہے۔وقتی جذبے اور پسند کی وجہ سے ماں باپ کے خلاف جانے والے لوگ زیادہ دیر خوش نہیں رہ پاتے۔

مگر فاخرہ کے اپنے گھر میں کچھ بھی اپنی جگہہ نہیں رہا تھا۔تین دن میں ان کا گھر ارحم اور سلطان کو ویرانیوں کا گھاٹ لگنے لگا۔فاخرہ کے بعد انہیں اپنا گھر اب گھر ہی نہیں لگتا تھا۔سو ارحم سے نا رہا گیا تو وہ سیدھا ماں کے پاس پہنچ گیا۔۔۔

"موم آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں۔۔۔؟ آپ کا فیصلہ بالکل غلط ہے۔۔۔" تیسرے دن ارحم ماں

کے پاس آگیا۔تین دن میں ان کی روزمرہ زندگی اپنے ٹریک سے اتر گئی۔جیسے ان سب کے بیچ میں ایک خلاء سا آگیا ہو

"ارحم بیٹا آپ ابھی نہیں سمجھو گے۔۔۔میں نے جو فیصلہ کیا ہے بالکل ٹھیک کیا ہے" فاخرہ اپنی ضد پر قائم رہیں۔۔۔بیٹے کا اداس چہرہ بھی اس کے ارادوں میں رکاوٹ نہیں ڈال سکا

"میں سب سمجھتا ہوں موم۔میں بچہ نہیں ہوں۔اگر بالفرض یہ سب سچ بھی ہے۔مطلب اگر ڈیڈ ان سب سرگرمیوں میں ملوث بھی تھے تو وہ ان کا ماضی تھا وہ سب کچھ چھوڑ چکے ہیں۔۔۔اب تو وہ سیدھے راستے پر آچکے تھے تو اب ان کو سزا کیوں دے رہی ہیں آپ۔۔۔؟"

"بیٹا انہوں نے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔۔۔وہ ابھی بھی ان سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔چاہیئے تو یہ تھا کہ میں انہیں اریسٹ کروا دیتی مگر مجبور ہوں اسلیئے صرف خود کو ان سے الگ کر رہی ہوں۔۔۔"

"آپ ایسا کیسے کر سکتی ہیں موم۔۔۔آپ ہم سب کو کیسے چھوڑ سکتی ہیں بھلا۔۔۔ایک لمحے میں ہی آپ نے سب کچھ ختم کر دیا ایک لمحے میں ہی ہمیں چھوڑ کے چلی آئیں۔ایک جھٹکے میں ہی سب کچھ ختم کر دیا۔کیوں موم۔۔؟؟" وہ جھنجھلا اٹھا

"ارحم بیٹا۔۔۔انسان کو توڑنے کیلئے ایک لمحہ ہی کافی ثابت ہوتا ہے۔وہ لمحہ جس میں اس کے اعتبار کا خون ہوتا ہے۔جس میں اس کی آنکھوں پر بندھی اعتبار کی پٹی کھلتی ہے۔وہ ایک لمحہ جب اس کا دل ٹوٹتا ہے۔بس اسی ایک لمحے میں ساری امیدیں ایک ایک کر کے دم توڑ دیتی ہیں۔اور میں نے تو یہ فیصلہ ایک لمحے میں نہیں کیا بہت کچھ سوچ بچار کے بعد اتنا بڑا اور مشکل قدم اٹھایا ہے۔میں اپنی زندگی میں باقی سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں جھوٹ، فریب، دھوکہ ہرگز نہیں۔یہ بات سلطان اچھی طرح جانتے ہیں میں نے سلطان سے ہمارے رشتے کے ابتدائی دن ہی یہ عہد لیا تھا۔مگر پھر بھی اس نے ہمارے اعتبار کا خون کیا۔میرے ساتھ فریب کیا۔اور سالوں تک ہمیں دھوکے میں رکھے رکھا

اور میں صرف سلطان سے خلع لے رہی ہوں۔۔۔آپ یہاں رہو گے میرے ساتھ۔۔۔میں نہیں چاہتی کہ میرا بیٹا ایسے شخص کے ساتھ رہے جس کے ہاتھوں پر معصوم لوگوں کا خون لگا ہو۔۔۔"

اس نے دانت پیستے ہوئے کہا ارحم نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیئے آنکھیں زور سے بند کر لی

"نہیں موم ۔۔۔ اگر میں نے بھی ڈیڈ کو چھوڑ دیا تو وہ بالکل ٹوٹ جائیں گے اکیلے پڑ جائیں گے ۔۔۔ آپ کے ساتھ تو پھر بھی آپ کے پیرنٹس ہیں مگر ڈیڈ بالکل اکیلے ہو جائیں گے میں کیسے انہیں چھوڑ سکتا ہوں بھلا ۔۔" ارحم نے صاف انکار کر دیا

"تو کیا آپ ایسے شخص کے ساتھ رہو گے جس نے اٹھارہ سال تک مسلسل ہمارے اعتبار کا خون کیا ہے ۔۔۔ ہم سب سے جھوٹ بولا ہم سب کو دھوکے میں رکھا ۔۔۔ ایسے شخص کے ساتھ آپ کیسے رہ سکتے ہو بیٹا ۔۔۔؟" وہ چیخنے پر آ گئیں

"موم کیا ہو گیا ہے وہ شخص میرے ڈیڈ ہیں ۔۔۔ اور ہم پہلے بھی تو رہ رہے تھے نا ۔۔۔ تو اب بھی وہی زندگی ہے ہم سب رہ لیں گے مل کے ۔ آپ بھی اپنا فیصلہ واپس لیں اور پلیز گھر آ جائیں موم ۔۔۔"

"ہرگز نہیں ۔۔۔ پہلے میں بے خبر تھی ۔۔۔ انجان تھی ۔ اب نہیں ۔۔۔ میں نے سوچ لیا ہے ۔ میں ایسے شخص کے ساتھ ایک دن بھی مزید نہیں گزاروں گی ۔ ڈائیورس نوٹس دو تین دن تک مل جائیں گے سلطان کو ۔۔۔"

وہ ہکا بکا ماں کا چہرہ دیکھنے لگا ۔۔۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو موم ۔۔۔؟ آپ اتنی بے رحم تو نہیں تھی پہلے ۔۔۔ آپ تو بہت نرم دل اور شفیق تھیں ۔۔۔"

"جب انسان کے اعتبار کا خون کوئی ایسا شخص کرے جس پر اس کو سب سے زیادہ بھروسہ ہو جو اس کو سب سے زیادہ پیارا ہو تو دل ٹوٹ جاتے ہیں ۔۔۔ پھر ایسا ہی ہوتا ہے دل پتھر ہو ہی جاتا ہے ۔۔۔ میں اپنا فیصلہ اب کبھی واپس نہیں لوں گی ۔۔۔ میں چاہتی ہوں بیٹا آپ بھی واپس آ جائیں یہاں میرے پاس ۔۔۔ میں خلع کے بعد عدالت میں پراپرٹی کیلئے بھی کیس کروں گی اگر اس نے پس و پیش کی تو ۔۔۔"

"بالکل بھی نہیں موم ۔۔۔ آپ ایسا کچھ بھی نہیں کریں گی ۔ میں پہلے ہی آپ کے فیصلے سے بہت اپ سیٹ ہوں ۔۔۔" وہ اپنی ماں کے عزم کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا

" کیوں نہیں۔۔۔میں کیس کروں گی۔کل کو سلطان نے سب کچھ اپنی پہلی بیوی اور بچے کے نام لکھ دیا تو تمہارا کیا ہوگا۔۔؟

میں جو کچھ کر رہی ہوں یا کرنے جا رہی ہوں یہ سب آپ کے لیئے ہی تو کر رہی ہوں۔ارحم بیٹا صرف آپ کے فیوچر کے لیے"

"مگر مجھے نہیں چاہیے۔کچھ بھی نہیں چاہیئے۔۔میں ایسے فیوچر کا کیا کروں گا جب منزل پر پہنچنے کے بعد میرے پاس میرا اپنا کوئی بھی نہیں ہوگا۔مجھے ایسا فیوچر بالکل نہیں چاہیے۔اور آپ پراپرٹی کیلئے کوئی کیس نہیں کریں گی۔۔۔اگر آپ نے ایسا کچھ بھی کیا تو میں کبھی آپ سے بات نہیں کروں گا۔۔"

" بیٹا آپ سمجھتے کیوں نہیں ہو۔۔۔یہ سب کچھ میں اپنے لیئے نہیں کر رہی۔یہ سب صرف آپ کیلئے کر رہی ہوں۔۔۔کل کو یہ سب سلطان نے بٹوارہ کر دینا ہے۔۔"

" امی مجھے کچھ بھی نہیں چاہیئے۔نا زمین جائیداد نا دولت پیسہ۔۔۔کچھ بھی نہیں۔مجھے صرف آپ دونوں کی ضرورت ہے۔آپ دونوں کے ہمیشہ ساتھ کی ضرورت ہے۔مجھے اپنی وہ فیملی چاہیئے جو کچھ دن پہلے تک تھی بس اور کچھ بھی نہیں بس

ڈیڈ جو بھی کریں گے مجھے منظور ہوگا۔۔ابھی وہ اس قدر اکیلے پڑ گئے ہیں کہ انہیں کسی چیز کا ہوش تک نہیں۔میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے انہیں مزید تکلیف کا سامنا ہو۔"

"ٹھیک ہے اتنا ہی خیال ہے تو جاؤ اور جا کے سنبھالو اپنے ڈیڈ کو۔۔۔مگر یاد رکھنا میں بھی آپ کی ماں ہوں میں نے جنم دیا ہے آپ کو۔۔"

" آپ ایسی باتیں کیوں کرنے لگی ہیں۔۔۔میں نے اس بات سے کب انکار کیا۔یا میں نے کب آپکا دل دکھایا۔؟؟؟" ارحم روہانسا ہو گیا

" تو یہ اور کیا ہے بیٹا۔۔۔میں آپ کے فیوچر کیلئے سب کچھ کر رہی ہوں۔اور آپ مجھے ہی غلط سمجھ کر روکنے کی کوشش کر رہے ہو۔مجھ سے ناطہ توڑنے کی بات کر رہے ہو۔۔۔"

" موم آپ کا فیصلہ شاید ٹھیک ہو۔۔لیکن ابھی اس فیصلے کا وقت ٹھیک نہیں ہے۔ڈیڈ کا سب کچھ

ہمارا ہی تو ہے ۔۔ابھی وہ بہت پریشان ہیں ۔۔۔آپ پلیز زز سمجھنے کی کوشش کریں ۔۔۔یہ کام کچھ عرصے کیلئے ٹال دیں ۔۔۔پلیز موم میری خاطر آپ اتنا تو کر سکتی ہیں نا۔۔۔؟؟؟"

"ٹھیک ہے ارحم ۔۔۔میں کچھ ماہ تک رک جاتی ہوں ۔۔۔صرف آپ کے لیے ۔۔۔ورنہ اب اس شخص سے میرا اعتبار ہمیشہ کیلئے اٹھ چکا ہے ۔۔۔یہ کام میں طلاق کے بعد عدت ختم ہونے پر کروں گی"

ارحم نے لمبی سانس ہوا میں خارج کرتے ہوئے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔۔چلو کچھ عرصہ تو سکون سے گزر جائے گا۔اور وہ اپنی ماں کی سوچ پر حیران بھی تھا۔چند دنوں میں ہی مام کتنی بدل گئی تھیں

وہ حیران نظروں سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ارحم جو سوچ کے آیا تھا کہ آج ماں کو منا کر ہی ساتھ جائے گا ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔اس کی ہزار کوششوں کے بعد بھی فاخرہ اپنے فیصلے سے ایک قدم پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہوئیں ۔۔۔مایوس دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ وہ وہاں سے واپس اپنے گھر آ گیا

اور سلطان ۔۔۔اس کی حالت سے صرف وہی خود واقف تھا۔

کبھی کبھی انسان زندگی میں اپنے ضمیر کی سنے بغیر دوسروں کے احساسات کو روندتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کی سپیڈ کو بریک تب جا کر لگتی ہے جب تک کوئی بڑا حادثہ پیش نہیں آتا۔جب تک خود اس پر نہیں گزرتی وہ نہیں جان پاتا کہ جب میں نے کسی بے بس انسان کے ساتھ ناانصافی کی تھی اس کے دل پر کیا گزری ہوگی۔۔۔؟

آج جب سلطان کو فاخرہ کی طرف سے خلع کا عدالتی نوٹس موصول ہوا اسے سب کچھ یاد آنے لگا ۔۔۔بہت سی پرانی باتیں ۔۔۔ماضی کھلنے لگا اس کا ماضی اس کے سامنے ایسے آ کھڑا ہوا جیسے وہ کوئی فلم دیکھ رہا ہو۔۔۔باری باری تمام مناظر ذہن کے پردے پر چلنے لگے۔۔۔

اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ عدالتی نوٹس پر دستخط کرتے ہوئے اپنے اندر کیا محسوس کر رہا ہے ۔بجھے بجھے دل اور زندگی سے تھکے ہارے ٹوٹے ہوئے انسان کی طرح جب اس نے دستخط کیئے اٹھارہ سال پہلے کا ایک چہرہ اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔۔۔نوری ۔۔۔جسے سلطان نے بے قصور طلاق دے دی تھی یہ سوچے بغیر کہ اس کے دل پر کیا گزرے گی۔۔۔

یہ سوچے بغیر کہ وہ گاؤں والوں کو کیا منہ دکھائے گی جب اس کے کردار پر لوگ کیچڑ اچھالیں گے۔۔۔یہ سوچے بغیر کہ ایک بے قصور لڑکی اب معاشرے میں طلاق کا لیبل پیشانی پر لگوا کر کس طرح اسی معاشرے میں زندگی گزارے گی۔۔۔لیکن اس وقت سلطان کو اگر کچھ یاد تھا تو صرف اپنی انا۔۔۔اسے یہ بات ہضم ہی نا ہو رہی تھی کہ اس کے ابا دین محمد نور بانو کیلئے اسے گھر سے نکال دے گا۔۔۔

سلطان نے طلاق کے کاغذات پر دستخط کر دیئے۔۔۔وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگا اس ایک ہفتے نے ہی اس کی ساری توانائی نچوڑ لی تھی۔۔۔

فاخرہ کے بغیر اس کو ایک ہفتہ بھی سالوں کے پیدل سفر سے زیادہ تھکان والا محسوس ہوا تھا۔گھر، در و دیوار اسے کاٹ کھانے کو دوڑتے تھے۔ساری ساری رات کروٹیں بدلتے گزر جاتی۔نینداس کی پہنچ سے بہت دور جا کر اس کی شب خوابی کا تماشہ دیکھتی رہتی۔غرض کچھ بھی اپنی جگہہ نہیں رہا تھا۔

بیڈ کراؤن کی ٹیک لگ کر بیٹھا تو اسے احساس ہوا کوئی اپنا چھوڑ جائے تو کتنا دکھ ہوتا ہے انسان اپنی چاہ کے ہاتھوں مارکھا جائے تو کتنا بے بس ہو جاتا ہے اسے آج سب کچھ سمجھ آ گیا۔۔۔

فاخرہ بھی تو اس کی چاہ تھی۔۔۔اس کی محبت۔۔۔جس کیلئے سلطان نے پاکستان کو بھلا دیا۔ملوکھاں کو بھلا دیا اپنے نوزائیدہ بچے کو بھلا دیا جس کے نام سے بھی وہ واقف نہیں تھا۔۔۔مگر آج اسی محبت نے سلطان کو چاروں شانے چت کر دیا تھا۔۔۔

اسے احساس ہونے لگا کہ ملوکھاں نے اس کے لیئے کتنی تکلیفیں اٹھائی ہوں گی، کس قدر دکھ جھیلے ہوں گے۔۔۔کتنے لوگوں کی چہ میگوئیاں برداشت کی ہوں گی کہ آخر اس میں ایسا کون سا عیب تھا جو سلطان ملوکھاں کو اس حالت میں چھوڑ کر گیا اور پھر کبھی مڑ کر ہی نا آیا۔۔۔

کیونکہ ہمارے معاشرے میں اکثر بے قصور ہوتے ہوئے بھی رسوائیاں عورت کا مقدر ہی ٹھہرتی ہیں۔مرد قصوروار ہوتے ہوئے بھی کئی بار بے قصور قرار دیئے جاتے ہیں کیونکہ وہ "مرد" ہوتے ہیں عورت کے حصے میں اس کے قصور کی سزا اس لیئے لکھی جاتی ہے کیونکہ وہ "عورت" ہوتی ہے۔

اسے سب کچھ یاد آنے لگا۔اپنی اماں بختاور، اپنا ابا دین محمد۔۔۔اپنا بچہ جسے وہ دیکھ بھی نہیں پایا

تھا، ملوکھاں جو اس کے نام پر فدا تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو شاید وہ سلطان کے نام پر بکنے پر بھی خوشی سے تیار ہو جاتی۔۔۔

آنکھوں کے کناروں سے کتنے آنسوؤں قطار باندھے ایک دوسرے کے پیچھے اس کی گردن تک آ پہنچے تھے۔۔۔

"ڈیڈ۔۔۔خود کو مضبوط کریں آپ۔۔۔میں آپ کا دکھ سمجھ سکتا ہوں۔۔۔پر مجھ سے آپ کی یہ حالت نہیں دیکھی جا رہی۔۔۔" ارحم اس وقت اندر کمرے میں داخل ہوا تو سامنے بیڈ پر اپنے باپ کو نیم سوئے ہوئے دیکھا جس نے اپنی نظریں چھت پر گاڑ رکھی تھیں۔ آنسوؤں گالوں پر بہتے ہوئے گردن تک آ پہنچے تھے۔ وہ خدا جانے کن خیالوں میں گم تھے کہ ان کو ارحم کی کمرے میں آمد کا بھی پتا نہیں چلا۔۔۔تو دو منٹ دروازے پر رکنے کے بعد وہ ان کے قریب آتے ہوئے بولا۔۔۔

سلطان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی نا ہی اس نے بیٹے کی بات کا جواب دیا۔۔۔

شاید اس نے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ وہ تو اپنے ماضی کی انگلی پکڑے کہیں دور دیس پہنچا ہوا تھا پاکستان میں اپنے پیاروں کے پاس۔

"ڈیڈ۔۔۔آپ کہاں کھوئے ہیں کیوں رو رہے ہیں آپ۔۔۔؟" اس بار ارحم نے باپ کا بازو ہلا کر پوچھا تو وہ چونک گئے۔۔۔ماضی کی چلتی فلم کے مناظر یکدم رک سے گئے۔۔۔وہ خالی خالی نظروں سے بیٹے کو دیکھنے لگا ایسے جیسے وہ اپنے بیٹے کو پہچانتا ہی نا ہو اسے پہلی بار دیکھ رہا ہو بالکل اجنبی نظروں سے۔۔۔ارحم کے دل میں گھبراہٹ ہونے لگی

"ڈیڈ۔۔۔کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔۔؟ آپ کی طبیعت ٹھیک تو ہے نا۔۔۔؟ ڈیڈ میں ارحم ہوں آپ کا بیٹا ارحم۔۔۔" اس نے باپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے چہرے پر لگاتے ہوئے کہا

"جی۔۔۔ہاں بیٹا میں ٹھیک ہوں۔۔۔بالکل ٹھیک۔۔۔بس جانے کس طرح پیچھے چلا گیا تھا بہت پیچھے۔۔۔" سلطان حال میں واپس آیا تو کھوئے کھوئے لہجے میں اس نے بیٹے کو تسلی دی۔۔۔

"ڈیڈ۔۔۔آپ خود کو سنبھالیں پلیز۔۔۔مجھ سے آپ کی یہ حالت نہیں دیکھی جا رہی۔۔"

" بیٹا میں ٹھیک ہوں ۔۔۔ بالکل ٹھیک ہوں ۔۔۔ آپ میری فکر نا کرو بیٹا ۔۔۔"

" کیسے فکر نا کروں ۔۔۔ آپ نے ایک ہفتے سے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا ۔۔۔ اس ایک ہفتے میں آپ ایک بار بھی سٹور پر نہیں گئے ۔۔۔ اپنا حلیہ دیکھیں ڈیڈ ۔۔۔"

" بیٹا کچھ وقت تو لگے گا نا مجھے اپنی زندگی میں دوبارہ واپس آتے ہوئے ۔۔۔ اور آپ فکر نا کرو میں ٹھیک ہوں کچھ نہیں ہوا حلیے کو ۔۔۔" سلطان نے ایک لمبی سانس ہوا میں خارج کرتے ہوئے اپنے سینے کا بوجھ کم کرنا چاہا ۔۔۔ بہت لمبی تھکن تھی ۔ اتنی آسانی سے کہاں ختم ہوتی

" کیسے فکر نا کروں ڈیڈ ۔۔۔ آپ نے ایک ہفتے سے شیو نہیں بنائی ۔۔۔ اور یہ کپڑے دیکھیں کتنے میلے ہو رہے ہیں ۔ اپنے اپ کو دیکھیں کتنے کمزور ہو گئے ہیں آپ ۔۔۔ آپ اٹھیں جلدی سے باتھ لے کے چینج کریں فریش ہو جائیں پہلے ۔۔۔"

" ارحم بیٹا ۔۔۔ جب چوٹ اندر دل پر جا کے لگے تو باہر مرہم لگانے سے زخم کبھی نہیں بھرتے ۔ اور پھر یہ تو چوٹ بھی نہیں ہے ۔ یہ تو بدل ہے ان سب عنایات کا جو میں نے اپنی ذات سے خود سے جڑے رشتوں پر کی تھی ۔۔۔ اور بیٹا یہ سب ہونا ہی تھا ایک نا ایک دن ۔۔۔ میں جب چھوٹا تھا نا میرے ابا کہتے تھے کہ سلطان پتر ۔۔۔ جب انسان کسی کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے کسی کا دل دکھاتا ہے یا کسی بے بس و لاچار کی بے بسی کا فائدہ اٹھاتا ہے تو اس بے بس انسان کا بدلہ اللہ تعالیٰ خود لیتے ہیں آخرت میں ۔۔۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے ۔ مگر کچھ لوگوں کا وہ دنیا میں ہی حساب شروع کر دیتا ہے ۔ مجھے لگتا ہے میرا حساب شروع ہو گیا ہے ۔۔۔" سلطان نے دیوار پر نظریں جمائے بیٹے کو ایک پرانی بات بتائی اپنے ابا دین محمد کی بات جو برسوں پہلے ایک دن دین محمد نے سلطان کو سمجھائی تھی ۔ اس کی نظریں ابھی تک دیوار پر گڑی تھی ۔ جیسے دیوار پر اس کے ابا کا چہرہ ابھر آیا ہو جیسے اس کے ابا اس کے سامنے بیٹھے بول رہے ہوں دیکھا سلطان میں نے سچ کہا تھا نا ۔؟ ارحم حیرانگی سے اپنے باپ کے کھوئے کھوئے لہجے اور نظروں کو دیکھنے لگا ۔ اور وہ باپ کی نظروں کے تعاقب میں دیوار کی طرف بھی دیکھنے لگا مگر اسے دیوار پر کچھ بھی غیر معمولی نظر نہیں آیا تو وہ دوبارہ باپ کے تھکے تھکے لاغر چہرے کو تکنے لگا ۔ کس قدر تکلیف دہ مرحلہ تھا اس کیلئے باپ کو اس حالت میں دیکھنا ۔

آج سے پہلے اس نے اپنے باپ کو اس قدر کمزور کبھی نہیں دیکھا تھا

☆......☆......☆

"ہاں خوشی پتر۔۔۔میں مجرم ہوں تمہارا۔۔۔قرضدار ہوں تمہارا۔اور ہاں سارا قصور میرا تھا۔۔میں نے ہار مان لی ہے۔اب میں تمہیں لینے آیا ہوں اور لے کے ہی جاؤں گا۔۔۔" نور بانو نے کسی طریقے اپنے ماموں تک پیغام بجھوا دیا تھا کہ وہ لوگ ایک بار اور کوشش کریں امید ہے اس بار خوشی مان جائے گا۔اور دین محمد آج صبح صبح ہی بختاور کو لے کر آگیا تھا۔۔۔انہیں آئے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے اور پچھلے دو گھنٹوں سے وہ دونوں میاں بیوی اور نانی تاج خوش بخت کو منانے میں لگے ہوئے تھے۔

"کیسے چلا جاؤں آپ کے ساتھ اور کیوں چلا جاؤں۔۔۔میں جب سے بڑا ہوا اسی گھر میں آنکھ کھولی۔بوڑھی نانی تاج کو اکلوتا رشتہ سمجھ کر بیس سال گزار دیئے۔دادا دادی کے ہوتے ہوئے بھی میں اپنے سگے رشتوں سے محروم رہا۔۔۔جانتے ہیں آپ کس طرح گزارے ہیں میں نے اتنے سال۔۔۔؟ جانتے ہیں آپ کسی گلی، بازار میں اچانک آپ سے سامنا ہو جاتا تو آپ کس طرح دوسری طرف منہ پھیر کے چل دیتے۔۔جانتے ہیں آپ مجھے اس وقت کتنا دکھ ہوتا۔۔۔؟

مجھ سے لوگ پوچھتے تھے، دوست سوال کرتے تھے کہ کیا تم ان کا خون نہیں ہو جو تمہاری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔۔۔؟

میرے پاس ان کے سوالوں کے جواب نہیں تھے۔میں بھی یہی سوچتا تھا کہ شاید لوگ سچ کہتے ہیں میں واقعی آپ کا سگا نہیں ہوں۔آپ کا خون نہیں ہوں۔

آپ کا خون ہوتا تو کبھی آپ میرے ساتھ یہ سلوک نا کرتے۔

سب کے اپنے رشتے ہوتے ہیں سگے ہوتے ہیں انکا فخر ہوتے ہیں ان کے لیئے ستون ہوتے ہیں۔مگر میرے لیئے ایسا کچھ نہیں تھا۔میرے اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی میں وہ فخر کبھی حاصل نہیں کر پایا جو دوسروں کو ہوتا ہے۔۔۔

اور اب جب میں نے اپنی محرومیوں کے بغیر رہنا سیکھ لیا ہے اب آپ کو میں یاد آگیا آپ کا ایک

پوتا بھی ہے؟؟؟"

خوشی بولنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا۔ جملے کی ادائیگی کے آخر میں اس کا لہجہ بھیگنے لگا آنکھیں بھر آئیں ۔۔۔ دین محمد بھرے دل کے ساتھ اپنے جوان ہوتے پوتے کو دیکھ رہے تھے۔ جس میں اسے اپنے بیٹے سلطان کی شبیہہ نظر آ رہی تھی

" خوشی یہ دیکھو میں نے ہاتھ بھی باندھ لیئے ۔۔۔ میرے بوڑھے ہاتھوں کو دیکھ لو ۔۔۔ میں سارے جرم اپنے ذمے لیتا ہوں ساری غلطی میری ہی ہے۔ بس مجھے معاف کر دو خوشی اور گھر آ جاؤ اب ۔۔۔ تمہارے سارے شکوے ساری باتیں بجا ہیں ۔۔۔ میں ہر بات کا اقرار کرتا ہوں ہر غلطی کا اعتراف کرتا ہوں اور میرے پاس سوائے معافی مانگنے کے اور کوئی جواب نہیں ہے ۔۔۔ یہ لو ایک بار پھر میں معافی مانگ لیتا ہوں ۔۔۔" دین محمد نے روتے ہوئے۔ ایک بار پھر ہاتھ باندھ لیئے ۔۔۔

" مجھے آپ سے معافی منگوانا مقصود نہیں تھا۔ مجھے صرف ایک سوال کا جواب دے دیں ۔۔۔ باقی ساری باتیں یہیں ختم ہو جائیں گی ۔۔۔ میں آپ کے ساتھ بخوشی جانے پر رضامند ہو جاوں گا۔

مجھے کس لیئے بے جرم سزا دی گئی کیا صرف اس لیئے کہ میں سلطان کا بیٹا تھا۔ یا پھر میرا کوئی قصور تھا تو وہ بھی بتا دیں مجھے ۔۔۔؟"

اس نے آخری سوال کیا

" ہاں کیونکہ تم سلطان اور ملوکھاں کے بیٹے تھے اور سلطان نے مجھے بہت دکھ پہنچائے ہیں خوشی ۔۔۔ مگر تم کچھ نہیں جانتے کاش تم سمجھ پاتے ۔۔۔" دین محمد نے ہوا میں ایک آہ چھوڑتے ہوئے جواب دیا

" تو کیا باپ کے کیئے کی سزا بیٹے کے حصے میں لکھی جاتی ہے۔؟"

" خوشی ان باتوں کو یہیں رہنے دو۔ یہ سب کچھ میں دفن کر چکا ہوں میں نہیں چاہتا پھر سے وہ ساری باتیں دہرائی جائیں اور پھر سے میرے بوڑھے سینے کے چاک ادھڑنے لگیں۔ مجھ میں اب سہنے کی طاقت نہیں ہے۔"

" خوشی اب مان جاؤ پتر ۔۔۔ بس کرو اب ۔۔۔ ہم بہت کمزور ہو چکے ہیں۔ اب گھر چلو ۔۔۔" اس

بار بختاور نے دہائی دی
خوشی کا دل پگھلنے لگا۔اس میں اپنے دادا دادی کے آنسو دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔
"بس اب مان جاؤ خوشی۔۔۔بھلا دو سب کچھ۔جو نصیب میں لکھا تھا وہ ہو چکا۔اب دل بڑا کرو اور معاف کر دو دادا دادی کو۔بوڑھے ہیں انہیں تمہاری ضرورت ہے اور تمہیں ان کی۔میرا تو کچھ بھی بھروسہ نہیں ہے آج ہوں کل نہیں۔تم اپنے دادا دادی کے پاس چلے جاؤ گے تو مجھے سکون مل جائے گا اپنی امانت میں سرخرو ہو جاؤں گی" نانی تاج بھی پیار سے خوشی کو سمجھانے لگیں
"میں ناراض نہیں ہوں آپ لوگوں سے۔لیکن میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔۔۔گھر میرا یہی ہے مجھے یہیں رہنا ہے نانی کے ساتھ ہمیشہ۔۔۔"
"خوشی ہم لوگ نہیں ہیں تمہارے دادا دادی ہیں ہمیں انہی رشتوں سے پکارو گے تو اور زیادہ خوشی ہوگی مجھے۔۔۔اور اس بار میں پکا انتظام کر کے آیا تھا۔تمہارے ساتھ ساتھ بوا تاج بھی وہیں چلے گی ہمارے گھر۔اب ان کے کام کرنے کی عمر نہیں ہے۔۔۔وہیں رہے گی ہمارے ساتھ سکون سے۔۔۔" دین محمد نے مسکراتے ہوئے سرپرائز دیا گویا خوشی کے آخری بہانے کا حل بھی نکال دیا
"دین محمد۔۔۔میں بوڑھی یہیں ٹھیک ہوں۔۔۔بس جو گنے چنے دن باقی ہیں اسی اپنے گھر میں گزاروں گی۔تم دونوں خوشی کو لے جاؤ۔۔۔تمہارا خون ہے۔میرے پاس تو صرف امانت تھا۔۔۔"
"نہیں بی بی۔۔۔اب مزید ایک دن بھی نہیں۔۔۔آپ بھی چل رہی ہیں ہمارے ساتھ۔اور آپ کا انکار نہیں چلنے والا اب۔ہم آپ کو اس اکیلے گھر میں نہیں رہنے دیں گے۔آپ کو چلنا ہے ہمارے ساتھ۔اور کوئی راستہ نہیں ہے آپ کے پاس بس۔۔۔"
بختاور نے بوا تاج کے ساتھ لاڈ کیا۔۔۔
تھوڑی سی پس و پیش کے نانی تاج بھی رضامند ہو گئیں۔
خوشی نے بھی اپنے شانے گرا دیئے۔مان گیا۔اس نے ہار مان لی۔تینوں بزرگ جیت گئے
"اپنے دادا کے گلے نہیں لگو گے خوشی۔۔۔؟" دین محمد نے بانہیں پھیلا دی

خوشی اٹھ کر ان کے سینے سے جا لگا۔۔۔دین محمد کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔اس بار اس نے اپنے سفید سلوٹوں بھرے صافے سے آنکھیں صاف بھی نہیں کی خوشی کے آنسوؤں تھے سو کھل کر بہنے دیا۔۔۔برسوں بعد کلیجے میں ٹھنڈک اتری تھی۔دین محمد کو ایسے لگا جیسے آج ان کے گلے خوش بخت نہیں ان کا اپنا بیٹا سلطان لگا ہو۔۔۔

خوشیاں لوٹ آئی تھی۔دین محمد اور بختاور۔خوشی اور نانی تاج کو اپنے گھر لے آئے۔اگلے دن دین محمد نے پورے گاؤں شاہ والی میں خیرات تقسیم کی۔اپنے خون کی حرارت اسے آج پھر سے جوان بنائے ہوئے تھی۔کس قدر خوبصورت احساس ہوتا ہے یوں برسوں بعد اپنے کھوئے ہوئے رشتوں کا آپس میں مل جانا۔روٹھے رشتوں کا جڑ جانا۔۔۔دلوں میں موجود کدورتیں اور رنجشیں اب کسی اور ٹھکانے قیام کرنے چلی گئی۔اب اس بوڑھے جوڑے کی آزمائشوں کے دن ختم ہو چلے تھے۔وہ زندگی کو اپنا امتحان دے چکے تھے۔۔۔

اب دین محمد کے گھر میں صرف خوشیوں نے پڑاؤ ڈالنا تھا۔خوشیوں نے دھمالیں ڈالنی تھی خوشیوں نے رقص کرنا تھا اور خوش بخت کی گھر واپسی سے خوشیوں نے یہاں پہلا قدم رکھ دیا تھا۔۔۔

☆......☆......☆

"کیا آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ زندگی کیا ہے۔۔؟ زندگی کی اصل تعریف کیا ہے۔۔؟"

سر جانسن آج پھر ڈائس کے پیچھے کھڑے براؤن شرٹ کے ساتھ میچنگ ٹائی پہنے کلاس سے خطاب کر رہے تھے۔ارحم سمیت کلاس میں سے کسی نے بھی ہاتھ کھڑا نہیں کیا سوائے ایک مسلم لڑکے کے

"زندگی ایک سفر ہے،ایک گزرگاہ ہے۔ایک مقام سے دوسرے ابدی مقام تک پہنچنے کا راستہ ہے۔" کلاس میں موجود ایک مسلم سٹوڈنٹ نے ہاتھ کھڑا کر کے جواب دیا

"زندگی ایک پڑاؤ ہے۔ایک تجربہ گاہ ہے۔جہاں ہم انسان اپنے علم اور عقل کی بنیاد پر تجربے کرتے گزرتے ہیں۔" اب کی بار بھورے سلکی بالوں والے ایک انگریز لڑکے نے ہاتھ کھڑا کر کے جواب دیا تھا۔

"کوئی اور۔۔۔؟" سر جانسن نے پوری کلاس پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے پوچھا

"زندگی ایک احساس ہے جینے کا سانس لینے کا کہ ہم زندہ ہیں ہم وجود رکھتے ہیں ہمارے پاس اعضاء ہیں ہمارے پاس صلاحیتیں ہیں جن کو ہمیں بروئے کار لاتے ہوئے اس احساس کو مزید خوبصورت بنانا ہے۔"

ان دونوں کی دیکھا دیکھی ارحم کے پہلو میں بیٹھی مارتھا نے حوصلہ پا کر اپنے مطابق زندگی کی تعریف کی۔

سر نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ اس کے خیال کو سراہا اور پھر سر کے اشارے کے ساتھ ہی اسے واپس بیٹھنے کو کہا۔اور ایک بار پھر پوری کلاس پر نظر دوڑائی مگر اب کی بار کسی طرف سے بھی جواب نہیں آیا۔

"صرف تین۔۔۔اور کوئی بھی نہیں۔۔۔؟ حیرت انگیز۔۔۔ہم جو زندگی جی رہے ہیں ہم میں سے کسی کو اس کی صحیح تعریف معلوم نہیں۔۔۔؟" سر نے ہلکے پھلکے انداز میں حیرت کے تاثرات چہرے پر طاری کرتے ہوئے پوری کلاس پر طائرانہ نظر ڈالی۔۔۔

"آپ لوگ صحیح ہیں۔واقعی ہم سے کوئی بھی زندگی کی صحیح تعریف کر ہی نہیں کر سکتا کیونکہ تعریف ہم اس چیز کی کرتے جو مکمل طور پر ہماری سمجھ میں آجائے۔اور آج تک کوئی بھی زندگی کو مکمل طور پر اس کی تمام رمزوں سمیت سمجھ ہی نہیں سکا۔۔۔

دنیا کی تاریخ میں بڑے بڑے نامور فلسفی اور دانشور آئے ہیں سب نے اپنے اپنے مشاہدے کے مطابق اپنے انداز میں اور اپنے اپنے الفاظ میں زندگی کی تعریف کی ہے مگر کوئی بھی آج تک زندگی کو مکمل طور پر جان ہی نہیں پایا۔۔۔"

کلاس پر ایک عمیق سکتہ طاری تھا۔تمام سٹوڈنٹس خاموشی سے سر جانسن کی طرف متوجہ تھے

"آپ سب چونکہ آرٹ کے سٹوڈنٹس ہیں اور آج ہم نے میوزک کو ڈسکس کرنا ہے تو میں میوزک سے متعلق ہی ایک عظیم فنکار کی مثال دینا چاہوں گا۔۔۔استاد نصرت فتح علی خان۔۔۔میوزک کی دنیا کے ایک عظیم ستارے گزرے ہیں۔آپ میں سے کون کون ان سے واقف ہیں۔۔۔؟ یا کس سٹوڈنٹ نے ان کو سنا ہے۔۔۔؟"

اب کی بار ارحم سمیت چار پانچ طالبعلموں کے ہاتھ بلند ہوئے

"گڈ۔۔۔فتح علی خان صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ" انسان تب تک زندہ رہتا ہے جب تک وہ سیکھتا رہتا ہے۔جس دن انسان سیکھنا بند کر دیتا ہے اسی دن اس کی موت واقع ہو جاتی ہے"

مطلب کہ ہم نے تمام عمر سیکھتے رہنا ہے۔ہر ایک سے،قدم قدم پر،سیکھنا ہے۔اور یہ سچ بھی ہے ہم سیکھتے ہی تو رہتے ہیں۔۔۔انسانوں سے،ان کے رویوں سے،ان کے چال چلن سے۔

ہم ہمیشہ سیکھتے ہی رہتے ہیں اساتذہ سے،ساتھی طالبعلموں سے،ماں باپ،بہن بھائیوں سے، دوستوں سے،دشمنوں سے بھی حتیٰ کہ جانوروں سے بھی،اور یہ سیکھنے کا عمل کبھی ختم نہیں ہوتا۔مختصر یہ کہ ہماری زندگی سے منسلک ہر انسان سے اور ہر چیز سے ہم ڈائریکٹ یا ان ڈائریکٹ،بالواسطہ یا بلاواسطہ کچھ نا کچھ ضرور سیکھتے رہتے ہیں۔۔۔

جیسے زندگی کبھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتی اسی طرح سیکھنے کا عمل بھی کبھی ختم نہیں ہوتا۔اور میرا ماننا ہے کہ جس انسان کو زندگی کچھ زیادہ چوٹیں لگاتی ہے یا جس کے ساتھ زندگی کچھ زیادہ سختی سے پیش آتی ہے وہ انسان سیکھتا بھی زیادہ ہے۔۔۔کیونکہ وہ لوگوں کے اصل چہروں سے شناخت حاصل کر لیتا ہے۔اسے تجربات زیادہ ہوتے ہیں۔دھکے کھاتے کھاتے اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور پھر وہ اپنا ہر قدم قدم پھونک پھونک کر اور دیکھ بھال کر رکھنا شروع کر دیتا ہے۔ایسے لوگ سے زندگی اگر بہت کچھ چھین لیتی ہے تو یہ لوگ پھر بہت کچھ حاصل بھی کرتے ہیں۔

جس طرح پیانو کی ہر کی سے یا گٹار کی ہر تار سے ایک نیا سر نکلتا ہے بالکل اسی طرح زندگی میں آنے والا ہر حادثہ انسان کو ایک نیا سبق دے جاتا ہے،زندگی میں ملنے والے ہر نئے دھکے کی بدولت ہم کچھ نیا سیکھ لیتے ہیں۔۔۔جیسے آگ سونے کیلئے کندن ثابت ہوتی ہے ویسے ہی حادثات،دکھ،تکالیف انسان کیلئے آگ کا کام کرتے ہیں جس میں انسان پک کر،جل کر کندن بن جاتا ہے۔۔۔

تو حقیقی آرٹ زندگی کو سمجھنا ہی ہے،بھلے ہم زندگی کو مکمل کبھی نہیں سمجھ سکتے۔مگر اس کی جستجو بھی ایک آرٹ ہے،زندگی میں ملنے والے دکھوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنا بھی ایک آرٹ ہے،چھوٹی چھوٹی

باتوں اور چیزوں میں زندگی تلاش کرنا بھی ایک آرٹ ہے اور زندگی کو جھیلنا بھی ایک آرٹ ہے، زندگی میں ملنے والا ہر دکھ، ہر آزمائش آپ کو تھکانے کیلیئے ہوتی ہے۔آپ کا راستہ روکنے کیلئے ہوتی ہے۔لیکن رکنا نہیں ہے آپ نے، تھکنا نہیں ہے آپ نے۔سفر آہستہ آہستہ ہی سہی ہمیشہ طے کرنے سے ہی ختم ہوتا ہے۔منزلیں اتنی آسانی سے نہیں ملتی منزلیں صرف مسلسل محنت اور اپنے آپ کے ساتھ ایمانداری سے ہی انسان کے قدموں کو چھوتی ہیں

حقیقت میں وہ لوگ سیلوٹ کے حقدار ہوتے ہیں جو زندگی کو تھوڑا بہت جان پاتے ہیں۔اور جو ان مراحل سے سالم گزر جاتے ہیں وہ پارس پتھر کی طرح بن جاتے ہیں۔پھر وہ جس چیز کو بھی چھولیں وہ سونا بن جاتی ہے۔۔۔"

"سر اپنے آپ سے ایمانداری۔۔۔مطلب۔۔۔؟" پہلی قطار میں بیٹھے براؤن سلکی بالوں والے انگریز لڑکے نے سوال اٹھایا

"ہاں اپنے آپ سے ایمانداری۔۔۔ہم زندگی میں تب تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک ہم اپنے آپ کے ساتھ ایماندار نہیں ہو جاتے۔

آپ چاہے زندگی کی کسی بھی سٹیج پر ہوں اپنے آپ کے ساتھ ایمانداری کرنی چاہیئے۔اگر سٹوڈنٹ ہو تو ایمانداری کے ساتھ محنت اور لگن سے تعلیم حاصل کرو۔اگر تم ایسا نہیں کرتے تم ناکام ہو جاؤ گے۔یہ کس کا نقصان ہوا۔۔؟

صرف تمہارا۔۔۔اور کیوں ہوا۔۔؟ کیونکہ تم اپنی ڈیوٹی کے ساتھ ایماندار نہیں تھے

ایک بزنس مین اپنے بزنس کی طرف توجہ نہیں دیتا تو ناکام ہو جاتا ہے نقصان کسی اور کا نہیں صرف اسی کی اپنی ذات کا ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے ساتھ ایماندار ہی نہیں تھا۔

تم جھوٹ بولتے ہو، چوری کرتے ہو، قتل کرتے ہو۔۔کوئی بھی غلط کام یا یا کوئی بھی کرائم کرتے ہو تو اس کا مطلب ہے تم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہو تم اپنی ذات کا نقصان کر رہے ہو کیونکہ تم اپنے ساتھ ایماندار ہی نہیں تھے۔۔۔

" انسان کندن اور پارس صرف محنت، سچی لگن اور اپنی ذات کے ساتھ ایمانداری سے ہی بنتا ہے"

سر جانسن خاموش ہوئے تو ایک سحر سا ٹوٹا تھا۔ جیسے کچھ دیر پہلے ساری دنیا ساکن سی ہو گئی ہو۔ وہ خاموش ہوئے کلاس میں سامنے بیٹھے تمام مجسموں میں جیسے جان آ گئی ہو۔۔۔

کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بولتے ہیں تو ہر کوئی چپ چاپ اور مکمل خاموشی سے انہیں سننے لگتا ہے۔ ارحم کے فیورٹ سر جانسن بھی انہیں میں سے ایک تھے

لیکچر ختم ہوا تو تمام سٹوڈنٹ کلاس سے باہر آ گئے۔۔۔

ارحم ایک ہفتے بعد آج کلاس میں آیا تھا۔۔۔ فاخرہ کے فیصلے نے اسے مکمل طور پر ڈسٹرب کر دیا تھا۔۔۔ بجھے دل کے ساتھ وہ گھر واپس آیا تو تھوڑی ہی دیر بعد کوکب آ دھمکی۔۔۔ جب وہ اپنی گیلری میں کینوس پر ایک اداس لڑکی کی تصویر بنانے میں مگن تھا

" میری خواہشات میں ایک خواہش یہ بھی شامل ہے کہ میں یہاں اس ٹیبل پر تمہارے سامنے اک ادا سے بیٹھوں اور تم اپنے کینوس پر خوبصورت رنگوں سے میری خوبصورت سی تصویر بناؤ۔۔۔" اس نے آتے ہی ہمیشہ کی طرح اپنے شوخ انداز میں ارحم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔۔۔

" اور تم جیسے فضول لوگوں کی ایسی فضول خواہش کبھی پوری نہیں ہو گی۔۔۔"

" اتنی اداس تصاویر بنانے سے کیا حاصل ہوتا ہے تمہیں۔۔۔؟ کبھی کوئی تصویر ایسی بھی بنا لیا کرو جو زندگی سے بھرپور ہو۔۔۔" کوکب نے اس کے

کینوس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا

" اگر دوبارہ کبھی زندگی ملی تو میں اللہ سے خواہش کروں گا کہ مجھے بھی کوکب کبیر جیسی زندگی ملے بے فکر، نا کوئی ٹینشن، بس اپنے آپ میں مگن۔۔ پھر میں واقعی ایسی ہی کوئی تصویر بناؤں گا"

" واہ ہمیشہ میری زندگی اور میری عادتوں پر طنز کرنے والے آج میرے جیسی زندگی کی خواہش کر رہے ہیں انقلاب آ گیا ہے۔۔" کوکب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا

" ہاں واقعی آج خواہش کر رہا ہوں کہ کاش میری زندگی کوکب کبیر جیسی ہوتی ۔۔۔" ارحم نے ایک ٹھنڈی سانس ہوا میں خارج کی

" آنٹی کی وجہ سے پریشان ہو نا ۔۔؟ اسلیئے اتنے دن سے کالج بھی نہیں آئے ۔۔۔"

" ہاں موم کے جانے سے ہم سب ڈسٹرب ہو گئے ہیں ۔۔۔اور ڈیڈ تو بہت زیادہ ۔۔۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ ڈیڈ کس طرح اور کب سمجھوتہ کریں گے ۔۔۔" ہمیشہ اپنے آپ میں رہنے والا آج کھل کر کوکب کو اپنے دکھ سنا رہا تھا

" ہاں مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ آنٹی کا ڈائیورس کا فیصلہ بالکل غلط ہے ۔انہیں کچھ تو سوچنا چاہیئے تھا۔" کوکب کو صرف یہی بتایا گیا تھا کہ فاخرہ نے کسی جھگڑے کی بنیاد پر خلع لینے کا فیصلہ کرلیا اسے ابھی تک جھگڑے کے پیچھے اصل حقیقت کا علم نہیں تھا

" ہاں میں نے موم کو کافی کنوینس کیا انہیں روکا مگر وہ اپنے فیصلے سے پیچھے ہٹنے کو تیار ہی نہیں تھیں ۔۔۔" ارحم کے لہجے میں دکھ کی ملاوٹ شامل تھی

" کوکب کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میری زندگی میں ضرور کچھ بڑا ہونے والا ہے ۔بہت ہی عجیب وغریب مطلب میری سوچ سے بھی بالکل مختلف ۔۔۔"

" ایسا کچھ نہیں ہو گا یار ۔۔۔ مجھے لگتا ہے تم آنٹی کی وجہ سے ڈپرس ہو ۔۔۔ تمہارا دکھ میں سمجھ سکتی ہوں ۔۔۔ دیکھنا بہت جلد تم لوگ پھر سے اپنی زندگی جینا شروع کر دو گے ۔سلطان انکل بھی کمپرومائز کرلیں گے جلد ۔۔۔" کوکب نے ارحم کو تسلی دی ۔جانے کیوں اسے یہ خود سے بے پرواہ لڑکا بے پناہ پسند تھا ۔عشق تھا اسے اس خاموش اور چپ چاپ رہنے والے لڑکے سے مگر اس قدر شوخ اور بے باک ہونے کے باوجود بھی وہ آج تک ارحم سے کھل کر اپنی محبت کا اظہار نا کر پائی ۔وہ جو کچھ بھی کہہ دینے والی لڑکی مشہور تھی اپنی محبت کے اظہار میں گونگی ہو جاتی ۔وہ ارحم کو اس قدر اداس کیسے دیکھ سکتی تھی

" اور تم نے ایسا کیوں سوچنا شروع کر دیا ہے ۔۔۔؟"

" پتا نہیں مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ میں ایسا کیوں سوچنے لگا ہوں شاید مجھے میری چھٹی حس وارن

کر رہی ہے"

" ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا ارحم ۔اور انسان جیسا سوچتا ہے ویسا ہی اس کے ساتھ ہوتا ہے تم اچھا سوچو گے اچھے کی امید رکھو گے تو تمہارے ساتھ ہمیشہ اچھا ہی ہوگا۔" تھوڑی دیر پہلے جو لہجے میں شوخی تھی اب وہ کوکب کے لہجے سے بالکل غائب تھی

"تم شاید صحیح کہتی ہو مگر کچھ لوگ ہوتے ہیں جو ہمیشہ نیگیٹو پہلو کو پہلے سامنے رکھتے ہیں ۔میں بھی انہی میں سے ایک ہوں ۔۔۔"

" جو نیگٹو پہلو کو پہلے سامنے رکھتے ہیں تو پھر سب کچھ ہوتا بھی نیگٹو ہے ۔اگر کچھ اچھا سوچو گے تو ہمیشہ اچھا ہی ہوگا۔کوکب کبیر کا یہ زندگی بھر کا تجربہ ہے ۔ہمیشہ اچھا سوچو ۔۔۔" بات ختم ہونے تک مسکراہٹ نے ایک بار پھر کوکب کبیر کے ہونٹوں کا احاطہ کر لیا تھا۔

"کیا چیز ہو تم کوکب کبیر ۔۔۔؟" ارحم بھی مسکرا دیا

" یہی تو مسئلہ ہے نا ارحم سلطان ۔۔۔تم کبھی تھوڑا سا غور تو کرو ۔کوکب کبیر کے بارے میں سوچو تو سہی کبھی ۔سارے پرت کھلتے جائیں گے ۔۔۔" اس نے ایک بار پھر مسکراتے ہوئے کہا

" اب میرا اتنا ٹائم اتنا بھی برا نہیں آیا کہ میں صرف تمہارے بارے میں سوچتا رہوں" ارحم کہاں ہار ماننے والا تھا اس سے ۔

مگر جو کوکب کبیر چاہتی تھی وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئی تھی ۔اس ساری بحث کا مقصد صرف یہی تھا کہ گھریلو ڈسٹربنس کی وجہ سے جو ارحم نے خاموشی کا قفل لگا رکھا تھا وہ اسے توڑنے میں کامیاب رہی ۔اور یہی وہ چاہتی تھی کہ ارحم بھی اس جیسا ہو جائے زندگی سے بھرپور

" تو آج لگا لو چیلنج ۔۔۔ایک نا ایک دن تم میری ذات کو ضرور سوچو گے ارحم ۔۔۔تمہیں میری شدید کمی محسوس ہوگی اپنی زندگی میں ۔۔۔" کوکب نے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا

" ہاں لگ گئی شرط ۔۔۔ایسا دن کبھی نہیں آئے گا ۔۔" ارحم نے بھی مسکراتے ہوئے چیلنج قبول کر لیا۔کوکب کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا

"سوچ لو ارحم۔۔۔تم ہار جاؤ گے تو مجھے سچ میں بہت دکھ ہو گا۔۔۔" ارحم کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ پر تھا

"فکر نا کرو۔۔۔میں تمہیں دکھی ہونے کا موقعہ کبھی نہیں دوں گا۔۔" ارحم نے اپنا ہاتھ اٹھانا چاہا مگر کوکب نے گرفت مظبوط کر لی

"اگر تم شرط ہار گئے تو۔۔۔؟"

"تو۔۔۔تو پھر۔۔۔یہ فیصلہ اس دن پر چھوڑ دیتے ہیں جو کبھی نہیں آنے والا ۔۔۔" کوکب نے گرفت ڈھیلی کر دی ارحم نے اپنا ہاتھ اٹھا لیا۔۔۔

تھوڑی دیر مزید بیٹھنے کے بعد وہ واپس اپنے گھر آ گئی۔

سارے گھر والے اپنی اپنی مصروفیات میں مگن تھے۔امی کچن میں لگی ہوئی تھی۔ابو حسب معمول اپنی سٹڈی میں گم تھے۔کبیر صاحب کی یہ جوانی کی عادت ابھی تک اسی طرح قائم تھی۔آفس سے واپس آ کر وہ اکثر اپنی سٹڈی میں ہی ملتے تھے۔مطالعے کے بڑے شوقین تھے۔اس کی چھوٹی بہن انجم اپنے کالج کے لیکچر یاد کرنے میں لگی ہوئی تھی۔تو وہ سیدھا اپنے روم میں ہی آ گئی

شام کو تکیے پر سوئی چھت کو گھورتی کوکب کبیر خود سے عہد کر رہی تھی۔۔۔

"میری محبت رائیگاں تو نہیں جائے گی ارحم۔محبتیں کبھی رائیگاں جاتی ہی نہیں۔محبتیں اگر رائیگاں جاتیں تو پھر کوئی کبھی محبت کرنا ہی چھوڑ دیتا۔۔۔تم مجھے سوچو گے۔مجھے مجھ سے مانگو گے ضرور مانگو گے۔۔۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا۔میں کبھی نہیں ہاری۔اور یہاں تو میری محبت کا سوال ہے۔یہاں تو ہارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ارحم۔تمہیں ہارنے کا مطلب تو زندگی ہارنا ہے میری محبت میں اتنی طاقت ہے کہ یہ ایک دن تمہیں میرے پاس کھینچ کے لائے گی۔ضرور لائے گی مجھے یقین ہے ارحم۔۔۔"

وہ بھرپور زندگی جینے والی لڑکی خود سے باتیں کرتے کرتے جانے کب نیند کی آغوش میں جا سوئی اسے خبر ہی نا ہوئی۔۔۔

اور کوکب کبیر کے گھر سے کچھ فاصلے پر اسی کمیونٹی کے ایک اور گھر میں بنی اپنی چھوٹی سی گیلری

میں بیٹھا وہ چپ چاپ اور خاموش مصور پھر سے اپنے کینوس پر اس اداس لڑکی کی تصویر کو بنانے میں مگن ہوگیا اس کی نوک پلک سنوارنے لگا۔ یہ سوچے بغیر کہ ایک کومل جذبوں والی لڑکی ابھی اسے سوچتے سوچتے نیند کی پرسکون وادیوں میں اتری ہے جہاں خواب جزیروں پر پریاں اسے جھولے جھولانے کے انتظار میں ہیں۔۔اس کی تصویر بھی بالکل اسی کی طرح اداس اور خاموش تھی۔۔۔سرسبز وشاداب وادیوں میں اداس بیٹھی وہ خوبصورت لڑکی جس کی آنکھوں سے اداسی جھلک رہی تھی جانے ایسا کیا تھا جو اسے یہ خوشنما وادی اور خوبصورت منظر بھی مسکرانے پر مجبور نا کر سکے۔۔۔

اداس لڑکی کی تصویر مکمل ہوگئی تو ارحم برش رکھ کر کینوس کے سامنے پڑی کرسی پر آبیٹھا۔۔۔
مسلسل کھڑے رہنے کی وجہ سے کمر میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہونے لگا۔۔۔دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں چٹخاتے ہوئے وہ اپنی تصویر کو آخری بار تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگا۔۔۔ارحم کی نظر جب اس اداس لڑکی کی آنکھوں پر پڑی تو اچانک اس کے ذہن میں ایک جھماکہ ہوا۔سر جانسن کی ایک لیکچر کے دوران کہی گئی ایک بات اس کے دماغ سے ٹکرانے لگی

"ہم اپنے تصور میں جو بھی تصویر بناتے ہیں بالکل اسی تصویر سے ملتا جلتا چہرہ اس دنیا میں کہیں نا کہیں دنیا کے کسی نا کسی حصے میں ضرور موجود ہوتا ہے۔۔۔اگر آپ میں سے کسی کی بھی اپنے بنائے ہوئے چہرے سے کبھی ملاقات ہو جائے تو اسے اپنی تصویر دکھائیے گا ضرور۔۔۔اس اجنبی چہرے والے انسان کو اپنی تصویر دیکھ کر ایک خوشگوار حیرت ہوگی اور تب آپ خود بھی اپنے اندر ایک عجیب سے خوشی محسوس کریں گے کہ جس چہرے کو میں نے اپنے تصور میں کینوس پر اتارا تھا آج اسے راہ چلتے پالیا ہے"

سر جانسن کی بات یاد آئی تو ارحم کے لبوں پر بے اختیار ایک مسکراہٹ سی آ ٹھہری۔

وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور کینوس کے قریب آگیا۔۔۔

"کیا میں بھی اپنے ہاتھ سے بنائے گئے اس چہرے سے مشابہہ چہرے والی لڑکی سے کبھی مل سکوں گا۔۔۔" اپنی بنائی تصویر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ارحم من ہی من میں سوچنے لگا۔۔۔

اور وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ ایک نا ایک دن اس کی یہ خواہش ضرور پوری ہونے والی تھی۔کبھی کبھی کسی

پل میں ہمارے دل سے نکلی جانے والی دعا بہت جلد اوپر پہنچ کر قبولیت کی سند پا لیتی ہے۔تھوڑی دیر پہلے جو ارحم کے لبوں سے ایک معصومانہ خواہش نکلی تھی وہ بہت جلد پوری بھی ہونے والی تھی۔۔۔اس کے حصے میں لکھ دیا گیا کہ بہت جلد نا صرف ارحم کی اس چہرے سے ملاقات ہوگی بلکہ یہ خاموش، چپ چاپ اور ہمیشہ اپنے خول میں رہنے والا لڑکا اس اداس لڑکی کی شدید محبت میں بھی گرفتار ہو جائے گا۔۔۔

وہ تو کچھ بھی نہیں جانتا تھا کیونکہ قدرت اپنے فیصلے ہمیشہ مخفی اور محفوظ رکھتی ہے۔۔۔اور کوئی بھی اس کے فیصلوں کو پھر کبھی چیلنج نہیں کر سکتا

☆......☆......☆

سترھواں حصہ

"یہ دنیا بھی عجب تماشا ہے خوشی ۔۔۔انسان چاہتا کچھ ہے سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے ۔۔۔" صبح صبح مٹی سے بنے چولہے کے پاس ناشتہ کرتے ہوئے دین محمد اپنے پوتے سے مخاطب ہوئے یہ انکا اپنے پوتے کے ساتھ پہلا ناشتہ تھا

"میں سمجھا نہیں دادا"

"انسان تمام عمر بھاگتا رہتا ہے

خوشیوں کے پیچھے، رشتوں کے پیچھے، خواہشوں کے پیچھے، خوابوں کے پیچھے، سرابوں کے پیچھے انسان حتی المقدور ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے اور جب عمر کے آخری حصے میں جا کے اپنی مٹھیاں کھولتا ہے تو اس کے ہاتھ خالی ہوتے ہیں ۔۔۔ان میں سوائے لکیروں کے جال کے کچھ بھی نہیں ہوتا ۔۔۔تب اسے ادراک ہوتا ہے کہ اس کی ساری زندگی کی ریاضت بیکار گئی ہے ۔۔۔اسے ادراک ہوتا ہے کہ وہ صرف لاحاصل کے پیچھے اندھا دھند بھاگتا رہا ہے۔حاصل تو کچھ بھی نہیں ہوا ۔۔۔تم جانتے ہو ادراک کا یہ مرحلہ کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے ۔۔۔؟؟؟

نہیں تم نہیں جانتے۔اور اللہ کرے تم اس مرحلے تک کبھی پہنچو بھی نا ۔۔۔" دین محمد کھانا بھول کر کھوئے کھوئے لہجے میں خوشی سے مخاطب تھے اور خوشی حیرت زدہ دادا کی باتیں سنے جا رہا تھا

یہ دادا کس سوچ کو لے کر ایسی گہری گہری باتیں کر رہے ہیں ایسا کیا کھویا ہے انہوں نے۔وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پایا

"کیسی اول جلول باتیں انڈیل رہے ہیں آپ بچے کے دماغ میں ۔۔۔؟ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے"

چولہے میں بیٹھی پراٹھے بناتی بختاور کو اپنی محنت ضائع ہوتی معلوم ہوئی تو انہوں نے دونوں کی توجہ ناشتے پر دلائی

"کچے ذہن ہوتے ہیں بختاور۔۔۔ بالکل گیلی مٹی کی طرح ۔انہیں جس طرف موڑو گے مڑ جائیں گے۔۔۔ان کی آبیاری کرنی پڑتی ہے۔ پیار سے،توجہ سے" اوپر چارپائی پر بیٹھی نانی تاج نے دین محمد کی طرفداری کرتے ہوئے بختاور کو سمجھایا

"ہاں بوا ایسا ہی ہے۔۔۔واقعی کچے ذہن ہوتے ہیں کچھ سمجھتے ہی نہیں ۔کون اپنا ہے کون پرایا، کس کو جوڑ رہے ہیں کس کو توڑ رہے ہیں سمجھتے ہی نہیں ۔۔۔کاش یہ کچے ذہن سمجھ پاتے" دین محمد نے ایک ٹھنڈی اور لمبی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ذہن کے دھندلے پردے پر ایک تصویر ابھری تھی سلطان کی تصویر اپنے اکلوتے بیٹے کی تصویر۔جانے آج کیوں سلطان کچھ زیادہ یاد آرہا تھا

"غم نا کرو دین محمد۔۔۔کبھی کبھی خدا انسان کو آزمائشوں سے گزارتا ہے اسے نکھارنے کے لیئے ۔یہ دیکھنے کیلیئے کہ میرا بندہ جسے میں نے اتنی محبت سے تخلیق کیا اپنا نائب بنایا وہ مشکل وقت میں بھی مجھ سے ویسی ہی محبت کرتا ہے یا میری راہ سے ہٹ کر اس وعدے سے مکر جاتا ہے جو اس نے عالم ارواح میں مجھ سے کیا تھا۔۔۔"

نانی تاج نے ایک بار پھر دین محمد کو دلاسا دیا۔جانتی تھی اس کا غم بہت گہرا ہے۔

"نائب بھی بنایا،صاحب عقل بھی بنایا،ساری مخلوقات سے افضل بھی بنایا پھر بھی ٹھوکریں مقدر میں لکھ دیں۔اتنا اعلیٰ مقام پانے کے بعد بھی ہم انسان کے ہاتھ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ہمیں اتنا اختیار نہیں ہوتا کہ ہم اپنی بگڑی کو سنوار سکیں۔۔۔"

"ایسا مت سوچا کرو دین محمد۔مایوس نہیں ہوتے۔کفر ہے مایوسی ،گناہِ عظیم ہے۔خدا کے ہر کام میں کوئی نا کوئی حکمت چھپی ہوتی ہے کوئی نا کوئی ایسی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے جسے ہمارے انسانی ذہن نہیں سمجھ پاتے۔بس ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔کچھ ہاتھ میں ہو تب بھی شکر اور سب کچھ چھین لے تب بھی شکر۔۔۔"

"صحیح کہتی ہیں بی بی آپ۔۔۔ہم راضی ہیں اس کی رضا میں۔زیادہ گزر گئی تھوڑی رہ گئی ہے یہ بھی گزر جائے گی" دین محمد کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے خوشی پہلے ہی ناشتے سے ہاتھ کھینچ چکا تھا

"آؤ خوشی آج باہر چلتے ہیں۔۔۔آج شاہ والی کی گلیاں دیکھتے ہیں، میرے اینٹوں کے اڈے پر چلتے ہیں، دریا کنارے چلتے ہیں۔۔۔"

نانی تاج اور چولہے میں بیٹھی بختاور حیرت سے دین محمد کا چہرہ تکنے لگیں

خوشی دادا کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔دین محمد نے اپنا سفید جھریوں بھرا صافہ اپنے کندھے پر رکھا۔خوشی کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل آیا۔ان گلیوں میں جہاں وہ برسوں پہلے سلطان کے ساتھ ایسے ہی اس کا چھوٹا سا ہاتھ پکڑ کر چلتا تھا

بازار سے گزرتے ہوئے لوگوں نے آج دین محمد کے چہرے پر عجب سے تاثرات دیکھے جانے خوشی کے تھے یا غم کے کوئی سمجھ نا پایا۔دین محمد آج خوشی کے ساتھ پھرتا رہا آہستہ قدموں سے، پورے گاؤں کی گلیوں کو ماپ لیا۔وہ اسے دریا کنارے لے گئے وہ جگہہ دکھائی جہاں اس کا بڑا بیٹا عمران بچپن میں ڈوب گیا تھا۔اور خوشی کو بتایا اس کا معصوم لاشہ ظالم موجوں نے آج تک واپس نہیں کیا۔اور اپنے معصوم عمران کا بتاتے ہوئے ان کے لہجے میں کس قدر کرب واضح تھا خوشی نے با آسانی اندازہ لگا لیا۔

وہ اسے اپنے اینٹوں کے اڈے پر لے گئے۔اپنا اڈہ دکھایا جہاں وہ جھلسا دینے والی کڑکتی دھوپ میں قمیض اتارے کچی اینٹیں بناتا تھا۔اسے وہ پرانا درخت دکھایا جو اب دین محمد کی طرح بوڑھا ہونے لگا تھا وہ درخت جس کے نیچے وہ ننھے سے سلطان کو بٹھایا کرتے تھے، جب وہ دین محمد کیلئے کھانا لے کر آتا تھا ننھا سلطان، سرخ وسفید گالوں والا سلطان، جس کے بالوں سے پسینے کی لکیریں لڑھک کر اس کے لال گالوں تک آ پہنچتی تھی۔دین محمد نے اسے بتایا کہ وہ کس طرح اپنے صافے سے اس کے گال پر آیا پسینہ صاف کرتا پھر بیٹے کو چومتا

دین محمد اسے لیئے پھر گاؤں کی گلیوں میں آ گیا۔اور بغیر مقصد کے گاؤں میں پھرتے رہے۔خوشی کی انگلی تھامے چلتا رہا بغیر تھکے۔جانے ان کے اندر کون سا احساس تھا، کتنے عرصے کی محرومیاں دبی ہوئی

تھی جن کو آج سر اٹھانے کا موقع ملا،

خدا جانے یہ وہی احساس محرومی تھا جو سالوں پہلے اپنے بیٹے کے چھوڑ دینے کے بعد سے ان سے چھن گیا تھا یا پھر یہ نواسے کی محبت تھی جو میسر ہوتے ہوئے بھی اس کی دسترس سے دور تھی اور آج بیس برس بعد ان کی دسترس میں آئی تھی۔خوشی اپنے دادا کے اندر چھپے احساسات کو پڑھنے میں ناکام رہا تھا

خوشی بھی اپنے دادا کے ساتھ چلتا رہا اس کے قدموں سے قدم ملا کے کسی روبوٹ کی طرح بغیر تھکے بغیر رکے، اور بغیر روکے کہ دادا جان یہ سب گلیاں میں ہزار بار پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ جو خوشی اور احساس اسے آج دادا جان کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوئے طمانیت بخش رہا تھا اس سے پہلے یہ طمانیت اسے کبھی حاصل نا ہوئی تھی

وہ چپ چاپ چلتا رہا۔سوچتا رہا کہ وہ تو خود کو ہی دنیا کا سب سے بڑا مظلوم سمجھتا تھا جس کے رشتے اس کے پاس نا تھے۔

یہاں تو سبھی اپنے حصے کے دکھ لیئے بیٹھے ہیں۔کوئی واویلا کرتا ہے کوئی خاموشی سے سہتا ہے، اندر سے خوش تو کوئی بھی نہیں۔جس کو ٹٹولو اس کے اندر سے لاوا ابھرتا ہے، ہر کوئی اپنی ذات اور برداشت کے برابر اپنے غموں کو لیئے جیئے جا رہا ہے۔جیئے جا رہا ہے سبھی اپنے دن پورے کر رہے ہیں۔

سبھی اپنے نصیب میں لکھے غموں کے گٹھڑ اٹھائے اپنے اپنے راستوں پر گامزن ہیں۔

شاید کسی شاعر نے اسی سوچ کو لے کر ہی یہ الفاظ لکھے ہوں گے۔

”جانے کب ہوں گے اس دنیا کے غم“

☆......☆......☆

کوکب نے سچ ہی تو کہا تھا وہ لوگ اپنی زندگی میں واپس آگئے تھے پھر سے۔ارحم نے باقاعدگی سے کالج اور آرٹ کلاسز لینا شروع کر دی۔سلطان بھی آہستہ آہستہ اپنی روٹین لائف کی طرف آنے لگے سٹور پر جانے لگے۔فاخرہ کے جانے سے زندگی میں تبدیلی ضرور آئی تھی بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ بہت بڑی تبدیلی آئی تھی مگر ان دونوں نے آہستہ آہستہ اس تبدیلی کو قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔

ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب کبھی ہمارے درمیان میں رہنے والا چیز، ہمارے آس پاس کے ماحول کا لازمی جزو اچانک سے کہیں کھو جائے یا اپنی جگہہ سے ہٹ جائے تو اس کی جگہہ ایک خلاء سا بن جاتا ہے۔اور اس خلاء کو پھر کبھی کوئی پر نہیں کر سکتا۔کبھی بھی کوئی دوسرا انسان اس کھوئے ہوئے انسان کی جگہہ نہیں لے سکتا ہاں مگر خدا تعالی نے انسان کی سرشت میں یہ خوبی رکھی ہے کہ اپنی زندگی میں آنے والی ہر تبدیلی کو قبول کر کے اس تبدیلی کے ساتھ جینا سیکھ لیتا ہے۔اور وقت کے ساتھ ساتھ اس خلاء کو بھی قبول کر لیتا ہے جو کبھی کوئی دوسرا نہیں بھر سکتا۔

دنیا سمجھتی ہے کہ وقت ہر زخم بھر دیتا ہے غلط سمجھتی ہے وقت کبھی کوئی زخم نہیں بھرتا بلکہ وقت ہمیں اس زخم کے ساتھ جینے کا ہنر سکھا دیتا ہے۔زخم تو ہمیشہ ہی زخم رہتا ہے اسے مرہم کبھی نصیب نہیں آتا۔

شروع شروع میں فاخرہ کے چھوڑ کر جانے بعد کافی مشکلات آئی تھی۔وہ اکثر سٹور سے واپس گھر آتے ہی بے دھیانی میں بے اختیار فاخرہ کو پکار بیٹھتے مگر پھر احساس ہو جاتا کہ اب اس کی پکار کا جواب دینے والی انہیں چھوڑ کر جا چکی ہے اب اس پکار کو کبھی جواب نہیں ہوگا پھر خیال آتا کہ اب تک تو اسے عادی ہو جانا چاہیئے۔اب کبھی سٹور سے واپسی پر اس کو اپنے استقبال کیلئے فاخرہ کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنے کو نہیں ملے گا۔

ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھاتے ہوئے اگر نظر اچانک دائیں طرف والی خالی کرسی پر پڑ جاتی جہاں ہمیشہ فاخرہ بیٹھ کر ان کے ساتھ کھانا کھاتی ان دونوں باپ بیٹے کے کھانے کا دھیان رکھتی انہیں پلیٹوں میں کھانا نکال کر دیتی تو خالی کرسی دیکھ کر اس کے حلق میں لقمہ اٹکنے لگتا۔مگر پھر خود کو سمجھا دیتا کہ اب یہ کرسی ہمیشہ خالی پڑی رہے گی

رات کو بیڈ پر سوتے ہوئے کروٹ لیتے وقت اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی تو اس کے بیڈ پر دوسری ساری سائیڈ خالی پڑی ہوتی جہاں پہلے ہمیشہ فاخرہ سوتی تھی۔اور فاخرہ کی عادت تھی کہ اس کی آنکھ ہمیشہ سلطان کے کروٹ بدلنے پر لازمی کھلتی تھی۔مگر اب اسے اس بیڈ پر اکیلا سونا تھا۔اس بیڈ کی خالی سائیڈ کو خالی ہی رہنا تھا۔اب سلطان کے کروٹ بدلنے پر کسی کی آنکھ نہیں کھلنی تھی۔اب سلطان کو بیڈ کی

خالی سائیڈ کو دیکھ کر در آنے والی اداسی کو سمجھاتا تھا کہ اب حقیقت کا سامنا کرتے ہوئے مجھے زندگی گزارنی ہے اور تلخ حقیقت یہ ہے فاخرہ مجھے چھوڑ کے جا چکی ہے

اور جب کبھی کبھی جب رات گئے تک ارحم اپنی گیلری میں بیٹھا کسی تصویر کو مکمل کرنے میں مگن ہوتا تو فاخرہ بھی جانے کیوں کروٹ پر کروٹ بدلتی رہتی۔اور اسے تب تک سکون کی نیند کی حاصل نہیں ہو پاتی جب تک ارحم اپنی گیلری سے اٹھ کے اپنے روم میں سونے نا چلا جاتا۔شاید ساری مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

مگر فاخرہ میں صلہ رحمی کا عنصر کچھ زیادہ ہی نمایاں تھا۔

جب بھی اسے کبھی محسوس ہوتا کہ حلیمہ خالہ کی طبیعت زرا درست نہیں ہے اور خود بتانے سے ہچکچا رہی ہے تو وہ فاخرہ خود سے جا کے اس کی طبیعت پوچھتی اسے دو تین کی چھٹی دیتی اور پیسوں کے ذریعے بھی ممکنہ حد تک اس کی مدد کرتی تا کہ وہ میڈیسن خرید سکے اور پھر حلیمہ خالہ کے بعد پورا گھر خود سنبھالتی جب تک کہ خالہ مکمل تندرست نہیں ہو جاتی

وہ ایسی ہی نرم دل تھی ہر کسی سے دل سے پیار کرنے والی۔سلطان کبھی کبھی سوچتا کہ اتنی نرم دل فاخرہ اچانک اتنی پتھر دل کیسے ہوگئی ہے پھر وہ خود ہی اقرار کرتا کہ اس میں فاخرہ کا کوئی قصور نہیں ہے یہ سب تو اس کے اپنے کرموں کا بدل لوٹا ہے اوپر والا ۔

زندگی تو پھر نام ہی تسلسل کا ہے۔یہ چلتی رہتی ہے کسی کے بغیر نہیں رکتی۔چاہے کتنے ہی اہم لوگ اپنا ہاتھ چھڑا کے ہم سے بہت دور چلے جائیں۔ہم زندگی کے ساتھ چلنا نہیں چھوڑ سکتے۔اور جو زندگی کی انگلی کو چھوڑ کر اس کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیتے ہیں پھر وہ پیچھے رہ جاتے ہیں بہت پیچھے۔زمانے کی گرد ان کے چہرے دھندلا دیتی ہے۔پھر ہم انہیں پہچان بھی نہیں پاتے کہ یہ وہی انسان ہے جس کے چہرے کی رونقوں کو سب رشک سے دیکھتے تھے۔۔۔

یہ وہی لوگ ہیں جو کبھی وقت کے ماتھے کا جھومر تھے اور آج اس طرح مٹی میں رل رہے ہیں کہ کوئی انہیں اٹھانے والا بھی نہیں۔۔۔

یہ ارحم کو باقاعدہ کلاسز جوائن کیئے چوتھا روز تھا جب اسے فیری برج پر وہ نیلی آنکھوں والا لڑکا

کرتب دکھاتے نظر آیا۔۔۔لوگوں کی ایک بھیڑ جمع تھی اس کے گرد اور وہ اس مجمع کے درمیان کھڑا سب کو اپنے ہاتھوں کے کمال سے محظوظ کر رہا تھا۔ہر کرتب کے اختتام پر پورے مجمع میں تالیوں کی ایک لہر اٹھتی اور وہ جھک کر داد وصول کرتا اور پھر سے نیا کرتب شروع ہو جاتا۔

فیری برج لندن کے مشہور پلوں میں سے ایک تھا۔ایک پر ہجوم پل جو ہر وقت لوگوں سے کھچا کھچ بھرا رہتا۔ہر رنگ کے لوگوں سے۔پل کے نیچے بہتا تیز رفتار اور نیلگوں گہرا پانی اور پر دنیا کے مختلف کونوں سے آئے انسان۔۔۔

پل کی طرزِ تعمیر بھی شاید کسی قدیم زمانے کے نمونے کو سامنے رکھ کر بنائی گئی تھی۔اور ماہر شاہکار ہاتھوں نے اس پل کو اس قدر لگن، محنت اور نفاست سے تعمیر کیا تھا کہ ہر دیکھنے والی آنکھ اس پل کو بنانے والے ماہر ہاتھوں کی تعریف کیئے بنا نہیں پاتی۔

لندن کی خاصیت بھی یہی ہے یہ ہر رنگ کے لوگوں کو پناہ دیتا ہے۔گورے، کالے، سانولے غرض ہر قسم اور ہر رنگ کے لوگوں کو یہ اپنی نرم گرم آغوشِ فراہم کر دیتا ہے

نیلی آنکھوں والے نوجوان جادوگر لڑکے کا تماشا ختم ہو چکا تھا۔اب وہ اپنی گول ٹوپی ہاتھوں میں لیئے دائرے میں کھڑے لوگوں کے آگے پھراتے ہوئے اپنے ہنر کی قیمت وصول کر رہا تھا۔لوگوں کے ہاتھ ان کی جیبوں میں پڑے پرس اور والٹ تک جاتے اور پھر کرنسی نوٹ کے ساتھ باہر آتے۔آہستہ بڑھتے قدموں کے ساتھ تھوڑی ہی دیر میں وہ لوگوں کے بیچوں بیچ کھڑے ارحم تک پہنچ گیا

"میں نے دینا کچھ نہیں ہے بلکہ آپ سے بہت کچھ لینا ہے۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا

نیلی آنکھوں والے لڑکے نے سر اٹھا کر ارحم کے چہرے کی طرف دیکھا۔اگلے پل آنکھوں میں شناسائی اتری۔لبوں پر ایک ہلکی سی مسکان نے احاطہ کیا اور لڑکے نے ارحم کو چھوڑ کر آگے قدم بڑھا دیئے۔مجمع چھٹنے لگا بھیڑ کم ہو گئی تو لڑکا سارے پیسے سمیٹ کر اپنے سامان کے پاس آبیٹھا اور سب کچھ سمیٹنے لگا

"آخر میں نے آپ کو ڈھونڈ ہی لیا نا۔۔۔!" لوگ ادھر ادھر بکھر گئے تو ارحم اس کے پاس آبیٹھا

"ڈھونڈنے والے آخر پا ہی لیتے ہیں۔تم نے ابھی دنیا سے انوکھا کچھ بھی نہیں کیا۔" لڑکے نے

سامان سمیٹتے ہوئے ارحم کی طرف دیکھے بغیر مصروف لہجے میں جواب دیا

"تو آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا۔۔۔"

"ہاں یاد تو ہے۔۔۔لیکن میں اپنے وعدے سے مکر بھی تو سکتا ہوں" اس بار سر اٹھا کر ارحم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"آپ آرٹسٹ ہیں۔۔۔اور آرٹسٹ اپنے وعدوں سے مکرتا اچھا نہیں لگے گا۔"

لڑکے نے حیرت سے ارحم کا چہرہ دیکھا۔لاجواب ہوا

"مجھے اچھے برے لگنے کی پرواہ نہیں ہے۔آرٹسٹ بھی دوسرے انسانوں کی طرح عام انسان ہوتے ہیں۔وہ بھی اپنے وعدوں سے مکر سکتے ہیں۔" لڑکے کا لہجہ ابھی بھی سپاٹ تھا

"ہاں شاید آپ نے صحیح کہا ہے۔مگر میں آپ کو کسی صورت مکرنے نہیں دوں گا"

"وہ کیوں۔۔۔اور بھلا کیسے۔۔۔؟؟؟" لڑکے کی ہنسی نکل گئی

"وہ اس لیئے کہ اگر آپ مکر گئے تو میرے دل سے آپ کی قدر ختم ہو جائے گی۔اور پھر اگر کسی پل پر ہمارا سامنا ہوا تو میں آپ کو دیکھ کر رکوں گا نہیں بلکہ دوسری طرف سے گزر جاؤں گا۔۔۔"

"بہت دلچسپ ہو لڑکے۔۔۔خوب جمے گی ہماری۔۔۔"

"آپ آزما کر تو دیکھیں ایک بار"

"دھوکہ دے سکو گے لوگوں کو۔۔۔؟"

"دل سے دھوکہ پسند تو نہیں ہے۔پر سیکھنے کیلئے اس بار دل کی نہیں سنوں گا۔۔۔"

"کس لیئے سیکھنا چاہتے ہو یہ سب۔۔۔پیسہ کیلئے یا شوق کیلئے؟"

"نہیں۔۔۔عشق ہے مجھے آرٹ سے۔ہر طرح کے آرٹ سے۔میں اپنے ہنر کو اپنی ذات کیلئے کبھی استعمال نہیں کرتا۔۔۔"

"حالات ابھی موافق ہوں گے تمہارے۔تبھی ایسا بول رہے ہو۔"

"حالات مخالف سمت میں چلنا شروع کر دیں تب بھی میں اپنے اس خود سے کیئے گئے وعدے

سے نہیں مکروں گا۔"

"کسی بھی ہنر میں کمال تک پہنچنے کیلئے سخت محنت کرنا پڑتی ہے اور اسی ہنر سے محبت لازم اور شرطِ اول ہوتی ہے۔جانتے ہو۔؟" وہ اپنا سامان ایک بیگ میں سمیٹ چکا تو اٹھتے ہوئے بولا

" آرٹ سے محبت میں شروع سے کرتا ہوں۔اور محنت سے کبھی کترایا نہیں۔آپ مجھے لائق شاگرد پائیں گے بے فکر رہیے۔" ارحم بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا

" یاد رہے ابھی تک میں نے سکھانے کیلئے ہامی نہیں بھری لڑکے۔۔۔" وہ ایک بار پھر مسکرایا

" مجھے یقین ہے آپ بہت جلد یہ حامی بھر کر مجھے اپنی شاگردی میں لینے والے ہیں۔۔۔" ارحم بھی پرعزم تھا

نیلی آنکھوں والا لڑکا ارحم سے خاصا متاثر ہوا تھا۔اسے ارحم میں بہت کچھ نظر آیا تھا

" تم نے مجھے ڈھونڈ لیا ہے۔اس لیئے اپنے وعدے سے نہیں مکر سکتا۔تمہیں ضرور سکھاؤں گا چھوٹے لڑکے۔تم بے فکر رہو۔" اس نے بیگ کندھے کے پیچھے ڈال کے قدم بڑھانا شروع کردیئے

" تو کیا مجھے ابھی اور بھی انتظار کرنا پڑے گا۔۔یا پھر کوئی اور امتحان باقی ہے؟۔" ارحم تیز تیز چل کے اس کے سامنے آرکا

" تو پھر یہیں پل پر سیکھنے کا ارادہ ہے کیا۔۔؟" وہ مسکرادیا

ارحم نے راستہ دے دیا

" یہ کارڈ رکھ لو۔کل سے اس اکیڈمی آجانا۔"

ارحم نے کارڈ پکڑلیا۔نیلی آنکھوں والا لڑکا اس کے پہلو سے نکل کر چلا گیا۔پل پر ارحم کھڑا تھا اور آس پاس سے گزرتے لوگ۔تھوڑی دیر بعد اس نے بھی اپنے گھر کی طرف قدم بڑھادیئے

دل کے کسی کونے میں ایک خوشی نے آبسیرا کیا تھا کیونکہ اب وہ پھر کچھ نیا سیکھنے والا تھا۔اور سیکھنے سے تو ہمیشہ سے محبت رہی تھی۔

☆......☆......☆

"اب تو آپ خوش ہیں نا اماں ۔۔۔" دوپٹے پر کڑاہی کرتے ہوئے جنت نے اپنی ماں نور بانو سے پوچھا۔

وہ لوگ شاہ والی کے زمیندار گھرانے سے تھے مگر نور بانو نے شروع سے ہی جنت کو سلائی کڑاہی میں طاق کر دیا تھا

نور بانو خود بھی ہر قسم کے ہنر میں طاق تھی اور اس نے اپنے تمام ہنر اپنی بیٹی جنت میں بھی منتقل کیئے تھے ۔وہ ان عورتوں میں سے تھیں جن کی سوچ ہوتی ہے کہ ایک عورت کو ایک کامیاب اور خوشگوار زندگی گزارنے کیلئے تمام قسم کے ہنر لازمی آنے چاہیئے۔

یہی وجہ تھی کہ جنت اب ہر قسم کے گھریلو کام کر لیتی تھی پھر چاہے وہ کچن کے مختلف پکوان ہوں یا سلائی کڑاہی ہو، یا کمر بند اور پراندے بنانے ہوں اسے ہر چیز میں کمال حاصل تھا اور جنت کے ہاتھ میں نفاست بھی بہت زیادہ تھی۔

"ہاں خوش تو ہوں میں ۔۔۔ماموں جان کی خوشیاں مکمل نا سہی کچھ نا کچھ تو لوٹ ہی آئی ہیں۔" نور بانو نے اپنے ماموں دین محمد کا حوالہ دیا۔

"ایک بات مجھے سمجھ نہیں آتی اماں ۔آپ اپنے ماموں سے اتنا پیار کرتی ہیں ۔اس گھرانے سے منسلق ہر اک چیز سے محبت ہے آپ کو۔آپ کی دعاؤں میں ماموں لوگ بھی لازمی شامل ہوتے ہیں ۔مگر آپ نے آج تک وہاں قدم نہیں رکھا۔اور نا ہی مجھے کبھی جانے دیا۔۔۔اور تو اور وہ لوگ بھی ہمارے گھر کبھی نہیں آئے ۔نانوں دین محمد جب کبھی مجھے باہر راستے میں اچانک مل جائیں مجھے ہمیشہ ڈھیروں پیار بھی دیتے ہیں ۔مگر ایک دوسرے کے گھروں میں کبھی کوئی نہیں آتا۔ یہ رویوں میں اتنا تضاد کس لیئے ہے۔۔۔؟"

سالوں سے جو بات وہ من ہی من میں سوچتی رہتی تھی ،سب کے رویوں کو نوٹس کرتی رہتی آخر آج جنت نے سب کچھ باہر نکال ہی دیا تھا۔

" کچھ باتیں ہوتی ہیں جنت جو بے سبب ہوتی ہیں ۔ کچھ چیزیں ہوتی جن پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا

۔بس ہمیں وقت کے دھارے کے ساتھ خود کو بہانا پڑتا ہے۔ہم اختیار رکھتے ہوئے بھی بے اختیار ہوتے ہیں۔" ایک لمبی خاموشی کے بعد نور بانو نے بیٹی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔لیکن وہ شاید اس میں مکمل کامیاب نہیں ہوئی۔

" خوشی کو بھی میں نے کئی بار بلایا۔مگر اس نے ہمیشہ ٹال دیا۔آپ بھی اسے میرے جیسا پیار دیتی ہیں۔کبھی کبھار زمینوں پر ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔ہم لوگ بھی ہمیشہ باہر ملتے ہیں۔کبھی زمینوں پر۔کبھی دریا کنارے۔مگر ایک دوسرے کے گھر کبھی نہیں گئے۔میرا تو ہمیشہ دل کرتا ہے نانو دین محمد کے گھر جانے کو مگر۔۔۔اکثر یہی سوچ میرے ذہن میں گردش کرتی رہتی ہے کہ ایسا کیوں ہے؟"

وہ اپنا دوپٹہ رکھ چکی تھی۔دل میں سالوں سے دبی خواہشیں زبان کے راستے باہر آنے لگیں

" اتنا مت سوچا کرو جنت۔سوچیں کھا جاتی ہیں۔انسان کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیتی ہیں۔روگ ہوتی ہیں یہ سوچیں۔مت سوچا کرو ایسی باتیں۔۔۔"

" ایسا سوچوں نا تو اور کیا کروں اماں۔۔۔سب کچھ دیکھتے ہوئے،اور چاہنے کے باوجود بھی ہم اتنے بے بس ہیں پھر سوچوں نا تو اور کیا کروں۔اور پھر سوچوں پر کسی کا اختیار تھوڑی ہوتا ہے۔۔۔"

" ہاں سوچوں پر اختیار تو نہیں ہوتا مگر۔۔۔بس تم صرف دعا مانگا کرو کہ اللہ سب کے دل نرم کر دے۔آسانیاں کر دے ہم سب کیلئے۔۔۔دعاؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے جنت۔" وہ مطمئن ہوئی یا نہیں مگر خاموش ضرور ہو گئی تھی۔اور دوبارہ اپنا دوپٹہ اٹھا کر کڑاہی شروع کر دی

آج تک دونوں گھرانوں نے اپنے بچوں سے سلطان اور نور بانو کی طلاق کو مخفی رکھا ہوا تھا۔نا تو نور بانو نے کبھی جنت کو اپنی سابقہ شادی کا بتایا اور نا ہی کبھی نانی تاج نے اس بات کا ذکر خوشی سے کیا تھا۔اور وہ سب لوگ چاہتے بھی یہی تھے کہ پچھلی باتیں جو سالوں پہلے دفن ہو چکی ہیں اب کبھی ان کے بچوں تک نا پہنچیں۔کیونکہ کوئی بھی یہ بالکل نہیں چاہتا تھا کہ بچوں کے دلوں میں کدورتیں بھر جائیں۔اور انہیں بھی نا چاہتے ہوئے ایک دوسرے سے دوریاں اختیار کرنی پڑیں۔یقیناً وہ لوگ ابھی تک اس عمل میں کامیاب بھی ہوئے تھے۔

مگر وقت کے ساتھ ساتھ بڑے ہوتے بچوں کے دماغ میں بھی سوالات جنم لینے لگے تھے۔شاید وہ وقت قریب آنے لگا جب ایک تلخ حقیقت نے آشکار ہونا تھا۔اور نور بانو ہمیشہ خدا سے یہی دعا کرتی کہ یہ دن کبھی نا آئے کم از کم اس کی زندگی میں تو بالکل نا آئے۔۔۔

جنت نے خاموش ہو کر پھر سے دوپٹہ اٹھالیا۔سفید دوپٹے پر پھول کی پتیاں کاڑھتے ہوئے اس کے دماغ میں ابھی تک وہی سوالات پھن پھیلائے ناچ رہے تھے جب اس کے ابا بیرونی دروازے سے گھر میں داخل ہوئے۔جنت نے سلائی والا دوپٹہ ایک طرف رکھ کر اپنے سر پر دوپٹہ سلیقے سے درست کیا اور بابا جان کے احترام میں کھڑی ہوگئی۔

"السلام علیکم۔۔۔کیسی ہے میری سوہنڑیں دھی۔۔۔"

"وعلیکم السلام بابا۔۔۔میں بالکل اچھی ہوں۔آپ تھک گئے ہوں نا۔۔۔"

وہ زمینوں سے آئے تھے تو جنت نے اس خیال سے بابا جان سے کہا

"تھک تو جاتا ہوں مگر اپنی دھی کی صورت دیکھتے ہیں میری ساری تھکن اتر جاتی ہے۔۔۔"

زمیندار صاحب نے مسکراتے ہوئے پیار سے اپنی جنت کے سر پر دستِ شفقت رکھا۔تھوڑے فاصلے پر بیٹھی نور بانو کے دل میں بھی ایک طمانیت سی اتری تھی۔

"بابا آپ بیٹھیے۔۔۔میں کھانا بنالوں آپ کیلئے۔۔۔"

"مطلب ابھی تک کھانا نہیں بنایا تھا۔۔۔اب بناؤ گے۔۔۔؟" زمیندار صاحب نے بیٹی سے سوال کیا

"نہیں بابا۔۔۔کھانا بنا ہوا ہے آپ نہیں تھے تو میں نے آپ کیلئے آٹا گوندھ رکھ دیا تھا تا کہ بعد میں آپکو گرم گرم روٹیاں بنادوں۔۔۔"

"اچھا پھر جلدی سے بنالو۔۔۔مجھے بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔پھر میں اور میری بیٹی مل کر کھائیں گے۔۔۔"

"جی بابا۔۔۔بس آپ بیٹھیں میں پانچ منٹ میں بنا کے لاتی ہوں۔۔۔" جنت مسکراتی ہوئی

چولہے کی طرف چل دی

☆......☆......☆

"اچھا اب اپنے رشتوں سے خدا نے ملوا دیا تو تم ہم سب کو بھول ہی بیٹھے ہو" آج وہ آٹھ دن بعد پھر ڈھلتی شام کے وقت دریا کنارے ایک دوسرے سے ملے تو جنت نے میٹھے لہجے میں شکوہ کیا

"نہیں ایسا تو بالکل بھی نہیں ہے۔تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں بھلا۔۔۔؟" خوشی نے تردید کی

"ایسا ہی تو ہے بھول گئے ہو تم۔آج ہفتے سے اوپر ہو گیا ہمیں ملے ہوئے۔یاد بھی ہے کچھ"

"جو حفظ ہو چکے ہوں وہ بھلا کیسے بھول سکتے ہیں۔۔۔؟"

"حفظ کی ہوئی چیز کو بھی بار بار دہرایا نا جائے تو وہ بھول ہی جاتی ہے خوشی۔" جنت نے خوشی کو لاجواب کر دیا۔

"چیزوں اور انسانوں میں فرق ہوتا ہے جنت۔۔۔اور تم چیز نہیں ہو انسان ہو۔بہت خاص انسان ہو تم جنت" خوشی کہاں پیچھے رہنے والا تھا

"بس اب باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔دل تھا اس بار تم سے ناراض ہونے کو پر کیا کروں تم سے ناراض ہو بھی نہیں سکتی۔۔۔"

"وہ کوئی اور رشتے ہوں گے جو آپس میں ناراضگیاں پال لیتے ہیں ہم ان سب سے بہت الگ ہیں جنت۔ہم ایک دوسرے کیلیئے لازم وملزوم ہیں"

خوشی کے جواب سے جنت چپ ہو گئی شاید اس نے صحیح کہا تھا وہ ایک دوسرے کو بہت لازمی ہو چکے تھے۔

تھوڑی دیر کیلیئے خاموشی آئی تو وہ بھی چپ چاپ دریا کی آتی جاتی لہروں کو دیکھنے لگا دریا آج بھی ہمیشہ کی طرح اسی روانی سے بہہ رہا تھا۔ڈھلتے سورج کی کرنیں پانی پر پڑتی تو ایک دم سے لہروں پر چمک پیدا ہوتی۔

"کل میں نے سارا دن دادا جان کے ساتھ گزارا۔وہ سارا دن باتیں کرتے رہے۔بہت سی

پرانی باتیں۔ اپنی، میرے ابا کی۔ اور تو اور میرے چچا عمران کا بھی بتایا جو بچپن میں اسی دریا میں ڈوب گئے تھے۔ اور مجھے آج تک اس بات کی خبر ہی نا تھی"

خوشی نے لہروں پر نظریں مرکوز رکھے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بتایا

"خوشی شاید بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ہمیں معلوم ہی نہیں ہیں۔۔۔ مجھے لگتا ہے ہمارے بڑے ہم سے بہت کچھ چھپاتے ہیں۔ ہے نا۔۔؟"

"ہاں۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ کچھ نا کچھ ایسا خاص ہے جو وہ ہمیں بتانے سے کتراتے ہیں۔ ہم سے پوشیدہ رکھتے ہیں"

"ہاں شاید۔۔۔ تمہیں یہ بات نہیں کھٹکتی کہ اتنی چاہتوں اور رشتوں کے باوجود بھی ہم ایک دوسرے کے گھر کبھی نہیں جاتے۔۔۔" جنت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تو خوشی نے بھی اپنی نظریں لہروں سے ہٹا کر جنت کی طرف دیکھا

"ہاں۔۔۔ یہ بات نانی سے بھی ایک دو بار پوچھی تھی میں نے۔ مگر انھوں نے ٹال دیا۔"

اس نے ایک پتھر اٹھا کر دریا میں پھینکا جو پانی کی گہرائیوں میں اترتا خدا جانے کہاں تک جا پہنچا"

"دریا کتنا گہرا ہے نا خوشی۔۔۔ اور پھر سمندر خدا جانے کتنا گہرا ہوگا جس میں دریا کا سارا پانی سما جاتا ہے۔۔۔" جنت نے حیرت سے خوشی کو بتایا

"ہاں گہرا تو بہت ہے مگر نانی کہتی ہیں انسان اس دنیا کی سب سے گہری مخلوق ہے۔ اس دریا سے بھی گہری سمندروں سے بھی گہری۔ انسان اس قدر گہرا ہوتا ہے کوئی بھی آج تک اس کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ پایا۔ سمندروں دریاؤں کی گہرائی تو پھر بھی ماپی جا سکتی ہے۔ اور انسان پھٹ پڑے تو شاید لاوا ابل پڑے"

"اس بار گنے کی فصل بہت اچھی نکلی ہے اس لیئے بابا بہت خوش ہیں آجکل۔۔۔ کچھ مزید زمین لینے کا سوچ رہے ہیں"

"ہاں بابا۔۔۔ بڑے بڑے لوگ۔۔۔ بڑی بڑی سوچیں، بڑے بڑے منصوبے۔۔۔

ہم غریب تو ان کی سوچ کو پہنچ بھی نا پائیں۔۔۔"

"خوشی کبھی تو ان باتوں سے ہٹ کر بھی سوچا کرو۔۔۔میں تمہیں صرف ایک بات بتا رہی تھی بس"

"میں نے سچ ہی تو کہا ہے۔ہمارے ان کا کیا مقابلہ بھلا۔۔۔"

"تو تمہیں مقابلہ کرنے کا کہا بھی کس نے۔۔۔بابا اپنی جگہہ خوش تم اپنی جگہہ خوش۔۔۔"

"جھلی ہو تم جنت۔۔۔کل کو انہوں نے ہی مجھ سے پوچھنا ہے کہ تمہارے پاس ہے بھی کیا۔۔۔"

"وہ کیوں پوچھیں گے بھلا۔۔۔" جنت سمجھی ہی نہیں کہ خوشی کس طرف اشارہ کر رہا ہے اور جب سمجھ میں آیا تو شرما کر سرخ پڑنے لگی۔آنکھوں کی پلکیں رکوع میں جھک گئیں

"کچھ اور بھی سوچ لیا کرو۔۔۔ان باتوں کے علاوہ۔۔۔"

"مجھے اور کچھ سجھائی دیتا ہی نہیں دیتا۔۔۔کیا کروں۔۔۔؟"

"کوئی کام دھندہ کیوں نہیں کرتے تم۔کشتی چلاؤ،مچھلیاں پکڑا کرو باقی سب کی طرح۔تم کچھ کام کیوں نہیں کرتے خوشی؟؟؟

"ہاں میں بھی سوچ رہا ہوں کچھ نا کچھ کرنے کا۔۔۔سوچتا ہوں دادا سے بات کر کے ایک کشتی بنوا لیتا ہوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے اس طرح فراغت بھی ختم ہو جائے گی کچھ پیسہ بھی ہاتھ آجائے گا اور یہ جو سارا دن تم الٹی سیدھی باتیں سوچتے رہتے ہو ان سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔۔۔"

خوشی جنت کی بات سن کر مسکرا دیا۔دریا بھی دور سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا

وہ ایسے ہی ایک دوسرے کے ساتھ اپنی باتیں،اپنے دن بھر کی کارستانی بانٹتے تھے۔جانے یہ کیسی محبت تھی ان دونوں کی جسے آج تک اقرار کی بیساکھی کی ضرورت نہیں پڑی تھی بس ایک حسین اور خوبصورت احساس کی ان دیکھی ڈور تھی جس سے ان دونوں کی محبت بندھی ہوئی تھی۔دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو وعدوں اور قسموں میں نہیں جکڑا مگر وہ جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کیلئے کس قدر لازم و ملزوم ہیں۔۔۔

کچھ رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں سچے، پاک، پرخلوص، محبتوں سے بھرے۔اور ان دونوں کا آپسی رشتہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔
شام آہستہ آہستہ مزید گہری ہونے لگی تھی سورج اپنے زوال کے قریب آپہنچا تو وہ دونوں بھی اپنے ہاتھ اور کپڑے جھاڑتے دریا کنارے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے گھروں کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ان کی پیٹھ پیچھے وہی دریا تھا جو اپنی ازلی روانی سے خدا جانے کتنے برسوں سے بہہ رہا تھا۔اور دریا کے پانیوں کے پار زرد سا آگ کا گولا اب چھپنے کے قریب تھا شاید رات کے اندھیرے سے منہ چھپانا چاہ رہا تھا۔
بس یہی تو زندگی ہے۔سورج ابھرتا ہے۔گرم ہوتا ہے۔آہستہ آہستہ اپنا سفر شروع کر دیتا ہے۔اور رات ہونے سے پہلے اپنی کھاہ میں جا چھپتا ہے۔پھر رات اترتی ہے دنیا پر اپنی کالی عمیق گہری چادر پھیلا دیتی ہے۔ایک پل ایسا بھی آتا ہے جب ساری دنیا اور دنیا کی ہر چیز خاموش ہو جاتی ہے۔ہر طرف سناٹا اور چپ چاپ جامد خاموشی چھا جاتی ہے۔پھر وہ عمیق اندھیرے والی رات تھک ہار کر سورج کو آواز دیتی ہے۔بلاتی ہے کہ میں تھک گئی ہوں۔میری تلاش ناکام ہوئی۔اب باہر آجاؤ۔
تبھی پھر سے سورج چپکے چپکے سے اپنی پوشیدہ کھاہ سے چھوٹی چھوٹی چندھیا آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ کیا رات نے سچ کہا ہے؟ واقعی ہار مان لی ہے یا یہ اس کی کوئی چال ہے۔؟
جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ واقعی رات نے ہار مان لی ہے اور وہ اس کی تلاش میں ناکام ہو گئی ہے تو مسکراتا ہوا ابھرتا ہے۔کسی فاتح کی طرح سینہ پھیلائے کھڑا ہو جاتا ہے اور پورے جہان پر روشنی کے تھال انڈیل دیتا ہے ساری دنیا کو زرد زرد کرنوں میں نہلا دیتا ہے۔۔اور پھر سے زندگی چل پڑتی ہے۔پورا ایک دن اور ایک رات مکمل ہو جاتی ہے۔کیلینڈر کی ایک تاریخ مزید آگے بڑھ جاتی ہے۔یہی تو زندگی ہے۔۔۔

☆......☆......☆

کلاس لینے کے بعد وہ اپنے گروپ فیلوز کے ساتھ کالج گراؤنڈ میں آبیٹھا تھا۔کوکب دو دن کی غیر حاضری کے بعد آج کالج آئی تھی۔دو دن رہنے والے مسلسل بخار نے اسے خاصا نقاہت کا شکار کر دیا تھا۔چہرہ بجھا بجھا سا تھا اور آج وہ اپنی طبیعت کے برخلاف خاموش سی بیٹھی تھی ورنہ کوکب کبیر اور خاموشی ایک دوسرے کے متضاد تھے۔دونوں کا ایک وقت میں ایک ہی جگہہ پایا جانا۔۔۔بہت مشکل تھا۔

"آج خیر تو ہے صبح سے اتنی چپ چپ کیوں ہو۔۔۔کہیں کچھ غیر معمولی ہوا ہے کیا۔۔۔؟"

اس کی خاموشی کو ارحم سمیت نوٹ سب نے کیا مگر پہل ڈینئیل نے کی

"کہاں یار۔۔۔دو ہفتے بعد فائنل ہیں اور تیاری خاک بھی نہیں۔۔" وہ اداسی سے منہ بنا کر ارحم کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوئی جیسے اس سے مدد طلب کر رہی ہو

"تو ابھی بھی بہت سا وقت پڑا ہے۔دو ہفتے کم تو نہیں ہوتے۔"

"کہاں یار۔۔۔دو ہفتے یوں گزر جانے ہیں یوں۔۔۔"کوکب نے دو تین چٹکیاں بجاتے ہوئے کہا

"آخر ثابت کر دیا نا سست قوم سے اپنا تعلق۔۔۔تم دو ہفتوں کو کچھ نہیں سمجھتی۔دنیا فتح ہو سکتی ہے دو ہفتوں میں۔" ڈینئیل کے مذاق نے پورے گروپ میں مسکراہٹ بکھیر دی

"سست قوم سے کیا مراد ہے تمہاری۔۔۔؟؟؟

مطلب ہم لوگ سست ہیں نکمے ہیں۔۔۔؟؟؟" اس بار ارحم بیچ میں کودا

"ہاں مسلم سست قوم تو ہیں نا۔۔۔یہ تو ماننا پڑے گا تم سب کو۔۔۔"

"کیسے ثابت کر سکتے ہو تم۔۔۔؟؟؟

تم جانتے ہو مسلمان قوم نے دنیا پر حکومت کی ہے۔تاریخ بھری پڑی ہے۔کبھی پڑھ کے دیکھنا۔"کوکب سے اپنی قوم کی بے عزتی برداشت نا ہوئی تو تلخ لہجے میں گویا ہوئی

"ہاں مانتا ہوں۔۔۔مگر یہ بھی تو مان لو ہم نے بغیر جنگ کیئے وہاں پر حکومت کی سو سال تک اپنا راج قائم رکھا۔۔۔وہ بھی لڑے یا کوئی قتل و غارت کیئے بغیر۔۔۔یہ سستی اور کاہلی نہیں تو اور کیا ہے

۔۔۔؟؟؟" ڈینیئل نے دونوں کو لاجواب کر دیا
" شاطرانہ چالوں کے زریعے گھسے تھے تم لوگ۔۔۔خون خرابا تو ہونا ہی نہیں تھا۔۔۔" کوکب اس کے مدمقابل تھی کہاں ہار مان لیتی وہ
" اپنی کمزوریوں کو ختم نہیں کرو گے تو سبھی فائدہ اٹھائیں گے تمہارا۔اور یہی تو سب سے بڑا مسئلہ ہے تم لوگ اپنی کمزوریاں ختم کرنے کی بجائے دوسروں پر الزام لگاتے پھرتے ہو شاطرانہ چالوں کا۔۔۔"
" ہمارے اندر کمزوریاں ضرور ہوں گی مگر ہم نے کبھی کسی پر الزام تراشی نہیں کی۔جھوٹ ہماری مٹی میں ہی نہیں ہے۔ہمیشہ سچے کو سچا اور جھوٹے کو جھوٹا بولتے ہیں" کوکب نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا
" بس کرو یار۔۔۔پچھلے سو سال میں تم لوگوں نے کیا ہی کیا ہے بتاؤ مجھے۔۔۔دنیا چاند تک پہنچ تک پہنچ گئی ہے اور تم لوگ جہاں تھے ابھی تک وہیں رکے ہوئے ہو۔۔۔"
" ایسی بات نہیں ہے ڈینیئل۔۔۔بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔اس کے برعکس مسلمانوں کے کارنامے دیکھو تو دنیا میں ہر میدان میں انہوں نے اپنا لوہا منوایا۔۔" ارحم نے دفاع کیا
" چھوڑو وو یار۔۔۔یہ کیا تم لوگ سو سال پرانے مسئلوں کو لے کر بیٹھ گئے ہو۔۔۔کتنا پیارا موسم ہے اور تم لوگ سارا مزا کر کرا کر رہے ہو۔" کرسٹی نے کھڑے ہوتے ہوئے بحث کو مزید بڑھنے سے روکا۔
ارحم نے گردن اوپر اٹھا
کر دیکھا۔واقعی بادل پانی سے بوجھل ہو چکے تھے۔برسنے کو تیار۔جیسے اب مزید پانی کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوں۔
" یہ لندن کے موسم کا بھی ہمیشہ سے ایسا رہا ہے کچھ بھی اعتبار نہیں ہوتا۔ابھی گھنٹہ پہلے تو آسمان بالکل صاف تھا" سٹیوارٹ نے لندن کے غیر یقینی موسم کا شکوہ کیا
" اوہ شٹ یار۔۔۔میں تو اپنا رین کوٹ بھی گھر بھول آئی ہوں۔پہلے ہی ٹمپریچر نے بڑی مشکل سے جان چھوڑی ہے۔کہیں پھر سے بستر نا پکڑ لوں۔یا اللہ کیا ہو گا میرا۔۔۔اوپر سے فائنل ایگزام۔۔۔"

کوکب نے رونی صورت بناتے ہوئے دہائی دی تو سارے گروپ نے قہقہہ لگایا سوائے ارحم کے جس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا

"ہنس لو سب۔۔۔کرسٹی تمہیں تو میں کبھی نہیں بخشوں گی" اس نے کرسٹی کو ہلکا سا مکا جڑ دیا

ابھی وہ لوگ گراؤنڈ میں ہی تھے کہ آسمان پر بنے بوجھل بادلوں نے پانی کے چھاجھ انڈیل دیئے۔سب نے برامدے کی طرف دوڑ لگائی جو قریب دو سو گز کے فاصلے پر ہوگا۔مگر اتنے سے وقفے میں بھی پانی نے ان سب کو اچھا خاصا بھگو دیا تھا۔

برامدے میں پہنچ کر سب نے سکھ کی سانس لی۔مگر ارحم نے کلاس روم کی طرف قدم بڑھا دیئے۔۔۔

"یہ اگست کی بارش تھی مطلب اب یخ کر دینے والی سردیوں نے آنے کی پوری تیاری پکڑ لی ہوگی۔لندن کی سردیاں۔لندن کی سردیاں اففففف مجھے تو بہت پسند ہیں" کرسٹی جوش سے ہاتھ ملتے ہوئے بولی

"ہاں بندے کی قلفی بن جاتی ہے۔زندگی مفلوج۔اور تمہیں بہت پسند ہے۔"کوکب نے چوٹ کی

تھوڑی ہی دیر میں ارحم رین کوٹ پہنے بارش میں شرابور بھاگتا ہوا آپہنچا۔پانی کے بے شمار قطروں نے اس کے کوٹ پر مسلسل زور آزمائی کی مگر وہ کوٹ کی وجہ سے زیادہ بھیگنے سے محفوظ رہا

"یہ لو پہن لو۔۔۔اور جلدی گھر جانا آج۔۔۔اور کل سے تمہاری تیاری میں اور کرسٹی مل کے کروائیں گے"

ارحم نے برامدے میں پہنچتے ہی کوٹ اتار کر کوکب کی طرف بڑھایا

سارے گروپ نے" اووو" کی مجموعی آواز نکالی۔

کوکب نے کوٹ پکڑ کر پہن لیا

دل میں خوشی سے لڈو پھوٹنے لگے

(بدلے میں تمہارا ساتھ اگر حاصل ہونے لگے تو میں تو روز بیمار ہونے کو تیار ہو جاؤں) کوکب نے دل ہی دل میں سوچا مگر زبان پر کچھ بھی نا لا سکی

" لگتا ہے تمہاری قسمت پلٹنے لگی ہے۔۔۔" کرسٹی نے چٹکی کاٹتے ہوئے کوکب کے ساتھ سرگوشی کی۔ کرسٹی ہی اس کی واحد سہیلی تھی جو ارحم سے متعلق اس کے جذبات سے واقف تھی۔

" میری قسمت اتنی جلدی بدلنے والی نہیں۔۔۔"

" شروعات تو ہوگئی نا۔۔۔" اس کی سرگوشیاں جاری رہی

" خدا جانے۔۔۔ویسے پتھروں میں دل تو نہیں ہوتے۔۔۔"

" یہ کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے لڑکیو۔۔۔" زاہد نے ان دونوں کو کھسر پھسر کرنے پر ٹوکا

" کچھ نہیں۔۔۔ہم بس موسم ڈسکس کر رہے تھے۔۔۔" کوکب نے کھنکھارتے ہوئے بات کو سنبھالا

بارش اب بھی اسی زور سے جاری تھی۔ پورے گراؤنڈ میں اب پانی بھر چکا تھا۔

" میرے خیال میں اب گھر چلنا چاہیے۔ بارش کے رکنے کے کوئی موڈ نظر نہیں آتے۔" مسلسل بارش نے زاہد کو مایوس کر دیا

" اور سر جوزف کی کلاس کا کیا ہوگا۔۔۔سر کو اسائنمنٹس بھی سبمٹ کرانی ہیں" ڈینیئل نے خبردار کیا

" اب اس بارش میں کلاس کون لے یار۔۔۔ چلتے ہیں بس۔ سٹیوارٹ گاڑی لایا ہے۔ ہم سب کو ڈراپ کر دے گا۔۔۔کل کا کل دیکھا جائے گا" کرسٹی نے بھی زاہد کی سائیڈ لی

اور ان کی بات مان لی گئی وہ سب سٹیوارٹ کی گاڑی میں اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے

☆......☆......☆

آج پھر سلطان کو مقررہ وقت سے پہلے سٹور سے اٹھنا پڑا۔ طبیعت پھر نقاہت کا شکار تھی۔ پچھلے دو ہفتوں سے وہ کافی کمزور نظر آنے لگے تھے۔ ارحم بھی اس بات کو نوٹس کر کے انہیں اپنی گرتی صحت کی طرف توجہ دینے کی تلقین کر چکا تھا۔ ابھی تین دن پہلے ہی سلطان نے ارحم کے کہنے پر نزدیکی ہاسپٹل سے چیک اپ کروایا تو ڈاکٹرز نے اسے سٹی ہاسپٹل میں ڈاکٹر فلپس کو ریکومنڈ کیا۔ اور اسی دن وہ سٹی ہسپتال بھی چلے گئے۔ جہاں ضروری ٹریٹمنٹ کے بعد دو دن بعد رپورٹ لینے کو کہا گیا تو اسی سلسلے میں آج وہ

پھر ڈاکٹر فلپس سے ملنے چلا آیا۔

اپنی طبیعت کی خرابی سے وہ خود بھی پریشان رہنے لگا تھا۔مسلسل رہنے والے ہلکے ہلکے بخار کے سبب وہ خود بھی ہر وقت نقاہت کا شکار رہنے لگا۔مگر سلطان نے اتنا سنجیدگی سے اس بات کی طرف توجہ نا دی۔اگر ارحم ضد نا کرتا تو شاید وہ چیک اپ کیلئے بھی نا جاتا۔اس سے پہلے کبھی سلطان نے خود کو اس طرح بیمار نہیں کیا تھا۔نا ہی کبھی اس قدر خود سے لا پرواہی برتی تھی

جانے کیوں اب اسے اپنی ذات کی فکر نہیں رہتی تھی۔اگر فکر رہتی تو اب صرف ارحم کی۔خود کی ذات کو جیسے وہ بھولتا جا رہا تھا۔اپنی پرواہ کرنا وہ چار ماہ پہلے سے چھوڑ چکا تھا جب سے فاخرہ اسے چھوڑ کے گئی تھی۔

ہسپتال میں ڈاکٹر فلپس کے روبرو بیٹھے اسے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے۔جب معاون نے سلطان کی رپورٹس فائل میں ڈاکٹر فلپس کے سامنے لا کر رکھیں۔۔۔ڈاکٹر نے ایک بار پھر رپورٹ کو پڑھنا شروع کر دیا۔اسی سارے دورانیے میں سلطان سامنے بیٹھا بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔

بے اختیاری طور پر وہ کرسی کے نیچے اپنے ایک پاؤں کو مسلسل ہلا رہے تھے۔

"مسٹر سلطان۔۔۔میرے پاس آپ کے لئے ایک مایوس کن خبر ہے اور وہ یہ کہ آپ بلڈ کینسر میں مبتلا ہو رہے ہیں۔۔۔" رپورٹس کو مکمل پڑھنے کے بعد اور تھوڑی دیر خاموشی کے بعد ڈاکٹر نے دھماکہ کیا۔

"بلڈ کینسر۔۔۔یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔؟؟؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔۔۔؟؟؟" آواز بڑی مشکل سے سلطان کے گلے سے باہر آئی

"اتنا پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔یہ ابتدائی سٹیج ہے اور بہت جلد ہم اس پر قابو پا لیں گے۔۔۔" ڈاکٹر نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر دلاسہ دیا

"مگر میں۔۔۔مجھے کیسے ہو سکتا ہے کینسر۔میں اچھا خاصا تو ہوں۔۔۔پھر یہ کینسر۔۔کیسے؟؟؟" سلطان کا لہجہ ٹوٹنے لگا

" جی بالکل ۔۔۔آپ اچھے خاصے ہیں ابھی ۔مگر میں نے آپ کا کیس مکمل سٹڈی کرلیا ہے ۔ یہ بہت خوش کن بات ہے کہ آپ نے جلد ہی علاج کا سوچا ورنہ دیر بھی ہو سکتی تھی ۔۔۔مگر ابھی ہم اسے با آسانی کنٹرول کر سکتے ہیں ۔آپ تسلی رکھیئے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔"

" وہ تو ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب ۔۔۔مگر مجھے یہ کیسے لاحق ہو گیا ۔پلیز مجھے کچھ سمجھائیے ۔ایسے اچانک یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔" وہ غیر یقین تھا ۔کینسر کا نام لینے سے گھبراہٹ ہونے لگی ۔اس کا کرسی کے نیچے مسلسل حرکت کرتا پاؤں بھی اب ایک جگہ رک چکا تھا

" دیکھیئے میں آپ کو سمجھاتا ہوں ۔۔۔یہ کینسر ہمارے جسم کے خلیئوں سے شروع ہوتا ہے ۔ یہ خلیئے دراصل چھوٹی چھوٹی باریک مائیکروسکوپک اینٹوں کی شکل کے ہوتے ہیں جس سے ہمارے اعضاء اور بافتیں وجود میں آتی ہیں ۔اور ہمارا جسم افزائش پاتا ہے یا کسی چوٹ کے نتیجے میں دوبارہ مرمت ہو جاتا ہے ۔" ڈاکٹر فلپس سانس لینے کیلئے رکے

" آپ کی باتیں ٹھیک ہیں مگر میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا جو مجھے کینسر جیسا خطرناک مرض لاحق ہو جائے پھر یہ کیوں ۔۔۔مجھے کیوں ہو گیا یہ کیسے سب ۔۔۔؟؟؟" سلطان کا دل ڈوبنے لگا تو اس نے ڈاکٹر کی بات بیچ سے ہی اچک لی ۔

" اوووہ ہووو ۔۔۔اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر سلطان ۔اس میں بعض اوقات انسان کی کوئی غلطی نہیں ہوتی مگر پھر بھی اسے کینسر لاحق ہو جاتا ہے ۔میں نے آپ کا کیس بہت اچھے سے سٹڈی کیا ہے ۔آپ کی مسلسل نقاہت ،کمزوری ،روز بروز گرتا ہوا وزن یہ سب رپورٹس یہ دیکھیں یہ سب ثبوت ہیں ۔۔۔میں آپ کی کیفیت سمجھ سکتا ہوں ۔آپ حوصلہ رکھیئے ۔ہم بہت جلد اس پر قابو پا سکتے ہیں ۔کیونکہ یہ اسکی ابتدائی سٹیج ہے ۔جسے لموفیا کہتے ہیں ۔جو خلیئے ہمارے جسم میں غیر ضروری طور پر کسی وائرس کے داخل ہونے یا کسی اور وجہ سے بن جاتے ہیں وہ غیر ضروری خلیئے مزید خلیوں کو جنم دیتے رہتے ہیں ۔جس سے ہمارے خلیات میں ان تمام غیر ضروری خلیات کی گلٹیاں سی بن جاتی ہیں جو بعض اوقات کینسر کی وجہ بن جاتے ہیں ۔۔۔

یہ لیوکیمیا اسکی ابتدائی سٹیج ہے۔مگر ہمارے ہاسپٹل میں کیموتھراپی کی سہولت موجود ہے ۔۔۔آپ کو صرف مایوس ہوئے بغیر ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔۔۔آپ ٹھیک ہوسکتے ہیں مسٹر سلطان ۔آپ مجھے سن رہے ہیں نا۔۔۔"

ڈاکٹر فلپس نے اسے تفصیل سے اس کی بیماری کے متعلق سمجھاتے ہوئے اسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔مگر وہ کچھ نہیں سن رہا تھا وہ غیر یقین تھا۔ڈاکٹر فلپس کیا تقریر جھاڑ رہا ہے اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آیا۔اس کے کانوں میں تو بس ڈاکٹر فلپس کا پہلا فقرہ مسلسل گونج رہا تھا

"مسٹر سلطان۔۔۔آپ بلڈ کینسر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔۔۔"

☆......☆......☆

میمونہ صدف کا بہت خوبصورت نیا ناول

سپاس گزار

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

راحت جبیں کا بہت خوبصورت نیا ناول

انگناں پھول کھلیں گے

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

اٹھارہواں حصہ

سلطان چپ چاپ رپورٹ اٹھائے ہسپتال سے باہر نکل آئے اگر مایوسی کے کچھ زینے ہوتے ہیں تو آج وہ مایوسی کے آخری زینے پر تھے جس کے بعد انسان کو دکھائی کچھ نہیں دیتا، سنائی کچھ نہیں دیتا۔۔ڈاکٹر فلپس کے الفاظ اس کے کانوں پر ابھی تک ہتھوڑے برسا رہے تھے۔

حالانکہ ڈاکٹر نے اسے علاج کی مکمل یقین دہانی کرائی۔مگر وہ ابھی تک بے یقین تھے۔من ہی من میں سوچنے لگے کہ آگہی واقعی عذاب ہوتی ہے۔کتنا اچھا ہوتا کہ وہ ڈاکٹر سے علاج کیلئے ملتے ہی نا۔اسے اپنی بیماری کے بارے میں معلوم ہی نا ہوتا۔وہ اندر ہی اندر گھلتا رہتا اور ایک دن مٹی تلے جا سوتا۔ویسے بھی تو مرنا ہی ہے نا۔۔۔

بوجھل قدموں کے ساتھ وہ گاڑی تک پہنچا۔بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ اپنے گھر تھا۔پورے گھر میں خاموشی کا غلبہ تھا۔مکمل سکوت۔کام والی کل وقتی ملازمہ حمیدہ خالہ جو کہ پاکستان سے ہی تھی گھر کی صفائی میں مصروف تھی۔اور ارحم اپنی آرٹ کی ایوننگ کلاس سے ابھی واپس ہی نہیں آیا تھا۔۔۔

"آج آپ جلدی آگئے صاحب۔۔۔کھانا لگاؤں آپ کیلئے۔۔۔؟" صاحب کو آج خلاف عادت جلدی واپس آتے دیکھا تو صفائی چھوڑ کر حمیدہ بائی ان کے پاس چلی آئی

"گھر کتنا خاموش ہوگیا ہے نا حمیدہ۔۔۔" سلطان نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے پورے گھر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا

"ہاں صاحب۔۔۔سچ کہوں تو گھر تو عورت کے دم سے ہی بنتا ہے۔عورت کا وجود ہی گھر کی مکمل تکمیل کا باعث بنتا ہے۔۔۔فاخرہ بی بی کے بعد واقعی اب یہ گھر، گھر نہیں لگتا۔۔۔"

"ہاں صحیح کہتی ہو تم گھر تو عورت کے دم سے ہی مکمل ہوتا ہے۔فاخرہ کے بعد کچھ بھی وہی اپنا سا نہیں لگتا۔ہر چیز اجنبی ہر چہرہ غیر شناسا لگتا ہے۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں تائید کی

"صاحب برا نا لگے تو ایک مشورہ دیتی ہوں۔گو کہ ابھی وقت مناسب نہیں ہے پھر بھی آپ ارحم بابا کی دلہن لے آئیں۔گھر سنبھالنے والی آجائے گی تو پھر سے گھر مکمل ہو جائے گا" سلطان نے اچھنبے سے حمیدہ بائی کی طرف دیکھا۔جیسے سوچ رہا ہو کہ اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا

مگر اس نے مزید کوئی بات نہیں کی وہ اپنی رپورٹس اٹھائے اپنے روم میں چلا آیا۔حمیدہ خالہ کی بات ادھوری رہ گئی اسے ہاں نا کا کوئی جواب نہیں مل سکتا۔وہ اندر جاتے ہوئے سلطان کی پیٹھ کو تھوڑی دیر تکنے کے پھر سے اپنے کام میں جت گئی

تمام رپورٹس اپنے پرسنل لاکر میں رکھ کر اسے بند کیا۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کی بیماری کے بارے میں ارحم کو کچھ پتا چلے۔۔۔اور وہ افسردہ ہو

ڈاکٹر فلپس نے اگلے ہفتے میٹنگ کے لیئے وقت دیا تھا جس میں سلطان کے علاج کیلئے مزید کیمو تھراپی کے کچھ سیشن کرنے تھے۔۔۔رپورٹس رکھنے کے

بعد وہ اپنے بیڈ پر دراز ہو گئے

آج فرصت سے کچھ وقت میسر آیا تو اسے پھر سب اپنے یاد آنے لگے۔سوچوں کے بے لگام گھوڑے پھر ہزاروں میل دور شاہ والی تک جا پہنچے

کتنا بے قدرا تھا میں۔جب سب میسر تھا سب اپنے،سب رشتے،ان کی بے لوث محبتیں پاس تھیں تب تو مجھے قدر ہی نہیں تھی احساس ہی نہیں تھا۔یہ سب بھی تو خدا کی نعمتیں ہی نا ہیں جو ہمیں بغیر مول عطاء کی جاتی ہیں۔تبھی تو ہم انسان ان نعمتوں کی قدر نہیں کرتے۔جو چیز مفت میں مل جائے انسان اس کی قدر ہی کھو دیتا ہے۔یہ سب رشتے،رشتوں سے جڑی محبتیں یہ سب خدا کی نعمتیں ہی تو ہیں۔پر ہم قدر ہی نہیں کرتے۔احساس ہی نہیں ہوتا ہمیں۔اور جس نعمت کی قدر کرنا ہم چھوڑ دیتے ہیں شکر کرنا چھوڑ دیتے ہیں احساس کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو خدا بھی ہم میں سے اپنی وہ نعمت اٹھا لیتا ہے،واپس لے لیتا ہے۔خدا

کو بے قدری پسند ہی نہیں ہے۔

من وسلویٰ اللہ نے اسی لیئے تو اٹھالیا تھا کیونکہ وہ مفت کا تھا۔کسی کو قدر ہی نہیں تھی اس مفت کی نعمت کی۔تو خدا نے واپس لے لیا۔۔

آج زندگی میں پہلی بار وہ اپنے آپ کو خود احتسابی کے مرحلے سے گزار رہا تھا۔اپنی عدالت میں اپنے سامنے خود کو کھڑا کیئے خود ہی اپنا احتساب کرنے لگا

مجھے جانا چاہیئے۔مجھے واپس پاکستان جانا چاہیئے۔سب سے معافی مانگنی چاہیئے۔پر کس منہ سے واپس جاؤں گا۔ابا کیا بولیں گے۔جب انہیں بیٹے کے جوان کندھوں کی ضرورت تھی تب وہ کیوں انہیں چھوڑ کر بھاگ گیا آج بیس بعد بوڑھے باپ کی یاد آئی ہے؟۔

اماں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔؟ ملوکھاں ،میرا بچہ جو ارحم سے بھی دو سال بڑا ہو گا۔مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ میری بیٹی ہے یا بیٹا۔میرا بچہ جس نے بیس اکیس سال تک باپ کا چہرہ بھی نہیں دیکھا۔کیا وہ مجھے اپنے باپ کے طور پر قبول کرلے گا۔۔؟

اور جنت وہ جب اپنا قصور پوچھے گی تب کیا جواب دوں گا میں۔سلطان خان تب کیا جواب دو گے تم۔۔۔؟؟؟

نہیں سلطان وہ سب تمہارے بغیر خوش ہونگے۔انہیں تمہارے بغیر جینے کی عادت پڑ چکی ہوگی۔ اب پھر پاکستان جا کر ان سب کی پرسکون زندگیوں میں پھر سے دخل مت دو۔وہ سب تمہارے بغیر جینا سیکھ چکے ہیں۔۔۔وہ سب تمہارے بغیر خوش ہوں گے۔اپنی منحوسیت خود تک محدود رکھو۔پھر سے ان معصوم لوگوں کو کوئی روگ مت دو۔"

ضمیر کی عدالت لگ چکی تھی۔اور وہ کٹہرے میں سر جھکائے کھڑا تھا۔اپنی صفائی میں بولنے کو اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔اس نے کندھے گرا دیئے ہر سزا کیلئے۔۔

"سلطان خان تم ایک ناکام انسان ہو۔بے قدرے انسان ہو۔تمہارے اندر احساس کا مادہ مر چکا ہے۔تمہاری کوئی سزا نہیں ہے۔تمہارے لیئے یہی سزا کافی ہوگی کہ تم خود کو سزا دیتے رہو۔اندر ہی اندر

پگھلتے رہو، سلگتے رہو، قطرہ قطرہ، دھیرے دھیرے جیسے موم بتی پگھلتی ہے۔تماری اور کوئی سزا نہیں ہے۔تمہاری یہی سزا ہے۔اور یہ سزا تا حیات ہے،کوئی ضمانت،کوئی رہائی نہیں ہے تمہارے لیئے،تمہارے لیئے کوئی معافی نہیں ہے۔۔۔" اس نے اپنے ضمیر کی عدالت میں خود کو مجرم ٹھہرا کر سزا سنادی تھی

آج اس کی بے بسی عروج پر تھی۔ندامت تھی جس نے سلطان کے پورے وجود کو اوڑھ رکھا تھا۔لوگ لوگوں کی نظروں میں گر جاتے ہیں۔وہ بھی گاؤں والوں کی نگاہ میں گرا ہوا ہوگا مگر آج جب اس نے اپنا احتساب کیا تو وہ اپنی ہی نظروں میں گر گیا۔دوسروں کی نظروں سے گرا انسان شاید دوبارہ اٹھ کھڑا ہو سکتا ہے خود کو سنبھال سکتا ہے۔مگر جو لوگ اپنی ہی نظروں میں گر جائیں وہ دوبارہ کبھی اٹھنے کے قابل نہیں رہتے۔دوبارہ کبھی سنبھل نہیں سکتے۔اور آج سلطان اپنے ضمیر کی عدالت کی پہلی سنوائی پر اپنی نظروں سے گر گیا تھا

☆......☆......☆

لندن کی یخ کر دینے والی صبح میں آج جوائے لینڈ پارک کی گہما گہمی پہلے کی نسبت کافی حد تک کم تھی۔حالانکہ اکثر یہ پارک صبح صبح ایکسر سائز کیلئے آئے لوگوں سے بھرا رہتا تھا خصوصاً ہفتے اور اتوار کے روز تو یہ پارک عوام سے کھچا کھچ بھرا رہتا مگر رات دیر تک رہنے والی برف باری کے سبب والکنگ ٹریک ابھی تک برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔شاید اسی خیال سے آج پارک میں لوگوں کا وہ رش نظر نہیں آرہا تھا جو کہ یہاں کا خاصہ ہے۔

مگر کوکب کبیر کے جنون کے آگے اس یخ کر دینے والی ٹھنڈ نے بھی گھٹنے ٹیک دیئے تھے کیونکہ پچھلے سوا گھنٹے سے نا صرف وہ خود جوگنگ کر رہی تھی بلکہ اپنے ساتھ ساتھ خود سے دو سال چھوٹی بہن انجم کبیر کو بھی عذاب میں ڈالا ہوا تھا۔اور وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے کوکب کو دہائیاں دیئے جا رہی تھی۔

" آخر کب ختم ہوگی یہ جوگنگ مارچ۔۔۔؟" انجم نے کوکب کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے اور ہانپتے ہوئے کہا۔

" مجھے ہر حال میں اس بار رننگ کمپیٹیشن جیتنا ہے اور ٹینس میں بھی میڈل لینا ہے۔اس کیلئے

مجھے کچھ دیر مزید ورزش کرنی ہے تم تھک گئی ہو تو جاؤ بینچ پر بیٹھ کے میرا انتظار کرو۔۔۔" آخر کوکب نے اس کے بار بار پوچھنے پر انجم کو بیٹھنے کی اجازت دے دی مگر اس کے خود کا ابھی ایسا کوئی موڈ نظر نہیں آ رہا تھا۔

انجم نے شکر ادا کیا اور ساتھ پڑے بینچ پر جا کر بیٹھ گئی۔

پارک میں ابھی بھی کہیں کہیں کسی کونے پر ایکسر سائز کرتے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔

آدھے گھنٹے کی مزید پریکٹس کے بعد وہ بھی تھک کر بہن کے ساتھ بینچ پر آ بیٹھی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

" آخر تمہارے سر پر یہ رننگ کا بھوت کیوں اور کب سے چڑھ گیا ہے۔۔۔" کوکب کے پاس بیٹھتے ہی انجم نے پہلا سوال داغا

" تین دن پہلے سے۔۔۔اور یہ سب کرسٹی کو چیلنج ہرانے کیلئے کر رہی ہوں میں۔اس کا دعویٰ ہے کہ میں یہ کمپیٹیشن کبھی نہیں جیت سکتی۔میں نے اسے جیت کے دکھانا ہے۔۔۔" کوکب نے تفصیل سے اسے جواب دیا۔اچھا تو یہ وجہ تھی

" ایک تو تم اور تمہارے دوستوں کا گروپ۔۔۔ہمیشہ ہی عجیب رہے ہو سارے۔۔۔"

" کیوں یار۔۔۔اب اس میں عجیب کیا ہے۔۔۔؟" کوکب حیران ہوئی

" عجیب ہے نا۔۔اچھی بھلی مزے سے سوئی تھی اب تمہارے ساتھ ساتھ اس سردی میں مجھے بھی خوار ہونا پڑ رہا ہے۔" وہ جلی بیٹھی تھی

" اچھا ہی ہے نا یار۔۔۔اب تمہیں سارا دن سونا ہی ہے نا یا پھر ڈیڈ کے ساتھ کتابوں میں سر کھپانا ہے اس بہانے چلو تم نے صبح کی روح پرور ہوا بھی کھالی۔۔۔"

انجم کو کتابیں پڑھنے کا شوق کبیر صاحب سے وراثت میں ملا تھا وہ اپنا سارا فارغ وقت باپ کی چھوٹی سی لائبریری میں گزار دیتی اور یہی اس کا پسندیدہ ترین مشغلہ بھی تھا۔

انجم کا شمار ان لوگوں میں تھا جو کتابیں کھاتے اور کتابیں پیتے ہیں۔

" تو ٹھیک ہے نا۔کتابوں سے کچھ نا کچھ حاصل ہی ہوتا ہے جاتا تھوڑی ہے۔۔۔"

وہ دونوں اب آہستہ آہستہ چلتی گھر کی جانب جا رہی تھی اور قریب کوئی پندرہ منٹ بعد وہ دونوں اپنے روم میں تھے جہاں کبیر صاحب اپنے کندھوں پر گرم شال اوڑھے آتش دان کے قریب بیٹھے تھے جبکہ سائرہ بیگم کچن میں ان تینوں کا ناشتہ بنانے میں مصروف۔

"آگئے میرے بیٹے۔۔۔" کبیر صاحب نے مسکراہٹ کے ساتھ دونوں بیٹیوں کا استقبال کیا

"ڈیڈ۔۔۔ یہ کہاں کا انصاف ہے بھلا خود کی قسمت میں آرام نا ہو تو دوسروں کے بھی بے آرام کیئے رکھے بندہ۔۔۔؟؟؟" بابا کی لاڈلی اب بابا سے کوکب کی شکایت لگا رہی تھی

"ہاں بھئی یہ تو واقعی نا انصافی ہوئی میری بیٹی کے ساتھ۔کیوں کوکب میری شہزادی کو کیوں تھکاتی ہو اپنے ساتھ۔۔۔؟" کبیر صاحب اپنی دونوں بیٹیوں سے بیٹوں سے بڑھ کر پیار کرنے والے انسان تھے ہمیشہ گھر میں دوستانہ ماحول قائم رکھا۔اور یہی بات ان کے لہجے کی شیرینی سے بھی ہمیشہ واضح ہوتی تھی۔

"ڈیڈ۔۔۔آپ بھی انجم کی سائیڈ لے رہے ہیں۔سوئے سوئے بستر توڑنے سے تو ایکسرسائز اچھی ہے نا۔۔۔"

"ہاں اچھی تو ہے پر ایک سنڈے ہی تو ہوتا ہے خوب جی بھر کے سونے کیلئے۔۔۔وہ بھی تمہاری وجہ سے غارت ہو گیا۔۔۔"

"اچھا بس اب لڑائی جھگڑے ختم۔۔۔آرام سے ناشتہ کرو آجاؤ۔۔۔" سائرہ نے ناشتہ لگا دیا تھا۔

"موم ناشتے کے بعد ایک میچ ہو جائے پھر۔۔۔"

"مجھے تو بخش دو کوکب۔میں تو تم لوگوں کا ساتھ بالکل نہیں دے رہی۔اپنے ڈیڈ کے ساتھ کھیلنا۔" سائرہ بیگم نے بھی ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

"تو آپ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ کی بیٹی میڈل سے محروم رہ جائے اور شرط ہار جائے تو ٹھیک ہے پھر۔۔۔ایسا ہی سہی۔"

"نہیں میری بیٹی بالکل نہیں ہارے گی۔میری بیٹی جیت کے دکھائے گی۔اور ناشتے کے بعد ہم

سب مل کر ایک میچ کھیل رہے ہیں ۔۔۔کسی کا کوئی بھی بہانہ قبول نہیں کیا جائے گا۔" کبیر صاحب نے ہمیشہ کی طرح بیٹی کا ساتھ دیا

"یہ ہوئی نا بات ۔۔۔" کوکب نے اٹھ کر پیچھے سے باپ کے گلے میں باہیں ڈال دیں ۔اس کا بلیک میلنگ کا ہتھیار ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر کارگر رہا تھا

☆......☆......☆

"ڈیڈ ۔۔۔آج آپ کا چہرہ اتنا اترا ہوا کیوں ہے ۔۔۔؟" ڈنر کے بعد ارحم باپ کے روم میں آگیا ۔وہ ڈنر کے دوران سارا وقت یہی نوٹ کرتا رہا تھا ۔اور اسے یہی لگا تھا کہ کچھ نا کچھ غیر معمولی ضرور ہے ۔ہمارے اندر چھڑی جنگ جسے ہم دوسروں پر کبھی عیاں نہیں کرتے چاہتے ہمارا چہرہ اور آنکھیں ہمارے سب راز فاش کر دیتی ہیں ۔سلطان کے چہرے پر بھی واضح لکھا تھا جیسے بہت کچھ معمول سے ہٹ کر ہوا ہو ۔وہ اسی بات کی کھوج کرنا چاہتا تھا جو اس کے ڈیڈ کو اندر ہی اندر کھا رہی تھی ۔

"خود احتسابی بہت مشکل ہوتی ہے ارحم ۔۔۔" انہوں نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا

"میں سمجھا نہیں ڈیڈ ۔۔۔"

"تم سمجھ بھی نہیں سکتے ارحم ۔۔۔پچھتاوے عذاب ہوتے ہیں ۔آج میں اپنی عدالت میں ہی مجرم ٹھہرایا گیا ہوں ۔" انہوں نے اعتراف کر لیا تھا

"ایک بات پوچھوں ڈیڈ ۔۔۔؟"

"پوچھو"

"جو کچھ بھی موم نے آپ سے کہا تھا مطلب جن باتوں پر موم نے ہمیں چھوڑا ۔۔۔کیا وہ سچ ہیں ۔۔۔؟"

"مکمل سچ نہیں ہیں ارحم ۔

ہاں میں پہلے سے شادی شدہ تھا پہلے سے ہی میرا بچہ بھی ہے ۔اور میں غلط دھندوں میں بھی ملوث رہا قریب دو سال تک ۔۔۔مگر میں سب کچھ چھوڑ چکا تھا ۔فاخرہ سے شادی کے بعد سے میں ایک

بار بھی پاکستان نہیں گیا۔میں محبت کرتا تھا فاخرہ سے۔اس کیلئے میں نے اپنا ملک، اپنا ماں باپ، اپنے خونی رشتے تک بھلا دیئے۔میں نے شادی کے بعد اس سے کبھی دھوکہ نہیں کیا۔یہ جھوٹ تھا الزام تھا۔۔۔"اس نے پہلی بار ارحم کو سب بتا دیا۔سب کچھ سچ سچ

ارحم خاموش بیٹھا رہا کچھ بھی نا بولا۔۔۔بس حیرت سے اپنے باپ کا چہرہ تکتا رہا

"موم کو یہ سب کس نے بتایا ہوگا؟ آخر کس نے ہمارے گھر میں نفرت کی چنگاری پھینکی ہے۔۔۔؟

"کسی کا بھی کوئی قصور نہیں ہے ارحم۔نا فاخرہ کا اور نا ہی چنگاری پھینکنے والے کا"۔

سلطان ایک پل کو خاموش ہوئے۔ایک لمبی سانس خارج کی اور پھر سے گویا ہوئے۔

"اور یہ سب تو ہونا ہی تھا۔دنیا مکافاتِ عمل ہے۔میں نے فاخرہ کیلئے سب کو چھوڑا، فاخرہ نے مجھے چھوڑ دیا۔۔۔"

وہ بولے تو لہجہ ہر احساس سے عاری تھا جیسے وہ سلطان نہیں بلکہ ارحم کے سامنے کوئی روبوٹ بات کر رہا ہو جس کی چابی گھما دی گئی ہو

"آپ واپس چلے جائیں ڈیڈ۔۔سب سے معافی مانگ لیں۔۔۔"

"کاش ایسا ہو سکتا۔۔۔"

"ایسا ہو سکتا ہے ڈیڈ۔۔۔آپ واپس پاکستان چلے جائیں۔"

"میں نہیں جا سکتا ارحم۔مجھ میں ان سب کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔میں ان کے سوالوں کے جواب نہیں دے پاؤں گا۔۔۔مجھ میں ان سب کی نظروں کے سامنے کھڑا رہنے کی ہمت نہیں ہے۔میں بہت گرا ہوا ہوں ارحم۔میں بہت گر چکا ہوں، ایک ایک لمحہ مزید تاریکیوں میں گرتا جا رہا ہوں۔"

"ڈیڈ ایسا تو نا کہیں پلیز۔۔۔آپ مجھے خوفزدہ کر رہے ہیں۔سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا پہلے جیسا۔آپ بس پاکستان جانے کی تیاری کریں۔۔۔"

"نہیں ارحم میں نہیں۔یہ سب تمہیں کرنا ہے۔جو کچھ بھی میں نا کر سکا وہ سب تمہیں کرنا ہے۔مجھ پر بہت سے رشتوں کے قرض باقی ہیں۔وہ سب تم نے اتارنے ہیں۔۔۔"

" میں کیسے اتار سکتا ہوں یہ سب قرض۔۔۔؟؟؟" ارحم نے حیرت سے سوال کیا

" اتار سکتے ہو ارحم۔۔۔اور تم نے ہی اتارنے ہیں۔۔"

" اچھا۔۔۔ڈیڈ آپ اللہ سے معافی تو مانگ سکتے ہیں۔کیا پتا اللہ آپ کو معاف کر کے ان کے دل نرم کر دے۔۔۔"

سلطان نے حیرت سے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔اسے یہ خیال پہلے کیوں نا آیا۔۔۔

انسان سنگ دل ہو سکتے ہیں۔وہ تو رحیم ہے نا۔سچے دل سے مانگی جانے والی دعائیں تو وہ ضرور سنتا ہے۔اسے اللہ سے معافی مانگنی چاہیے۔اور میں ضرور مانگوں گا۔۔۔

☆......☆......☆

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ بدل گیا تھا۔بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔

اس بار نیا منتخب ہونے والا نمائندہ خدا ترس ثابت ہوا۔اس نے شاہ والی کی حالتِ زار سنوارنے کی ٹھان لی۔تھوڑے ہی عرصے میں گاؤں کی گلیوں میں اینٹوں کی سولنگ بچھ گئی۔مڈل سکول کی تعمیر و مرمت کر کے اسے ہائی سکول کا درجہ دے دیا گیا۔گاؤں کے کچھ گھروں تک جو ابھی تک بجلی کی سہولت سے محروم تھے نئے کھمبے لگوا کر بجلی مہیا کر دی گئی۔ٹرانسپورٹ کیلئے نزدیکی شہر تک سرکاری بس چلنے لگی۔اب شاہ والی کے مچھیروں کی مچھلی منڈی تک رسائی آرام سے ممکن ہو گئی تھی۔سڑک کے آنے سے نئے نئے روزگار کھلنے لگے

گزرتے وقتوں کے ساتھ شاہ والی کا نقشہ ہی بدل گیا

لوگ نئے نمائندے کو دعائیں دیتے نا تھکتے۔

خوشی بھی باقی لوگوں کی طرح اپنے گاؤں کی ترقی سے بہت خوش تھا۔

" زمانہ کتنا بدل گیا ہے بی بی

۔ہمارے وقتوں میں زندگی بہت مشکل ہوتی تھی۔اب آسان ہو گئی ہے۔" گھر کے آنگن میں بچھی چارپائی پر دراز دین محمد نے نانی تاج سے کہا جو عمر میں ان سے کوئی سات آٹھ سال بڑی تھیں۔

"زمانہ کہاں بدلتا ہے دین محمد۔ہم بدل جاتے ہیں لوگ بدل جاتے ہیں۔لوگوں کی ضروریات اور ان کے معیار کے تقاضے بدل جاتے ہیں۔زمانہ تو وہی رہتا ہے۔وہی چاند سورج ،وہی ندیاں ،وہی پہاڑ سب کچھ وہی۔بدلتے ہیں تو صرف ہم انسان اور ہماری ترجیحات۔۔۔"

نانی تاج جائے نماز پر بیٹھے تسبیح روک کر تفصیل سے اسے جواب دیا۔

"کبھی یہ بھی سوچا ہے بی بی کہ پرانے وقتوں میں تھوڑی پر بھی گزارا ہو جاتا۔کھانے والے زیادہ ہوتے کمانے والا ایک ہوتا۔پھر بھی سب پیٹ بھر کر کھاتے ہنسی خوشی جیتے۔اب تو ایسا بالکل نہیں ہے۔جتنا کماؤ تنگی پھر بھی باقی رہتی ہے۔۔۔"

"وہی ہماری ترجیحات اور ضروریات بدل جاتی ہیں نا۔اور اصل چیز ہم شکر کرنا بھول گئے ہیں۔اللہ کا فرمان ہے کہ میں شکر کرنے والے کو اور زیادہ نوازتا ہوں۔۔۔

باقی تبدیلی تو آ گئی ہے۔ہمارے رویوں میں اب وہی خالص پن نہیں رہا۔ہر انسان نے اپنے چہرے پر کئی اور چہرے سجا رکھے ہیں۔ہر کسی پر دوسرے سے آگے بڑھنے کی دھن سوار ہے۔انسان بہت آگے جا چکے ہیں۔مگر انسانیت پیچھے کی طرف سفر کر رہی ہے وہیں پتھروں کے دور کی طرف۔"

"اب سب کچھ ہمارے اختیار میں تو نہیں ہوتا بی بی۔ہم پوری انسانیت کا قبلہ تو نہیں درست کر سکتے۔۔"

"سب کچھ ہمارے اپنے ہاتھ میں ہی ہوتا ہے دین محمد۔۔۔بس ہم انسانوں کو بہانے گھڑنے کی عادت بن چکی ہے۔اگر ہر کوئی خود اپنا قبلہ سنوار لے اپنی سمت متعین کر کے درست راستے پر گامزن ہو پڑے تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔۔۔

اگر لوگ حلال حرام کا فرق جان کر صرف حلال کو ترجیح دینے لگیں تو وہی تھوڑی کمائی بھی بہت ہو جاتی ہے۔اللہ نے اگر ہمارے لیئے کچھ قوانین مقرر کیئے ہیں تو وہ ہمارے فائدے کیلیئے ہی ہیں۔لوگوں کو یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ اگر صرف حلال پر گزارہ ممکن نا ہوتا تو وہ خدا پہلے دن سے ہی حرام کو جائز قرار دے دیتا۔کیونکہ اللہ سے بڑھ کر ہمارا کوئی اور خیر خواہ تو نہیں ہے۔اللہ سے بڑھ کر کوئی قانون دان نہیں ہے۔

اب دنیا میں خوراک کی قلت کیوں ہے۔کیوں کہ لوگوں نے ذخیرہ اندوزی شروع کر دی ہے۔لوگوں کو زکوٰۃ نکالنا بھاری معلوم ہوتا ہے۔اسلامی نظامِ زندگی کو سب اپنا لیں تو کوئی غریب باقی نا رہے یا اگر رہیں گے بھی تو انکی حالت اس طرح ابتر نہیں ہوگی جب ہم اللہ کی مخالف سمت میں چلیں گے تو بھٹکنے لگیں گے۔اللہ نے جو ہمارے لیئے حدیں مقرر کی ہیں ان سے آگے بڑھیں گے تو سراسر نقصان اٹھائیں گے۔اگر اللہ کے مقررہ قانون توڑیں گے تو ناکامی مقدر بن جائے گی۔۔۔"

نانی سانس لینے کو رکی۔دین محمد خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے بغیر ٹوکے

"اب اپنے گاؤں کو ہی دیکھ لو۔ایک خدا ترس نے اپنے عہدے کا صحیح استعمال کیا۔اپنی ذمہ داری نبھائی جس کیلئے اسے چنا گیا تھا۔اس ایک آدمی کی نیک دلی سے پورے گاؤں کی حالت سنور گئی ہے"

"بی بی اس کے پاس اختیار تھا۔سیٹ تھی تبھی اس نے یہ سب کچھ کیا۔ہم غریب لوگ ہم کیا کر سکتے ہیں ہمارے ہاتھ میں کیا ہے بھلا۔۔۔؟؟"

"ہم کم از کم اپنے رویئے تو سنوار سکتے ہیں۔اپنے انفرادی معاملات میں ایمانداری سے کام تو لے سکتے ہیں۔اپنے ذاتی معاملات میں تو ہمارا اختیار ہے ہم سب کو۔تبدیلی ہمیشہ انفرادی تبدیلی سے ممکن ہوتی ہے۔ہمیشہ تھوڑا تھوڑا کر کے بہت ہوتا ہے قطرہ قطرہ مل کے دریا بنتا ہے۔ذرہ ذرہ مل کے چٹان بن جاتی ہے۔

جب ہر انسان انفرادی طور پر خود کو ٹھیک کر لے گا تو پورا معاشرہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔لیکن ہم اپنی ذات کا محاسبہ کیئے بغیر ہمیشہ دوسروں کو جانچتے رہتے ہیں۔یہی سب سے بڑی وجہ ہوتی ہے تنزلی کی۔۔۔سیٹ تو اس سے پہلے والے نمائندوں کے پاس بھی تھی انہوں نے کیا کیا؟ ہر انسان کو اپنی ذمہ داری سمجھنی چاہیئے۔کیونکہ ہر انسان کے پاس سیٹ ہوتی ہے ہر انسان حاکم ہوتا ہے اپنے سے نچلے لوگوں کیلئے۔ہر انسان اپنے معاملات میں خود اپنا نمائندہ ہوتا ہے۔تم حاکم ہو اس گھر کے۔تم سے نچلے رعایا ہیں تمہاری۔تم سے پوچھ گچھ ہوگی ان سب کی"

" ساری باتیں درست ہیں آپ کی بی بی سچ کہتی ہیں آپ ۔۔۔ پر ان دکھوں کا بندہ کیا علاج کرے جو اللہ نے برداشت سے بھی زیادہ نصیب میں لکھ دیئے ہیں ۔۔۔" دین محمد نے اپنی انفرادی زندگی کا سوچتے ہوئے نانی سے سوال کیا

" ایسا نہیں بولتے دین محمد ۔ اللہ کبھی کسی کو اس کی برداشت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا ۔ تمہارے دکھ ایوب علیہ السلام سے بھی زیادہ ہیں؟؟؟

یہ دکھ درد تو اللہ کی انسان پر ڈالی جانے والی آزمائشیں ہوتی ہیں ۔ انسان کو اللہ سے قریب کرنے کا بہانہ ہوتے ہیں ۔ اس کا اللہ سے تعلق پختہ کرنے کا طریقہ ۔۔۔ اور یاد رکھو اللہ انسان پر آزمائشیں صرف کسی خاص وجہ کیلئے نہیں ڈالتا ۔ آزمائشیں بے سبب بھی ہو سکتی ہیں ۔ جب خدا کو انسان کا امتحان لینا مقصود ہوتا ہے تو وہ اسے آزمائشوں میں ڈال دیتا ہے ۔۔۔ اور یاد رکھو آزمائشوں کے بعد اللہ انعام سے بھی نوازتا ہے ۔ اب اگر اللہ تمہیں تمہارے پوتے سے نا ملواتا تو تم کیا کر سکتے تھے ۔ کچھ بھی تو نہیں ۔۔۔ مگر اس نے ملوا دیا ۔ یہ اس کا انعام ہی تو ہے ۔۔۔"

دین محمد خاموش ہو گئے مزید کوئی سوال نا کیا ۔ نانی تاج نے تھوڑی دیر اس کے سوال کا انتظار کرنے کے بعد پھر سے تسبیح اٹھا لی ۔ شام ڈھلنے کے قریب آ پہنچی تھی ۔ گھر میں لگے واحد پرانے اور گھنے درخت پر چڑیاں سارا دن رزق کی تلاش میں پھرنے کے بعد درخت پر واپس آنے لگی ۔ اس وقت ہمیشہ سارے گھر میں چڑیوں کا شور مچا رہتا ۔ دین محمد دھیرے سے اپنی چارپائی سے اٹھا اور درخت کی ڈال کے نیچے لٹکا چھوٹی رسی سے بندھا ہوا مٹی کا پیالہ پانی سے بھرنے لگا ۔ زندگی کی ایک اور شام ہونے لگی تھی ۔ وقت نے ہر ذی روح کو اس کی قبر سے فاصلے کو مزید ایک دن کم کر دیا تھا

☆......☆......☆

کالج میں سپورٹس ویک شروع ہو چکا تھا ۔ ہر طرف طلباء و طالبات کی گہما گہمی اور ذوق و شوق دیدنی تھا ۔ کوکب بھی رننگ اور ٹینس کے علاوہ ایک پلے میں حصہ لے رہی تھی ۔ اور پچھلے بیس منٹ سے وہ ارحم کو قائل کرنے میں لگی ہوئی تھی کہ وہ بھی اس پلے میں حصہ لے ۔ مگر وہ ارحم تھا کسی کی نا سننے والا ، اپنے

مزاج کا واحد بندہ۔بقول کوکب دنیا کا سب سے بڑا بورنگ انسان

"یار کوکب تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔مجھے یہ سب اوٹ پٹانگ پسند نہیں ہے۔تمہیں حصہ لینا ہے تو تم لے لو مجھے چھوڑ و۔۔۔"

"یہ اوٹ پٹانگ نہیں ہے یار۔شیکسپیئر کا ایک مشہور ڈرامہ ہے جسے ہم لوگ سٹیج پر پرفارم کر رہے ہیں۔اور تمارے لیئے ایک اچھا کردار ہے۔" وہ اسے مسلسل قائل کرنے میں لگی رہی

"نہیں مجھے تو بالکل نہیں کرنا۔بلکہ مجھے تو یہ ڈرامے بازی آتی ہی نہیں ہے۔میں اصلی زندگی میں جیتا ہوں"

"تم اور تمہاری یہ باتیں۔۔۔

ارحم یہ جسے تم ڈرامے بازی کہہ رہے ہو ایک ہلکی پھلکی تفریح ہے صرف۔۔۔اور تم جانتے ہو تم نے حصہ نہیں لیا تو پھر میں بھی اپنا کردار چھوڑ دوں گی۔۔۔"

"تم پاگل ہو گیا۔۔۔تمہارا دل ہے تو تم حصہ لو۔میرے لیئے اپنا کردار مت چھوڑو۔۔۔"

"ارحم تم میرے لیئے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔۔۔؟؟؟" وہ روہانسی ہو گئی

"تم کیا کر سکتی ہو میرے لیئے۔۔۔؟؟" اس نے الٹا سوال کر دیا

"کچھ بھی کر سکتی ہوں۔یہ کردار چھوڑ سکتی ہوں، اپنا فیورٹ پیزا کھانا چھوڑ سکتی ہوں۔۔۔اور کریلوں سے مجھے سخت نفرت ہے وہ بھی کھا سکتی ہوں۔کریلوں کا جوس آنکھیں بند کر کے غٹاغٹ پی سکتی ہوں۔۔۔اور۔۔" وہ مسکراتے ہوئے انگلیوں پر گننے لگی

"بس کرو کافی ہیں یہ سب۔۔۔کھانے پینے کے علاوہ بھی سوچ لیا کرو کچھ۔۔۔" وہ بھی مسکرا دیا

"تم بھی کبھی میرے بارے میں سوچ لیا کرو۔۔۔"

"دنیا کی سب سے نکمی لڑکی کے بارے میں، میں کیوں سوچوں گا بھلا۔۔۔اتنا بھی فری وقت نہیں ہے میرے پاس۔اگر ہوتا تب بھی میں کچھ اچھا سوچ لیتا۔۔۔تمہیں تو ہرگز نہیں" ارحم نے اس کا ہلکا سا مذاق اڑایا

" سوچ لو ارحم ۔۔۔ابھی وقت ہے سوچ لو ۔۔۔ابھی کوکب کبیر میسر ہے تمہیں اس لیئے ہلکے میں لے رہے ہو۔ بعد میں خود منتیں کرو گے تب بھی کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ یاد رکھنا"

بات گھوم پھر کر وہیں آ گئی

" میں بھی قائم ہوں اپنے وعدے پر۔۔۔بھولا کچھ نہیں ہوں۔"

"تمہیں پتا ہے تم میں ذرا بھی احساس نہیں ہے ارحم۔۔۔کیا تمہیں اپنی اس خوبی کا علم ہے۔۔۔؟"

"تم کیا جانو میرے اندر کتنا احساس ہے۔۔۔"

"کوکب سے زیادہ تمہیں اور کون جان سکتا ہے۔۔۔"

"تمہیں تو کسی اور سیارے پر ہونا چاہیئے تھا غلطی سے یہاں آ گئی ہو۔۔۔"

" کیوں میں تمہیں ایلین لگتی ہوں۔۔۔؟؟؟"

" نہیں وہ تو تم سے کئی گنا اچھے ہونگے ۔۔۔دوسرے سیارے پر اسلیئے کیونکہ تمہیں تو میری وہ خوبیاں معلوم ہیں جو مجھے معلوم بھی نہیں ہیں۔ اور تم مجھے مجھ سے زیادہ جانتی ہو۔"

" یہ تمہیں اسلیئے زیادہ جانتی ہے کیونکہ چاہتی ہے تمہیں۔ پاگل ہے تمہارے پیچھے۔ مگر تمہیں احساس ہی نہیں ہے۔" پچھلے تین منٹ سے ان کے ساتھ آ بیٹھی کرسٹی نے ایک ہی پل میں وہ بات کہہ دی جو کوکب پچھلے کتنے عرصے سے نہیں کہہ پائی تھی۔

ایک منٹ کو تینوں خاموش ہو گئے۔ کوئی کچھ نا بولا۔ سکوت چھا گیا۔ کوکب کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کی سب سے بیسٹ فرینڈ کرسٹی یوں اس کے سامنے ارحم کو بول دے گی۔۔۔

وہ رکی نہیں۔ اٹھ کے چلی گئی۔ کرسٹی نے اسے پیچھے سے آواز دی مگر کوکب کے قدم نہیں رکے۔ تو وہ بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتی اس کے پیچھے دوڑی۔

ارحم وہیں بیٹھا رہ گیا۔ وہ جو ہر وقت کوکب کو اس کے نکمے پن اور اس کی ہلکی پھلکی زندگی سے بھرپور حرکتوں کو فضولیات تصور کرتا تھا وہ لڑکی من ہی من میں اسے چاہتی بھی ہے اسے آج معلوم ہوا۔

اس کے خیال میں کوکب فطرتاً ایسی ہی تھی ہنس مکھ، بات بات پر ہنسنے والی، ہر کسی سے جلدی گھل

مل جانے والی۔

"کیوں بتایا تم نے ارحم کو یہ سب۔۔۔" کرسٹی اس کے پیچھے کلاس روم میں پہنچی تو کوکب اس پر چیخ پڑی

" کیونکہ تم میں تو اتنی ہمت ہی نہیں ہے اور اسے اتنا احساس ہی نہیں ہے کہ وہ یہ سب خود سے محسوس کرلے، تمہیں سمجھ سکے۔۔"

" پھر بھی تمہیں نہیں کہنا تھا کرسٹی۔۔۔ بالکل نہیں کہنا چاہیئے تھا۔"

" کیوں نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ بلکہ سب سے بڑی پاگل تم خود ہو اسے تمہارا احساس نہیں تو تم بھی وہی رویہ رکھو ارحم کے ساتھ۔کسی اور کے ساتھ ریلیشن رکھ لو۔تم کیوں بار بار اس پر جامرتی ہو یار انسان کی اپنی بھی کچھ سیلف ریسپیکٹ ہوتی ہے۔کیوں ارحم کے سامنے خود کو اتنا ہلکا کردیتی ہو تم۔۔۔کیوں خود کو اور اپنی سیلف ریسپیکٹ کو بھول جاتی ہو تم۔؟؟؟" اس نے کوکب کو جھاڑ کر رکھ دیا

" تم نہیں سمجھو گی کرسٹی۔۔۔تم سمجھ ہی نہیں سکتی۔۔۔" اس بار کوکب کا لہجہ دھیما تھا۔۔۔جیسے کوئی شکست تسلیم کرلیتا ہے۔

" میں سب سمجھتی ہوں۔۔۔جسے تمہاری قدر نہیں اسے کک مارو۔بھاڑ میں جائے۔کسی اور کا ہاتھ تھامو جو مخلص ہو تمہارے ساتھ۔۔۔یہی زندگی ہے بس۔"

" میں ایسا نہیں کرسکتی کرسٹی۔۔۔جب وہ سامنے ہوتا ہے تو مجھے اپنی ذات، اپنی خوشی، اپنی پسند نا پسند سب بھول جاتی ہے۔۔۔میرے لیئے وہی سب کچھ ہے، میرے لیئے صرف وہی اہم ہے بس۔اسے خوش رکھنا اہم ہے صرف۔۔۔"

" تمہارا کوئی علاج نہیں ہے۔۔۔لا علاج ہو تم پاگل ہو تم کوکب۔۔۔میں اب کبھی تمہیں نہیں سمجھاؤں گی یہ سب۔۔۔بھاڑ میں جاؤ تم اور بھاڑ میں جائے تمہارا ارحم۔۔۔جارہی ہوں میں"

وہ رکی نہیں۔۔۔تیز تیز قدم اٹھاتی غصے میں روم سے باہر چلی گئی۔۔۔پیچھے کوکب بیٹھی تھی کسی مفتوح کی طرح۔وہ کوکب جو محفل کی جان سمجھی جاتی۔وہ کوکب جو سب پر چھا جاتی، وہ کوکب جو زندگی سے بھرپور سمجھی جاتی تھی۔

پر جو اس کی زندگی تھا جانے کیوں اسے سمجھتا ہی نہیں تھا۔اس کی آنکھوں میں لکھا اپنی محبت کا اقرار نامہ پڑھ ہی نہیں پاتا یا پھر جان بوجھ کر پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

" آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔اپنے گناہوں کی معافی میں جتنا ممکن ہو جلدی کرنی چاہیے کیونکہ زندگی کا کچھ بھی بھروسہ نہیں ہوتا" امام صاحب نے سلطان کو سراہا جوان کے سامنے دوزانو بیٹھا تھا وہ آج پہلی بار اس اسلامک سنٹر آیا تھا۔۔۔

ارحم کی بات ان کے دل پر لگی اور وہ دوسرے دن ہی اسلامک سنٹر آ پہنچے۔نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد وہ وہیں بیٹھا رہا۔جب مسجد نمازیوں سے تقریباً خالی ہو چکی تو وہ امام صاحب کے پاس آ گئے اور انہیں بتایا کہ وہ اللہ سے معافی مانگنا چاہتا ہے

" پر امام صاحب ۔۔۔میں بہت گناہگار ہوں۔مجھے یاد ہی نہیں ہے کہ میں نے آخری بار نماز کب ادا کی تھی۔مجھے طریقہ بتائیے میں کیسے معافی مانگوں کہ اللہ میری سن لے۔مجھے معاف کر دے۔میرے گناہ بہت بڑے ہیں۔میں اس کی بارگاہ میں کھڑا نہیں ہو پاؤں گا۔میری ٹانگیں کانپنے لگ جائیں گی۔سر شرم کے مارے اٹھ نہیں پائے گا۔۔" وہ صحیح معنوں میں شرمندہ تھا

" بیٹا اللہ کبھی طریقہ نہیں دیکھتا۔صرف نیت دیکھتا ہے۔اپنی طرف پلٹنے کا انداز دیکھتا ہے۔طریقہ ضروری نہیں ہے صرف نیت کا خلوص ضروری ہے۔

اور یاد رکھو گناہ چاہے کتنے ہی بڑے کیوں نا ہو جائیں۔اس کی رحمت سے ہرگز بڑے نہیں ہو سکتے۔چاہے کسی کے گناہ آسمان تک بھی کیوں نا جا پہنچیں۔

اور اگر گناہ گار کو اپنے گناہ کا احساس ہو جائے تو یہی احساس بھی اس کی بخشش کا ذریعہ بننے کیلئے کافی ثابت ہو سکتا ہے۔تمہیں اللہ سے معافی مانگنے کیلئے کسی خاص طریقہ کار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔تم جس انداز سے بھی معافی مانگو گے وہ قبول ضرور کرے گا شرط یہ ہے کہ سچے دل سے معافی مانگے جائے۔اور دوبارہ ان گناہوں سے کنارہ کشی کرنے کی پوری کوشش کی جائے۔۔۔" سفید باریش بزرگ اپنے

خوبصورت لہجے اور الفاظ سے سلطان کے دل پر بارش کے پہلے قطروں کے جیسے پھوار برسا رہا تھا۔ دل میں جو پچھلے دو تین سے اضطراب تھا وہ امام صاحب کی گفتگو سے قدرے کم ہو گیا۔

" بیٹا سارا قصور ہم انسانوں کا ہی ہوتا ہے۔ اللہ نے جو اول روز سے ہمارے لیئے نصاب مقرر کیا وہ ہم بھول چکے ہیں۔ جو نظامِ زندگی خدا نے انسان کیلئے مرتب کیا ہم اسے چھوڑ چکے ہیں۔ تبھی تو ہم راہ سے بھٹک گئے ہیں۔

ہم اپنا راستہ بھول چکے ہیں کیونکہ ہم نے اس ہادی عالم کی انگلی چھوڑ دی ہے۔ ہم نے اس کے قدموں پر چلنا ترک کر دیا۔۔۔ تبھی تو ہم بھٹک گئے راستہ بھول گئے ہیں۔ تبھی تو منزلوں کے نشان کھو بیٹھے ہیں۔ اسی لیئے تو دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔۔۔ ہم کبھی آسمان کی بلندیوں پر تھے اور آج دنیا سے ہمارا نام و نشان بھی مٹتا جا رہا ہے۔ ہر جگہہ ہم ذلیل اور پسپا ہو رہے ہیں۔

اللہ تو انسان کے انتظار میں ہوتے ہیں کہ کب میرا بندہ میری طرف پلٹتا ہے۔ وہ تو بخشنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ پر ہم سمجھتے ہی نہیں۔۔۔"

امام صاحب کی باتیں تھی یا ٹھنڈے پانی کی پھوار جو اس کے جلتے سینے میں آہستہ آہستہ ٹھنڈک پیدا کرتی جا رہی تھی۔

" اللہ معاف کر دیتا ہے پر اس کے بندے مشکل سے معاف کرتے ہیں۔ وہ بندے ہیں اپنے خالق جتنے رحیم نہیں ہو سکتے۔ تمہیں ان سب سے بھی معافی لازمی مانگنی چاہیئے۔ پہلے اللہ سے سچے دل سے توبہ کرو۔ ہو سکتا ہے پھر اللہ بھی تمہارے لیئے ان سب کے دلوں میں نرمی ڈال دے۔

اللہ سے جب بھی معافی مانگو

سب کہہ دینا ایک ایک بات، ایک ایک غلطی بتا دینا۔ حالانکہ وہ سب جانتا ہے۔ ہماری پلکوں کی حرکت تک سے وہ واقف ہے۔ مگر جب اس کی بارگاہ میں اس کا نائب اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتا ہے، سچے دل سے توبہ کرتا ہے تو مالک کو خوشی ہوتی ہے۔ اور ایک وہی بارگاہ تو ہے جہاں انسان کو اپنے تمام گناہوں کا اقرار کرنے جھکنے، پیشانی اور ناک زمین پر رکھنے میں کوئی شرمندگی نہیں ہوتی بلکہ سکون

حاصل ہوتا ہے۔قلب کا سکون۔اور جسے قلب کا سکون میسر آجائے اسے پھر کسی اور بات کی طلب نہیں رہتی۔

جاؤ بیٹا۔۔اللہ سے مانگنے میں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔کیونکہ سانسوں کی کچی ڈوری کے ٹوٹنے میں کبھی دیر نہیں لگتی زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں ہوتا۔نا تمہیں نا مجھے اور نا ہی کسی اور کو۔زندگی تو کچی ڈور کی طرح ہوتی ہے ہلکے سے کھنچاؤ سے ٹوٹ جاتی ہے۔جاؤ بیٹا۔۔۔خدا رحیم ہو۔۔۔"

سلطان واپس آگیا۔جب سینٹر آرہا تھا تو دل میں خوف تھا اضطراب تھا مگر اب واپسی پر اضطراب اور خوف کی جگہہ سکون نے لے لی تھی

وہ واپس آگیا۔اور اس نے آتے ہی خود کو کمرے میں بند کیا جائے نماز بچھائی اور سر سجدے میں گرا دیا۔وہ روتا رہا گڑگڑاتا رہا۔اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتا رہا۔ہر گناہ جو اسے یاد تھا کہ اس سے سرزد ہوا خدا سے اس کی معافی مانگی۔

اپنے والدین کی نافرمانی کی، ان کے دل دکھانے کی، نوری کو بے قصور طلاق دینے کی، ملوکھاں اور اپنے بچے کے حقوق ادا نا کرنے کی، اور جو دو سال اس نے ہتھیاروں اور اسلحے کے دھندے میں چوہدری صاحب کے ساتھ گزارے ان گناہوں کی بخشش مانگی، اس دھندے میں جانی و مالی نقصان پہنچنے والوں انسانوں کا رو نا رو کر معافی طلب کی۔آج اپنے گناہ شمار کرنے بیٹھا تو وہ بے شمار تھے۔مگر امام صاحب کی بات بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی کہ انسان کے گناہ چاہے کتنے ہی بڑے کیوں نا ہوں مگر اس کی رحمت کے آگے کچھ بھی نہیں ہوتے۔۔۔

دو گھنٹوں بعد جب وہ کمرے سے باہر نکلا تو پر سکون تھا۔اسے یقین تھا کہ انسان معاف کریں نا کریں لیکن خدا اسے ضرور معاف کر دے گا۔

مگر وہ یہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ اس کی آزمائشیں اور امتحان تو ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔یہ خدا کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں اس کے اپنے بھید ہوتے ہیں۔اس کے بھیدوں تک کبھی کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

وہ اپنے بندوں کو آزماتا رہتا ہے۔امتحان لیتا رہتا ہے۔اللہ دے کر بھی آزماتا ہے اور لے کر بھی آزماتا ہے۔اور پھر یہ ہم انسانوں پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم امتحانوں سے کس قدر سرخرو ہو کر نکلتے ہیں

۔۔۔اور سلطان کا امتحان ابھی ختم نہیں ہوا تھا

☆......☆......☆

اگلی صبح ہوئی تو ناشتے کے فوراً بعد جب وہ سٹور پر جانے کی تیاری کر رہا تھا تبھی اسے ہاسپٹل کی طرف سے ای میل موصول ہوئی۔۔۔جس میں اسے تین دن بعد کیموتھراپی کے پہلے سیشن کیلئے آنے کو کہا گیا تھا۔۔۔ڈاکٹر فلپس نے اسے پہلے بتایا تھا کہ زیادہ سے زیادہ انہیں تین سیشن کرنے پڑیں گے۔ ہر سیشن کے بعد کچھ دن کا وقفہ دیا جائے گا اور بیچ کے ان

دنوں میں سلطان کو ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق مختلف ادویات استعمال کرنی ہوں گی

چونکہ یہ بلڈ کینسر کی ابتدائی سٹیج تھی تو اسلیئے ڈاکٹر فلپس بھی پر امید تھے کہ وہ بہت جلد کینسر کی افزائش والے خلیات پر قابو پالیں گے۔ای میل میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس کی کیموتھراپی وریدوں کے زریعے کی جائے گی۔

(یہ ایک طرح کا کینولا ہوتا ہے جس کی مدد سے وریدوں کے زریعے خون کے خلیات تک دوائی پہنچائی جاتی ہے۔جس سے کینسر کی افزائش والے خلیات ایک طرح بڑھنا ختم ہوجاتے ہیں۔ممکن ہے کہ اس عمل میں جسم کے دوسرے خلیات بھی متاثر ہو سکتے ہیں۔)

ای میل مکمل پڑھنے کے بعد وہ اپنی گاڑی میں سٹور آگیا۔معاون سٹور کھول چکا تھا۔۔اتنے عرصے میں سلطان نے اپنے اس بزنس کو کافی وسعت دے دی تھی اور فی الوقت یہ اپنے ایریے کا مشہور سٹور تھا۔جہاں پر روزمرہ ضروریات کی تقریباً تمام چیزیں دستیاب تھیں۔ یہاں پر سارا دن کسٹمرز کے درمیان کس طرح مصروفیت میں کٹ جاتا اسے کچھ خبر ہی نہیں ہوتی۔

اور ٹھیک تین دن بعد وہ مقررہ وقت پر ہاسپٹل کے ریسپشن میں بیٹھا اپنی پہلی کیموتھراپی کے پہلے سیشن کیلئے موجود تھا۔ڈاکٹر فلپس کسی مریض کے اپریشن میں مصروف تھے۔اس کے بعد اگلی اپائنمنٹ سلطان کی تھی

سلطان اپریشن ،کیموتھراپی یا چیر پھاڑ سے خوفزدہ ہونے والا انسان نہیں تھا مگر آج اس کی

بائیں آنکھ بار بار پھڑک رہی تھی اور خدا جانے کیوں آج اس کا دل بہت گھبراہٹ کا شکار تھا۔ دل بوجھل سا تھا جیسے کوئی بھاری وزنی سی سل رکھ دی گئی ہو۔ اور وہ نہیں جانتا تھا کہ ایسی کیفیت کس لیئے ہے۔؟

مگر وہ جانتا ہے کہ کچھ نا تو ضرور ہونے والا ہے یا ہو چکا ہے۔ چھٹی حس اسے مسلسل کسی خطرے یا انہونی سے خبر دار کر رہی تھی۔ وقت کی سوئیاں اسی مقرر رفتار سے آگے بڑھنے میں مصروف تھیں مگر اسے لگتا جیسے گھڑی کی سوئیوں سے کوئی بھاری چیز سی باندھ دی گئی ہو اسے لگا وقت کی رفتار آج معمول سے بہت دھیمی ہے۔

تھوڑی دیر بعد اس کی پینٹ کی جیب میں رکھا موبائل تھرتھرانے لگا۔ موبائل نکالا تو سکرین پر" ارحم کالنگ" جگمگا رہا تھا۔ کان سے لگایا۔ تو دوسری طرف سے جو خبر سنائی گئی اس نے سلطان کو وہیں سن کر دیا۔ جیسے کسی نے اس کا سارا خون نچوڑ دیا ہو اس سے حرکت کی طاقت چھین لی ہو۔۔

" ڈیڈ۔۔۔ موم کا کار ایکیڈنٹ میں انتقال ہو گیا ہے۔ آپ جلدی گھر پہنچیں۔۔۔" دوسری طرف سے ارحم روتے ہوئے اسے بتا رہا تھا۔ اگلی بات اس میں سننے کی ہمت ہی نہیں ہوئی موبائل والا ہاتھ دھیرے سے اس کی گود میں آ گرا۔۔۔

نا تو اس کے لبوں سے کوئی آواز یا آہ نکلی نا ہی آنکھ سے کوئی آنسو ٹپکا۔۔ صرف ایک دل تھا جو ڈوبتا ہی جا رہا تھا۔ جیسے بہت نیچے کی طرف گرتا جا رہا ہو۔ کسی گہرائی میں۔

اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا

ان کی طلاق کو مشکل سے چھ ماہ ہی تو گزرے ہوں گے اس کی سب سے محبوب ہستی آج دنیا چھوڑ کر چلی بھی گئی۔ اور وہ مجبور اتنا کہ اپنی محبوب بیوی کا آخری منہ بھی نا دیکھ سکتا تھا۔

یہ کیسی آزمائش تھی۔ ہاں واقعی اس کے امتحان ابھی کہاں ختم ہوئے تھے۔

کافی دیر اسی پوزیشن میں بیٹھے رہنے کے بعد کسی نے اس کے کندھوں کو پکڑ کر ہلایا تو اسے ہوش آیا ۔ ریسپشن پر اس کا نام پکارا جا رہا تھا۔ اس کی پہلی کیموتھراپی کا وقت آ گیا تھا۔ اپنی پوری طاقت لگا کر کرسی سے اٹھا اور بوجھل آہستہ قدموں سے چل دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا اس کے قدم اسے کس طرف لے جا رہے ہیں۔

اس نے خود کو ہسپتال کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔اس کے کانوں نے سنا ریسپشن پر اگلا نام پکارا جا رہا تھا اور وہ مسلسل دروزے کی طرف۔

جب زندگی ہی نہیں رہی تو پھر جینے سے کیا مطلب۔۔۔

وہ بھلے سے اس کی زندگی سے نکل گئی تھی۔پر دنیا میں تو تھیں۔یہ تو سکون حاصل تھا کہ دنیا میں کہیں نا کہیں اس کا وجود ہے۔اور اب یہ سکون بھی چھن گیا۔تو پھر کس لیئے علاج اور کس کے لیئے یہ زندگی؟؟؟

☆......☆......☆

انیسواں حصہ

سلطان گھر پہنچا تو گھر میں قیامت کا سکوت تھا۔ایک گھمبیر خاموشی تھی جس نے پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔در و دیوار ایک دوسرے کے گلے لگے چپ چاپ آنسوؤں بہا رہے تھے۔کیوں نا روتے بھلا۔۔بیس سال تک اس گھر کی حفاظت کرنے والی، اس گھر کی ایک ایک چیز کا خیال رکھنے والی فاخرہ نے آج دنیا سے منہ موڑ لیا تھا۔وہ اپنی نادیدہ آنکھوں سے دیکھتے رہتے کہ کس طرح فاخرہ اپنی محبت سے اس گھر کو سنوارتی تھی۔اس گھر کی ایک ایک چیز کو سلیقے سے نکھارتی۔ہر عورت کی طرح فاخرہ کی اپنے گھر سے محبت نا قابل بیاں تھی۔

اسے اب محسوس ہوا تھا کہ ایک گھر کیلئے عورت کے وجود کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔

سلطان اپنے گھر کے صحن میں اکیلا کھڑا تھا۔گھر میں اس وقت کوئی نہیں تھا جس سے وہ اپنا دکھ بانٹتا جس کے کندھے پر سر رکھ کر اپنے آنسوؤں بہاتے ہوئے اسے بتاتا کہ میں نے فاخرہ سے کتنی محبت کی تھی۔اور وہ بے وفا جو بیس سال تک اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی رہی مگر آخری چھ ماہ اس نے اپنا راستہ الگ کر دیا۔۔اپنی منزلیں الگ کر لیں۔اور آج، آج تو اس نے دنیا بھی چھوڑ دی۔۔کوئی کسی سے اس قدر بھی ناراض ہوتا ہے کہ سارے رشتے سارے ناطے ہی توڑ دیئے جائیں۔۔۔

سلطان نے پورے گھر پر نظر دوڑائی۔اسے گھر کی دیواریں گھومتی نظر آنے لگیں۔سر چکرانے لگا تو وہ وہیں صحن میں ہی بیٹھ گیا۔جیسے کوئی انسان اپنا سب مال و متاع لٹانے کے بعد ہاتھ جھاڑ کے بے بس بیٹھا ہوتا ہے خالی ہاتھ خالی دامن۔۔۔ارحم اور حمیدہ خالہ دونوں فاخرہ کی آخری رسومات ادا کرنے گئے ہوئے تھے۔وہاں سب تھے ایک دوسرے کا غم بانٹنے کیلئے۔ایک دوسرے کو سہارا دینے کیلئے۔ایک

دوسرے کے آنسوؤں اپنے کندھوں پر جذب کرنے کیلئے ۔مگر یہاں اسے سہارا دینے کیلئے کوئی موجود نہیں تھا۔اس کے آنسوؤں کسی کے کندھے پر نہیں بلکہ اپنے گھر میں بچھے سنگِ مرمر کے ٹائلز پر گر رہے تھے۔

اس کا من کیا کہ وہ اڑ کر چلا جائے اور اپنی محبوب بیوی کا آخری منہ دیکھے مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔طلاق کے بعد سے ہی وہ اس کیلئے نامحرم ہو چکی تھی۔اسے کچھ حدود نے جکڑ رکھا تھا۔ورنہ دیوانہ وار بھاگتے پہنچ جاتا۔

جنازے کا وقت ہوا تو وہ سب سے پیچھے تھا۔اپنے سر پر ایک بڑا سا کپڑا ڈالے جس سے اس کا چہرہ قدرے چھپ گیا تھا وہ باقی تمام لوگوں سے قدرے فاصلہ رکھ کر سب سے پیچھے چلتا رہا۔سب سے پچھلی صف میں کھڑے ہو کر نماز جنازہ ادا کی۔اور پھر اسی طرح سب سے پیچھے ایک فاصلہ بنائے باقی لوگوں کے پیچھے قبرستان کی طرف چلتا رہا۔

وہ دور سے فاخرہ کو قبر میں اتارنے کا منظر دیکھتا رہا۔اسے محسوس ہوا جیسے لوگ اسے بھی فاخرہ کے ساتھ دفنا رہے ہوں۔اور یہ دور کھڑا سب منظر دیکھ رہا ہے یہ کوئی اور سلطان ہے۔وہ تو فاخرہ کے ساتھ ہی مر گیا۔

ہمیشہ اپنے زورِ بازو پر ناز کرنے والا سلطان،کبھی کسی کی نا سننے والا سلطان،ہمیشہ اپنی کہنے اور اپنی سننے والا سلطان اس قدر بھی بے بس ہو سکتا ہے اس نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔خدا انسان سے کیسے کیسے امتحان لیتا ہے۔۔۔

لوگ تھوڑی دیر رک کر فاتحہ پڑھنے کے بعد چلے گئے۔وہ نہیں گیا۔منہ چھپائے وہیں کھڑا رہا ۔جب قبرستان میں ایک بھی انسان باقی نا رہا تو وہ اپنی محبوب بیوی کے پاس آ گیا۔اس کی قبر کے پہلو میں آ بیٹھا۔قبر پر ہاتھ رکھے اس سے رو رو کر معافی مانگتا رہا جیسے وہ سب سن رہی ہو۔جیسے وہ اس کے آنسوؤں پونچھنے کیلئے ابھی اٹھ بیٹھے گی۔مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔یہ دنیا کا اصول ہے جو ایک بار یہاں سے چلا جائے پھر کبھی واپس نہیں آتا۔۔۔چاہے کتنا اسے روتے رہو،دھاڑتے رہو،

اسے چیخ چیخ کر پکارو،مگر وہ اپنی آنکھوں کے ساتھ اپنے کان بھی بند کر لیتا ہے۔فاخرہ نے بھی

یہی کیا تھا۔

خدا جانے ایسا کون سا سحر ہے جو اگلی دنیا میں جانے والے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔ یہ دیکھنے تک نہیں آتے کہ پیچھے والے انہیں کس قدر روتے ہیں، کتنا یاد کرتے ہیں وہ ان کے بغیر کتنے اکیلے کتنے ادھورے ہیں مگر اس دنیا سے جانے والوں کو کبھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اسے فاخرہ کی قبر کے سرہانے بیٹھے روتے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے تھے۔ مسلسل روتے روتے اس کے آنسوؤں خشک ہو گئے تو وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ خاموشی سے تازہ بنائی گئی قبر پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ جیسے وہ فاخرہ کی قبر کے پہلو میں نہیں بلکہ فاخرہ کے پہلو میں بیٹھا ہو۔

ہر طرف اندھیرا چھانے لگا۔ قبرستان کے سکوت اور خوف وہراس نے بھی اس کے دل کو کمزور نہیں کیا۔ کسی نے سچ کہا تھا جب کوئی اپنا مر جائے تو قبرستانوں سے بھی ڈر نہیں لگتا۔ اسے بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ ہر طرف چھائے اندھیرے اور قبروں سے بھی اسے کوئی خوف محسوس نا ہوا۔ وہ اس طرح بیٹھا تھا جیسے اسے پھر کبھی یہاں سے اٹھنا ہی نا ہو۔ باقی دنیا کا جیسے وجود ہی مٹ گیا ہو۔

"اب واپس چلے جائیں صاحب۔ اس قدر رونے سے بھی کوئی یہاں سے واپس نہیں آتا"

تھوڑی دیر بعد قبرستان کے گورکن نے اس کے پاس آ کر کہا

مگر سلطان کے مجسمے میں کوئی حرکت نا آئی۔ نا ہی اس نے گورکن کی بات کا جواب دیا۔ وہ ویسے ہی بیٹھا رہا چپ چاپ خاموش

"اندھیرا بہت بڑھ گیا ہے صاحب۔ مجھے قبرستان بند کرنا ہے۔" اس بار گورکن نے اسے کندھے سے ہلا کر متوجہ کیا

سلطان نے اندھیرے میں خالی خالی آنکھوں سے گورکن کی طرف دیکھا۔ اندھیرے کی وجہ سے اس کے چہرے کے نقوش بھی واضح نظر نہیں آ رہے تھے۔

اگلے پل اس نے گورکن کی طرف سہارے کیلئے ہاتھ بڑھایا جیسے اس کی اپنی ساری طاقت ختم ہو چکی ہو۔ گورکن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھنے میں سہارا دیا۔ وہ سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ قدموں سے

قبرستان کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔کپڑوں پر خشک مٹی لگی ہوئی تھی مگر اسے فکر نہیں تھی اس نے کپڑوں کو نہیں جھاڑا۔مٹی صاف نہیں کی۔جیسے اپنی ذات کی فکر ہی بھول گیا ہو ہمیشہ کیلئے۔

اسے تو یہ بھی یاد نہیں

تھا کہ اس کا ایک بیٹا ارحم بھی ہے۔اسے بھی تو سہارے کی ضرورت ہوگی۔وہ کتنا رویا ہوگا اپنی ماں کیلئے۔اس نے باپ کی غیر موجودگی کو کتنا محسوس کیا ہوگا۔اسے تو کچھ بھی یاد نہیں تھا۔فاخرہ کا صدمہ ہی اس قدر زیادہ تھا کہ سلطان باقی دنیا کے غم بھول گیا

☆......☆......☆

ارحم کا دکھ بھی کم نہیں تھا اس کا دل بھی رو رہا تھا۔وہ بھی غمزدہ تھا۔جب کسی انسان کی زندگی سے اس کے بہت اہم اور قریبی لوگ ہمیشہ کے لیئے چلے جائیں تو زندگی میں جو کربناکی در آتی ہے وہ صرف وہی محسوس کرسکتا ہے۔اس کا درد اور کرب بھی صرف وہی محسوس کرسکتا تھا۔مگر اس نے درد کو اپنے اندر دفن کرلیا۔اپنی ذات کی گہرائیوں میں چھپالیا۔

وہ اپنے ڈیڈ کے درد سے بھی واقف تھا۔جانتا تھا ان کیلئے یہ صدمہ ان کی کمر توڑنے سے کم نہیں ہے۔اس نے اپنے باپ کو جنازے میں سب کے پیچھے منہ چھپائے چلتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔قبرستان جب لوگوں سے خالی ہو رہا تھا اس نے اپنے ڈیڈ کو وہیں دیکھا تھا سب سے دور بیٹھے ہوئے منہ چھپائے ہوئے روتے ہوئے۔جانے وہ کرب کے کس مقام پر تھے جانے کس سے منہ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔؟

اس نے سب سے آخر میں قبرستان کے دروازے سے نکلتے ہوئے آخری بار پیچھے مڑ کر دیکھا تو اپنے ڈیڈ کو ماں کی قبر کی طرف بڑھتے دیکھا تھا۔اس کے دل نے کہا تھا کہ وہ اسی وقت اپنے باپ کے پاس چلا جائے ان کے آنسوؤں پونچھے انہیں سہارا دے،ان کے آنسوؤں کو بہنے کیلئے اپنا کندھا فراہم کرے مگر اس نے خود کو روک لیا کہ غم ابھی تازہ ہے۔کچھ آنسوؤں بہائیں گے اپنی محبوب بیوی سے اپنے درد بانٹیں گے ان کو اپنا غم سنائیں گے تو کچھ درد کم ہو جائے گا۔وہ واپس چلا گیا تھا۔اس نے

باپ کو دیکھ کر بھی ان دیکھا کر دیا۔ان کا بھرم رکھ لیا کہ انہیں کسی نے بھی نہیں دیکھا۔۔۔
زندگی اب بھی وہی تھی۔وہی روز مرہ کی زندگی وہی روز مرہ کی صبحیں وہی شامیں۔کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔صرف گھر میں خاموشی نے اپنے خیمے گاڑ لیئے تھے۔سارے گھر میں ہر وقت خاموشی چھائی رہتی۔کوئی کسی سے کچھ بھی نا بولتا۔جب خاموشی انسان کے اندر اتر جاتی ہے تو بندہ الفاظ کے سمندر رکھنے کے باوجود بھی چپ رہتا ہے۔چپ چاپ خاموش۔کسی خاموش سمندر کی طرح چپ چاپ اور گہرا۔۔۔پرسکون۔۔۔ہر دیکھنے والی آنکھ سمندر کی پرسکونیت دیکھتی ہے۔اس کی گہرائی تک کوئی نہیں جاتا۔۔۔
ارحم نے بھی اپنی ذات کو سمندر کی طرح ڈھال لیا۔کسی سے کچھ بھی نا کہنا۔بس زندگی کے دھارے کے ساتھ بغیر ہاتھ پاؤں مارے بہتے رہنا۔۔۔

☆......☆......☆

صبح کی نماز مسجد میں باجماعت ادا کرنے کے بعد دین محمد صبح کے پرسکون اور خالص ماحول کی تازگی اپنے اندر اتارتا گھر واپس پہنچا تو بختاور بھی نماز سے فارغ ہونے کے بعد چولہے میں چائے چڑھانے کی تیاری کر رہی تھی۔۔۔
نانی تاج نماز کے بعد ابھی بھی مصلے پر بیٹھی ہوئی ذکر واذکار میں مصروف تھی جبکہ خوشی ابھی تک گھوڑے گدھے بیچ کر چارپائی پر اوندھا پڑا نیند میں گم تھا۔حالانکہ دین محمد مسجد جانے سے پہلے اسے نماز کیلئے اٹھا کر گئے تھے۔
مگر وہ دادا جان کے پیٹھ پھیرتے ہی کروٹ بدل کر دوبارہ سو گیا تھا
"خوش بخت۔۔۔ابھی تک سوئے ہوئے ہو تم۔نماز بھی ادا نہیں کی۔اٹھو اور جلدی سے نماز ادا کرلو۔۔۔جماعت تو چھوڑ دی۔اب وقت نکل گیا تو قضا ہو جائے گی" دین محمد نے لکڑی کی چارپائی پر سوئے خوشی کو جھنجوڑتے ہوئے کہا اور خود بھی ساتھ والی چارپائی پر بیٹھ گئے۔
"اٹھتا ہوں دادا جی۔۔۔" اس نے آنکھیں موندے جواب دیا اور کروٹ بدل لی
"اٹھتا ہوں نہیں۔۔۔ابھی اٹھو۔وقت تمہارا محتاج تھوڑی ہے جو تمہارے لیئے رکا رہے گا۔"

اس بار دین محمد نے اسے باقاعدہ اٹھا کے بٹھا دیا اور وہ منہ بنائے غسل خانے کی طرف چل دیا
" شادی کر دیتے ہیں اس کی۔خوشی کو سیدھا رکھنے والی آجائے گی تو ہر کام وقت پر کرے گا۔"
بختاور نے وہیں چولہے میں بیٹھے مسکراتے ہوئے کہا
" آجکل ہر آنے والی پہلے سے ہی ٹیڑھی ہوتی ہے وہ شوہر کو کیا سیدھا کرے گی۔" دین محمد نے بھی مسکراہٹ اچھالتے ہوئے کہا۔
" اب ایسا بھی کال نہیں پڑا۔اپنے ارد گرد دیکھو۔بہت سی نیک سیرت بچیاں موجود ہیں۔"
خوشی نماز پڑھ کے واپس آچکا تو دادا کے ساتھ اسی کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔۔۔
" تم خود بتاؤ خوشی۔۔۔ہم تمہاری شادی کا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں۔بتاؤ تمہیں کون پسند ہے۔"
دین محمد نے اس کے کاندھتے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا
" یہ صبح صبح آج میری شادی کی کیوں پڑ گئی آپ سب کو۔۔؟" وہ حیرت سے بولا
" اپنی عمر دیکھو۔۔۔تمہارے دوست سب شادیاں کر کے بال بچوں والے ہو چکے ہیں۔ایسا نا ہو کنوارہ بیٹھے بیٹھے ہی بال سفید کر لو" دین محمد ایک بار پھر مذاق کے موڈ میں بولے
" اب لوگوں کا کوئی کیا کر سکتا۔اولاد ذرا بڑی ہوئی نہیں والدین اسے کھونٹے سے ٹانگ دیتے ہیں۔۔۔اور میرے خوشی کی عمر اتنی بھی نہیں بڑھی۔اس کی پیدائش کا دن شیشے کی طرح صاف یاد ہے مجھے"
بختاور اپنے پوتے کی مدد کو آئیں
" تو اچھا ہے نا۔۔جلدی شادی سے بچہ بہت سی برائیوں اور بے راہ روی سے بچ جاتا ہے۔اور سنت رسول بھی یہی ہے۔" نانی تاج نے تسبیح اور مصلہ دیوار میں گڑھی کلی کے ساتھ لٹکاتے ہوئے کہا۔وہ اپنے روز کے ذکر واذکار سے فارغ ہو چکیں تھیں
" ہاں آپ کی بات درست ہے۔مگر بچہ پہلے خود کو سنبھالنے اور بیوی کی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل ہو جائے تب شادی کرنی چاہیئے۔" بختاور اپنے موقف پر قائم رہیں
" آجکل سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔بچے قابل بنتے بنتے اپنا آدھا سر سفید کر لیتے ہیں۔اب اپنے

شاہ والی پر نظر کرلو۔کتنی بچیاں ایسی ہیں جو اسی آس میں بیٹھی ہوئی ہیں اوران کے بالوں میں چاندی اتر چکی ہے" نانی کے پاس بھی مضبوط دلیل موجود تھی۔مصلہ لگانے کے بعد وہ بختاور کے ساتھ چولہے میں آبیٹھی

"ارے کوئی اس کی تو سن لے پہلے۔بتاؤ خوشی تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے یا ہم اپنی پسند کی لڑکی ڈھونڈ لائیں تمہارے لیئے۔۔" دین محمد نے ان دونوں کو مزید بحث سے روک کر دوبارہ خوشی سے پوچھا

"پسند تو ہے مجھے ایک لڑکی دادا جی۔۔۔پر اس سے میری شادی بہت مشکل ہے۔۔" اس نے بڑی مشکل سے اپنی بات پوری کی۔یوں سب کے سامنے اپنی پسند بتانے سے اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

"ارے تم نام تو لو۔۔۔کسی لڑکی کے سر پر ہاتھ تو رکھو۔میں اپنے خوشی کے لیئے وہی دلہن لے آوں گا ہر قیمت پر۔ایک ہی تو پوتے ہو تم میرے اور آخری وارث بھی۔بتاؤ تم کون ہے وہ لڑکی۔۔۔" دین محمد جوش سے بولے۔

"جنت۔۔۔" دادا کی طرف سے ڈھارس ملنے پر اس نے نام بتا دیا

دین محمد کے ہونٹوں پر آئی مسکان ایک دم غائب ہوگئی۔چہرے پر سنجیدگی آ ٹھہری چولہے میں بیٹھی دونوں خواتین نے مڑ کر خوشی کی طرف دیکھا۔وہ گھبرا گیا۔

"جنت کو چھوڑ کے اور بھی تو لڑکیاں ہیں گاؤں میں۔تم شادی کے لیئے کوئی اور نام بتا دو۔" دین محمد نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔تھوڑی دیر پہلے جو ان کے لہجے سے جوش چھلک رہا تھا اب وہ ایک دم سے کہیں غائب ہوگیا۔

"کوئی اور کیوں۔۔۔جب مجھے پسند ہے وہی ہے تو جنت کیوں نہیں۔۔۔" وہ حیران ہوا ابھی تھوڑی دیر پہلے دادا کتنا خوش ہو کر اس سے پسند پوچھ رہے تھے اب پسند بتائی تو اعتراض

"نہیں خوشی جنت نہیں۔۔۔اس سے تمہاری شادی بالکل نہیں ہوسکتی"

"کیوں نہیں ہوسکتی بھلا۔۔۔ہاں وہ ہم سے امیر ہیں۔زمیندار صاحب کی بیٹی ہے۔لیکن دادا جی آپ کوشش کر کے تو دیکھیں۔پھر میں خود بھی تو کمانے لگوں گا۔۔۔"

" غربت امارت کی بات نہیں ہے خوشی ۔۔۔بس تمہاری جنت سے شادی ہرگز نہیں ہو سکتی ۔تم کوئی اور سوچو۔۔۔"

" آخر کیوں نہیں ہو سکتی ۔اگر غربت کی بات نہیں ہے تو پھر وجہ کیا ہے آخر۔۔۔مسئلہ کیا ہے جنت سے شادی میں۔۔۔؟"

" میں نے کہا نا خوشی۔۔۔بس اب اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا۔۔" دین محمد اٹھ کے چلے گئے۔

خوشی نے حیرانگی سے انہیں جاتا ہوا دیکھا ۔ایسا تو کچھ بھی غلط نہیں بولا میں نے جو دادا جی یوں اٹھ کے باہر چلے جائیں۔۔۔

وہ بھی اٹھ کے نانی کے پاس آ بیٹھا وہیں چولہے میں۔۔۔

" نانی بتائیں نا۔۔۔آخر جنت سے کیوں نہیں ہو سکتی ۔مجھے وہ بہت پسند ہے۔۔اور وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔پھر مسئلہ کیا ہے۔دادا جی یوں اٹھ کے کیوں چلے گئے ہیں۔۔۔" اس کے پاس کئی سوالات تھے

دونوں خواتین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا

" اسلیئے کہ تمہارے باپ نے جنت کی ماں کو طلاق دی تھی ۔بغیر کسی خاص وجہ کے ۔جنت کی ماں نور بانو تمہارے باپ سلطان کی پہلی منکوحہ تھی ۔سلطان نے اسے شادی کے پہلے ہی سال طلاق دے کر واپس بھیج دیا تھا۔۔۔

نور بانو ، دین محمد کی بھانجی تھی ۔یتیم تھی ۔وہ بڑی چاہت سے اپنی بھانجی کو سلطان کے ساتھ بیاہ لائے تھے ۔مگر یہ شادی زیادہ دیر چل ہی نا سکی بلکہ سلطان نے چلنے ہی نا دی ۔نور بانو کی طلاق کے بعد دین محمد نے سلطان سے سارے تعلق توڑ دیئے تھے ۔اور اسے گھر سے نکال دیا تھا۔یہی وجہ تھی کہ اس دن سے سلطان نے جو گھر چھوڑا پھر وہ آج تک واپس نہیں آیا۔

اب دین محمد اپنی بے قصور بھانجی سے نظریں ملاتے شرم محسوس کرتے ہیں۔۔۔کس منہ سے وہ رشتہ مانگنے جائیں گے نور بانو کے پاس۔۔۔کیا کہیں گے اسے کہ جس سلطان نے تمہیں بے قصور طلاق دی تھی میں اس کے بیٹے کے لیے تمہاری بیٹی کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں۔۔۔"

نانی تاج نے خوشی کے کانوں میں الفاظ نہیں سیسہ انڈیلا تھا۔۔۔اس کے کانوں میں بم پھوڑا تھا ۔وہ سنتے ہی سن ہو گیا۔کچھ بولنے کے قابل ہی نا رہا۔بلکہ وہ تو اس طرح آنکھیں پھاڑے حیران مجسمہ بنا بیٹھا تھا جیسے کہ اس میں سانس ہی نا ہو ابھی ہاتھ لگاؤ ابھی وہ گرا۔

تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے اٹھ آیا اور اپنی چارپائی پر آ گرا۔۔۔یہ کیا سنا تھا اس نے ابھی ابھی ۔۔۔کیا یہ سب سچ تھا۔۔۔اگر سچ تھا تو اس کی زندگی کا سب سے بھیانک ترین سچ تھا۔

☆......☆......☆

"تو یہی وجہ تھی۔اسلیئے کوئی کبھی کسی کے گھر نہیں جاتا تھا" ساری کہانی سننے کے بعد جنت نے خوشی سے پوچھا

"ہاں ۔۔۔یہی وجہ تھی۔اس لیئے دادا جان صبح ناشتہ کیئے بغیر چلے گئے۔وہ شاید ڈر رہے تھے کہ میں کس طرح اپنے باپ کے کارنامے سنوں گا اور وہ کس منہ سے اپنے بیٹے کا کارنامے بیان کریں گے ۔۔۔"خوشی کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی تھی

"پھر اب ۔۔۔اب کیا ہو گا خوشی"

"پتا نہیں کیا ہو گا۔۔۔شاید خدا کو منظور ہی نہیں یہ سب۔۔۔" اداس لہجے میں خوشی نے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا

جنت نے نظریں جھکا لیں۔

اس نے آج تک خوشی کی آنکھوں میں دیکھ کر بات نہیں کی تھی

"پر اماں نے تو مجھ سے کبھی کچھ نہیں چھپایا۔۔۔انہوں نے اتنی بڑی بات مجھے کیوں نہیں بتائی ۔۔۔" وہ ماں کے صبر پر حیران تھی

"کچھ لوگ ہوتے ہیں جنت۔جو اپنی تکلیفوں پر شکوے کبھی نہیں کرتے۔نا انسانوں سے اور نا ہی خدا سے۔بس اپنے ہونٹ سی لیتے ہیں۔صبر کا گھونٹ پی لیتے ہیں۔۔۔

نور پھوپھو بھی انہی میں سے ایک ہیں۔ابا جی نے انہیں طلاق دی لیکن پھر بھی وہ مجھ سے پیار کرتی ہیں۔

وہ چاہتی تو ہم دونوں کو کبھی ملنے ہی نہیں دیتی۔۔۔مگر انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔کبھی ان کے رویے سے یہ ظاہر نہیں ہوا کہ میرے باپ نے ان پر اس قدر۔۔۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی

کچھ باتوں کے مکمل ہونے سے پہلے دل لبریز ہو جاتے ہیں۔

جنت بھی چپ چاپ بیٹھی رہی۔اپنی ماں سے وہ بے حد پیار کرتی تھی۔پر آج اس پیار اور احترام میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا

"پر جنت میں کسی اور سے کیسے کر سکتا ہوں بھلا۔۔۔میرا مطلب میں تمہارے بغیر۔۔۔کیسے یہ سب۔۔۔؟؟؟" خوشی کے الفاظ ٹوٹنے لگے۔جنت کو کھونے کا تصور ہی دل دہلا دینے والا تھا

"یہ سب ہمارے ہاتھ میں کہاں ہوتا ہے خوشی۔۔۔سب ڈوریاں تو اسی اوپر والے کے پاس ہوتی ہیں۔ہم تو کٹھ پتلیاں ہیں صرف۔اور کٹھ پتلیاں اپنی مرضی سے تھوڑی کچھ کر سکتی ہیں۔سب کچھ ڈور ہلانے والے کے پاس ہوتا ہے۔۔۔چاہے جس طرف بھی موڑ دے"

دل تو جنت کا بھی ڈوب گیا تھا۔خوشی کے بغیر زندگی کا تصور تو اس کیلئے بھی مشکل تھا۔۔۔

آج دونوں ایک دوسرے سے نظریں ملانے سے گریز کر رہے تھے۔آج دونوں اداس تھے تو انہیں دریا کا کنارہ بھی اداس معلوم ہو رہا تھا۔یہی دریا کا کنارہ تو ان کی پاک محبت کا گواہ تھا۔آج اس پر بھی سوگواری سی چھائی ہوئی تھی

"میں کبھی شادی کروں گا ہی نہیں۔۔۔تم نہیں تو اور بھی کوئی نہیں۔۔۔" وہ ڈٹ کر بولا

"نہیں خوشی۔۔۔کبھی کبھی اپنوں کیلئے قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔وقت کے ساتھ سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔۔۔یہ قربانی ہمارے نام سہی۔

اس گھر میں بڑی دیر سے خوشیاں واپس آئی ہیں۔۔۔جو وہ سب چاہیں مان لینا تم۔"

"پر میری اپنی کوئی خوشی نہیں۔۔۔؟؟؟"

"قربانی دینی پڑتی ہے"

وہ بل کھا کے رہ گیا۔کیا کرتا بے بس ۔۔۔کسی دوسرے کی وجہ سے اپنی چاہت سے دستبر داری کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔وہ بے بس ہوا بیٹھا تھا کیونکہ وہ دوسرا انسان اور کوئی نہیں اس کا اپنا باپ تھا۔۔۔

جس سے نا وہ لڑ سکتا تھا اور نا ہی برا بھلا کہہ سکتا تھا۔

مگر وہ کسی صورت میں جنت کو چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔چھوڑنا دور وہ چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔پھر اس کے بغیر اتنی زندگی بھلا کیسے گزرتی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم تھے۔خوشی کیلئے وہ جنت سے کم نہیں تھی اور اس میں جنت کی خوشی کی خوشی تھی۔کوئی اپنی جنت کو یا اپنی خوشی کو اتنے سستے میں بھلا کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

☆......☆......☆

"کوکب بیٹا۔۔۔انجم بتا رہی تھی کہ تم نے کالج کے پلے اور دوسرے کمپٹیشنز سے اپنا نام واپس لے لیا ہے۔۔۔؟" وہ اپنے روم میں بیڈ پر بیٹھی کمبل اوڑھے کوئی انگلش موووی دیکھ رہی تھی جب کبیر صاحب اپنے مخصوص انداز میں اپنے کندھوں پر شال ڈالے ہاتھ میں کافی کا مگ پکڑے اس کے روم میں داخل ہوئے۔

"جی ڈیڈ۔۔۔" اس نے ٹی وی ریموٹ سے آف کرتے ہوئے ڈیڈ کو جواب دیا

"کیوں بیٹا ایسی کیا بات ہوئی ہے۔جبکہ تم تو بہت زیادہ ایکسائیٹڈ تھی اس کمپیٹیشن کیلئے۔۔۔" وہ اب چلتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگے دو صوفوں میں سے ایک پر آبیٹھے۔

کمرے کو نہایت نفاست سے سجایا گیا تھا اور یہ ساری نفاست اس کی بہن انجم کبیر کی ہی مرہون منت تھی

"وجہ کچھ خاص نہیں ہے ڈیڈ۔۔۔بس دل ہی نہیں کر رہا۔"

کبیر صاحب ان مردوں میں سے تھے جو اپنی بیٹیوں کو ہمیشہ بیٹوں سے کم نہیں سمجھتے تھے۔اور زندگی کے ہر شعبے میں اور ہر سٹیج پر انہیں آگے دیکھنا چاہتے تھے

"اچھا پھر آگے کیا پلاننگ ہے آپ کی۔ایگزام کے بعد کچھ کرنے کا سوچا ہے۔۔۔؟"

" کچھ خاص پلان نہیں ہے ڈیڈ۔بس زندگی نے جس طرف رخ موڑ دیا مڑ جاؤں گی۔۔۔"

" بیٹا یاد رکھنا۔۔۔کچھ بڑا کرنے کیلئے سب سے پہلے بڑا سوچنا لازم ہوتا ہے۔"

" جی ڈیڈ۔۔۔" جانے کیوں آج اس کے لہجے میں بھی اداسی در آئی تھی

" اداس کیوں ہے میرا بیٹا۔۔۔؟"

وہ کافی کا سپ لیتے ہوئے بولے۔آج انہیں کوکب میں غیر معمولی تبدیلی نظر آ رہی تھی

" مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی ڈیڈ کہ میں اپنے لیئے کیا کروں اور کیا نا کروں۔۔۔؟"

" میری بیٹی اتنی کمزور تو نہیں تھی جس طرح میں آج دیکھ رہا ہوں۔تمہیں خدا نے ڈیسیژن پاور دی ہے تم اپنا اچھا برا خود سوچ سکتی ہو۔تمہیں اتنی میچور ہو کہ اپنے نفع نقصان میں فرق جان سکتی ہو۔اپنی راہیں خود متعین کر سکتی ہو۔۔۔"

" آپ صحیح کہہ رہے ہیں ڈیڈ۔۔۔مگر جانے کیوں میں تھکنے لگی ہوں۔مجھے اپنا آپ اس طرح محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی کو ایک لمبی مسافت طے کرنے کے پتا چلتا ہے کہ وہ جس راہ پر سالوں سے چل رہا ہے یہ راہ تو اس کی منزل کی طرف نہیں جاتی۔"

" مجھے اپنی بیٹی پر اتنا یقین ہے کہ اگر اس مسافر کی جگہہ میری کوکب ہوئی تو وہ اسی راہ سے اپنے لیئے نئی منزل تلاش کر لے گی۔۔۔" کبیر صاحب نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

" اور اگر انجم کبیر ہوئی تو۔۔۔؟" اگلے پل اپنا مخصوص چشمہ لگائے انجم روم میں داخل ہوئی اور آتے ساتھ ہی مسکراتے ہوئے گفتگو میں کود پڑی

" مجھے میری دونوں بیٹیوں پر فخر ہے۔میرے لیئے تم دونوں سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔اس کی جگہہ انجم ہوئی تو وہ بھٹکے گی ہی نہیں۔۔۔" فقرے کے آخر میں کبیر صاحب مسکرا دیئے تھے۔

" یہ ہوئی نا بات۔۔۔ڈیڈ آپ سب سے اچھے ہیں۔" وہ چلتی ہوئی کبیر صاحب کے پہلو میں صوفے پر آ بیٹھی اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال لیں

" بیٹا یہ زندگی کافی کی طرح ہوتی ہے ہر گھونٹ پر منہ میں کڑواہٹ گھلتی ہے اور ہم اپنے اندر یہ

کڑواہٹ انڈیل جاتے ہیں اسی طرح زندگی میں ہر نئے موڑ پر، ہر اگلے قدم پر کچھ نا کچھ مشکلات ہمارا خیر مقدم کرتی ہیں اور ہمیں ان ہرڈلز کا سامنا کرتے ہوئے آگے کی طرف بڑھنا ہوتا ہے۔۔۔ مجھے یقین ہے میری دونوں بیٹیاں ہر موڑ پر سرخرو ہوں گی۔۔۔"

"بالکل ڈیڈ۔۔۔آپ ہم سے کبھی مایوس نہیں ہوں گے۔" کبیر صاحب کے حوصلے کی وجہ سے کوکب پر چھائی اداسی چھٹنے لگی تھی۔اور اب وہ پہلے کے مقابلے کے ہشاش بشاش دکھائی دے رہی تھی

"کیوں نا آج آئس کریم کھانے چلیں ڈیڈ۔۔۔کچھ چینج آجائے گا؟" انجم کو جانے کیوں اس وقت آئس کریم کی یاد ستانے لگی

"بالکل چلتے ہیں۔۔۔تم لوگ جلدی سے اپنی ممی کو تیار کرو اور میں گاڑی نکالتا ہوں۔۔۔" دو منٹ میں ہی ماحول تبدیل ہوگیا تھا

اگلے دس منٹ میں وہ سارہ بیگم کے انکار کے باوجود اسے گاڑی میں بٹھانے پر کامیاب ہو گئے تھے سارہ بیگم اس ٹھنڈ میں باہر آئس کریم کیلئے بالکل تیار نہیں تھی مگر کوکب اور انجم بھی اسی کی بیٹیاں تھیں وہ اپنی ماں کو زبردستی منانے میں کامیاب ہو ہی گئیں تھیں اور یہ چار افراد کا کنبہ رات کے اس پہر ٹھنڈ کے باوجود بھی آئس کریم کھانے نکل پڑا تھا

☆......☆......☆

"نانی آپ دادا جی کو سمجھائیں نا۔۔۔مانتا ہوں یہ ان کیلئے بہت مشکل ہے۔نانی میرے لیئے بھی یہ بہت مشکل ہے کہ میں اپنی زندگی سے جنت کو نکال کر خود کو کسی اور کیلئے وقف کردوں۔۔۔" خوشی دوسرے دن ہی نانی اور دادی کے گھٹنے آبیٹھا

"خوشی تم سمجھ ہی نہیں سکتے ان کی کیفیت۔۔۔تم نہیں جانتے تمہارے دادا کتنی چاہ سے اپنی بھانجی کو یہاں بیاہ لائے تھے۔اور جب سلطان نے نور بانو کو طلاق دی اسی دن سے دین محمد نے دوبارہ نور بانو سے آنکھ تک نہیں ملائی۔شرمندگی محسوس کرتے ہیں وہ۔ان کا سامنا کرنے سے کتراتے ہیں۔اس کی سوالی آنکھوں میں دیکھنے سے وہ گھبراتے ہیں خود کو مجرم سمجھتے ہیں وہ نور بانو کا۔۔۔" جواب نانی

تاج کی بجائے اس کی دادی بختاور نے دیا تھا۔۔۔

" آپ کی ساری باتیں ٹھیک ہیں دادی۔۔۔لیکن اس میں سارا قصور ابا جی کا تھا۔ پھر دادا جی کیوں خود کو سزا دیتے ہیں۔ ان کا تو کوئی جرم نہیں ہے اس سب میں۔۔۔"

" ہاں ان کا کوئی جرم نہیں ہے مگر پھر بھی وہ خود کو نور بانو کا مجرم سمجھتے ہیں۔"

" دادی آپ لوگ دادا جی کو سمجھائیں نا۔۔۔ان سے کہیں کہ وہ ایک بار اپنا دل بڑا کر کے دوبارہ اس چوکھٹ پر جائیں۔ جنت کا رشتہ مانگیں۔ اس بار اپنے بیٹے کیلیئے نہیں بلکہ اپنے پوتے کیلیئے جائیں۔"

دونوں خواتین خاموش بیٹھی اس کا چہرہ تکتی رہیں اس کی سوالی آنکھیں دیکھتی رہیں۔ یہ ان کے گھر کا واحد چراغ تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس آخری چراغ کی لو بھی ٹمٹمانے لگ جائے پر کیا کرتے وہ لوگ بھی مجبور تھے۔ حالات بھی انسان کس کس طرح مجبور نہیں کرتے۔

" میں بہت خوش رکھوں گا جنت کو۔ اور یہ اس زخم کی تلافی بھی تو ہو گی جو میرے ابا نے نور بانو خالہ کو دیا۔۔۔"

وہ بے بس تھا۔ اس کے اختیار میں نہیں تھا ورنہ خود ہی جنت کا ہاتھ مانگنے چل دیتا

" خواہش میری بھی یہی ہے پتل کہ اس آنگن میں جنت کو مسکراتے دیکھوں اور اس طرح ہماری خوشیاں بھی دوبارہ لوٹ سکتی ہیں۔ دوبارہ دونوں گھرانے ایک ہو سکتے ہیں۔۔۔لیکن اللہ نا کرے پتل اگر کبھی تم دونوں میں ناچاقیاں آجائیں اور تم پھر وہی حالات پیدا کر دو جو بائیس سال پہلے سلطان نے کیئے تھے تو پھر۔۔۔؟؟؟" نانی بھی آخر دل کی بات ہونٹوں پر لے ہی آئیں

" نہیں نانی ایسا کچھ بھی نہیں ہو گا۔ میں جنت کو بہت خوش رکھوں گا ہمیشہ۔ اور جنت کو بھی میں جانتا ہوں اگر زمیندار صاحب نے اسے کسی اور کے ساتھ بیاہ دیا تو وہ مان تو جائے گی باپ کی لاج تو رکھ لے گی مگر کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔۔۔"

" ہاں وہ نیک بچی ہے۔ نور بانو نے اس کی اچھے سے تربیت کی ہے۔ سر جھکا دے گی بغاوت

کبھی نہیں کرے گی۔۔" نانی تاج نے تصور میں جنت کا معصوم چہرہ دیکھتے ہوئے اس کی تعریف کی
" دادی ہم دونوں کی خواہش یہی ہے۔۔۔جنت بھی یہی چاہتی ہے۔اس طرح ہم سب ایک ہو سکتے ہیں۔ابا کے عمل سے جو بیچ میں دراڑیں آ گئی ہیں وہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائیں گی
دونوں خاندانوں نے سالوں سے ایک دوسرے کے گھر کا دروازہ پار نہیں کیا۔یہ بیچ کا خلا ہم ختم کرنا چاہتے ہیں۔۔۔دوریاں مٹانا چاہتے ہیں ہم۔۔۔آپ لوگ دادا جی کو منائیں ان کا حوصلہ بڑھائیں ۔۔۔ہم سب پھر سے ایک ہو جائیں گے۔۔۔"
خوشی ان دونوں خواتین کو مسلسل قائل کرنے میں لگا رہا۔اور وہ دونوں قائل ہو بھی گئی تھیں کیونکہ دل سے دونوں یہی چاہتی تھیں۔پر پہلا قدم اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔۔۔
خوشی ان کو قائل کر کے چلا گیا اب جو کرنا تھا ان دونوں خواتین نے کرنا تھا
" خوشی اور جنت کے رشتے سے محبتوں کی وہ شاخ جو آبیاری نا ہونے کی وجہ سے مرجھا گئی ہے پھر سے ہری بھری ہو جائے گی۔۔۔خوشی صحیح کہتا ہے۔اس طرح جو چھاپ اس کے باپ پر لگی ہوئی ہے وہ بھی ہمیشہ کیلئے مٹ سکتی ہے بختاور۔۔۔" خوشی کے جانے بعد نانی تاج نے اپنے دل کی بات بختاور کے آگے کھول دی
" اللہ کرے ایسا ہی ہو۔۔والدین کب یہ چاہتے کہ ان کی اولادیں اپنے رشتوں سے منہ موڑے زندگی گزارتے رہیں۔۔۔خواہش میری بھی یہی ہے۔پر یہ مرحلہ آسان نہیں ہوگا۔دین محمد کیسے راضی ہوں گے؟ میں اپنے شوہر کے مزاج سے واقف ہوں۔جانتی ہوں کہ سلطان کی وجہ ان کی جھکی آنکھوں کا دوبارہ اٹھنا مشکل ہے۔ایک شخص جو خود کو کسی کا مجرم گردانتا ہو وہ دوبارہ کس طرح اس کی چوکھٹ پر رشتے کیلئے جھولی پھیلا سکتا ہے۔یہ ان کیلئے بہت مشکل ہوگا" بختاور نے حقیقت سے پردہ اٹھایا
"مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔۔۔ہم دونوں مل کر بات کریں گی تو دین محمد مان جائیں گے ۔مجھے یقین ہے وہ میری بات کو رد نہیں کرے گا"
اور پھر خدا جانے ان دونوں خواتین نے دین محمد کو کیسے راضی کیا کس طرح راضی کیا۔مگر ایک

ہفتے کی لگا تار کوششوں کے بعد آخر کار راضی کر ہی لیا۔ دین محمد بائیس سال بعد اپنی بھانجی کی چوکھٹ پر قدم رکھنے کیلئے تیار ہو گئے۔ وہ بائیس سال بعد پھر سے جھولی پھیلانے کیلئے راضی ہو گئے۔ پہلے نور بانو کے ابا کے آگے نور بانو کیلئے جھولی پھیلائی تھی۔ آج بائیس سال بعد وہ نور بانو اور زمیندار صاحب کے آگے جنت کیلئے جھولی پھیلانے پر تیار ہو گئے تھے

خوشی کی خوشی کا اس دن کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ دادا جان راضی کیا ہوئے اس کے پاؤں ہی زمین سے اٹھنے لگے۔ اس کی جنت اس کی ہونے جا رہی تھی۔ اس کی محبت اب اس کی دسترس سے زیادہ دور نہیں تھی۔

کوئی اتنی جلدی اپنی محبت کو پا سکتا ہے اسے حیرت ہو رہی تھی اس قیس کی طرح کسی صحراء کی خاک نہیں چھاننی پڑی تھی، فرہاد کی طرح اس نے کسی کوہ کو توڑ دودھ کی نہر نہیں نکالی تھی، اور نا ہی مہینوال اور رانجھے کی طرح اسے اپنی ہیر کی بھینسوں کو چرانا پڑا تھا۔ خوش بخت آج خود کو دنیا کا خوش نصیب ترین انسان سمجھنے لگا تھا۔ اسے آج یقین ہونے لگا تھا کہ وہ صرف نام کا خوش بخت نہیں ہے۔ حقیقت میں بھی بخت اس کا غلام ہے۔

مگر وہ کچھ نہیں جانتا تھا اوپر ساتوں آسمانوں سے بھی بہت اوپر بیٹھے ہماری کہانیاں لکھنے والے کچھ اور منظور تھا شاید۔۔۔

اور محبت اس قدر آسانی سے کب کسی کے ہاتھ آئی ہے جو خوشی کے ہاتھ آ جاتی۔ محبت میں تو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگتی ہیں پاؤں میں بیڑیاں پڑتی ہیں زندانوں کی تاریکیاں نصیب ہوتی ہیں آبلہ پائی ہوتی ہے تپتی گرم ریت کے صحراء ننگے پاؤں عبور کرنے پڑتے ہیں، پتھر کھانے پڑتے ہیں تب کسی نصیب والے کو محبت نصیب ہوتی ہے محبت بھلا اتنی آسانی سے کب کسی کو حاصل ہوئی ہے۔۔۔

☆......☆......☆

وقت کی رفتار ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ مگر کبھی کبھی جب انسان مشکلات میں گھرا ہوتا ہے تو انسان کو لگتا ہے کہ وقت نے اپنی رفتار بہت کم کر دی ہے مگر ایسا نہیں ہوتا۔۔۔ وقت کسی کیلئے نہیں رکتا زندگی کسی

کیلئے بھی نہیں رہتی۔
سلطان کو بھی فاخرہ کی موت کے بعد ایسا ہی محسوس ہوتا تھا کہ زندگی بہت سلوموشن میں چلنے لگی ہے۔وقت کے پہیے مسلسل چلتے چلتے اب گھس گئے ہیں۔فاخرہ نے دنیا سے منہ کیا موڑا سلطان کی تو دنیا ہی تبدیل ہوگئی تھی۔۔۔
وہ اس کی زندگی سے تو پہلے ہی چلی گئی تھی مگر اب تو وہ اس دنیا سے بھی چلی گئی تھی۔۔۔
اسے اب اپنی روز بروز گرتی ہوئی صحت کا خیال بھی نہیں رہا تھا۔فاخرہ کو گزرے ایک ماہ پورا ہوگیا مگر کیموتھراپی کیلئے اس نے دوبارہ ہسپتال کی طرف قدم بھی نہیں بڑھایا تھا۔اس ایک ماہ میں ڈاکٹر فلپس کی طرف سے تین بار ای میل سلطان کو موصول ہوئی جن میں اسے اپنی کیموتھراپی جلد از جلد کرانے کی ہدایت کی گئی کیونکہ دوسری صورت میں کینسر کے خلیات کی تعداد میں مسلسل اضافہ بہت خطرناک صورت اختیار کر جاتا
مگر اس نے کوئی توجہ نا دیا۔اب اپنی زندگی اور صحت سے کوئی دلچسپی نا رہی تھی۔اسے اگر فکر تھی تو صرف ارحم کی۔۔۔اگر اسے کچھ ہوگیا تو ارحم کا کیا ہوگا۔وہ اتنی زندگی کس کے سہارے گزارے گا۔یہاں تو اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔
ارحم کے نانا نانی زندہ تو تھے اور اچھا خاصا سٹیٹس بھی رکھتے تھے اسد حسین صاحب کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی مگر شروع سے ہی ارحم ان سے اتنا اٹیچ نہیں رہا تھا۔وہ اپنے ماں باپ سے بے حد کلوز تھا۔مہینوں گزر جاتے بلکہ کئی بار تو اسد صاحب خود ارحم کو بلوا بھیجتے مگر پھر بھی وہ ان کے ہاں جانے میں کوئی دلچسپی نا دکھاتا۔
یہ فاخرہ کے گزرنے کے ایک ماہ بعد کی بات تھی جب وہ دونوں باپ بیٹا ناشتے کی ٹیبل پر اکٹھے بیٹھے تھے
"ڈیڈ۔۔۔میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی صحت بہت گرتی جا رہی ہے۔آپ کسی ڈاکٹر سے چیک اپ کیوں نہیں کراتے۔۔۔"

"نہیں بیٹا میں بالکل ٹھیک ہوں
کچھ بھی تو نہیں ہے مجھے۔ مکمل فٹ ہوں"
"آپ نے خود کو آئینے میں آخری
بار کب دیکھا تھا۔۔۔؟" اس نے عجیب سا سوال کیا
"یاد نہیں بیٹا۔ شاید تمہاری ماں کے گزرنے سے پہلے۔۔۔ کیوں۔۔۔؟؟؟" وہ حیران ہوئے
ایسے سوال پر
"آج ایک بار پھر ضرور دیکھئے گا۔۔۔"
"مگر کیوں۔۔۔؟"
"کیوں کہ آپ کا چہرہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ آپ بیمار ہیں۔۔۔ جیسے صحرا میں سفر کرنے مسافر کا نام ایک لمبی مسافت طے کرنے کے بعد ہوتا ہے۔۔۔ بے رونق، بجھا ہوا، تھکا تھکا سا۔ اور جیسے کسی نے آپ کا خون نچوڑ لیا ہو۔۔۔ اور صحت دیکھیں اپنی۔ آپ پہلے سے کتنا کمزور ہو گئے ہیں۔ آپ نے آج ہی چیک اپ کروانا ہے اور اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔۔۔"
"بیٹا۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بس تم اپنا خیال رکھا کرو۔"
"ڈیڈ۔۔۔ آپ بہت بیمار پڑ چکے ہیں۔ اچھا ناشتے کے بعد ہم دونوں چلتے ہیں۔ مجھے پتا ہے آپ پھر لاپرواہی کریں گے۔۔۔ اور سٹور سے بھی ایک ہفتہ ریسٹ لے لیں آپ۔۔۔" ارحم نے خود ہی ڈیڈ کو ہسپتال لے جانے کا عزم کر لیا
"نہیں بیٹا۔۔۔ تم اپنی آرٹ کلاس لینا۔ میں آج خود جاؤں گا ہسپتال۔۔۔" سلطان نے اس کی تسلی کیلئے جھوٹ بول دیا
"میں تسلی کروں۔۔۔ پرامس؟؟؟"
"پرامس۔۔۔"
دونوں کے بیچ کچھ دیر کیلئے باتوں کا سلسلہ تھم سا گیا۔ وہ باپ بیٹا اس پورے ماہ میں پہلی دفعہ اس

قدر باتیں کر رہے تھے ورنہ تو جب بھی وہ صبح یا رات کے کھانے پر اکٹھے ہوتے خاموشی سے کھانا کھایا جاتا ۔دونوں کھانا کھا کر اپنی اپنی مصروفیت میں لگ جاتے ۔جانتے تھے کسی نے بھی پرانی باتیں چھیڑی تو زخم ادھڑ جائیں گے آنسوؤں چھلک پڑیں گے

اور پچھلے پورے ماہ میں وہ ایگزام کی وجہ سے بہت مصروف بھی رہا تھا۔اپنی تیاری ساتھ کوکب کی تیاری کروانا۔انہیں ایگزام نے خاصا تھکا دیا تھا۔اللہ اللہ کر کے پیپرز سے جان چھوٹی تھی۔

آج موقعہ ملا تو سلطان اس موقع کو ہرگز ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے ۔وہ دل ہی دل میں الفاظ ترتیب دینے لگے ۔کیونکہ جانتے تھے ارحم جتنا بھی فرمانبردار بیٹا سہی پر آج اس نے باپ کو صاف انکار ہی کرنا ہے

" ارحم بیٹا۔۔۔اب تو تمہارے ایگزام ہو گئے نا۔۔" اس نے آج ارحم سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔آخر کار ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا تو آج ہی کیوں نا

" جی ڈیڈ۔۔۔ختم ہو گئے ہیں۔"

ارحم نے سپاٹ لہجے میں باپ کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا

" بیٹا میں چاہتا ہوں کہ اب تم پاکستان چلے جاؤ۔۔۔" سلطان نے ایک وقفے کے بعد بول ہی دیا

" پاکستان۔۔۔؟؟؟

لیکن کیوں ڈیڈ۔۔۔وہاں کیوں جاؤں میں۔۔۔"

" ارحم وہاں سب تمہارے اپنے ہیں ۔وہاں تمہارے رشتے ہیں میرے رشتے ہیں ۔یہاں اب کچھ بھی تو باقی نہیں ہے"

" آپ ہیں نا۔۔۔مجھے اور کسی رشتے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔میں ہرگز نہیں جاؤں گا" توقع کے مطابق ارحم نے صاف انکار کر دیا

" بیٹا یہ میری خواہش ہے۔اور مجھے یقین ہے میرا بیٹا میری خواہش ضرور پوری کرے گا"

"ٹھیک ہے ہم ساتھ چلتے ہیں پھر۔۔۔میں تیار ہوں"

"نہیں ارحم۔۔۔ پاکستان صرف تم جاؤ گے۔میں نہیں۔۔۔"

"لیکن کیوں ڈیڈ۔آپ کیوں نہیں۔۔۔اور آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں آپ کو یوں اکیلا چھوڑ کے چلا جاؤں گا۔سوری ڈیڈ میں آپ کی بات نہیں مان سکتا۔۔اگر چلیں گے تو دونوں ساتھ ورنہ کبھی نہیں"

"ارحم تم سمجھنے کی کوشش کرو نا۔۔۔میں نہیں جا سکتا۔میں وہاں موجود اپنے ماں باپ اپنے رشتوں کا سامنا نہیں کر سکتا۔مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے اب۔۔۔تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔۔۔" سلطان کا لہجہ اور الفاظ اس بار بلند ہو گئے

"پھر بھی سوری ڈیڈ۔۔۔میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر کبھی نہیں جا سکتا۔۔۔" کہتے ساتھ ہی وہ ٹیبل سے اٹھ کر چلا گیا

"ارحم۔۔۔رکو میری بات سنو۔ارحم۔۔۔" مگر وہ نہیں رکا

سلطان نے بے بسی سے اپنا سر کرسی کی پشت پر گرا دیا

یہ اسے زندگی نے کس موڑ پر لا کھڑا کیا۔۔۔جہاں سے آگے کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔پیچھے وہ جا نہیں سکتا تھا کیونکہ اب دوبارہ پیچھے سفر کیلئے صدیوں کی مسافت درکار تھی اور وہ اتنی مسافت کے اہل نہیں رہے نا ہی اس میں اتنا حوصلہ باقی تھا کہ دوبارہ واپس جائے اور ان سب چہروں کا سامنا کرے جن کو بھی وہ چھوڑ کر چلا گیا تھا

"تمہیں جانا ہی ہوگا ارحم۔۔۔تمہیں مجھ پر واجب تمام قرض اتارنے ہیں ارحم۔۔۔

تمہیں جانا ہی ہوگا۔۔۔تم ضرور جاؤ گے اور میری خاطر ہی جاؤ گے۔۔۔میرے لیئے ہی جاؤ گے۔۔"

وہ کرسی کی پشت پر سر ٹکائے خود سے ہی باتیں کر رہا تھا

☆......☆......☆

بیسواں حصہ

آج بادلوں نے شاہ والی کے سارے آسمان پر اپنی کالی سی چادر پھیلا دی تھی۔موسم پچھلے دو تین دن سے خوشگوار چلا آرہا تھا۔اور آج تو موسم کے رنگ ہی نرالے تھے۔ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے سب کے دلوں کو مسرور کر رکھا تھا۔لوگ دریا کنارے آنکلے تھے۔نیلے پانیوں کی لہریں ہوا کے زور سے ایک دوسرے کا پیچھا کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔قوی امکان تھا کہ آج بارش ضرور آئے گی۔

دریا سے آگے گاؤں کی طرف سفر کیا جائے تو بازار سے ہو کے جو گلی دین محمد کے گھر کی طرف آجاتی ہے اس گلی میں دین محمد بغیر استری کے شکنوں بھرا سوٹ پہنے کندھے

پر اپنا صافہ رکھے نیچے نیروزی

جو پچھلے ایک سال سے اس کے استعمال میں تھی پہنے چلا آرہا تھا

اس کے پہلو میں دین محمد کی بیوی خود کو ایک بڑی سی چادر سے مکمل ڈھانپے چل رہی تھی اور دونوں میاں بیوی نور بانو کے گھر کی طرف رواں دواں تھے۔۔۔پانچ سات منٹ کی مسلسل مسافت کے بعد وہ دونوں اسی چوکھٹ پر پہنچ چکے تھے جہاں دین محمد نے بائیس سال پہلے قدم رکھا تھا۔دھڑکتے دل کے ساتھ بسم اللہ پڑھ کر دین محمد نے گھر کی دہلیز کے اندر قدم بڑھا دیئے۔

بڑے سے آنگن پر مشتمل اس گھر کے بیرونی دیوار کے ساتھ گھنا سا پیپل کا درخت لگا ہوا تھا جس کی آدھی چھاؤں گھر کے اندر جب کہ آدھی دیوار کے پار جا رہی تھی۔اسی دیوار کے ساتھ بیرونی طرف گرمیوں کی دوپہر میں گاؤں کا واحد چاول چھولے والا اپنی ریڑھی سمیت کبھی کبھی آرکتا تھا۔۔۔

آنگن کے اختتام پر ایک ترتیب میں چار کمرے بنے ہوئے تھے جن میں تین پکے اور ایک کچا تھا یہ زمیندار صاحب کا گھر تھا یہ دین محمد کی بھانجی نور بانو کا گھر تھا۔۔۔

شاہ والی میں صرف چند لوگوں کے گھر پکے تھے زمیندار صاحب بھی انہیں میں سے ایک تھے باقی اکثریت لوگ ابھی بھی حیثیت رکھنے کے باوجود کچے مکان میں رہنے کو زیادہ ترجیح دیتے تھے۔چوتھے اور کچے کمرے کے آگے مٹی کا ایک چولہا ڈال دیا گیا تھا جس پر سفید چکنی مٹی کا لیپ لگایا گیا تھا۔

دیوار کے ساتھ چارپائی رکھے نور بانو اپنی بیٹی جنت کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی جب اس نے اپنے آنگن میں اتنے عرصے بعد اپنے ماموں دین محمد کو بیوی سمیت آتے دیکھا۔نور بانو کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔جلدی سے وہ چارپائی سے اتری پاؤں میں چپل اڑستی سر پر چادر سنبھالتی تیز قدموں سے دونوں کے استقبال کو بڑھی۔۔۔

"بسم اللہ۔۔۔آج تو بختوں والا دن ہے کوئی۔میرے آنگن میں ماموں۔۔۔مجھے یقین ہی نہیں آرہا۔۔۔"خوشی سے اسکی آنکھیں بھر آئیں۔"

دین محمد کی آنکھیں بھی زیادہ دیر خشک نا رہ سکیں

بختاور نے بڑھ کر نور بانو کو گلے لگایا۔اتنی دیر میں جنت نے دو اور چارپائیاں باہر نکال کے رکھ دیں۔۔۔نور بانوان دونوں کو بیٹھنے کیلئے چارپائیوں کی طرف لے آئی۔

گھر کا پورا آنگن صاف ستھرا اور نفاست سے بھرپور تھا۔

"میری جنت کیسی ہے۔۔۔؟"دین محمد نے جنت کے سر پر سلیقے سے پہنی گئی چادر کے اوپر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا

"بہت اچھی ہوں نانا جان۔۔۔آپ بیٹھیں یہاں۔۔۔"اس نے چارپائیوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا

جنت نے سادہ سے کپڑے پہن رکھے تھے اور چہرہ کسی بھی قسم کے میک اپ سے عاری تھا گلے میں ایک کالا دھاگہ پہنا ہوا تھا اس قدر سادگی کے باوجود بھی جنت کا دمکتا چہرہ دین محمد اور بختاور کے دل میں اترنے لگا۔

تھوڑی دیر میں ہی جنت جلدی سے ٹھنڈے شربت کا جگ بھر کے لے آئی۔۔۔اور دونوں کو

بڑے بڑے گلاس بھر کے پیش کیا۔۔۔دین محمد نے گلاس لبوں سے لگا لیا اور دوسری سانس میں ہی گلاس خالی کر دیا ٹھنڈے شربت نے اندر پہنچتے ہی اپنی تاثیر دکھائی اور نور محمد کو بھی اب اپنی گرمی جاتی محسوس ہو رہی تھی۔

"اتنا عرصہ آپ کو میری یاد
نہیں آئی ماموں۔۔۔؟" نور بانو نے پہلا پیار بھرا شکوہ کیا
"جھلی تم پوچھو کب یاد نہیں آئی۔کوئی دن ایسا نہیں جو خطا گزرا ہو۔۔۔بس میں تم سے آنکھیں ملانے سے ڈرتا تھا۔شرمندہ تھا میں نور۔۔۔"
"اللہ کبھی ایسا دن نا لائے ماموں۔۔۔آپ کیوں شرمندہ تھے ایسا تو مت کہیں۔۔۔" نور بانو کو دکھ ہوا
"کیسے سامنا کرتا تمہارا۔۔۔مجھ میں تو ہمت ہی نہیں ہوئی"
"ایسا آپ نے سوچا بھی کیسے۔وہ سب جو ہوا وہ میرا نصیب تھا۔آپ کا تو اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔۔میں نے کبھی آپ سے شکوہ نہیں کیا۔کبھی دل میں آپ کیلئے ناراضگی نہیں رکھی۔اور میرا اللہ گواہ ہے میں نے تو کبھی "اس" کیلئے بھی کوئی شکوہ نہیں کیا"
"بس کر میری دھی۔۔۔ورنہ مجھے خود پر قابو نہیں رہے گا۔آنکھیں چھلک پڑیں گی میری۔۔۔
وہی نالائق تھا۔سارا قصور اسی کا تھا۔میں جانتا ہوں تجھے نور۔تو بڑی نیک ہے کرموں والی ہے۔۔۔"
"بس جانے دیں۔۔۔میں نے سب نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔اللہ نے احسان کیا۔پھر سے گھر دے دیا بیٹی دے دی۔۔۔" اس کے الفاظ سے شکر جھلک رہا تھا
"سلامت رہو بیٹی۔۔بس کبھی انسان اتنا کمزور پڑ جاتا ہے کہ وہ اپنے خول میں سمٹ جاتا ہے کسی سے آنکھیں تک نہیں ملا پاتا۔۔۔میری حالت بھی ایسی ہی سمجھ لو۔۔۔تم صابرہ تھی اللہ نے تمہیں تمہارے صبر کا اجر دیا۔۔۔"
"خوشی اور نانی تاج کیوں نہیں آئے۔۔۔؟" نور بانو نے ممانی بختاور سے دریافت کیا
"بی بی اب کمزور ہو گئیں ہیں زیادہ چلنے پھرنے سے گھٹنے تکلیف کرتے ہیں۔اب عمر کا تقاضا بھی تو ہے"

"ہاں صحیح کہتی ہیں آپ۔۔۔اور خوشی۔۔۔؟"
"خوشی بھی نہیں آرہا تھا اسی کی وجہ سے تو آج آئے ہیں خوشی نے ہی ہمیں یہاں بھیجا ہے۔" بات کے اختتام تک بختاور کے لبوں پر ہنسی بکھر گئی تھی۔مگر نور بانو ابھی تک اس مسکراہٹ کا مطلب صحیح طرح نہیں سمجھ پائی تھی۔

باتیں چلتی رہی گلے شکوے ہوتے رہے۔۔۔محبتوں کے تبادلے بھی ہوتے رہے۔آنسوؤں بھی آنکھوں سے نکلتے رہے۔بائیس سال کی باتیں تھیں اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی بھلا کیسے ختم ہو جاتی

ان کی باتوں کو بریک زمیندار صاحب کی آمد سے ہی جا کے لگی۔۔۔زمیندار صاحب بھی اتنے لمبے عرصے بعد ان لوگوں کو اپنے گھر میں دیکھ کر ایک بار تو خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گئے۔۔۔

پھر آگے بڑھ کر انہوں نے دین محمد کو جپھی ڈال کر خیر مقدم کیا اور پھر اسی احترام کے ساتھ وہ بختاور سے بھی ملے۔

اتنے دھن کے باوجود بھی آج تک زمیندار صاحب کے رویئے اور چال ڈھال میں کسی قسم کی کوئی مغروریت نہیں آئی تھی۔حالانکہ دین محمد نے اپنی زندگی میں بہت سے لوگوں کے دولت آتے ہی رویئے اور لہجے بدلتے دیکھے تھے۔

" زمیندار صاحب۔۔۔اتنے عرصے بعد اس چوکھٹ پر قدم رکھا ہے میں نے وہ بھی سوالی بن کر۔۔۔میں آپ کی جنت کے رشتے کیلئے آیا ہوں۔۔۔آپ سے جنت کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں اپنے خوشی کیلئے۔۔۔" دین محمد نے رسمی دعا سلام کے بعد مدعے کی بات چھیڑ دی۔۔۔جنت سنتے ہی اٹھ کے کمرے کے اندر چلی گئی

جانے کیوں دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔چہرے کی سرخی بڑھنے لگی۔پلکیں بوجھل ہو کر رکوع میں جھک گئیں۔جانے یہ کیسا احساس ہوتا ہے۔شاید یہی مشرق کی عورت کی حیا ہوتی ہے

"کیا مطلب چچا۔۔۔جنت اور خوشی۔۔۔یہ کیسے سوچا آپ نے۔۔۔؟" زمیندار صاحب ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔انہیں دین محمد سے ایسی کسی بات کی کوئی توقع نہیں تھی۔

نور بانو کے چہرے پر بھی ایک رنگ آ کر بکھر گیا

"ہاں پتر۔۔۔میں اپنے خوشی کیلئے جنت کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں۔۔۔"

زمیندار صاحب نے نور بانو کے چہرے کی طرف نگاہ کی مگر وہ اس کے چہرے پر کچھ بھی پڑھنے میں ناکام رہے

"چچا ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔آپ ہمارے لیئے محترم ہیں آپ کا احترام بجا ہے اور اپنی جگہہ ہے۔۔مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ہو سکتا۔۔۔میری طرف سے معذرت قبول کر لیں۔۔۔" انہوں نے صاف انکار کر دیا سوائے زمیندار صاحب کے اس وقت وہاں بیٹھے تینوں نفوس کے چہرے ایک دم سے مرجھا گئے تھے

"بیٹا۔۔۔تم دل میں کوئی خدشات مت پالو۔خوشی بہت اچھا لڑکا ہے۔خوش رکھے گا جنت کو۔۔۔"

اس بار بختاور بولی تھی

اندر بیٹھی ایک نازک سی لڑکی کے دل کی دھڑکن مزید تیز ہو گئی۔اتنی تیز کہ وہ اپنی دھڑکن کی آواز با آسانی سن سکتی تھی۔اندر وہ سہمی بیٹھی تھی اور باہر چار لوگ اس کی آگے کی زندگی کا فیصلہ کر رہے تھے

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ۔حیرت ہے مجھے۔خون تو اسی سلطان کا ہے نا۔بیٹا تو اسی ملوکھاں کا ہے۔پھر یہ اپنے باپ سے مختلف کیسے ہو گا۔اس نے بھی وہی کلمہ پڑھنا ہے۔جو سلطان نے پڑھا تھا۔" زمیندار صاحب کے منہ سے الفاظ نہیں طنز میں ڈبوئے ہوئے نشتر نکلے تھے

نور بانو نے اپنے شوہر کے چہرے کی طرف دیکھا۔آنکھوں سے التجا کی کہ خدارا پچھلی باتیں مت دہراؤ۔یہ وقت مناسب نہیں ہے۔اور نا ہی اس میں اپنے ماموں اور ممانی کے بجھتے چہرے دیکھنے کی ہمت تھی مگر زمیندار صاحب سمجھ ہی نا پائے۔ہر کسی کو تو آنکھیں پڑھنا نہیں آتا نا

"پتر لازم نہیں ہوتا کہ جو کہانی باپ نے لکھی ہو وہی بیٹا بھی دہرائے۔۔۔خوشی ایسا نہیں ہے۔اور تم یہ بھی تو سوچو کہ اس رشتے سے محبتیں پھر سے کھل اٹھیں گی۔دونوں گھرانے پھر سے ایک ہو جائیں گے۔"

"دونوں گھرانے ویسے بھی ایک ہو سکتے ہیں۔میل جول نا رکھنے کی کوئی ایسی وجہ اب موجود نہیں ہے۔مگر یہ رشتہ نہیں ہو سکتا۔میری ایک ہی بیٹی ہے۔اور سب کی طرح مجھے اپنی اولاد بہت پیاری ہے میں

اسے محفوظ ہاتھوں میں دوں گا جہاں وہ خوش بھی رہ سکے اور ہمارے دل کو بھی کسی قسم کا کوئی دھڑکا نہ ہو۔۔۔"

" ایسے وہم مت پالو پتر۔میرا خوشی نیک لڑکا ہے۔خوشی بہت چاہتا ہے جنت کو۔۔۔میں تمہارا بزرگ ہوں پتر۔میری بزرگی کی طرف دیکھ لو مجھے خالی ہاتھ مت لوٹاؤ۔جنت بیٹی میری جھولی میں دے دو۔میں سوالی بن کر آیا ہوں"

" آپ کا احترام بجا ہے چچا۔مگر یہ بچوں کی زندگیوں کا معاملہ ہے کوئی سو دو سو کا سودا نہیں ہے۔میں جنت کے ساتھ کبھی کوئی ایسی ناانصافی نہیں ہونے دوں گا۔جو اس کی ماں کے ساتھ ہوئی تھی۔"

زمیندار صاحب نے بات ختم کی تو سارے چہرے فق بیٹھے تھے۔دین محمد اور بختاور لاجواب بیٹھے تھے۔اور جب سے انہوں نے رشتے کی بات شروع کی تھی نور بانو تب سے بت بنی خاموش بیٹھی ساری کارروائی دیکھ اور سن رہی تھی۔ابھی تک اس نے اس معاملے میں ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔

" نور بانو کو سلطان نے ملوکھاں کی وجہ سے طلاق دی تھی۔اور خوشی،سلطان اور ملوکھاں کا بیٹا ہے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے رشتہ۔وقت ایک بار پھر پیچھے پھر جائے گا۔چچا آپ سمجھدار ہیں آپ کو یہ رشتہ لانے سے پہلے کچھ تو سوچنا چاہیئے تھا۔" وہ کچھ لمحے چپ رہ کر ایک بار پھر دین محمد سے مخاطب ہوا تھا

" بیٹا جنت کے باپ کی حیثیت سے تمہارے سارے خدشات بجا ہیں۔لیکن میں خوشی کی ضمانت دیتا ہوں پتر۔وہ اپنے باپ جیسا ہرگز نہیں ہے۔بہت خوش رکھے گا جنت کو"

" چچا۔۔آپ کی ضمانت کب تک چل سکتی ہے بھلا۔زندگی ان دونوں نے گزارنی ہے۔اور میں ایسی کوئی حماقت دوبارہ کبھی نہیں کر سکتا۔آپ کا احترام کرتا ہوں۔بس آپ ہماری طرف سے معذرت قبول کر لیں۔یہ رشتہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

امید کے جو دیئے جلا کر وہ دونوں گھر سے نکلے تھے۔وہ بجھ گئے بالکل ان دونوں کے بجھے ہوئے چہروں کی طرح۔چہرے صرف دو نہیں بجھے تھے تیسرا الجھنے والا چہرہ نور بانو کا تھا۔ایک دل اندر کمرے میں بھی دھڑک رہا تھا جس کے کان باہر کی ساری گفتگو پر لگے ہوئے تھے۔وہ دل جو تھوڑی دیر پہلے برق رفتاری سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے ابھی ساری حدود پھلانگ کر باہر نکل پڑے گا۔اب وہ دل شاید

اتنا تیز دھڑکتے دھڑکتے تھک گیا تھا۔اس کی رفتار مدھم ہوگئی تھی۔جیسے تیز دوڑتا انسان بھاگتے بھاگتے تھک کر اپنی رفتار کم کر دیتا ہے اور پھر آخر میں رک جاتا ہے۔اب جنت کا دل بھی دھڑکنا بند ہو چکا تھا۔

دین محمد اور بختاور انکار سننے کے بعد زیادہ دیر نہیں بیٹھے۔انہیں دعا دینے کے بعد وہاں سے اٹھ آئے۔نور بانو ان دونوں کو دروازے تک چھوڑنے آئی تھی جبکہ زمیندار صاحب وہیں چارپائی پر بیٹھے رہے تھے

"میں مجبور ہوں ماموں۔کچھ نہیں کر سکتی۔اگر میرے اختیار میں ہوتا تو اب واپسی پر آپ کے چہرے یوں بجھے ہوئے نہیں ہوتے۔مسکراتے چہروں کے ساتھ آپ لوگ واپس جاتے"

دروازے پر الوداع کرنے سے پہلے نور بانو نے اپنی مجبوری ان کے سامنے رکھی۔۔۔

"میں سمجھ سکتا ہوں میری دھی۔زمیندار صاحب کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔شاید یہ رشتہ اوپر لکھا ہوا ہی نہیں ہوگا

خوش رہو ہمیشہ۔چلتے ہیں"

دین محمد نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔بختاور نے گلے لگایا

"آپ واپس آئیں گے نا ماموں۔۔۔" اسے لگا اس رشتے کے انکار کے بعد ان لوگوں کے بیچ پھر کہیں سالوں کی دوریاں نا آجائیں۔نور بانو بولی تو لہجہ خدشات سے بھرپور تھا

"ہاں نور پتر۔۔۔ضرور آئیں گے اپنی دھی کے پاس۔خدشے مت پالو۔" دین محمد اس کا ڈر سمجھ گئے تھے اس لیئے اس کے سر پر ایک بار پھر ہاتھ رکھتے ہوئے جانے سے پہلے تسلی دینا ضروری سمجھا تھا۔پھر اپنا صافہ سر پر کس کر باندھا اور بختاور کے ساتھ دروازہ عبور کر گئے

گلی کا موڑ مڑنے تک دین محمد کو اپنی پیٹھ پر دو مجبور آنکھیں چبھتی رہی۔وہ دونوں گلی کا موڑ مڑ گئے۔دو آنکھیں وہیں کہیں گلی میں ہی رہ گئیں۔ان دونوں کے اوجھل ہونے کے بعد نور بانو دروازہ بند کر کے واپس لوٹ آئی۔زمیندار صاحب ابھی تک اسی جگہہ اپنی سابقہ پوزیشن میں بیٹھے تھے۔نور بانو نے ان سے کچھ بات نا کی کچھ بھی گلہ شکوہ یا اس معاملے پر بحث ہی نہیں کی جیسے کچھ ہوا ہی نا ہو۔وہ خود کو مصروف

رکھنے کیلئے چار پائیاں اٹھا کر اندر رکھنے لگی تھی ۔زمیندار صاحب حیرت سے اس کا چہرہ تک رہے تھے اسے کام کرتے دیکھنے لگے مگر بولے کچھ بھی نہیں ۔

اداس اور مرجھائے چہروں کے ساتھ وہ دونوں گھر لوٹے تو خوشی نے ان کے چہروں سے ہی اندازہ لگا لیا کہ زمیندار صاحب نے کیا جواب دیا ہوگا۔اس لیئے اس نے آگے بڑھ کر کوئی سوال نہیں کیا۔

مگر نانی تاج کی بے چینی قائم تھی ۔اس نے دین محمد سے پوچھا تو دین محمد نے شروع سے لے کر آخر تک ساری بات بتا دی ۔تمام کہانی سننے کے بعد نانی تاج بھی خاموش ہو گئی ۔کوئی کیا کر سکتا تھا بھلا ۔ان کی اپنی بیٹی تھی ان کا اپنا ترکہ تھا وہ چاہے جسے سونپیں جسے انکار کریں ۔

اور سب جانتے تھے کہ زمیندار صاحب کے خدشات لازم اور جائز تھے ہر باپ اس جگہہ بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیتا جہاں سے پہلے اس کی بیوی طلاق کا لیبل لگوا چکی ہو ۔قصور زمیندار صاحب کا بالکل نہیں تھا اگر قصور تھا تو صرف سلطان کا ۔اگر قصور تھا خوش بخت کا کہ اس کی قسمت کا کہ اس نے سلطان کے گھر میں جنم لیا تھا ۔یہ اس کی بدقسمتی ہی تو تھی کہ اسے گاؤں کی سب لڑکیوں کو چھوڑ کر ایک ایسی لڑکی کی چاہت ہوئی جس کی ماں کو اس کا باپ طلاق دے چکا تھا ۔

"خوش بخت پتر ۔۔۔جنت تیرے نصیب میں نہیں ہے بھول جا اسے تو پتر ۔۔۔" دین محمد نے ٹوٹے دل کے ساتھ خوشی کو سمجھایا

"دادا جی ایک بات بتا دیں ۔میرا نام خوش بخت کس نے رکھا تھا ۔؟"

"کیوں ۔۔۔؟" دین محمد کو ایسے کسی سوال کی امید نہیں تھی

"کیونکہ بخت نام کی چیز تو اپنی پوری زندگی میں آج تک میں نے نہیں دیکھی" کیا کیا شامل نہیں تھا اس وقت خوشی کے لہجے میں درد، کرب، نا امیدی، بے بسی کل تک خوشی جو اپنے آپ کو ساری دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا آج اس کی ساری خوشی کسی غبارے میں سے ہوا کی طرح نکل گئی ۔آج اسے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے نام کا مترادف ثابت ہوا ہے اس بڑا بد نصیب تو کوئی دنیا میں ہی نہیں جس کی خوشی کے راستے میں اور کوئی نہیں بلکہ اپنا باپ آگیا

"ایسامت بولو چَل ۔۔۔گناہ ہوتا ہے۔۔۔" نانی تاج نے اسے ٹوکا

"تو کیسے بولوں نانی۔؟۔۔کیا بولوں میں۔؟کیا کروں میں؟کر بھی کیا سکتا ہوں آخر۔۔۔؟

اپنی بدنصیبی پر اپنے باپ کو بددعائیں بھی نہیں دے سکتا کیونکہ وہ باپ ہے میرا۔اور کچھ معلوم نہیں کہ زندہ ہے یا نہیں۔۔۔کس کو دوش دوں میں آخر۔۔خود کو دوش دوں کہ میں اس گھر میں پیدا کیوں ہوا۔۔۔؟" خوشی کا لہجہ بھیگنے لگا تو وہ اپنے آنسوؤں چھپانے کیلئے گھر کے دروازے سے نکل کر باہر کی طرف چل دیا

پیچھے حیرت کے مجسمے بنے نانی تاج، بختاور اور دین محمد بیٹھے تھے۔جو بول نہیں رہے تھے بس تر ترایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے تھے۔

وہ چلتا رہا بغیر راستوں کی طرف دیکھے مگر اس کے پاؤں آج بھی اسے وہیں لے آئے جہاں وہ ہمیشہ جنت کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتا تھا۔دریا کنارے۔مگر آج دریا کے کنارے پر اس کے ساتھ جنت نہیں تھی۔اپنی آنکھیں پانیوں سے بھرے آج وہ اکیلا بیٹھا تھا وہ۔اپنی خالی نظریں دریا کی لہروں پر ٹکا رکھی تھیں جو ہوا کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

جانے آج دریا میں پانی زیادہ تھا یا اس کے بھرے ہوے نین کٹوروں میں جو تنہائی پاتے ہی چھلکنے کو تیار تھے۔

دریا کنارہ بھی آج حیرت سے اپنے دوست کو دیکھ رہا تھا جو آج اکیلا بیٹھا چھلکنے کو تیار تھا۔آج سے پہلے اس کے ساتھ ہمیشہ ایک کومل سی لڑکی بھی ہوتی تھی مگر آج وہ اکیلا تھا کومل جذبوں والی سانولے حسن کی ملکہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔

"دیکھ رہے ہو نا یہ سب تم۔دیکھ رہے ہو میرے ساتھ کیا کیا ہو رہا ہے۔۔۔خوشی نام ہے میرا ۔۔۔پر آج تک دیکھا نہیں خوشی کیسی ہوتی ہے، کیسی دکھتی ہے، کس رنگ کی ہوتی ہے۔میرے ساتھ اتنے مذاق کیوں کر رہی ہے قسمت۔؟

باقی ساری دنیا بھی تو ہے۔وہ سب تو خوش خوشحال جی رہے ہیں۔ایک میرے ساتھ ہی کیا دشمنی

ہے قسمت کی۔؟

ایک میرا ضبط آزمانے پر کیوں تل گئی ہے۔۔۔؟" وہاں اس وقت خوشی کے پاس اور کوئی نہیں تھا۔وہ دریا کو اپنے درد سنا رہا تھا جیسے دریا اس کے سارے درد بانٹ لے گا۔شاید وہ اندر سے بہت بوجھل ہو گیا تھا چھلکنا چاہتا تھا کسی کندھے کو تلاش کر رہا تھا۔اپنے آنسوؤں بہانے کیلئے۔اور دریا سے بڑا اس کا کوئی اور دوست تھا بھی نہیں۔دریا سچا پکا دوست۔سارے غم اپنے اندر اتار لینے والا۔سارے راز اپنے اندر دفن کر لینے والا

"تمہیں معلوم ہے نا میں جنت کو بہت چاہتا ہوں۔تم گواہ ہو نا میرے۔۔۔ٹھیک ہے قسمت کو کرنے دو مذاق میرے ساتھ۔میں بھی سہتا رہوں گا۔آج تم سے گلہ کیا ہے صرف پھر کبھی کسی سے نہیں کروں گا۔تم تو دوست ہو نا میرے۔میرے اور جنت کی محبت کے گواہ۔۔۔تم کبھی کوئی مذاق نا کرنا میرے ساتھ۔ورنہ میں سہہ نہیں پاؤں گا۔ضبط کھو دوں گا پھر تمہاری ان لہروں میں طوفان آجائے گا۔کچھ بھی نہیں بچے گا۔ہر چیز تباہ ہو جائے گی۔شاہ والی بھی ڈوب جائے گی ساری۔۔۔

مگر میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔تم جانتے ہو نا مجھے اچھی طرح سے۔تم جانتے ہو نا خوشی کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔وہ شاہ والی کو ڈوبتا کبھی نہیں دیکھ سکتا۔

ہاں صرف تم ہی تو دوست ہو میرے،صرف تم ہی تو جانتے ہو مجھے۔۔۔"

وہ دریا کنارے بیٹھا اپنے غم دریا کو سنا رہا تھا۔اپنے دکھڑے لہروں کو سنا رہا تھا۔اپنی بھڑاس نکال رہا تھا۔جیسے وہ کان رکھتی ہوں جیسے وہ سب سن سکتی ہوں۔۔۔

اس سے تھوڑی دور کنارے پر آج کچھ لوگ جمع تھے۔موسم کی خوشگواریت نے ان سب کی طبیعتوں کو نہال کر دیا تھا۔وہ آٹھ دس لوگوں کا گروپ مل کر رحیم بخش کو دریا پر لکھی گئی نظم سنانے کو کہہ رہے تھے جو ایک مشہور شاعر اشولال نے دریا سے اپنی محبت پر لکھی تھی جو رحیم بخش شاہ والی کے ہر سجیلے نوجوان کی شادی خوشی کے موقع پر گایا کرتا تھا۔تھوڑی دیر میں خوبصورت گلے کے مالک رحیم بخش گانے کیلئے راضی ہو گئے۔اسے درمیان میں بٹھا کر باقی سب لوگوں نے اس کے ارد گرد دائرہ سا بنا لیا تھا ایک آدمی

نے ہاتھ میں پلاسٹک کی چھوٹی سی ڈرمی پکڑ رکھی تھی جس سے ڈھولکی کا کام لیا جا رہا تھا۔رحیم بخش نے گانا شروع کر دیا۔اس کی اونچی اور سریلی آواز ہوا کی لہروں کے ساتھ سفر کرتی تھوڑے فاصلے پر بیٹھے خوشی کے کانوں تک پہنچ رہی تھی

دریا او دریا پانی تیڈے ڈونگے
توں ساڈا پیر ماہی اساں تیڈے پونگے

دریا او دریا دھپ تیڈی تکھڑی
بیڑیاں وچ لنگھ گئی عمراں دی لکھڑی

دریا او دریا چن تھیا پورا
لوڑھی پلوڑھی جیون ادھورا

دریا او دریا جنگلاں ڈسانویں
کہیں ڈینہہ تاں ہوسی خوشی ساڈے نانویں

دریا او دریا اچی تیڈی ماڑی
ماڑی دے اندر مونجھاں دی ماری

رحیم بخش کی آواز چاروں طرف سرگھولتی جا رہی تھی۔اس کا گیت ابھی ادھورا تھا۔مگر خوشی وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔اس سے پہلے کہ اس کے ضبط کا پیمانہ چھلک پڑتا وہ وہاں سے چلا گیا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ

یہیں وہ اپنا ضبط کھو بیٹھے اور آنکھوں کو بہنے کی کھلی اجازت دے دے۔۔۔
مگر اس نے ایسا بالکل نہیں کیا۔ضبط ٹوٹنے سے پہلے ہی وہاں سے چل دیا کہ کیا پتا دریا کی لہروں میں سچ مچ کا طوفان آجائے اور وہ اپنی بھرپور طاقت سے پورے شاہ والی کو بہا لے جائیں۔مگر وہ ایسا کیونکر ہونے دیتا۔اسے تو اپنی شاہ والی سے پیار تھا نا بہت زیادہ پیار۔۔۔
اسی لیئے تو اٹھ کے چلا گیا۔

☆......☆......☆

"آخر پاکستانی خون ہونا۔۔۔ایموشن تو زیادہ ہوں گے۔"سٹیورٹ نے کوکب پر کمنٹ پاس کیا وہ لوگ کالج گراؤنڈ میں آؤٹنگ کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔آپشن میں میوزیم،لندن سرکس شو، اور ہل سٹیشنز پر ہائکنگ شامل تھے۔سب لوگ تیار تھے مگر ارحم نے ابتداء سے ہی انہیں جوائن کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ابھی اس کے زخم تازہ تھے وہ اس قسم کی کسی ایکٹیویٹی میں بالکل حصہ نہیں لینا چاہتا تھا۔اور ارحم کی وجہ سے کوکب جو پہلے اس پروگرام کو لے کر بہت زیادہ ایکسائٹڈ تھی اس نے بھی ارحم کی وجہ سے معذرت کر لی۔

"ہر بار قومیت پر بات مت لایا کرو یار۔اس میں قومیت کہاں سے آگئی۔جیسے بھی ہیں تم سے اچھے ہیں" وہ جھنجھلا اٹھی
"ہم رئیل لائف میں جیتے ہیں۔یہ اس قدر ایموشن ہم میں نہیں ہوتے۔اب وہ نہیں آرہا تو نا آئے۔تم کیوں سارے پروگرام کی بینڈ بجا رہی ہو۔۔۔تم تو چلو"
"سوری میں نہیں چل سکتی۔"کوکب نے معذرت کر لی اور ان سب کے بیچ سے اٹھ کر چلی گئی۔
"کوکب۔۔۔یہ سب کیا ہے یار۔کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔"کرسٹی اس کے پیچھے پیچھے آگئی
"کچھ نہیں ہوا یار۔۔۔"
"تم کیوں وہاں سب کے بیچ سے ایسے اٹھ کے آگئی ہو۔۔۔؟"
"تم نے اس کے طنز سنے تھے کرسٹی۔کیا ابھی میرا وہاں بیٹھنا بنتا تھا۔۔۔حد ہے یار۔۔۔؟"

"اسے چھوڑ دو یار۔۔۔وہ تو ہے ہی پاگل۔تم کیوں نہیں چل رہی؟"

بس میرا موڈ نہیں ہے چلنے کا۔تم لوگ جاؤ انجوائے کرو۔"

"یہ اچانک جو تمہارا موڈ تبدیل ہوا میں جانتی ہوں کیوں ہوا ہے۔حالانکہ پہلے تم اسی پروگرام کو لے کر سب سے زیادہ ایکسا یٹڈ تھی۔۔۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی کوئی جواب ہی نہیں دیا اسے

"کوکب بات سنو۔۔۔تم ارحم کو خود پر اتنا کیوں سوار کر رہی ہو یار۔۔۔تم اس کی نیچر سے اچھی طرح واقف ہو کہ کس قدر بورنگ انسان ہے وہ۔اور تم دونوں کے مزاج کس قدر مختلف ہیں ایک دوسرے سے۔زمین آسمان کا فرق ہے تم دونوں میں۔سچ کی عینک لگا کر دیکھو تو تم دونوں کی نیچر میں ایک بہت واضح فرق ہے تم دونوں کا جوڑ بن ہی نہیں سکتا۔اگر کسی طرح بن بھی گیا تو زیادہ نہیں چل سکے گا۔۔۔سچ کا سامنا کیوں نہیں کرتی تم"

وہ اپنی دوست کی وجہ سے دکھی تھی۔کوکب کرسٹی کو بہت پیاری تھی

"ایسی بات نہیں ہے کرسٹی۔میرے اختیار میں ہوتا تو اس سے پیار ہی نا کرتی۔۔۔

اور وہ اس طرح بالکل نہیں ہے جس طرح دکھائی دیتا ہے۔اس نے کچھ کرائسز کی وجہ سے خود پر ایک خول چڑھا رکھا ہے۔اندر سے وہ بہت اچھا انسان ہے۔

بالکل کسی ناریل کی طرح۔اوپر سے سخت اور اندر سے سوفٹ۔۔۔"

کوکب نے ارحم کو ڈیفنڈ کیا

کوکب۔۔۔خود کو دھوکہ مت دو یاررر۔۔۔اس کی زندگی میں یہ کرائسز پچھلے چھ ماہ سے آئے ہیں اور ہم سب اسے دو سال سے جانتے ہیں کہ وہ کس طبیعت کا مالک ہے۔" کرسٹی نے دکھ سے اسے حقیقت بتائی جو سب کے سامنے واضح تھی مگر جانے کیوں ایک اسی کو ہی نظر نہیں آتی تھی۔

شاید محبت ہوتی ہی ایسی ہے۔محبوب کی ساری خامیاں چھپا کر ان پر پردہ ڈال دیتی ہے۔پھر محبوب کی ہر خامی بھی خوبی دکھائی دینے لگتی ہے۔یہاں بھی ایسا ہی تھا

"کوکب تم صرف اس کی وجہ سے ہم سب کا پروگرام خراب کر رہی ہو۔ پہلے وہ نہیں آ رہا تھا اب تم ۔ہم سب کو پھر خاک مزا آئے گا"

"ہم پھر کبھی چلے جائیں گے۔سب دوست مل کر انجوائے کریں گے۔اوکے۔۔۔؟"

کوکب نے کرسٹی کا دل رکھنے کو کہا

مگر وہ کوئی جواب دیئے بنا باہر نکل گئی

کوکب تھوڑی دیر بعد وہیں بیٹھنے کے بعد باہر آ گئی

موبائل نکالا ۔اور ارحم کا نمبر ڈائل کر دیا۔

تیسری بیل پر کال پک کر لی گئی۔

"کہاں ہو ارحم۔۔۔اور آج کالج کیوں نہیں آئے"

"بس ایسے ہی دل نہیں کیا آج۔" آواز سنتے ہی دل پر ٹھنڈی پھواری پڑی

"تم ٹھیک تو ہو نا۔۔۔؟" آواز میں فکر شامل تھی

"ہاں ٹھیک ہی ہوں۔۔۔مجھے بھلا کیا ہونا ہے۔۔" ان دیکھے سگنلز کے ذریعے ارحم کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی

"ہو کہاں تم۔۔۔"

"گھر پہ ہی ہوں۔۔۔"

"اچھا گھر پہ رہنا۔میں آ رہی ہوں آج۔۔۔"

"ابھی تو تھوڑی دیر میں مجھے کہیں جانا ہے۔۔۔ایسا کرو تم کل آجانا۔۔۔"

"بعد میں چلے جانا۔اتنا لازم ہے کیا۔۔۔؟"

"ہے بھی سہی اور نہیں بھی
ہم کل ملتے ہیں نا۔۔۔اچھا ایسا کرتے ہیں تم شام میں آجاؤ۔۔۔"
"اچھا ٹھیک ہے۔" مایوسی سے فون دوبارہ ہینڈ بیگ میں ڈال دیا
اوور کوٹ پہنا اور کالج سے باہر نکل آئی۔اسے کبھی کبھی لگتا کہ کرسٹی سچ ہی کہتی ہے
وہ کیوں خود کو ارحم کیلئے اتنا بے مول کر رہی ہے۔کیوں لا حاصل کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ان کا سچ میں کوئی جوڑ بھی تو نہیں تھا۔ارحم کی زندگی میں شاید اس کی وہ اہمیت بالکل نہیں تھی جو ارحم کی اس کی زندگی میں تھی۔
مگر وہ کرتی بھی تو کیا۔ارحم سے اس کی محبت بے اختیاری تھی۔اسے اختیار ہی نہیں رہا تھا خود پر۔
اور یہی تو محبت ہے۔محبت سب سے پہلے انسان سے اختیار ہی تو چھین لیتی ہے۔محبت نے کبھی جوڑ دیکھے ہی نہیں۔کبھی مزاجوں کا فرق دیکھا ہی نہیں۔محبت کا اپنا مزاج ہوتا ہے یہ سب کو اپنے مزاج میں ڈھال دیتی ہے۔
محبت کا اپنا رنگ ہوتا ہے یہ سب کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے

☆......☆......☆

ارحم سے وعدہ کرنے کے باوجود بھی سلطان نے چیک اپ نہیں کروایا تھا۔جینے کی اب کوئی خاص وجہ نہیں تھی اس کے پاس سوائے ارحم کو چھوڑ کے۔اور اب وہ یہی چاہتے تھے کہ جلد سے جلد ارحم پاکستان چلا جائے۔مگر ارحم اسے چھوڑ کے پاکستان جانے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔وہ جانتا تھا ارحم اس کی یہ بات کبھی نہیں مانے گا۔۔۔
صرف ایک راستہ اس کے پاس تھا۔اور وہ اس راستے پر سوچ سمجھ کر عمل بھی کر رہا تھا۔سلطان کو روز بروز اپنی گرتی صحت کا بھی اندازہ تھا۔اب جب کہ فاخرہ کو گزرے تین ماہ ہو چکے تھے اور ارحم دوبارہ اپنی زندگی کی طرف لوٹ آیا مگر وہ اپنے پلان پر پورا عمل کر رہا تھا۔جانتا تھا وہ روز بروز اپنی موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ہر گزرتا دن اسے اپنی قبر سے مزید قریب کر رہا ہے۔وہ چاہتا بھی یہی تھا خود کو اذیت

کی آخری سیڑھی پر لے جانا چاہتا

تھا۔درد کی آخری حدوں کو چھونا چاہتا تھا۔دیکھنا چاہتا تھا کہ جب کوئی انسان جان بوجھ اپنی زندگی کا ہاتھ چھوڑتا ہے تو وہ احساس کی کس سیڑھی پر ہوتا ہے۔

اور آج تین ماہ بعد وہ پھر ڈاکٹر فلپس کے آگے بیٹھا تھا۔اپنے علاج کیلئے نہیں صرف یہ جاننے کیلئے وہ اپنی موت کے کتنا قریب پہنچ چکا ہے

"مسٹر سلطان۔۔۔مجھے آپ سے اس درجے لاپرواہی کی ہرگز امید نہیں تھی۔۔۔لگتا ہے آپ کو اپنی زندگی پیاری نہیں ہے۔" ڈاکٹر فلپس نے افسوس سے اسے دیکھا

"زندگی سے کس کو پیار نہیں ہوتا ڈاکٹر صاحب۔۔؟"

"تو پھر اتنی لاپرواہی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔۔۔؟؟؟"

"ایک وجہ نہیں ہے اس کی۔بہت سی وجوہات ہیں۔خیر ان باتوں کو رہنے دیں۔آپ یہ بتائیں کہ اب میرا کینسر کس قدر میرے جسم میں پھیل چکا ہے۔۔۔؟"

ڈاکٹر فلپس نے حیرانگی سے اپنے سامنے بیٹھے سلطان کو دیکھا

"جب آپ تین ماہ پہلے آئے تھے تو آپ کے خون میں بلڈ کینسر کے خلیات جنم لے رہے تھے۔تب علاج بہت آسان تھا۔

مگر اب رپورٹس کے مطابق یہ خلیات بہت زیادہ افزائش پا چکے ہیں۔کینسر کے خلیات آپ کے جسم میں موجود ریڈ بلڈ سیلز پر مسلسل غالب آتے جا رہے ہیں۔ان کی تعداد میں خطرناک حد اضافہ ہو چکا ہے۔آپ دن بدن اپنی موت کے قریب تر ہو رہے ہیں۔مجھے کہتے ہوئے بالکل اچھا نہیں لگ رہا کہ اب آپ کا علاج بہت مشکل ہو چکا ہے۔کینسر کے مضر خلیات آپ کے بلڈ میں 70% تک پھیل چکے ہیں لیکن اگر آپ ہمارا ساتھ دیتے ہیں تو ہم پھر بھی اچھے کی امید رکھ سکتے ہیں۔۔۔"

ڈاکٹر فلپس نے رپورٹس پر نگاہ ڈالنے کے بعد سلطان کو اپنی طرف سے بیڈ نیوز دی تھی مگر سامنے بیٹھے شخص کو زرا بھی فکر نہیں ہوئی۔بلکہ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آٹھہری

" مجھے اب امید و نا امیدی کے چکروں میں نہیں پڑنا ڈاکٹر صاحب ۔میں ان حدول سے کہیں آگے نکل آیا ہوں ۔۔۔"

" آپ کیوں خود کو موت کے منہ میں دھکیل رہے ہیں ۔کیونکہ یہ لاپرواہی خودکشی کے برابر ہے ۔"

" اب زندگی کی چاہ ختم ہو چکی ڈاکٹر صاحب ۔بس دن جلدی سے پورے ہو جائیں ۔اسی انتظار میں ہوں"

" اس سے پھر اچھا تھا موت کو گلے لگا لیتے ۔کیونکہ روز روز مرنے سے تو ایک بار کا مرنا ہی بہتر ہے " ڈاکٹر فلپس نے سلطان کی ذہنی حالت پر شک کرتے ہوئے طنز کیا۔

" میں خود بھی یہی سوچ بیٹھا تھا۔بہت جلد اس مشورے پر عمل کروں گا۔۔۔چلتا ہوں"

اس نے رپورٹس اٹھائی اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے

" آپ پاگل ہو چکے ہیں۔۔" پیچھے سے ڈاکٹر کی آواز نے اس کا پیچھا کیا مگر سلطان کے قدم نہیں رکے

" ہاں شاید۔۔۔شاید پاگل پن سے بھی کچھ زیادہ ۔۔۔" اس نے اپنا آخری جملہ ادا نہیں کیا بلکہ دل ہی دل میں دہرایا تھا۔اس کے بعد وہ ڈاکٹر فلپس کے میٹنگ روم سے باہر نکل آیا

ہسپتال کے احاطے سے باہر نکل کر اس نے ایک لمبی سی سانس خارج کر کے اپنے اندر کی گھٹن کم کی اور پارکنگ سے گاڑی نکال کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔۔۔

گھر پہنچتے ہی اس نے رپورٹس اسی سیف میں رکھی جہاں پہلے بھی کچھ رپورٹس محفوظ پڑی تھی ۔ارحم کی دسترس سے دور۔

اب کچھ کام باقی تھے جنھیں جلد از جلد نپٹانا لازم تھا۔ان میں سب سے پہلا کام اپنا سٹور بیچ کر ساری رقم ارحم کے اکاؤنٹ میں جمع کرانی تھی ۔سو تھوڑی دیر کے ریسٹ کے بعد وہ پھر اٹھا گاڑی نکالی اور ایک ڈیلر سے ملنے چلا گیا۔جس سے وہ سٹور کے حوالے سے پہلے بھی مل چکا تھا۔

☆......☆......☆

جنت کے ابا کے انکار کے بعد خوشی کے چہرے سے مسکراہٹ رخصت سی ہوگئی تھی۔ ہر وقت اداسی چہرے کا احاطہ کیئے رکھتی۔ کھانے پینے میں دلچسپی بھی برائے نام رہ گئی تھی۔

گھر کے سب افراد خوشی کی اس کیفیت سے واقف تھے مگر سب مجبور تھے کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لیئے خاموش تھے۔۔۔

دین محمد سے پوتے کا اترا چہرہ دیکھا نا گیا تو وہ ایک بار پھر زمیندار صاحب سے ان کی زمینوں پر جا کے رشتے کے سلسلے میں ملے۔ اس بار وہ ان کے گھر نہیں گئے بلکہ زمیندار صاحب کی زمینوں پر ان سے ملنے آئے مگر کوئی بات نہیں بنی۔ رشتے کے معاملے پر زمیندار صاحب کی سوئی وہیں اٹکی رہی جہاں پر پہلے اٹکی تھی۔ اس بار بھی کافی بحث مباحثے کے بعد ان کا جواب وہی تھا

بلکہ اس بار تو دین محمد نے ایک طرح سے اسے اس رشتے کیلئے منت بھی کی تھی مگر وہ مان کے نہیں دیئے بلکہ الٹا دین محمد پر ہی ناراض ہوگئے کہ وہ خواہ مخواہ انہیں مجبور کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور سمجھ بوجھ رکھنے کے باوجود تمام حالات سے آگاہی کے باوجود بھی اسے تنگ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ ان کا احترام کرتے تھے اور بالکل نہیں چاہتے تھے کہ اس بات پر وہ احترام کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ بیٹھیں۔

"چچا جی۔۔۔ آپ مجھے بار بار مجبور مت کریں۔ جنت کے معاملے میں میرا جواب جو پہلے تھا اب بھی وہی ہے اور ہمیشہ وہی رہے گا۔ اسلئے بھلائی اسی میں ہے کہ آپ لوگ بھی اس رشتے کی ہر امید دل سے دل نکال کر کچھ اور سوچیں۔

اور خدارا مجھے بار بار مجبور کر کے میرا صبر مت آزمائیں۔۔۔" یہ وہ آخری الفاظ تھے جو اس دوسری بار کی بحث کے بعد زمیندار صاحب کی طرف سے ادا ہوئے تھے۔ اب کوئی امید کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

جب کوئی امید نظر نہیں آئی تو دین۔ محمد بوجھل قدموں سے واپس گھر لوٹ آئے۔

رشتہ نا ہونے کے علاوہ خوشی کی اداسیوں کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ پچھلے کئی دنوں سے جنت دریا کنارے اس سے ملنے بھی نہیں آئی تھی۔ خوشی جنت کا چہرہ دیکھنے کو ترس گیا تھا۔ جانتا تھا کہ ضرور اسے ابا نے جانے سے روک دیا ہوگا۔ ورنہ کہاں ممکن تھا کہ جنت کو خوشی سے ملے بغیر چین آتا۔۔۔

وہ ہر روز مقررہ وقت پر دریا کنارے آ بیٹھتا۔ جنت کا انتظار کرتا رہتا۔ دریا کی آتی جاتی لہروں کو گنتا

رہتا اور جب سورج تھک کے زرد ہو جاتا اور دریا کے پانیوں کے پار نیچے اترنے کے قریب ہوتا تو وہ بھی اداس دل سے اپنے کپڑے جھاڑ کے واپس آجاتا۔۔۔

دوسری طرف جنت کا حال بھی خوشی سے مختلف نہیں تھا۔نیندیں اس کی بھی کہیں کھو گئی تھی۔ہر وقت کھلکھلاتی جنت اب سارا دن اداس آنکھوں کے ساتھ گھر کے کام کاج نپٹاتی رہتی۔نا تو اس نے کسی سے کچھ کہا اور نا ہی کسی سے کوئی شکایت کی۔قسمت نے ان دونوں کے ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا جہاں سے نا آگے راستہ تھا اور نا ہی کوئی پیچھے۔

نور بانو بیٹی کے دل کے حال سے واقف تھی۔وہ اس کے چہرے پر لکھی اداس تحریر پڑھ سکتی تھی محبت ایسی اداس آنکھیں اور اداس چہرے پڑھنا سکھا دیتی ہے۔سالوں پہلے وہ بھی تو ایسے ہی موڑ پر کھڑی تھی جہاں آج اس کی بیٹی آٹھہری تھی اس کے چہرے پر بھی یہی تحریریں لکھی ہوتی تھی جو آج اس کی بیٹی کے چہرے پر رقم تھیں۔۔۔

مگر وہی بے بسی۔۔۔زمیندار صاحب بہت کم غصہ ہوتے تھے۔اس نے اپنی ازدواجی زندگی میں بہت کم انہیں غصہ کرتے دیکھا تھا۔اس دن دین محمد کے کھیتوں میں آکر ملنے اور پھر وہی رشتہ کی بات چلانے پر وہ واپس آکر کافی غصہ ہوئے تھے۔نور بانو چاہتی تھی کہ ان سے بات کرے مگر وہ انتظار میں تھی کسی اچھے دن کے جب زمیندار صاحب خوش ہوں تو وہ بات آگے چلائے۔

تا کہ زندگی میں اس کی جنت کبھی یہ گلہ نا دے کہ اماں آپ نے بھی تو میرے لیئے کوئی کوشش ہی نا کی۔۔آپ نے بھی تو میری جنگ نہیں لڑی تھی۔پھر کامیابی کیسے ممکن ہوتی۔وہ جانتی تھی اس کی جنت کبھی منہ سے یہ بات بالکل نہیں کہے گی۔مگر اس کی اداس آنکھیں تو سب کچھ کہہ دیتی تھیں نا۔۔۔

اور نور بانو کو اداس آنکھیں پڑھنے کا ہنر اچھی طرح آتا تھا۔

وہ ان تمام مرحلوں سے سالوں پہلے گزر چکی تھی جن سے آج گزرنے کی باری اس کی بیٹی جنت کی تھی۔نور بانو نے ابھی تک اس معاملے پر خاموشی اوڑھ رکھی تھی۔وہ صبر کرنا جانتی تھی۔یہ بھی جانتی تھی کہ صبر طویل ضرور ہوتا ہے،تکلیف دہ ضرور ہوتا ہے لیکن اس کا پھل ہمیشہ توقع سے بڑھ کر ملتا ہے۔

☆......☆......☆

اس دریا کنارے آباد بستی شاہ والی سے ہزاروں لاکھوں میل دور لندن میں خوشی کے ابا اپنے دوسرے بیٹے ارحم کے سامنے بیٹھے اس سے محوگفتگو تھے۔ سردیوں نے شدت پکڑ لی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن ہونے والی بارش کے ساتھ ہونے والی برف باری لوگوں کو مفلوج کر کے رکھ دیتی۔ سڑکیں برف کی چادر پہن لیتی، آئے روز سڑکوں پر برف صاف کرنے والی بڑی بڑی مشینیں دکھائی دیتیں۔ چھتیں برف سے اٹ کر وزنی ہو جاتیں مگر وہ لوگ اب اس موسم کے عادی ہو چکے تھے اور جب انسان کسی چیز کا عادی ہو جاتا ہے پھر وہ چیز اپنی صفت میں کتنی ہی شدید کیوں نا ہو جائے انسان کو اثر نہیں پڑتا۔ یا پھر اثر تو پڑتا ہے وہ اس ماحول کو اپنا لیتا ہے۔

" ارحم میرا دل کر رہا ہے آج ہم باہر جائیں کچھ آوٹنگ کریں، کوئی مووی، کوئی لائیو میچ جا کے دیکھیں، کسی بڑے سے مال میں مل کر شاپنگ کریں۔۔۔کیا خیال ہے تمہارا۔۔۔؟"""

ارحم اپنے ڈیڈ کی بات سن کر حیران ہوا۔اس سے پہلے ڈیڈ نے کبھی ایسے کسی خواہش کا نہیں کہا تھا اور نا ہی ان کے لہجے میں اتنی ایکسائٹمنٹ ہوتی تھی جس طرح آج ارحم نے نوٹ کی

" ڈیڈ۔۔۔اتنی سردی میں ہم کہاں جائیں گے آوٹنگ پر۔۔۔رات اتنی برف باری پڑی ہے۔ابھی تو راستے بھی مکمل صاف نہیں ہوئے ہونگے۔۔۔"

" ارے نہیں بیٹا۔۔۔تم اس بات کی فکر چھوڑو۔کہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔سب ٹھیک ہوگا۔صرف یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا موڈ ہے۔کہاں جانا چاہیئے پہلے۔۔۔؟"

" میرے خیال میں مووی دیکھنے چلتے ہیں پھر" وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا

ڈیڈ کا خوش خوش چہرہ دیکھ کر اسے لگا کہ آج انکار نہیں چلنے والا ۔اور پھر پہلی بار تو ڈیڈ نے ایسی کسی خواہش کی بات کی تھی

" چلو ٹھیک ہے پھر جلدی سے تیار ہو جاؤ ہم بیس منٹ میں نکلنے والے ہیں۔"

ارحم باپ کے رویئے پر حیران ہوتا تیار ہونے اٹھ گیا۔جینز کے اوپر شرٹ تبدیل کی۔اوپر اوور کوٹ پہنا پاؤں میں سوکس پھر جوگرز اور ہاتھوں میں دستانے پہنے وہ بیس منٹ سے بھی پہلے نکل آیا

دو تین منٹ بعد سلطان بھی اسی کی طرح تیار ہو کر سردی سے بچانے والے اوزاروں سے لیس اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔۔۔

"ریڈی ہو۔۔۔ارحم۔۔۔؟" وہ دستانے چڑھاتے ہوئے مصروف لہجے میں بولے

"یس ڈیڈ۔۔۔" ارحم مسکرا دیا

دونوں باپ بیٹا باہر نکل آئے۔گیراج میں گاڑی کھڑی تھی مگر سلطان کے قدم گیراج کی بجائے بیرونی گیٹ کی طرف تھے۔۔۔

"ڈیڈ۔۔۔گاڑی۔۔۔؟" ارحم نے یاد دلایا کہ شاید وہ بھول گئے ہوں

"ارحم آج گاڑی نہیں چلے گی آج ہم پیدل گھومیں گے۔انجوائے کریں گے۔لندن کی سڑکیں ناپنی ہیں ہم نے۔سمجھو آج تمہاری ٹانگوں کا امتحان ہے۔۔۔"

"ڈیڈ۔۔آپ تھک جائیں گے بیمار تھے آپ۔۔۔"

"ارے نہیں یار۔۔۔کچھ نہیں ہوتا مجھے۔بیماری کی ایسی کی۔۔۔تم چلو میں نہیں تھکوں گا۔ابھی تم سے زیادہ جوان ہوں ابھی۔۔۔"

ارحم حیران ہوا۔اور کندھے اچکاتے ہوئے باپ کے ساتھ بیرونی گیٹ سے باہر نکل آیا۔

باہر نکلے تو احساس ہوا کہ سردی تو غضب کی ہے۔

"ایک منٹ ڈیڈ۔۔۔میں کچھ بھول گیا" ارحم دوبارہ اندر دوڑا۔۔۔اور اپنا گرم مفلر اور ڈیڈ کی اونی ٹوپی لیئے بھاگ کے باہر نکل آیا۔

وہ دونوں پیدل چلتے رہے۔لندن کی سڑکیں ناپتے رہے۔دھند میں لپٹے ویک اینڈ کو انجوائے کرنے صرف وہ دونوں باپ بیٹا نہیں آئے ہوئے تھے اور بھی لاتعداد لوگ تھے جو منہ سے دھواں نکالتے تیز تیز چلتے سردی کی شدت کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔تیز تیز چلنے سے جسم کا ٹمپریچر لیول بڑھ جاتا ہے تو سردی کی وجہ سے خون رکتا نہیں بلکہ اسے گردش کرنے میں مزید آسانی رہتی ہے۔

وہ دونوں باپ بیٹا بھی پونے گھنٹے کی پیدل مارچ کے بعد انتھونی گریس سینما ہال آ پہنچے جہاں پر دو

گھنٹے کی انگلش فلم دیکھی گئی ۔۔۔فلم مزاحیہ تھی ۔سو ہر مزاحیہ ڈائیلاگ پر پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھتا ۔ان قہقہوں میں سلطان کے قہقہے بھی شامل تھے ۔ارحم حیرانی سے اپنے باپ کے اتنے اونچے قہقہے سنتا رہا ۔اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔کبھی کبھار تو وہ ان ڈائیلاگز پر بھی ہنسنے لگتے جو مزاح سے خالی ہوتے ۔

"میرے چہرے پر فلم نہیں چل رہی یار وہ سامنے چل رہی ہے پردے پر موی کو انجوائے کرو یار اتنا سیریس کیوں بیٹھے ہو۔۔۔"

"ڈیڈ۔۔۔کہیں کچھ غیر معمولی ہے کیا۔۔۔؟" اسکی چھٹی حس پتا نہیں کیوں آج بار بار اسے چونکا رہی تھی

"نہیں تو۔۔۔؟

"آپ بیمار تھے نا ڈیڈ۔۔۔آپ ڈاکٹر سے ملے۔۔۔؟"

"یہ ان باتوں کا وقت ہے؟

کم آن یار رکیا ہو گیا ہے۔۔۔؟" سلطان نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا

"مجھے پتا نہیں کیوں آج کچھ غیر معمولی سا لگ رہا ہے۔۔۔" اسے نا چاہتے ہوئے بھی مطمئن ہونا پڑا۔

ہمارے غم ان سب سے زیادہ تو نہیں ہیں ۔دیکھو کیسے اونچے اونچے قہقہے لگا رہے ہیں سب"

ارحم کو بار بار حیرانی اپنے منہ کی طرف دیکھتا پا کر سلطان ۔نے سینما سکرین اور پھر لوگوں کی طرف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"اب آرام سے موی دیکھو ورنہ یہ سب لوگ ہمیں نکال باہر کریں گے ۔۔" سلطان نے مسکراتے ہوئے اسے یاد دلایا کہ وہ لوگ سینما ہال میں موجود ہیں ۔وہ بھی خاموشی سے موی دیکھنے لگا۔

فلم دیکھنے کے بعد ان کی پیدل مارچ پھر سے شروع ہو گئی ۔تھوڑی دیر بعد وہ لوگ ایک بڑے مال میں تھے ۔جہاں سے سلطان نے ارحم کے ہزار انکار کے باوجود بھی اس کو زبردستی ڈھیروں ڈھیر شاپنگ کرائی کپڑے ، جوتے ،کوٹ ، دستانے اس کی پینٹنگز کے سامان ایک نیو گٹار ۔ایک سوٹ اور جوتے حمیدہ خالہ کیلئے بھی لیے گئیے

"ڈیڈ اب آپ اپنے لیئے بھی تو کچھ لیں نا۔۔" آخر شاپنگ کرتے کرتے جب دونوں تھک چکے

تو ارحم نے دیکھا کہ اس کے ڈیڈ نے اپنے لیئے تو کچھ بھی نہیں لیا۔

"نہیں بیٹا۔۔۔میرے پاس پہلے سے ہی سب کچھ ایکسٹرا موجود ہے۔اور تم جوان ہو ان سب کی ضرورت مجھ سے کہیں زیادہ تمہیں ہے۔۔۔ہمیں اب کون دیکھتا ہے بھلا۔۔۔؟" سلطان نے مسکرا کر بات کو مذاق کے موڈ میں اڑایا

"یہ اب ناانصافی ہوگئی ہے ڈیڈ۔۔۔صبح گھر سے نکلتے وقت آپ نے خود کہا کہ آپ مجھ سے زیادہ نوجوان ہیں۔اب آپ الٹ بول رہے ہیں۔۔۔"

"ہاہاہا۔۔۔بیٹا وہ پیدل چلنے کے معاملے میں کہا تھا۔"

سلطان نے قہقہہ لگاتے ہوئے بیٹے کو جواب دیا

"پھر بھی ڈیڈ۔۔۔مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔آپ نے میرے لیئے اتنی شاپنگ کی ہے اپنے لیئے کچھ بھی نہیں خریدا۔"

"ارے کوئی بات نہیں یار۔۔۔اچھا وعدہ رہا کہ اگر زندگی میں ہم کبھی دوبارہ یہاں شاپنگ کرنے اکٹھے آئے تو ساری شاپنگ میں صرف اپنے لیئے کروں گا۔۔۔اور وہ بھی تمہارے پیسوں سے۔۔۔اب خوش۔۔۔؟"

سلطان نے بیٹے کو مطمئن کر دیا۔

"پھر تو ہم بہت جلد دوبارہ یہاں آئیں گے اور میں آپ کو اگلی بار زبردستی شاپنگ کرواؤں گا۔۔۔کوئی انکار نہیں چلے گا پھر۔۔۔" ارحم نے باپ کو تنبیہی انداز میں کہا

جس کا سلطان نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ بات کو کسی دوسری طرف موڑ دیا۔

شاپنگ کے بعد وہ لوگ ایک بڑے ہوٹل آگئے۔جہاں سلطان نے سارا مینیو ارحم کی پسند کا منگوایا۔اس کی پسند کے کھانوں سے ٹیبل بھر دیا گیا۔ارحم کے منع کرنے کے باوجود بھی سلطان نے اتنی ساری ڈشز منگوا لیں۔آدھے سے زیادہ کھانا بچ گیا۔

کھانے کے بعد وہ لوگ باہر نکل آئے اس بار بہت سے شاپنگ بیگز کے ساتھ پیدل مارچ

بہت مشکل تھی۔ اس لیئے ٹیکسی کا سہارا لے لیا گیا۔ یوں شام کو وہ واپس لوٹے اور دونوں کی زندگی کا ایک بھرپور دن اپنے اختتام کو پہنچنے والا تھا

شاپنگ بیگز سے لدے پھندے دونوں باپ بیٹا گھر داخل ہوئے تو حمیدہ خالہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گیئں۔ بلکہ حیرانگی سے زیادہ وہ ایک خوشگوار حیرت میں مبتلا تھی کہ اس کے صاحب کو اس روپ میں انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا گھر کی تمام شاپنگ ہمیشہ فاخرہ کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ اور اس نے اپنی ذمہ داری ہمیشہ بخوبی واحسن طریقے سے نبھائی بھی تھی۔ اور فاخرہ کے گزر جانے کے بعد وہ سلطان کو شاید پہلی بار ارحم کے ساتھ اس قدر خوش دیکھ رہی تھی دل ہی دل میں اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان سب کی زندگی پر کب سے چھایا جمود ٹوٹا تھا۔

رات کا کھانا بھی خوشگوار موڈ میں کھایا گیا تھا۔ کھانے کے بعد کافی دیر سلطان کے پاس بیٹھا گپ شپ کرتا رہا دن بھر کی اور دنیا جہان کی باتیں ڈسکس کرتا رہا۔ رات کے بارہ بجے دونوں تھک کر اپنے اپنے کمروں میں چل دیئے تھے۔

جہاں بستر پر گرتے ہی وہ دن بھر کی تھکن کی وجہ سے دونوں بہت جلد خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگے۔

مگر یہ کوئی رات کا آخری پہر تھا جب سلطان کو کھانسی کا دورہ پڑا کھانسی کی وجہ سے اس کی آنکھ بھی کھل گئی۔ ساتھ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس انہوں نے لبوں سے لگایا اور غٹا غٹ پورا گلاس پی گئے مگر کھانسی کا دورہ پھر بھی نہیں رکا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے مسلسل کھانس رہے تھے جب کھانستے کھانستے اسے اپنے ہاتھ پر کچھ محسوس ہوا ہاتھ آنکھوں کے سامنے کیا تو اس کی ہتھیلی لال لال خون سے بھری ہوئی تھی۔ سلطان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گیئں وہ اب بھی وقفے وقفے سے کھانس رہا تھا۔ اس کی یہ حیرت زیادہ دیر تک نہیں رہ سکی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بہت جلد یہ مرحلہ آنے والا ہے۔ اب جلدی سے جلدی اسے اپنے پلان پر عمل کرنا تھا کیونکہ اس کے پاس حقیقتاً وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

لندن کی مصروف سڑکوں سے پیدل گزرتا اوورکوٹ پہنے ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کالے رنگ کا منی بیگ پکڑے وہ خراماں قدموں سے رواں دواں تھا۔اس وقت وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کس کیفیت سے گزر رہا ہے۔

پچھلی رات سٹور کی فروخت کے تمام معاملات طے کرنے کے بعد وہ ساری رقم ارحم کے اکاؤنٹ میں جمع کرا چکا تھا اس کے علاوہ بھی باقی اپنی ساری جمع پونجی اس نے ارحم کے اکاؤنٹ میں جمع کرادی۔کل کا دن اس کی زندگی کا ایک یادگار دن تھا۔

اس نے اپنے اس فیصلے کے بارے میں ایک انسان تک کو بھی بھنک نا پڑنے دی۔جانتا تھا یہ فیصلہ بہت مشکل ہے مگر اسے کرنا تھا۔

آنکھوں کے آگے کچھ منظر چل رہے تھے جیسے کوئی پرانے دور کی بلیک اینڈ وائٹ فلم ہو۔کچھ چہرے بار بار آنکھوں کے سامنے آکے ٹھہر جاتے۔

ابا کا چہرہ،اماں کا چہرہ،ملوکھاں،جنت کا چہرہ،فاخرہ اور ارحم کے چہرے۔

مگر وہ باوجود کوشش کے بھی ملوکھاں سے ہونے والے اپنے بچے کا تصوراتی چہرہ تراشنے میں ناکام رہا تھا۔اس کے پیدل چلنے کی رفتار اب بھی وہی تھی۔اتنے چہروں نے بھی اس کے قدموں کو بالکل نہیں جکڑا تھا۔

آدھے گھنٹے کی مسلسل مسافت کے بعد وہ اس مصروف پل پر پہنچ چکا تھا۔یہ وہی فیری برج تھی جہاں ارحم کی دوسری ملاقات نیلی آنکھوں والے جادوگر لڑکے سے ہوئی تھی

معمول کے مطابق آج بھی پل پر بے حد رش تھا۔کالے گورے ہر قسم کے لوگ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے تیز تیز چلتے اپنی منزلوں کی طرف گامزن تھے۔

یہاں کسی کو کسی دوسرے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔لندن کی زندگی ہمیشہ بھاگتی ہی رہتی ہے۔یہاں جمود کا نام ونشان تک نہیں۔ہر کوئی مصروف ہر کسی کو دوسرے سے آگے نکلنے کی زیادہ جلدی ہوتی ہے۔

پل کے ایک طرف آج بھی ایک مسخرہ اپنے کرتب دکھا رہا تھا اس کے ارد گرد کچھ لوگ بھی جمع تھے۔
ان سے تھوڑے فاصلے پر ایک نابینا فقیر بیٹھا بانسری کی دھنیں بجا رہے تھے۔ اس کے آگے رکھے پیالے میں لوگ گزرتے ہوئے ایک ادھ سکہ ڈال کر آگے چل دیتے۔
پل پر پہنچ کر سلطان کے قدم رک گئے۔ اس نے تھوڑی دیر وہاں رک کر مسخرے کے کرتب دیکھے پھر کرتب کو بیچ میں چھوڑ کر سلطان نے اپنا اوورکوٹ اتارا اور اس کنارے پر بیٹھے بوڑھے بانسری بجاتے نابینا فقیر کو پہنا دیا۔
" زندگی کے سفر میں ہمیشہ کامیاب رہو۔۔" گرم کوٹ ملتے ہی بوڑھے نابینا فقیر کے لبوں سے اپنے ان دیکھے مہربان کیلیے دعا نکلی
" میرا سفر اختتام کو پہنچ چکا ہے اور میں اپنے سفر میں ناکام رہا ہوں۔" بوڑھے کو جواب دینے کے بعد وہ اسے حیران چھوڑتا اس کے پاس سے کھڑا ہو گیا
اگلے پل اس نے پل کے درمیانی پلر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ یہاں ایک اونچی ناف تک آتی مضبوط لوہے کی حفاظتی گرل لگی ہوئی تھی۔ اس حفاظتی آڑ کو پھلانگو تو نیچے پل کے بڑے بڑے اور چوڑے چھے ستون تھے جن کے اوپر یہ پل اٹھایا گیا تھا۔ سلطان اس حفاظتی آڑ کو پھلانگ کر چوڑے ستون پر آ بیٹھا۔ نیچے گہرائیوں میں جاتا یہ ستون گہرے اور تیز رفتار پانیوں میں اتر رہا تھا۔
تھوڑی دیر وہ اس ستون پر بیٹھا رہا بالکل خاموش۔ گہرے اور تیز رفتار پانی کو دیکھتا رہا۔
" برادر خودکشی کا ارادہ ہے کیا۔۔" اوپر سے ایک گورے نے اسے ستون پر اطمینان سے بیٹھا دیکھ کر آواز دی
" ہاں ایسا ہی کچھ ارادہ ہے۔" سلطان نے جواب دیتے ساتھ ہی ایک قہقہہ لگایا
گورے نے مذاق سمجھا اور آگے کی طرف چل دیا
تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے اس کام کو انجام دینے کا فیصلہ کر لیا جس کیلئے وہ یہاں آیا بیٹھا تھا
ایک آخری نگاہ پل کی طرف اچھالی لوگ اب بھی اسی طرح آ جا رہے تھے لیکن اسے لگا جیسے سب

کچھ سلوموشن میں ہو رہا ہو۔ مسخرے کے ارد گرد اب بھی لوگ جمع تھے مسخرے کی حرکات بھی اسے سلوموشن میں محسوس ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں جیسے کانوں سے بھی کچھ نا سنائی دے رہا ہو وہ صرف دنیا کو دیکھ رہا تھا۔ سلوموشن میں کچھ پل مزید گزرے تو سلطان نے ہاتھ میں پکڑا منی بیگ کھولا اس میں پڑی رسی نکالی ۔اور وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے بائیں ہاتھ کو اپنے بائیں پاؤں سے باندھنے لگا۔ اس عمل کے بعد اس نے دوبارہ بیگ میں ہاتھ ڈالا اس بار اس کے ہاتھ میں ایک کالے رنگ کا ماسک تھا۔ ایک گہرا اور لمبا سانس لینے کے بعد اس نے اپنے آزاد ہاتھ سے وہ ماسک اپنے چہرے پر چڑھا لیا۔

ماسک کے نیچے لبوں میں حرکت ہوئی۔ لبوں نے زندگی کو خدا حافظ کہا۔ کلمہ پڑھا اور پھر سلطان نے نیچے گہرے تیز رفتار پانی میں چھلانگ دی

☆......☆......☆

اکیسواں حصہ

کالج میں پریکٹیکل کلاسز ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ بارش نے ایک بار پھر جل تھل کر دیا۔حالانکہ کچھ گھنٹے پہلے تک آسمان بالکل صاف تھا۔مگر یہ لندن کا موسم تھا ہمیشہ سے بے اعتبارا۔بارش کے بعد ہونے والی برف باری نے ماحول کو مزید ٹھنڈا کر دیا تھا۔

سردیوں کی شدت میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

فائنل ایگزامز ختم ہوئے تو سب نے سکھ کا سانس لیا تھا۔اب کچھ پریکٹیکلز باقی تھے جن کیلئے سب سٹوڈنٹس آج پھر کالج اکھٹے ہوئے تھے۔پریکٹیکل سے فارغ ہونے کے بعد سب دوست اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

چونکہ کوکب اور ارحم کا تعلق ایک ہی ایریا سے تھا تو وہ دونوں اکثر اکھٹے واپس آتے۔کالج جانے میں کبھی کبھار دیر سویر ہو جاتی مگر واپسی دونوں کی زیادہ تر ایک ساتھ ہی ہوتی تھی۔

آج بھی وہ دونوں ایک ساتھ کالج سے واپس جا رہے تھے۔

سڑکوں پر تھوڑی دیر پہلے ہونے والی برف باری کی وجہ سے ابھی بھی برف پڑی ہوئی تھی

"کوکب کبھی تم نے غور کیا ہے کہ ہم انسانوں کی زندگی کس قدر تیز رفتار ہو گئی ہے۔ہم سب اپنی مصروفیات میں اس قدر گم ہو چکے ہیں کہ خود کو دینے کیلئے بھی وقت میسر نہیں ہوتا ہمارے پاس۔" ارحم نے باتوں باتوں کے دوران اس کی توجہ لندن کی بھاگتی دوڑتی زندگی کی طرف دلائی

"ہاں یہ تو ہے۔زندگی بہت تیز رفتار ہو گئی ہے۔واقعی انسان خود کو وقت نہیں دے پاتا۔اسی لیئے تو ڈپریشن کا مریض بنتا چلا جاتا ہے" کوکب نے اس کی بات سے اتفاق کیا

وہ کافی دنوں بعد اس طرح کھل کر بات کر رہے تھے

کوکب کیلئے وہ ہر ایک منٹ قیمتی اور نایاب ہوتا تھا جو اس کا ارحم کے ساتھ گزرتا۔حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جب سے کرسٹی نے کوکب کے احساسات کے بارے میں اس دن گراؤنڈ میں ارحم کو کھل کر بتایا تھا کہ کوکب کیلئے وہ کیا ہے اور وہ اس کیلئے کون سے جذبات رکھتی ہے دل میں ۔۔۔اس دن کے بعد سے دونوں اس طرح دو بدو کوئی خاص ملاقات نہیں ہوئی تھی ۔نا ہی کبھی تنہائی میسر آئی تھی ۔کیونکہ ایگزام کی وجہ سے ہر کوئی مصروف رہا تھا اور سب کو اپنی ہی پڑی ہوئی تھی ۔اور آج جب ان دونوں کو یہ موقع میسر آیا تو دونوں میں سے کسی نے اس ٹاپک پر بات ہی نہیں کی اور نا ہی کرسٹی کی باتوں کو دہرایا۔شاید دونوں ہی اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتے تھے ۔شاید بچنا چاہتے تھے اس موضوع سے ۔مگر کب تک۔۔۔؟

وہ انہی پل دل میں دعا کرتی کہ وقت یہیں رک جائے ۔کبھی آگے ہی نا بڑھے ۔اور وہ دونوں اسی طرح وقت ساتھ گزارتے رہیں ۔مگر وقت کب کہاں کسی کیلئے رکا ہے۔؟

۔" مجھے تو اس مصروفیت والی زندگی سے اور اس بھیڑ بھاڑ سے .بہت الجھن ہوتی ہے ۔ہر طرف ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں بھاگتے دوڑتے انسان ۔۔۔یہ بھی کوئی زندگی ہے بھلا۔۔۔"

"تو پھر تم کیسی زندگی چاہتے ہو۔۔۔؟"

" میں چاہتا ہوں سکون ہو، خاموشی ہو، اس قدر انسانوں کی بھیڑ نا ہو۔کوئی قدرتی مناظر ہوں فطرت سے قریب ترین ۔جن کو بندہ محسوس کر سکے ۔اور کوئی خاموش سر سبز جزیرہ ہو جہاں بیٹھ کے میں کبھی زندگی کو کینوس پر اتاروں یا پھر کوئی جھیل یا سمندر۔جس کے کنارے بیٹھ کے میں ہواؤں میں مختلف سازوں کے سر بکھیروں"

اس نے پہلی بار اپنے دل کی خواہشیں کوکب کے سامنے بیان کی

" ارے واہ ۔۔۔تم خود کے بارے میں اتنا بھی سوچ لیتے ہو۔میں تو حیران ہوں آج۔"

" کیوں میں اپنی ذات کے بارے نہیں سوچ سکتا۔۔۔؟"

" نہیں ۔۔میرا مطلب ہے کہ پہلے تمہارے منہ سے اس طرح کی باتیں کبھی سنی ۔ہی نہیں نا"

کوکب کھلکھلا کر ہنس دی۔
"اب اتنا بھی میں سڑو نہیں ہوں۔جس طرح تم سمجھتی ہو۔"
"میری طرح تو پھر بھی نہیں ہونا۔۔"کوکب نے اپنا اوورکوٹ اتار کر بازو پر رکھتے ہوئے کہا مسلسل پیدل چلنے کی وجہ سے جسم حرارت پکڑ چکا تھا
"تمہاری طرح میں ہونا بھی نہیں چاہتا۔۔ایسے ہی ٹھیک ہوں بس۔۔" ارحم نے مسکراتے ہوئے ہلکا پھلکا طنز کیا
"تم جانتے ہو کچھ عرصے سے میرے مزاج اور میری زات میں بھی سنجیدگی آتی جارہی ہے۔لگتا ہے تمہارا رنگ چڑھتا جارہا ہے۔"کوکب نے اسے اپنی کیفیت بتائی جو وہ پچھلے کچھ دن سے محسوس کررہی تھی۔دراصل یہ بھی تو اظہار کا ایک طریقہ تھا مگر کوئی سمجھے بھی تو۔یا تو وہ سمجھا ہی نہیں تھا یا پھر سرے سے سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا اور جان بوجھ کر اگنور کرتا تھا کوکب سمجھ نہیں پائی۔
"کم از کم میرے لیئے تو یہ ماننا بہت مشکل ہے کہ کوکب کبیر نے سنجیدگی اپنالی ہے۔"
"ارحم میں سچ بول رہی ہوں"
"ہو ہی نہیں سکتا۔۔جو باتیں ممکن ہی نا ہوں میں ان پر کیسے یقین کروں۔۔؟"
"ٹھیک ہے مت کرو یقین۔۔"کوکب کا منہ بن گیا اور وہ خاموشی سے چلنے لگی
"کوکب۔۔۔ہر انسان کا اپنا ایک زندگی جینے کا طریقہ ہوتا ہے،اپنی الگ سوچ ہوتی ہے،الگ ایک اندازِ فکر ہوتا ہے اور وہ اسی انداز میں بیسٹ ہوتا ہے۔تم اپنے انداز میں بہت جدا ہو،بہت اچھی ہو اور یہی تمہارا اپنا رنگ تم پر سوٹ کرتا ہے اس لیئے میرا یا کسی اور کا رنگ چڑھانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔"اس بار وہ سنجیدہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔تھوڑی دیر پہلے کا مزاج اب کہیں اڑن چھو ہو چکا تھا
"تم سچ کہہ رہے ہو۔۔۔؟"کوکب کو یقین ہی نہیں آیا
"ہاں سچ میں۔۔۔"ارحم نے تائید کی
"تم تو ہمیشہ کہتے تھے کہ کوکب تم نان سیریس ہو،کھلنڈری ہو،زندگی ایسے نہیں گزرتی،یہ ہو تم،وہ ہو

تم۔۔۔"کوکب نے اسی کا انداز نقل کیا

"ہاں کہتا تھا۔۔۔اب یہ بھی تو میں خود کہہ رہا ہوں نا۔۔۔"

ان دونوں کا سفر ختم ہونے والا تھا۔کوکب کا دل دھڑکنے لگا۔جانے یہ ارحم کے ساتھ راستہ اتنا مختصر کیوں ہو جاتا ہے۔

"اور اگر تم سچ میں ہی سنجیدہ ہوتی جا رہی ہو تو پھر اس کا مطلب ہے کہ تمہارے اندر میچوریٹی آ رہی ہے"

"یہ کچھ اور بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"اور۔۔۔مطلب۔۔کیا۔؟"

"تمہارا رنگ چڑھنے لگا ہے تو تم ہی بتا دو یہ کیا ہے۔۔۔؟"

"میرا تو کوئی رنگ ہی نہیں ہے۔پانی کی طرح بے رنگ ہوں میں۔۔۔" ارحم نے اسے جواب دیا اور اس کی طرف ہاتھ ہلاتا اپنے گھر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔کوکب کو لگا کہ شاید وہ جان بوجھ کر ہی اس ٹاپک سے بچنا چاہتا ہے۔اسے اس طرح کی کوئی امید دینا ہی نہیں چاہتا۔

اس سے اگلی گلی میں کوکب کا گھر تھا اسے یہ چند منٹ کا مختصر سا سفر اب اکیلے طے کرنا تھا۔مگر اب اس کے قدم ہی نہیں اٹھ رہے تھے۔

"تمہارا بھلے کوئی رنگ نا ہو ارحم۔مگر میں تو تمہارے رنگ میں رنگ چکی ہوں۔تمہاری محبت کے رنگوں نے میرے سارے رنگ اتار کے مجھ پر اپنا رنگ چڑھا دیا ہے۔کبھی نا اترنے والا رنگ ۔۔۔" وہ دل میں ہی سوچتی رہ گئی الفاظ باہر نالا سکی۔

"کتنا ہی اچھا ہوتا تمہارے ساتھ یہ سفر کبھی ختم ہی نا ہو۔ہم ایسے ہی ہمیشہ چلتے رہیں۔بغیر رکے، بغیر تھکے۔ایک دوسرے کی زات میں گم ہو کر۔۔۔"

آہستہ قدموں سے اپنے گھر کی طرف بڑھتی وہ سوچتی ہوئی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

وہ تھکا تھکا سا گھر پہنچا تو حمیدہ خالہ گھر کے معمول کے کام کاج میں لگی ہوئی تھی ۔اور ڈیڈ اس وقت سٹور پر ہوتے تھے اور اکثر دن کا کھانا بھی وہیں باہر سے ہی کھا لیتے ۔

"کھانا لگاؤں ارحم ۔۔۔؟"حمیدہ خالہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا

"نہیں ابھی نہیں ۔۔تھوڑی دیر بعد کھاؤں گا۔تھک گیا ہوں کافی ۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں جواب دیتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا

اندر جاتے ہی اپنا کوٹ اتار کر لٹکایا دستانے سائیڈ ٹیبل پر رکھے اور تھوڑی دیر ریسٹ کیلیئے بستر کی طرف آیا۔مگر اس کے قدم وہیں رک گئے

بیڈ کے عین درمیان میں ایک کیسٹ پڑا ہوا تھا۔اس نے حیرت سے کیسٹ اٹھایا نیچے سے ایک پرچہ بھی برآمد ہوا۔جس پر لکھا تھا۔کھانا کھا کے اسے سن لینا۔وہ اس لکھائی کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔یہ اس کے ڈیڈ کی ہی لکھائی تھی ۔(دو سال تک چوہدری صاحب کے دھندے کا انچارج اور بیس سال تک اپنا سٹور سنبھالنے کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ وہ تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتے تھے)تجسس پھیلنے لگا پہلے ڈیڈ نے کبھی اس طرح کا کوئی کیسٹ یا نوٹ نہیں چھوڑا تھا اگر کوئی بات ہوتی تو وہ اسے کال کر دیتے یا پھر حمیدہ خالہ کو پیغام دے جاتے ۔اس لیئے ارحم کا حیران ہونا بنتا تھا۔

تجسس نے اسے کھانا نہیں کھانے دیا۔کیسٹ اٹھائے وہ پلیئر کی طرف آیا اور کیسٹ لگا دیا۔

سلطان کی ریکارڈڈ آواز کمرے میں پھیلنے لگی

" ارحم کھانا نہیں کھایا نا۔۔۔؟ مجھے معلوم تھا میرے چھوڑے گئے پرچے کے بعد بھی تم تجسس سے کھانا نہیں کھاؤ گے ۔

بیٹھ جاؤ ارحم ۔۔۔اور سکون اور تحمل سے میری باتیں سنو۔کیونکہ یہ موقع پھر کبھی نہیں آئے گا۔"

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا

" ارحم میں جانتا ہوں میں جو کرنے جا رہا ہوں بالکل غلط ہے ۔گناہ بھی ہے ۔مگر میرا معاملہ میرے اللہ کے ساتھ ہے ۔اور مجھے یقین ہے اللہ ضرور مجھے معاف کر دے گا۔۔۔"

" میں آج جا رہا ہوں بیٹا۔۔۔تم سے دور بہت دور۔پھر کبھی نا ملنے کیلئے۔۔۔وہاں جہاں سے کبھی کوئی مڑ کے واپس نہیں آتا

(کرسی پر بیٹھے ارحم کا دل ایک جنبش سے پھڑ پھڑا اٹھا)

میرے لیئے بھی یہ فیصلہ کافی مشکل تھا بلکہ یہ میری زندگی کا مشکل ترین فیصلہ تھا میرے گھر چھوڑنے کے فیصلے سے بھی بہت مشکل اور مشکل ترین اس لیئے بھی کیونکہ اس سے زیادہ مشکل فیصلے کرنے کیلئے میرے پاس اب زندگی باقی ہی نہیں ہوگی۔

زندگی کے آخری دن آج مجھے سچ میں احساس ہو رہا ہے کہ

زندگی واقعی بہت پیاری ہوتی ہے کیونکہ یہ صرف ایک بار ملتی ہے۔اور دنیا چھوڑنا بہت مشکل امر ہوتا ہے۔"

(کرسی پر بیٹھے ارحم کی آنکھوں کے کٹورے گرم گرم آنسوؤں سے بھرنے لگے)

" مجھے معلوم ہے اب تمہیں رونا آ رہا ہوگا۔لیکن ارحم رونا نہیں ہے۔رونا بالکل نہیں۔ورنہ مجھے تکلیف ہوگی۔مجھے ایسا کہنا نہیں چاہیے کیونکہ میں خود تم کو زندگی کی سب سے بڑی تکلیف سے گزارنے جا رہا ہوں۔"

(ارحم نے اپنی گیلی ہوتی آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر صاف کیا)

"کیا کروں ہمیشہ سے ہی خودغرض جو ہوں۔خود سے منسلک رشتوں کا کبھی سوچتا ہی نہیں میں۔عادت سے مجبور ہوں نا۔۔"

" بالکل ایسے ہی میں پاکستان میں اپنے بہت سے پیارے رشتوں کو تکلیف میں چھوڑ آیا تھا۔بہت مشکل ہوتا

ہے خودغرض بن کر جیتے رہنا اور سب اپنوں کو

بھلا دینا حالانکہ خون کے رشتے کبھی بھی بھلائے نہیں جا سکتے۔چاہے انسان جتنا بھی خودغرض بن جائے ایک نا دن اسے انہی رشتوں کی ضرورت ضرور پڑتی ہے۔

میں نے بھی ہمیشہ خودغرضی کی زندگی گزاری ،ہمیشہ اپنے بارے میں سوچا۔اپنے پیچھے چھوڑے رشتوں کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔اور آج میں اپنے آخری دن بیٹھا سوچ رہا ہوں اور اقرار کر رہا ہوں کہ میں غلط تھا اور میں نے رشتوں کو چھوڑ کے غلط کیا تھا۔کیونکہ آج جب مجھے میرے رشتوں کی ضرورت ہے کوئی میرے پاس نہیں ہے۔شاید یہی میری سزا چنی ہے اللہ نے۔۔"

"بیٹا میں نے اللہ سے معافی مانگ لی تھی اور مجھے یقین ہے اللہ مجھے ضرور معاف کر دے گا۔

مگر اللہ کے کچھ بندوں کے بھی قرض ہیں مجھ پر۔بہت زیادہ مقروض ہوں میں۔اس لیئے میں چاہتا تھا کہ تم پاکستان چلے جاؤ۔وہاں سب میرے اپنے ہیں تمہارے اپنے ہیں۔یہاں میرے علاوہ تمہارا کوئی نہیں ہے اور آج تو میں بھی جا رہا ہوں تمہیں ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر۔میں بہت خودغرض ہوں نا۔"

"ارحم میں نے تمہاری ماں سے بہت محبت کی تھی۔اتنی محبت کہ تمہیں بتا بھی نہیں سکتا۔مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی جب فاخرہ نے یہ الزام لگایا کہ میں اب بھی پاکستان جاتا ہوں سب سے ملنے۔۔۔یہ غلط تھا ارحم میں بیس سال سے کبھی مڑ کے پاکستان نہیں گیا۔

حالانکہ مجھے جانا چاہیئے تھا۔مگر میں اب ان سب کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں تھی۔میرے پاس ان کے سوالوں کے جواب نہیں تھے۔

ارحم میرا کہنا مان لو۔۔۔پاکستان چلے جاؤ۔وہاں مجھ پر واجب قرض اتارنے ہیں تم نے۔بہت سے رشتوں کے قرض۔

اماں ابا سے میری طرف سے معافی مانگنا۔کہنا کہ سلطان کو بخش دیں حالانکہ وہ اس قابل بالکل نہیں ہے۔

اور ہاں وہاں بھی میرا ایک بچہ ہے۔تم سے شاید دو سال بڑا ہوگا۔ارحم اس نے اپنی پیدائش سے باپ کا چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔اسے ہمیشہ خوش رکھنا۔باقی کی زندگی میں اس کی آنکھ میں کبھی آنسوؤں نہیں آنے دینا۔تم اس سے چھوٹے ہو مگر پھر بھی تم نے اب ہمیشہ اس کا خیال رکھنا ہے۔یاد رکھنا ارحم کبھی تمہاری وجہ سے اس کی آنکھ میں آنسوؤں نا آنے پائیں

میں نے سٹور بیچ کر ساری رقم تمہارے اکاونٹ میں جمع کرا دی ہے۔اس کے علاوہ بھی میرے پاس جو اثاثے تھے وہ سب تمہارے اکاوئنٹ میں جمع ہیں انہیں پاکستان جانے سے پہلے نکلوا لینا۔۔آدھا حصہ تمہارا ہے اور باقی آدھا میرے اس بچے کا جسے آج تک میں دیکھ ہی نہیں سکا۔

میں نے پاکستان میں دو شادیاں کی تھی۔ملوکھاں اور نور بانو سے۔۔ان سے بھی میری طرف سے معافی مانگنا۔۔نور بانو کو میں نے بے قصور طلاق دی تھی۔میں چاہتا ہوں تم اس غلطی کا مداوا کر و میری طرف سے۔اس سے میری طرف سے معافی مانگو۔ورنہ اس دنیا کی طرح مجھے آگے بھی چین نصیب نہیں ہو گا۔

آج مرنے سے پہلے مجھے اپنے سب گناہ یاد آرہے ہیں۔آج میں تمہارے سامنے یہ اعتراف بھی کر رہا ہوں کہ ملوکھاں سے ہونے والی اولاد میری غلطی کا نتیجہ تھی۔اس لیئے میں چاہتا ہوں تم ہمیشہ اس کا خیال رکھنا اور اسے ہمیشہ خوش رکھنا"

(ارحم نے اپنا سر کرب سے کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔دو آنسوؤں آنکھوں سے لڑھ کر کانوں کی طرف بہنے لگے)

"مجھے معلوم ہے یہ سب باتیں سننا تمہارے لیئے تکلیف دہ ہے۔مگر بیٹا زندگی میں میں نے عجیب عجیب موڑ دیکھے ہیں۔تم سوچ رہے ہو گے کہ میرا باپ کیا چیز تھا؟ کیسا انسان تھا؟

تمہیں دکھ ہو رہا ہو گا۔تمہیں مجھ پر رونا بھی آئے گا مگر ارحم رونا نہیں ہے۔تم نے بہادر بننا ہے۔ہر کڑوی سے کڑوی بات کو اور ہر مشکل سے مشکل گھڑی کو سہنا ہے

ارحم مجھے یقین ہے کہ تم میری اس آخری خواہش کو ضرور پورا کرو گے۔تم پاکستان ضرور جاؤ گے۔

میں بھی تمہارے ساتھ ضرور جاتا مگر میں کینسر میں مبتلا ہو گیا تھا۔میرے پاس اتنا وقت باقی نہیں تھا کہ میں وہاں تمہارے ساتھ جاؤں اور وہاں جا کر میں ان سب کو ایک اور دکھ بالکل نہیں دینا چاہتا تھا۔اپنی موت کا دکھ۔۔۔میں پہلے ہی انہیں بہت زیادہ دکھ پہنچا چکا ہوں۔۔۔

(ارحم کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔کرسی کی پشت سے ٹکا سر اوپر اٹھا۔آنکھیں پانیوں سے لبریز تھیں۔کچھ آنسوؤں لکیریں بنا کے گردن تک لڑھک آئے تھے۔اس کے ڈیڈ کو بلڈ کینسر تھا اور اسے معلوم

بھی نہیں تھا۔۔۔)

میری سیف میں میری تمام رپورٹس اور باقی تمام ضروری کاغذات پڑے ہیں ہوئے ہیں۔شاہ والی کا ایڈریس بھی۔وہ سب نکال لینا۔جانتا ہوں تمہارے لیئے وہ زندگی بہت مشکل ہوگی مگر مجھے یقین ہے میرا بیٹا ہر حالات سے لڑنا جانتا ہے۔

مجھے میرے بیٹے پر بھروسہ ہے۔یقین ہے۔اور مجھے یقین ہے کہ میرا بیٹا کبھی میرا یقین نہیں توڑے گا۔

وقت بہت کم ہے اور باتیں بہت زیادہ۔۔۔دل چاہتا ہے بس ایسے ہی بولتا رہوں بولتا رہوں۔۔۔جب باتیں ختم ہو جائیں تو بے مقصد بولتا رہوں پاگلوں کی طرح۔لیکن وقت بہت کم ہے۔

چلتا ہوں ارحم۔میں فیری برج پر خودکشی کرنے جا رہا ہوں۔میری ڈیڈ باڈی وصول کر لینا۔

اور ہاں رونا بالکل نہیں۔۔۔ایک آنسو بھی مت گرانا۔ورنہ مجھے بہت تکلیف ہوگی۔اور ہو سکے تو میری یہ آخری خواہش ضرور پوری کر دینا پاکستان چلے جانا۔مجھے یقین ہے میرا بیٹا میری آخری خواہش ضرور پوری کرے گا۔۔مجھے یقین ہے میرا ارحم میرا یقین کبھی نہیں توڑے گا۔

خدا حافظ ارحم۔۔۔تمہارا لیئے بہت سارا پیار۔۔۔"

سلطان کی ریکارڈڈ آواز بند ہو چکی تھی۔وہ کرسی کی پشت پر سر ٹکائے بے سدھ پڑا تھا۔کتنے لمحے اسی طرح گزر گئے۔کتنا وقت بیچ میں اسی طرح بے سدھ پڑے گزر گیا اسے کچھ معلوم نا ہوا

پھر اس نے سر اٹھایا اپنے بکھرے وجود کو سمیٹا خود کو اکٹھا کیا۔کرسی سے اٹھا۔اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

"اب کھانا لگاؤں ارحم۔۔۔تھکن کچھ کم ہوگئی آپ کی۔۔۔؟" خالہ حمیدہ نے اسے کمرے سے باہر آتا دیکھ کر دوبارہ کھانے کا پوچھا

"نہیں خالہ اب تو بھوک بھی اڑ گئی ہے۔اور تھکن ختم نہیں ہوئی پہلے سے بھی بہت بڑھ گئی ہے۔۔۔"

وہ پرسکون لہجے میں گیراج کی طرف بڑھ گیا گاڑی نکالی۔اور فیری برج پل کی طرف روانہ ہو گیا۔

پیچھے گھر میں اس کی بات کا مطلب ڈھونڈتی صرف خالہ حمیدہ رہ گئی تھی۔جو اس کی بات سمجھ میں نا آنے کے بعد پھر سے اب اپنے کام میں لگ گئی تھی۔

☆......☆......☆

" آخر ایسا کب تک چلے گا چنل ۔۔۔دو ہفتوں سے نا تم نے صحیح طرح کھانا کھایا ہے۔نا ہی گھر میں بیٹھتے ہو۔یہ بری بات ہے۔اب تم بڑے ہو چکے ہو" نانی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا جو جنت سے رشتے کے انکار کے بعد بالکل گم سم سا رہنے لگا تھا

" دل تو بڑا نہیں ہوا نانی۔یہ تو ہمیشہ بچہ ہی رہتا ہے۔کبھی بڑا نہیں ہوتا۔۔۔"

"لیکن چنل ۔۔۔حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔دل کو سمجھانا پڑتا ہے۔"

" دل کوئی زبان سمجھتا ہی نہیں ۔بس اپنی کہے جاتا ہے ۔ایک ہی نام کی رٹ لگائے رکھتا ہے ۔ایک ہی راگ الاپتا رہتا ہے۔سنتا کب ہے کسی کی۔۔۔"

" چنل جو نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔وہ ہو کر رہتا ہے۔کوئی کتنی ہی مخالفت کرے نصیب کا لکھا مل کر رہتا ہے۔اور جو نصیب میں ہی نا لکھا ہو۔اس کیلیئے سر توڑ کوششیں کرو پتھروں سے سر پھوڑ دو وہ کبھی نہیں ملتا۔تمہارے دادا دوسری بار بھی گئے تھے جنت کے ابا کے پاس ۔مگر انہوں نے وہی جواب دیا ۔جو پہلے دیا تھا۔بیٹا ہم سب بھی یہی چاہتے ہیں ۔مگر کیا کریں۔خدا کو شاید منظور ہی نہیں ہے"

" آپ خود ایک باران کو راضی کرتیں کیا پتا وہ مان جائیں۔۔۔" اس کے لہجے میں التجا چھپی تھی

نانی خاموش ہوگئی۔ان

کو احساس ہوا کہ ایک بار انہیں خود بھی جانا چاہیئے کیا پتا وہ لوگ مان جائیں

" ٹھیک ہے چنل ۔۔۔تیرے لیئے میں خود جاؤں گی۔خود بات کروں گی مگر چار آٹھ روز تک ۔اور تم بھی دعا مانگا کرو۔تمہیں معلوم ہے نا دعا دستک ہوتی ہے۔اور مسلسل دستک سے در کھل بھی جاتے ہیں۔۔۔"

" ہاں ۔۔۔یہ تو میں بھول بیٹھا تھا۔میں دعا مانگوں گا نانی بہت سی دعا مانگوں گا۔اور اگر اللہ نے

میری یہ دعا قبول نہیں کی تو میں پھر ان سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گا۔ پھر کبھی دعا کیلئے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا ۔۔ پھر ساری زندگی مانگنا ہی چھوڑ دوں گا"

"ایسا نہیں بولتے پتل ۔۔۔ اللہ ناراض ہو جاتا ہے۔اور اگر ایک بار اللہ ناراض ہو جائیں تو پھر دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ بنتے کام بگڑ جاتے ہیں۔ایسا کبھی نا بولنا اب۔۔۔"

"آپ خود جائیں گی نا ایک بار میرے لیئے ۔۔۔ جنت کو مانگنے ۔۔۔؟" خوشی نے دوبارہ تصدیق چاہی

"ہاں پتل جاؤں گی میں ۔۔۔ ضرور جاؤں گی۔تم سے بڑھ کر تو میرے لیئے اور کوئی نہیں ہے دنیا میں ۔۔۔"

نانی کی آمادگی سے اس کے دل کو کچھ حوصلہ مل گیا۔خوشی نے دل میں سوچ لیا وہ اللہ سے دعا کرے گا ۔۔۔ بہت زیادہ دعا۔ بس یہی اس کی سب سے قیمتی چیز تھی اس دنیا میں۔اور وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا

"اور اب یہ رونی شکل بھی ختم کرو ۔۔۔ اچھے بھلے چہرے کا ستیاناس کر رکھا ہے۔اور کھانا ٹھیک سے کھایا کرو ۔۔۔ بلکہ جاؤ پہلے نہا لو پھر کھانا کھا لینا ۔۔۔" نانی نے اسے ڈپٹا تو وہ مسکراتے ہوئے نہانے چلا گیا

☆......☆......☆

زمیندار صاحب کچھ دن سے گھر کے ماحول میں آنے والی تبدیلی کو اچھی طرح محسوس کر رہے تھے۔مگر وہ ابھی تک سمجھ نہیں پائے تھے کہ یہ اتنی خاموشی کیوں رہنے لگی ہے ہر وقت ۔۔۔ نور بانو بھی چپ چاپ رہتی اور خاموشی سے گھر اور شوہر کے سب کام کاج انجام دیتی رہتی ۔۔۔ جنت کے چہرے سے بھی خوشی کہیں روٹھ کے چلی گئی تھی۔ ہر وقت گم سم۔اور اداس اداس سی پھرتی رہتی پورے گھر میں ۔۔۔ گھر میں اس قدر خاموشی زمیندار صاحب کو چبھنے لگی تو وہ خود ہی نور بانو سے پوچھ بیٹھے کیونکہ جانتے تھے نور بانو کتنی ہی تکلیف میں کیوں نا ہو کبھی منہ سے کچھ نہیں مانگے گی کبھی کوئی شکایت نہیں کرے گی۔

"نور بانو ۔۔۔ کہیں کچھ مسئلہ ہے۔ یا کچھ ایسا خاص ہوا ہے کیا ۔۔۔؟"

"نہیں تو کچھ بھی خاص نہیں ہے۔سب ٹھیک ہے۔ پہلے جیسا" نور بانو نے ان کے آگے گرم

گرم کھانا رکھتے ہوئے جواب دیا
" کچھ تو خاص ہے ۔ورنہ گھر میں اتنی خاموشی پہلے کبھی نہیں تھی ۔اب میں کتنے دنوں سے یہ بات محسوس کر رہا ہوں ۔۔۔"
" وہم ہوگا آپ کا ۔۔۔سب کچھ ٹھیک ہے کہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے ۔" انہوں نے تسلی دی
" پھر مجھے کیوں یہ خاموشی چبھ رہی ہے ۔جنت کیوں اداس ہے اتنے دنوں سے ۔"
" بچی ہے نا ۔۔۔سمجھ جائے گی وقت کے ساتھ ساتھ"
" تم لوگ کچھ چھپا رہے ہو مجھ سے ۔مجھے بتانے سے گریز کر رہے ہو نا ۔۔۔"
" تو آپ خود اندازہ کر لیں ایسی کیا بات ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے اتنی خاموشی محسوس ہوئی آپ کو ۔" نور بانو نے آج بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا
" مجھے تو کچھ بھی سمجھ نہیں آرہی ۔۔کیا اندازہ لگاؤں ۔"
وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بھی اندازہ نہیں لگا پائے کہ کیا وجہ ہو سکتی ہے
" آپ کو خوشی کے رشتے کیلئے انکار نہیں کرنا چاہیئے تھا ۔" اس نے آخر کار اصل وجہ بتا ہی دی
" کیا بول رہی ہو تم ۔۔۔اس کا مطلب ہے کہ انہیں جنت کیلئے ہاں بول دینی چاہیئے تھی ۔اور وہ بھی سلطان کے بیٹے کیلئے ۔جس نے تمہیں طلاق دی خوشی کی ماں کیلئے ۔۔۔" زمیندار صاحب حیران رہ گئے ۔انہیں نور بانو سے اس درجے سے حماقت کی توقع بالکل بھی نہیں تھی ۔
" یہ سب نصیب کا کھیل ہوتا ہے ۔خوشی کے باپ نے جو کیا اس میں خوشی کا تو کوئی قصور ہی نہیں ہے ۔اس نے تو ماں باپ کو دیکھا ہی نہیں ۔پھر بھی آپ نے صرف اسی وجہ سے ان لوگوں کو اتنی سنوا دیں ۔ایسا تو نہیں بولنا چاہیئے تھا آپ کو"
" نور بانو تم کس مٹی سے بنی ہوئی ہو ۔۔۔میں آج تک سمجھ نہیں پایا ۔۔۔"
"مٹی سب کی ایک ہی ہوتی ہے ۔آگے یہ خود انسان پر منحصر ہے کہ وہ کیسے گزارتا ہے دنیا میں ۔کیا کیا کچھ کرواتا ہے اس مٹی کے پتلے سے

خوشی بہت چاہتا ہے ہماری جنت کو۔اور میں جانتی ہوں جنت بھی بہت خوش رہے گی خوشی کی سنگت میں۔آپ جس بات کو لے کر خدشات پالے بیٹھے ہیں ایسا بالکل نہیں ہوگا۔وقت ہر بار خود کو نہیں دہراتا۔۔۔"

" جنت میری اکلوتی بیٹی ہے۔اور میں جنت کیلئے اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا۔گاؤں والے کیا سوچیں گے۔یہ بھی سوچا ہے تم نے۔۔۔؟"

" جنت میری بھی اکلوتی بیٹی ہے۔میں نے جنم دیا ہے اسے۔مجھے بھی آپ سے کم پیاری نہیں ہے۔آپ گاؤں والوں کے بارے میں سوچ رہے ہیں کہ وہ کیا سوچیں گے۔وہ جو سوچتے ہیں سوچتے رہیں۔یہ ہم کیوں سوچیں کہ وہ کیا سوچیں گے۔

آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اس رشتے سے برسوں پرانے ٹوٹے رشتے پھر سے جڑ جائیں گے۔محبت پھر جاگ اٹھے گی دونوں گھروں میں۔ماموں نے کتنی امیدوں سے بائیس سال بعد ہمارے گھر میں قدم رکھا۔اور آپ نے پانچ منٹ میں ان کے منہ پر انکار کر کے ان کی ساری امیدیں توڑ ڈالیں۔آپ نے تو سوچنے کا وقت بھی نہیں لیا۔جانتے ہیں آپ کے اس انکار سے امیدوں کے ساتھ ساتھ اور کتنے دل ٹوٹے ہیں۔یہ کیوں نہیں سوچتے آپ۔۔۔؟؟؟"

نور بانو بولنے پر آئی تو بولتی ہی چلی گئی۔زمیندار صاحب کے منہ میں رکھا لقمہ وہیں رہ گیا تھا۔وہ اسے چبا کر نگلنا ہی بھول گئے۔اس سے پہلے ان کی پوری زندگی میں نور بانو کبھی اتنا نہیں بولی تھی۔

وہ تو ہمیشہ خاموش اور رضامند رہنے والی عورت تھی کبھی کوئی شکایت نا کرنے والی۔مگر زمیندار صاحب نہیں جانتے تھے کہ وہ اس کی اپنی زندگی تھی۔اور یہ اس کی بیٹی کی زندگی کا معاملہ تھا۔ایک عورت ہونے کے ساتھ ساتھ اسے ایک ماں کا کردار بھی نبھانا تھا سو وہ آج چپ نہیں رہی

" وہ محبتوں سے گندھے ہوئے لوگ ہیں سب۔ایک سلطان کو نشانہ بنا کر ان سب کی شریفانہ زندگی پر سوال اٹھانا نا انصافی ہوگی۔میں جانتی ہوں جنت وہاں بہت خوش رہے گی۔وہ لوگ میرے اپنے ہیں جیسے مجھے پیار دیتے تھے جنت کو وہاں مجھ سے بڑھ کر پیار ملے گا۔کیونکہ اس رشتے کی وجہ سے سب بچھڑے رشتے پھر سے ایک ہو جائیں گے۔

جنت کا کیا ہے۔وہ بیٹی ہے۔ہم اسے جس کے بھی پلو باندھ دیں گے وہ خاموشی سے بندھ جائے گی۔ہونٹ سی لے گی۔کبھی شکایت نہیں کرے گی مگر یہ ظلم ہو گا ناانصافی ہو گی جنت کے ساتھ۔اگر وہ ہماری مرضی پر سر جھکا سکتی ہے۔ہمارا سر اونچا رکھنے کیلئے اپنی خواہشوں کا گلہ گھونٹ سکتی ہے تو ہمیں بھی اپنا حق ادا کرنا چاہیے۔اس کی رضامندی لینی چاہیے۔اس سے اس کی پسند پوچھنی چاہیے۔"

نور بانو کی باتوں نے زمیندار صاحب کے کان کھول دیئے تھے۔آج وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔دل ہی دل میں خود سے اقرار کیا کہ ہاں واقعی میں غلط کرنے جا رہا تھا۔شکر ادا کیا کہ نور بانو نے آج اس کے سامنے بہت سے راستے کھول دیئے تھے وہ راستے جو اسے کھلی آنکھوں سے بھی نظر نہیں آئے تھے

☆......☆......☆

پل پر ہنگامہ سا مچ گیا تھا۔کچھ لوگوں نے پانی میں کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز سنی تو جلدی سے جھک کر نیچے دیکھا۔مگر انہیں کچھ بھی نظر نا آیا۔سوائے پانی کی لہروں میں گول گول بنتے دائروں کے۔اور ایک کالا بیگ جو ستون کے اوپر کھلا پڑا تھا۔

پل پر موجود لوگوں کو بس ایک گمان ہوا تھا کوئی انسان ہی گرا ہے

اسی اثنا میں کسی نے ریسکیو پولیس کو کال ملا دی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں ریسکیو پولیس کی گاڑیاں سائرن بجاتی پل پر پہنچ گئیں۔

ایک دو بندوں سے پوچھا گیا مگر کوئی بھی یقین سے نہیں بتا سکا کہ پانی میں کیا گرا ہے۔ستون پر خالی پڑے کالے بیگ کو دیکھ کر قوی اندازہ لگایا گیا کہ کسی نے پانی کے اندر چھلانگ لگا کر خودکشی کی ہے۔

کیونکہ اگر کوئی اچانک سے گرا ہوتا تو ستون پر یوں خالی بیگ پڑا دکھائی نا دیتا

ریسکیو پولیس کی کشتیاں پانی کے اندر ڈال دی گئیں۔اور پونے گھنٹے کی لگاتار کوشش کے بعد لندن ریسکیو پولیس کے ماہر تیراک ڈیڈ باڈی نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ڈیڈ باڈی شکل سے ہی کسی ایشیائی مرد کی نظر آ رہی تھی۔

جب سلطان کی ڈیڈ باڈی نکالی گئی تو اس کے چہرے پر ماسک ابھی تک چڑھا ہوا تھا اور بایاں ہاتھ بھی بائیں پاؤں کے ساتھ رسی سے بندھا تھا۔ پولیس کو اندازہ ہوگیا کہ خودکشی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی گئی ہے۔ تاکہ بچنے کا کوئی بھی چانس باقی نا رہے۔

ارحم جب اپنی گاڑی پر پل پر پہنچا تو تب تک پولیس ڈیڈ باڈی نکال کر پوسٹ مارٹم کیلئے لے جا چکی تھی سو اس نے بھی گاڑی کا رخ پولیس سٹیشن کی طرف موڑ دیا۔

پولیس والوں نے اپنی ضروری کاروائی اور کچھ تفتیش کر کے قریب دو گھنٹے بعد سلطان کی ڈیڈ باڈی اس کے حوالے کر دی۔ وہ آتے ہوئے اپنے ساتھ ڈیڈ کا آئڈنٹٹی کارڈ، پاسپورٹ اور کینسر کی تمام رپورٹس بھی ساتھ لایا تھا۔ جب کاروائی کے دوران اس سے سلطان کی خودکشی کی وجہ پوچھی گئی تو ارحم نے سیدھی کہانی سنا دی کہ سلطان پچھلے چار پانچ ماہ سے بلڈ کینسر میں مبتلا تھے۔ اور اس بات کا انہوں نے کسی دوسرے کو علم تک نہیں ہونے دیا۔ سو روز روز مرنے سے انہوں نے ایک بار ہی موت کو گلے لگانا بہتر سمجھا۔ پولیس کے پاس اب یقین کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس طرح لاتعداد کیسز وہ پہلے ہی بھگتا چکے تھے۔ سو ایمبولینس میں اس کے ساتھ سلطان کی ڈیڈ باڈی بھجوا دی گئی۔۔

سلطان کو مسلم قبرستان میں دفناتے ہوئے ارحم کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ مگر اگلے پل اس نے رومال سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ ڈیڈ کی ریکارڈڈ آواز ابھی بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

" ارحم تم نے رونا نہیں ہے۔ خود کو مضبوط رکھنا ہے۔ رونا بالکل نہیں ہے۔ اگر تم روئے تو مجھے وہاں بہت تکلیف ہوگی۔"

ارحم نے سارے آنسو پونچھ ڈالے۔ آنسو اب بھی گر رہے تھے مگر کہیں اندر کسی اور راستے سے دل پہ گر رہے تھے۔

اس نے آنکھوں پر باڑ لگا دی کہ کوئی آنسو باہر نا آنے پائے۔ مگر پانی رکتا کہاں ہے۔ پانی چاہے آنکھ کا ہو یا کسی دریا، ندی کا۔ اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے۔

جنازے میں اس کے کمیونٹی کے جان پہچان والے سلطان کے دوستوں کے ساتھ ساتھ ارحم کو

دلاسہ دینے کیلئے اس کے نانا اسد حسین صاحب اور کبیر صاحب بھی موجود تھے۔

وہ واپس گھر آ گیا۔حمیدہ خالہ ابھی تک گھر میں سلطان کو یاد کر کے رو رہی تھی ۔ارحم نے اسے بھی رونے سے منع کر دیا۔

وہ اندر چلا گیا۔اپنے کمرے میں ۔کل ڈیڈ کے ساتھ کی گئی شاپنگ والے سارے شاپنگ بیگ ابھی تک ویسے ہی بند پڑے تھے اس نے سارے شاپر کھولے ۔ایک ایک چیز نکالی جو کل ڈیڈ نے اسے دلائی تھی۔

ساری شاپنگ میں سوائے حمیدہ خالہ کے ایک سوٹ کے باقی ساری چیزیں ارحم کی تھیں۔

" (ڈیڈ آپ زیادتی کر رہے ہیں ۔آپ اپنے لیئے بھی تو کچھ لیں نا"

" اگر اگلی بار کبھی زندگی میں ایک ساتھ شاپنگ کرنے آئے تو ساری شاپنگ میں اپنے لیئے کروں گا اور وہ بھی تمہارے خرچے سے ۔۔")

سارے کپڑے کوٹ شوز گٹار باہر نکالتے ہوئے اسے باپ کی بات یاد آئی ۔ارحم کو اب معلوم ہوا کہ سلطان نے صرف اس کیلئے کیوں اتنی ساری چیزیں خریدی تھیں ۔اپنے لیئے کیوں کچھ نہیں خریدا۔

اپنی چیزیں اگلی بار پر کیوں چھوڑ دیں ۔کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ اگلی بار کبھی نہیں آئے گی ۔کیونکہ اب اس کے وجود کو ان زیبائش کی مادی چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی انہوں نے اپنے وجود کو ہمیشہ کیلئے مٹی میں اوڑھ لینا تھا۔

اس نے ساری چیزیں کمرے میں بکھیر دیں ۔اور خود بھی کمرے کے فرش پر گھٹنے کے بل بیٹھ گیا ۔کافی دیر گزر گئی وہ یونہی بیٹھا رہا کمرے کے درمیان میں ۔ایک ہی نقطے پر نظریں مرکوز کیئے۔

وہ رونا چاہتا تھا۔بہت زیادہ رونا چاہتا تھا چیخ چیخ کر رونا چاہتا تھا اس گھر کے در و دیوار کو رو رو کر ہلا دینا چاہتا تھا۔مگر وہ نہیں رو سکتا تھا سلطان جاتے جاتے اس کے رونے پر بھی پابندی عائد کر گئے تھے۔

پھر وہ فرش سے اٹھا۔اسے اب اٹھنا ہی تھا سب کچھ اب خود کرنا تھا

اب یہاں اس کے سارے سہارے ختم ہو چکے تھے ۔اسے اپنا سہارا خود بننا تھا۔خود سب کچھ کرنا

تھا۔سب سے پہلے اٹھ کر حمیدہ خالہ کا سوٹ اس کے حوالے کیا۔جو سوٹ لیتے ہوئے چھلک پڑی تھیں۔

اور پھر آگے کی پلاننگ کرنے لگا۔ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ساری رقم نکلوانی تھی پاسپورٹ بنوانا تھا۔پاکستان جانا تھا۔ڈیڈ کی آخری خواہش پوری کرنی تھی۔ان کے زمے قرض چکانے تھے۔بہت سے محبتوں کے قرض،بہت سے رشتوں کے قرض

☆......☆......☆

" ارحم ۔۔۔تم ہماری اس آرٹ اکیڈمی کے سب سے قابل سٹوڈنٹس میں سے رہے ہو۔اور میں نہیں جانتا کہ تم نے اپنے فن کو مزید نکھارنے کی بجائے ترک کیوں کر دیا ہے۔۔۔"

وہ آج کافی عرصہ بعد دوبارہ اپنی آرٹ اکیڈمی آیا تھا۔کلاس کی ٹائمنگ ختم ہو چکی تھی سو وہ سر جانسن کے پاس ان سے ملنے آفس میں ہی آگیا

" سر۔۔۔پچھلے کچھ عرصے میں میری زندگی میں چند ایسے موڑ آئے ہیں کہ میں مفلوج ہو کے رہ گیا ہوں ۔اور اب اس سٹیج پر ہوں کہ میرے ہاتھوں میں کچھ بھی نہیں ہے ۔میں نے خود کو حالات کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا ہے۔مزاحمت چھوڑ دی ہے۔چاہے جس طرف بھی لے جائیں۔"

ارحم نے سر سے کچھ بھی مخفی نہیں رکھا۔سب کچھ کہہ سنایا

" بہت افسوس ہے مجھے ارحم کہ میں تمہارا غم نہیں بانٹ سکتا۔تمہارے دکھ کم نہیں کر سکتا۔مگر بطور ٹیچر ایک مشورہ ضرور دوں گا کہ کبھی بھی خود کو حالات کے حوالے نا چھوڑو۔ہمیشہ ہاتھ پاؤں مارتے رہنا۔مزاحمت ہمیشہ جاری رکھنی چاہیئے۔حقیقت میں انسان مفلوج تب ہوتا ہے جب وہ مزاحمت کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا کہ تم اپنے ڈیڈ کی آخری خواہش پوری نا کرو۔ضرور پوری کرو۔ایک اچھے بیٹے کی حیثیت سے کرنی بھی چاہیئے۔مگر خود کو ایکسپلور کرتے رہو۔تمہارے اندر بہت زیادہ فن ہے۔قدرتی ہنر ہے۔اسے سنوارتے رہو۔ورنہ یہ گہنا جائے گا۔۔۔"

ساری داستان سننے کے بعد سر جانسن کو بھی اس کی زندگی میں آنے والی ٹریجڈیز سن کر بہت دکھ ہوا۔وہ اس کا سب سے قابل سٹوڈنٹ رہا تھا اور وہ بالکل نہیں چاہتے تھے کہ ارحم اپنے فن کو بھول جائے

اسے ترک کر دے تو چہ نا دے۔

ارحم ابھی تک ان کے سامنے اسی پہلی پوزیشن میں چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا

" ارحم میں اکثر کہتا رہتا ہوں کہ زندگی کے دکھوں اور پریشانیوں سے لڑنا اور انہیں جھیلنا ہی اصل آرٹ ہے۔

خود کو وقت کے حوالے نا کرو۔وقت کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالو۔غم قسمت میں لکھ دیئے گئے ہوں تو گھبراؤ مت ہنس کر انہیں گلے سے لگاؤ ان کا خیر مقدم کرو۔تاکہ غم اور دکھ بھی سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ یہ ہمارا پالا کس انسان سے پڑا ہے۔یہی حقیقی آرٹ ہے۔زندگی میں آنے والے دکھوں، تکلیفوں اور پریشانیوں کا ہنس کر مقابلہ کرنا ان کے سامنے سینہ تان کر ثابت قدم کھڑے رہنا ہی اصل آرٹ ہے۔

انسان اگر کبھی ان سب سے تھک ہار کر گر پڑے تو گر کر دوبارہ اٹھنا اور اپنے قدموں پر کھڑے ہونا ہی حقیقی آرٹ ہے

اور مجھے یقین ہے ارحم تم کبھی ان سب سے نہیں گھبراؤ گے کیونکہ تم ایک حقیقی آرٹسٹ ہو۔ایک پیدائشی آرٹسٹ"

سر جانسن کی باتوں نے اسے کافی حوصلہ دیا تھا۔ایک لمبی نشت کے بعد وہ گھر واپس آگیا تھا۔

رات میں اسد صاحب اسے لینے کیلئے آگئے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ اب ارحم کو اس طرح اکیلے گھر میں بالکل نہیں رہنا چاہیئے۔بلکہ ان کے ساتھ چل کے ان کے اپنے گھر رہنا چاہیئے مگر ارحم نے ان کے ساتھ چلنے سے معذرت کرلی تھی۔

اور انہیں اپنی آگے کی پلاننگ بھی بتائی جو وہ پاکستان جانے کے متعلق سوچ رہے تھے۔اسد صاحب تو ارحم کے خیالات جان کر ہی حیران ہو گئے بلکہ اس کی بیوقوفی پر بھڑک ہی اٹھے۔وہ ارحم کو پاکستان جانے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتے تھے۔انہیں خدشات تھے کہ ارحم پاکستان جا کر سوائے اپنا فیوچر برباد کرنے کے اور کچھ بھی نہیں کر سکے گا اور یہ کہ پاکستان ایک بالکل ان سیکیور ملک ہے جہاں شہری حقوق کی پامالی کی جاتی ہے۔وہاں انسانی زندگی لندن کی زندگی سے پچاس سال پیچھے ہے۔

مگر ارحم مصمم ارادہ کر چکا تھا وہ ایک میچور لڑکا تھا اور اپنا برا بھلا جان سکتا تھا اسے اپنے فیصلے لینے کا مکمل اختیار حاصل تھا سو نا چاہتے ہوئے بھی اسد صاحب کو ارحم کی ضد کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑ گئے۔

پاسپورٹ بن چکا تھا۔ ایک ہفتے بعد اسے لندن کو خدا حافظ کہنا تھا۔

آج کچھ فرصت ملی تو وہ ایک بار پھر اپنی چھوٹی سی گیلری میں آبیٹھا۔

کینوس پر نگاہ پڑتے ہی اس کے قدم خود بخود اس کینوس کی جانب بڑھ گئے۔

برش اٹھایا مگر سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آج وہ کیا بنائے۔ تھوڑی دیر ہاتھوں میں برش پکڑے یہی سوچتا رہا کہ کینوس پر کیا اتارے۔ کوئی خواب، کوئی چہرہ، کوئی قدرتی منظر، کوئی آبشار، جھیل، سمندر میں اترتا سورج، گھروں کو لوٹتے پنچھی، کیا بنائے۔ خیالات بھٹک رہے تھے دل و دماغ کسی بھی ایک چیز پر متفق نہیں ہو رہے تھے یہ سب چیزیں وہ پہلے بھی پینٹ کر چکا تھا۔

اور کافی دیر سوچنے کے بعد اس کے ہاتھوں میں حرکت ہوئی اور کینوس پر رنگ بکھرنے لگے۔ پینتیس منٹ بعد اس نے تصویر مکمل کر لی تھی۔ کینوس پر اس کے سامنے ممی پاپا دونوں ایک ساتھ بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

تصویر مکمل ہو گئی تھی۔ دل و دماغ میں سکون اتر آیا تھا شاید اس سے پیاری تصویر اس نے پہلے کبھی نہیں بنائی تھی۔ یہ تصویر اسے ان سب تصاویر سے قیمتی اور خوبصورت محسوس ہوئی جو اس نے آج تک بنائی تھی۔

تصویر مکمل ہونے کے بعد اسے یہ بھی اطمینان ہو گیا کہ اس کے ہاتھوں میں ابھی بھی جادو موجود ہے۔ وہ بھولا کچھ بھی نہیں ہے۔

یہ تصویر ارحم نے گیلری میں باقی کولیکشن کے ساتھ رکھنے کی بجائے اپنے سامان کے ساتھ سنبھال کے رکھ لی۔ ہمیشہ اپنے پاس رکھنے کیلئے۔۔۔

☆......☆......☆

"کہاں گم رہتے ہو تم ارحم۔۔۔؟ اب تو میسر ہی نہیں ہوتے تمہیں۔" پانچویں دن وہ کوکب کے اصرار پر اس سے ملنے نزدیکی پارک آیا تھا

آتے ساتھ ہی ہمیشہ کی طرح کوکب کی شکایتیں شروع ہو گئی تھی
"اپنے آپ میں۔۔۔" اس نے تین لفظی جواب دیا
"اور بھی تو لوگ ہیں تمہارے آس پاس۔ باقی دنیا بھی تو ہے۔" اس نے اپنی طرف مبہم سا اشارہ دیا
"پہلے خود کو تو فرصت سے دیکھ لوں۔ باقی دنیا کو بھی دیکھ لوں گا۔۔"
"ارحم تم خود کو اتنا اکیلا مت کرو میں تمہارا دکھ سمجھ سکتی ہوں میں برابر کی شریک ہوں تمہارے ساتھ۔۔ میرے بس میں ہوتا تو تمہارے سارے دکھ اپنے حصے لکھ لیتی" کوکب اس کے حالات کو دل سے محسوس کرتی تھی
"کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا کوکب۔ یہ سب باتیں ہوتی ہیں صرف۔ جس پر گزرتی ہے وہی سمجھ سکتا ہے بس۔"
اس کی تلخ باتیں کوکب کا دل چیرتے گزر گئیں
"ایسا کیسے کہہ سکتے ہو تم۔ کسی کے خلوص اور سچائی کو اس طرح تو نہیں دھتکارا جاتا۔" کوکب کو سچ میں ارحم کے الفاظ سے دکھ پہنچا
"کیا کروں کوکب۔۔ بہت تلخ ہو گیا ہوں۔ مجھ سے اب زبان پر شیرینی کی تہہ نہیں چڑھائی جاتی۔"
"کچھ بھی کرو۔۔۔ بس صرف خود کو اکیلا مت چھوڑو۔ خود کو اکیلا مت کرو۔ اس بھیڑ بھاڑ میں اور کوئی تمہارے ساتھ ہو یا نا ہو۔۔۔ کوکب کبیر ہمیشہ تمہارے ساتھ کھڑی ہو گی۔ ہر جگہ ہر موڑ پر۔" آج اس نے سب کہہ دیا۔
تمہارا شکریہ کوکب۔۔۔ تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا۔ مگر اب ایسا کوئی موڑ نہیں آئے گا کیونکہ اب کھونے کو کچھ بچا ہی نہیں ہے۔"
وہ چپ ہو گئی۔ کچھ بھی نا بولی۔ سچ ہی تو کہا تھا ارحم نے اس کے پاس اب کھونے کو کچھ بھی تو نہیں بچا تھا۔
"مگر میں تمہیں کبھی نہیں نہیں کھونا چاہتی۔ تمہارے پاس واقعی کچھ بھی نہیں بچا۔ مگر میرا سب کچھ

تم ہو ارحم۔آج میں اقرار کر رہی ہوں خود سے"

کوکب نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اپنا دل اس کے سامنے کھول کے رکھ دیا۔"

کوکب۔۔۔میں یہ سب افورڈ نہیں کرسکتا اب۔بہتر ہے کہ تم اپنی چاہتیں کسی ایسے شخص پر نچھاور کرو جو تمہاری چاہت سنبھال سکے۔اس کی قدر کرسکے۔میں تمہارے جذبوں کی قیمت نہیں چکا پاؤں گا۔تم ایک بہت اچھی لڑکی ہو اور تم اپنے جیسا ہی بہترین انسان ڈیزرو کرتی ہو۔۔۔اور اس موڑ پر آپہنچا ہوں کہ میں تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکتا۔۔۔"

اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا

"میں نے قیمت مانگی کب ہے ارحم۔۔۔یہ میرے جذبے تمہارے لیئے بے مول ہیں"

"مجھے اپنی ذات کا کچھ بھروسہ نہیں ہے کوکب۔۔تم انہیں سنبھال کر رکھو۔"

وہ جانتا تھا کہ کوکب کا دل توڑ رہا ہے۔ایک وہی تو تھی ہمیشہ اس کا ساتھ دینے والی۔مگر وہ اسے کسی دلاسے کسی امید میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔اسے دو دن بعد یہاں سے جانا تھا ہمیشہ کیلئے۔وہ خود کو کسی کمزور لمحے کے سپرد نہیں کرنا چاہتا تھا

ناہی کسی کو جھوٹے وعدوں کی انگلی تھما کر ہمیشہ کیلئے انتظار کی سولی پر چڑھانا چاہتا تھا۔سو اس نے کسی بھی جھوٹی تسلی سے گریز کیا

کوکب کا چہرہ بے رنگ ہو گیا۔اس کا دل کسی گہری کھائی میں جا گرا جیسے

"ہم ہمیشہ اچھے دوست تو رہ سکتے ہیں پہلے کی طرح۔۔۔"تھوڑی دیر خاموشی کے بعد وہ دوبارہ بولی تھی۔وہ اسے سرے سے کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی کسی نا کسی رشتے سے ارحم کے ساتھ ہمیشہ جڑے رہنا چاہتی تھی

"ہاں ہم ہمیشہ دوست رہیں گے۔پہلے کی طرح۔اچھے دوست۔ہر موڑ پر ایک دوسرے کا ساتھ دینے والے۔"اس بار ارحم نے اس کا دل رکھ لیا تھا۔

اپنے حالات کے ہاتھوں مجبور سہی مگر اتنا بھی پتھر دل نہیں تھا وہ۔اگر حالات مختلف ہوتے تو محبت نا سہی مگر اس سے پیار کرنے والی اس پرخلوص لڑکی کو شاید وہ اپنا بھی لیتا۔لیکن حالات مختلف ہوتے

تب نا

وہ دونوں کافی دیر ساتھ بیٹھے رہے۔گفتگو جاری رہی مگر ارحم نے اسے بالکل بھی یہ نہیں بتایا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔دو دن بعد وہ لندن چھوڑ رہا ہے۔وہ محبتوں سے گندھی اس ہنس مکھ لڑکی کو مزید اداس نہیں کرنا چاہتا تھا

دو دن پلک جھپکنے میں گزر گئے۔۔اور لندن چھوڑنے کا دن آپہنچا۔اس نے اپنا سامان پیک کیا۔کپڑے،جوتے،کوٹ،اپنے ہاتھ سے بنائی گئی چند خوبصورت تصاویر،گٹار،بانسری،ڈیڈ کا کچھ ضروری سامان،ان کی آخری ریکارڈڈ آڈیو کیسٹ سب کچھ۔گاڑی وہ تین دن پہلے بیچ کے رقم اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر چکا تھا

خالہ حمیدہ سے پیار لیا۔انہیں معقول رقم دے کر ہمیشہ کی چھٹی دی۔ایک آخری نظر اپنے سارے پرگھر پر ڈالی۔ایک ایک کمرے میں جا کے اس گھر سے وابستہ یادوں کو اللہ حافظ کہا اور ہیتھرو ایئرپورٹ کی طرف چل دیا

☆......☆......☆

رنگا رنگ کہانیوں سے سجا، خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اُردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ) کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجئے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ابھی sohnidigest@gmai.com پر ای میل کریں۔

بائیسواں حصہ

آج آسمان صاف تھا۔سورج اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا۔یہ اکتوبر کے اوائل دن تھے۔گرمیاں آہستہ آہستہ دبے پاؤں واپس جارہی تھیں۔لیکن پھر بھی دن کو سورج کافی گرمی برساتا تھاہاں راتیں ضرور ٹھنڈی ہوگئی تھیں۔رات کو دریا کی طرف سے چلنے والی ہوا میں دریا کی نمی بھی شامل ہوجاتی تو سردی کا احساس بھی زیادہ ہوتا تھا۔

خوشی ناشتہ کرنے کے بعد کافی دیر گھر میں رہا پھر اکتاہٹ دور کرنے کیلئے کھیتوں کی طرف نکل آیا۔کھیتوں کے درمیان بنی چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر خراماں خراماں چلتے وہ بغیر ارادتاً جنت کے ابا کی زمینوں تک آپہنچا۔زمیندار صاحب کی زمینوں پر فصل پورے جوبن سے لہلہارہی تھی۔بیری کے درخت تلے جنت اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی باتوں میں مصروف تھی۔کھلے اور پرسکون ماحول کی وجہ سے آہستہ آہستہ چلنے والی ہوا بھی طبیعت کو فرحت بخش رہی تھی

"آؤ خوشی۔۔۔بڑے دنوں بعد دکھائی دے رہے ہو۔کیسے آنا ہوا۔۔۔؟" بیری کے درخت تلے بیٹھی نور بانو نے خوشی کو دیکھتے ہی پہلا شکوہ کیا

جانے کیوں اسے اس لڑکے سے عجیب سی انسیت تھی۔شاید اس کے باپ سے۔بہت پہلے کی جانے والی محبت کے اثرات ہی تھے یہ۔محبت کے جرثیم تاعمر وجود میں باقی رہتے ہیں۔انسان کسی بھی بڑے سے بڑے طب کے ماہر سے علاج کروالے مگر یہ محبت ہمیشہ لا علاج ہی رہتی ہے تاعمر۔۔۔

"ایسے ہی پھپھو بس طبیعت ذرا اداس تھی تو ہوا لگوانے کھلے میں نکل آیا کھیتوں کی طرف۔" اس نے درخت تلے پہنچ کر رسمی سلام دعا کے بعد سادہ سے لہجے میں جواب دیا

نور بانو کے ساتھ بیٹھی جنت جانے کیوں خود میں سمٹنے لگی۔

آج زمیندار صاحب بھی کسی ضروری کام سے نزدیکی شہر گئے ہوئے تھے۔

"اچھا ہے کسی بہانے ہی سہی آج تمہیں دیکھنا تو نصیب ہوا۔ایک ماہ ہونے کو آیا ہے اور تم مڑ کے واپس ہی نہیں آئے۔۔۔"

"ہاں پھپھو۔۔۔بس زندگی ہے کہ بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑے چلی جا رہی ہے۔سمجھ ہی نہیں کچھ نہیں آتا کہ کس سمت جانا ہے اور کس سمت نہیں۔۔"

"اس سے پہلے کہ زندگی کے گھوڑے کی رفتار مزید تیز ہو اور وہ بے سمت سرپٹ بھاگنے لگے انسان کو اپنی سمت پہلے ہی متعین کر لینی چاہیئے۔" نور بانو نے خوشی کو سمجھایا

"اور اگر سمت کا انتخاب اختیار میں ہی نا ہو پھر۔۔۔؟"

"خوشی مختار کل تو وہی ایک زات ہے۔سارے اختیار اسی ایک زات کے پاس ہیں۔مگر اس نے بندے کے سامنے بہت سی راہیں کھول دی ہیں۔اور بندے کو انتخاب کا اتنا حق ضرور دے رکھا ہے کہ وہ ان بہت سی راہوں میں سے ایک صحیح راہ چن لے۔ایک صحیح راہ کا انتخاب کر لے۔۔"

"اب بتاؤ طبیعت کیوں اداس تھی۔۔۔؟" وہ کچھ نا بولا تو نور بانو نے ایک اور سوال کر دیا

"پتا نہیں پھپھو۔۔۔عجیب سی گھٹن ہو رہی تھی۔حبس سی بڑھ رہی تھی اندر۔سوچا یہاں تو کھلی ہوا ہو گی۔۔۔صاف ستھری۔آلودگی اور کثافتوں سے بالکل پاک۔۔۔شاید روح کو تازگی مل جائے جائے کچھ۔۔۔"

"ہاں صحیح کہہ رہے ہو۔۔۔ہوا تو کثافتوں اور آلودگی سے پاک مل جاتی ہے مگر ڈھونڈنے سے بھی آجکل کوئی ایسا انسان نہیں ملتا جو کثافتوں اور آلودگی سے پاک ہو۔"

"صحیح کہتی ہیں آپ۔۔۔ہمارے اندر کی کالک ہی تو ہے۔جو ہمارے رستے کھوٹے کر رہی ہے۔۔۔"

"ہاں انسان کا کیا دھرا اس کے سامنے تو ضرور آتا ہے ہر حالت میں۔ہمارے اعمال ہی ہماری پہچان کا باعث بنتے ہیں۔۔۔"

وہ چپ ہو گیا۔مزید کوئی سوال نہیں کیا۔تھوڑی دیر رسمی باتیں چلتی رہیں۔گھر کی، گھر والوں کی۔کچھ

دیر بعد نور بانو دھوپ میں رکھے گھاس کے ایک گٹھڑ کو اٹھا کر بیری کے درخت تلے چھاؤں میں رکھنے کیلئے ان دونوں کے بیچ سے اٹھ کر چلی گئی ۔کچھ دیر کیلئے سہی ان دونوں کو ایک ساتھ باتیں کرنے کا وقت مل گیا تھا

"کیسی ہو جنت ۔۔۔" خود میں سمٹی بیٹھی جنت سے اس نے پہلا سوال کیا

" اچھی ہوں ۔تم کیسے ہو ۔"

" دریا کا کنارہ بہت اداس ہو گیا ہے ۔کافی دن سے تم آئی نہیں تو تمہیں یاد کر رہا تھا" اس نے جنت کی بات کا جواب نہیں دیا

" اسے کہنا جنت کہہ رہی تھی کہ کنارے کبھی اداس نہیں ہوتے ۔کنارے اداس ہو گئے تو پانی کی ان موجوں کا کیا بنے گا جو ہر وقت اس سے سر ٹکرانے آجاتی ہیں ۔۔۔"

" موجوں کا کنارے سے ٹکرانا ان کے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے ۔اس سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کنارہ اداس ہے یا خوش ۔۔۔وہ تو بس اپنی ازلی روانی سے آتی ہیں اور ٹکرا کے چلی جاتی ہیں ۔۔۔"

" وہ موجیں ہیں خوشی ،لہریں ہیں پانی کی ۔آتی ہیں ٹکراتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں ۔میں انسان ہوں ۔لڑکی ہوں ،احساس رکھتی ہوں ۔میں کبھی نہیں ٹکرا سکتی نا کناروں سے اور نا ہی رشتوں سے ۔

مجھے کچھ بیڑیوں نے جکڑا ہوا ہے ۔قسمت سے چاہ کر بھی نہیں لڑ سکتی ۔"

"تم مت ٹکراؤ جنت ۔۔۔مگر اس طرح بھی تو نا کرو ۔۔۔میں بہت اداس ہو گیا ہوں ۔۔۔"

"تو تم کیا سمجھتے ہو میں خوش ہوں ۔۔۔؟"

جنت نے آج اس کی آنکھوں میں دیکھ کر جواب دیا تھا ۔لہجہ ہی ایسا گھائل تھا کہ وہ کچھ مزید بات کر ہی نا سکا ۔۔۔

اس کے دل میں سر اٹھاتے سارے خدشے اپنی موت مرنے لگے ۔وہ جان گیا اس کی محبت کو مجبوریوں کی بیڑیوں نے جکڑا ہوا ہے ۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ لوگ اپنی محبت کیلئے باغی کہلائے جائیں صرف اپنی خوشی کیلئے دو گھرانوں کو برباد کر ڈالیں اور ہمیشہ کیلئے اپنے ماتھے پر کلنک لگوا لے ۔اسے بس اپنا

نصیب آزمانا تھا۔

اب یہ خدا کو ہی معلوم تھا کہ وہ اپنا نصیب آزما رہا تھا یا اس کا نصیب اسے آزمانے پر آیا ہوا تھا۔۔۔؟

"میں پھر بھی تمہارا انتظار کروں گا۔ وہیں اسی دریا کنارے جو ہمارا ہمیشہ سے ساتھی رہا ہے۔ ہمیشہ سے خاموش گواہ رہا ہے۔ دریا کی موجوں سے شرط لگا آیا تھا کہ جنت پھر سے یہیں آئے گی۔ اسی کنارے میرے ساتھ اپنے پاؤں بھگونے۔۔۔ مجھے دریا کے سامنے شرمندہ مت ہونے دینا مجھے ہارنے مت دینا جنت۔۔۔"

خوشی اسے وہیں مخمصے میں چھوڑ کر رکا نہیں۔ واپس چلا گیا۔ جنت کو اس کے جاتے ہی گھٹن محسوس ہونے لگی۔ آہستہ چلتی ٹھنڈی ہوا بھی اپنا اثر کھو چکی تھی

"خوشی واپس چلا گیا۔۔۔؟" تھوڑی دیر بعد گھاس کا گھٹڑ اٹھائے نور بانو درخت تلے واپس پہنچی تو اداس بیٹھی جنت سے سوال کیا

"ہاں اماں۔۔۔ واپس چلا گیا۔" ایک لمبی سانس خارج ہوئی تھی۔

"وابستگیاں بہت تکلیف دہ ہوتی ہیں نا جنت۔۔۔ بہت عذاب دیتی ہیں جان کو۔"

"بات وہی ساری اختیار کی ہی تو ہوتی ہے اماں۔ اختیار میں ہو تو انسان وابستگیاں رکھے ہی کیوں"

"جنت تم میرے کلیجے کا ٹکڑا ہو۔ میں تمہارے لیئے ہر وہ لڑائی لڑوں گی جو میرے لیئے لڑنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں چاہتی ہوں میری بیٹی وہ عذاب کبھی نا سہے جو میں نے سہے تھے۔ میرے پاس ماں نہیں تھی تمہارے پاس ماں ہے۔۔۔ تمہارے لیئے لڑنے والی ماں موجود ہے۔ میری ممتا تمہارے لیئے لڑے گی نصیب سے بھی اور زمیندار صاحب سے بھی"

نور بانو نے جنت کو تسلی دی۔ اس کے بس میں نہیں تھا ورنہ جنت کے سارے دکھ اپنے ذمے لے لیتی۔ اپنے کھاتے میں لکھوا دیتی۔ بس میں ہی تو نہیں ہوتا۔ ورنہ دنیا کی ہر ماں اپنی ساری اولاد کے غم اپنے اوپر لے لیتی۔ چاہے اولاد کس قدر ہی گناہوں بھری کیوں نا ہو۔

"اماں جب لڑائی قسمت سے ہو تو لڑنے کا فائدہ کچھ نہیں ہوتا

انسان لڑتے لڑتے صرف خود کو تھکا دیتا ہے۔شکست اس کے حصے میں لکھ دی گئی ہوتی ہے۔فتح تو ہمیشہ نصیب کی ہوتی ہے۔حاصل تو پھر بھی کبھی کچھ نہیں ہوتا۔"

"جنت۔۔۔لڑنے والا کبھی نہیں ہارتا یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔اسے کبھی شکست نہیں ہوتی۔وہ یا جیت جاتا ہے یا لڑ کر مر جاتا۔اسے کبھی شکست نہیں ہوتی۔شکست صرف اسے ہوتی ہے جو لڑنا چھوڑ دیتا ہے۔ہار مان لیتا ہے۔مگر میں تمہارے لیئے لڑوں گی۔اپنی طاقت سے زیادہ لڑوں گی۔اتنی آسانی سے تمہیں کبھی نہیں ہارنے دوں گی۔"

☆......☆......☆

ایک لمبی فلائٹ کے بعد اس نے پاکستان کی سرزمین پر اپنا پہلا قدم رکھا تھا۔یہاں ایئر پورٹ لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ جیسا نا سہی پھر بھی اچھا تھا۔ایئر پورٹ سے باہر نکل کر ٹیکسی پکڑی اور کراچی بس سٹینڈ پر آپہنچا۔اسے بس اڈے کی حالت زار اور اس قدر شور وغل دیکھ کر عجیب سی حیرت ہوئی۔بسوں کی دھکم پیل برداشت کرتا ایک لمبے اور تھکا دینے والے سفر کے بعد وہ شاہ والی آپہنچا۔

یہ شاہ والی تھا۔اس کے ڈیڈ کا گاؤں۔دریا کنارے بستا گاؤں۔پسماندہ سہی مگر اسے اب یہیں جینا تھا اسی ماحول میں۔انہی لوگوں کے بیچوں بیچ۔ایڈریس اس کے ہاتھوں میں تھا۔آتے جاتے لوگوں سے پوچھتے پوچھتے بالآخر وہ اپنے بابا کے گھر کے قریب آپہنچا۔شاہ والی کے سادہ لوح لوگ اس خوبصورت اور پینٹ شرٹ میں ملبوس، آنکھوں پر گلاسز لگائے ایک بیگ کندھے سے لٹکائے دوسرا ہاتھوں میں اٹھائے اس اجنبی لڑکے کو دیکھ کر حیرتوں میں مبتلا تھے۔

ایک لڑکا اسے دین محمد کے گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔

"یہ مجھے دیں صاحب۔میں اٹھا لیتا ہوں۔۔۔" گیارہ سالہ لڑکے نے راستے میں اسے اپنی مدد کی پیشکش کی

"نہیں۔۔میں ٹھیک ہوں۔بس مجھے دین محمد کے دروازے تک چھوڑ دو۔۔۔"

"آپ کہاں سے آئے ہیں۔۔۔؟"

لڑکے نے پہلی بار ارحم کو گاؤں میں دیکھا تھا تو حیرت سے سوال کیا

"دور سے"

"کتنی دور سے۔۔۔؟؟؟" ایک اور معصومانہ سوال

"بہہہت دوورر سے"

"دریا کے بھی پار سے۔۔؟" اس کے معصوم عقل کے مطابق دنیا یہی تھی دریا کے اس پار ۔۔۔دریا کے اس پار کچھ بھی نہیں تھا

"ہاں تمہارے دریا سے بھی دور سمندر سے بھی دور۔۔"

وہ لڑکا اسے دین محمد کے دروازے تک چھوڑ کر واپس چلا گیا۔لکڑی کا دروازہ بند تھا۔بند دروازے کے سامنے رکے اسے چند پل مزید گزر گئے وہ انہی سوچوں میں مبتلا تھا کہ اپنا تعارف کن الفاظ سے کروائے گا۔۔۔

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے لکڑی کے دروآزے پر دستک دے دی۔دروازہ اندر سے بند تھا۔تھوڑی دیر بعد پہلے سے قدرے زور سے دستک دی۔کچھ دیر بعد دروازے کے پیچھے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی تو دل کی دھڑکن کی رفتار مزید تیز ہوگئی۔۔۔

"ارے بھائی حوصلہ رکھو آ رہا ہوں۔۔۔؟" پیچھے سے چلتے قدموں کے ساتھ بھاری مردانہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی

اگلے پل دروازے کو پیچھے کی طرف سے لگائی گئی کنڈی گری۔دونوں دروازے کنڈی کی قید سے آزاد ہوئے تو ایک دم سے کھل گئے جیسے صدیوں سے اس کنڈی نے انہیں جکڑ رکھا ہو اور وہ اس سے رہائی کے انتظار میں ہوں۔

اس کے سامنے ایک پکی عمر کا آدمی کھڑا تھا جس کا آدھے سے زیادہ سر سفید ہو چکا تھا۔داڑھی کی بھی یہی حالت تھی قلمیں دونوں طرف سے بالکل سفید پڑ چکی تھیں۔مضبوط جسامت کا آدمی اسے دروازے کے پار سے کھوجتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔جانے ارحم کے چہرے میں کسی کی شباہت تلاش کر رہا تھا یا پھر

کسی اجنبی کو اتنے سامان کے ساتھ اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران تھا ارحم اندازہ نہیں لگا سکا
"جی بچہ۔۔۔کس سے ملنا ہے آپ کو۔۔۔" تھوڑی دیر پہچاننے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد دین محمد نے ارحم سے سوال کیا۔ جانے کیوں اسے یہ نقوش دعوت دے رہے تھے کہ مجھے پہچانو مگر وہ پہچاننے میں ناکام رہا تھا

"دین محمد۔۔۔آپ ہی ہیں نا؟"

"جی۔میں ہی ہوں۔مگر آپ کو پہچانا نہیں۔کون ہیں آپ؟"

"میں ارحم سلطان ہوں۔آپ کا پوتا۔۔۔"

دین محمد حیرتوں کے سمندر میں ڈبکیاں لگانے لگا

"کیا مطلب پتر۔۔۔کیا کہہ ہو۔۔۔؟" اسے یقین ہی نہیں آیا

"دادا جی میں آپ کا پوتا ہوں۔آپ کے بیٹے سلطان کا بیٹا"

"کیا مطلب ہے تمہارا پتر۔۔۔میرا ایک ہی پوتا ہے خوشی۔کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو۔۔۔؟"

"دادا جی میں آپ کا دوسرا پوتا ہوں۔ارحم۔۔۔ارحم سلطان۔
میں آپ کو سب سمجھاتا ہوں۔میں اندر آجاؤں۔۔۔؟؟؟"

وہ خاموش ہو گئے۔حیرت تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی

"میں اندر آسکتا ہوں دادا جی۔۔۔؟" ارحم سامان اٹھائے تھکنے لگا

"ہاں۔۔۔آجاؤ۔" دین محمد نے اسے راستہ دے دیا

وہ سامان اٹھائے تین کمروں والے اس کچے پکے گھر میں داخل ہو گیا۔گھر کچا تھا مگر نفاست دیدنی تھی۔آنگن میں نیم کا ایک گھنا سا پیڑ لگا ہوا تھا جس کے نیچے دو چار پائیاں بچھی تھیں ایک چار پائی پر دو بڑی عمر کی عورتیں محو گفتگو تھیں۔جو دین محمد کے ساتھ آتے سامان اٹھائے ہوئے اس اجنبی لڑکے کو دیکھ کر حیران ہو گئیں۔

"سنتی ہو بختاور۔۔۔یہ لڑکا کہہ رہا ہے کہ یہ ہمارے سلطان کا بیٹا ہے۔ہمارا پوتا ہے۔" آنگن میں

داخل ہوتے ہی دین محمد اپنی بیوی سے مخاطب ہوئے

وہ دونوں پیڑ کے نیچے پہنچے تو ارحم نے اپنے بیگ خالی پڑی دوسری چارپائی پر رکھ دیئے ۔جہاں پر پہلے دین محمد بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے اٹھ کر آنے کی وجہ سے اب خالی پڑی ہوئی تھی ۔کندھے اب بیگ اٹھائے اٹھائے درد کرنے لگے تھے

وہ ان تین لوگوں کے بیچ اجنبیوں کی طرح کھڑا تھا جن کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان کا پوتا ہے ۔ان کے بیٹے سلطان کا بیٹا ہے۔

دین محمد نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ارحم آرام سے بیٹھ گیا تو دین محمد بھی اس کے ساتھ آ بیٹھا۔بختاور اور نانی تاج ابھی تک اسے حیران نظروں سے تکے جا رہی تھیں۔

"ہاں اب بولو پتر۔۔۔کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو۔۔۔؟" دین محمد نے پھر وہی پہلا سوال کیا۔

ارحم نے بولنا شروع کر دیا۔ساری کہانی سنانا شروع کر دی۔شروع سے لے کر آخر تک۔سلطان کے کراچی جانے سے لے کر لندن پہنچنے ،فاخرہ سے شادی ،طلاق ،بیماری ،اور پھر اس کی خودکشی کی ساری کہانی مختصر الفاظ میں بیان کر دی۔

وہ لوگ خاموشی سے کہانی سنتے رہے کوئی بھی بیچ میں کچھ نا بولا ۔بس پھٹی پھٹی غیر یقین آنکھوں سے دیکھتے رہے۔اپنے بیٹے کے نین نقوش والے اس اجنبی لڑکے کو باتیں کرتے سنتے رہے۔کہانی ختم ہو چکی تھی وہ سب ابھی بھی گنگ بیٹھے تھے۔جیسے وہ انسان نا ہوں کسی نے مجسمے لا کے رکھ دیئے ہوں ۔ہاں البتہ اب دین محمد کو بیٹے کے نقوش اس چہرے میں دکھائی دینے لگے تھے۔

کہانی ختم ہو چکی تو وہ تینوں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ارحم نے بیگ کھولا ۔سلطان کا آئی ڈی کارڈ انہیں دکھایا۔اس کی بلڈ رپورٹس دکھائیں۔اپنے موبائل میں محفوظ سلطان اور فاخرہ کی تصاویر دکھائیں۔کچھ تصاویر میں وہ تینوں بھی موجود تھے۔فاخرہ ،سلطان اور ارحم۔اس کے پاس ایسی بہت سی تصاویر محفوظ تھیں۔تینوں کی ہنستی مسکراتی ایک خوشحال فیملی کی تصاویر۔پھر اس نے دوسرا بیگ کھولا

اپنے ممی پاپا کی اپنے ہاتھ سے بنی وہ تصویر نکالی جو اس نے دو دن پہلے اپنی گیلری میں بیٹھ کے بنائی تھی ۔ہر چیز کا کوئی نا کوئی مصرف ہوتا ہے ۔یہ تصویر شاید اسی موقع کیلئے بنی تھی

وہ لوگ تصاویر کو چھوتے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے ۔آخر میں ارحم نے انہیں اپنے ڈیڈ کی آخری ریکارڈڈ آواز سنائی ۔جس میں سلطان کی بہت سی باتیں ریکارڈ تھی ۔ارحم کو پاکستان جانے کی نصیحت تھی ۔سب سے معافی کی درخواست تھی ۔اور اپنی خودکشی اور کینسر کی باتیں ریکارڈ تھیں

اس کچے پکے سادہ طرز کے بنے گھر میں اس وقت عجیب سا سماں تھا ۔وہ اگر ارحم کی وجہ سے خوش تھے کہ یوں اچانک انہیں اپنا پوتا مل گیا

تو دکھی بھی تھے رنجیدہ بھی تھے اپنے سلطان کیلئے ۔

پہلے ہمیشہ دل کو ایک موہوم سی امید لگی رہتی تھی کہ کسی دن اچانک سلطان واپس آجائے گا ۔اب وہ ہلکی سی امید بھی ٹوٹ گئی تھی ۔

خوشی آیا تو اسے بھی ساری باتیں بتائی گئی ۔اس کی کیفیت بھی ان سب سے مختلف نا تھی ۔دین محمد نے زور سے ارحم کو اپنے کلیجے سے لگا لیا ۔باری باری سب نے اسے روتے ہوئے پیار دیا ۔وہ جان ہی نہیں پایا کہ ان کے یہ آنسوؤں خوشی کے ہیں یا غم کے ۔

ان سب کے رونے کی وجہ سے ارحم کی اپنی آنکھوں کے پیالے بھی چھلک پڑے ۔اسے اپنے ڈیڈ کی بات بھی بھول گئی کہ بیٹا رونا نہیں ورنہ مجھے بہت تکلیف ہوگی

☆......☆......☆

" دادا جی میں اب کوئی کام شروع کرنا چاہتا ہوں ..." خوشی ناشتے سے ہاتھ کھینچ چکا تھا جبکہ ارحم اور دین محمد ابھی بھی چارپائی پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے ۔

بختاور گرم گرم پراٹھے لگاتی جا رہی تھی اور دوسری چارپائی پر نانی تاج ہاتھ میں تسبیح پکڑے اپنے روزانہ کے پڑھے جانے والے وظیفے دہرا رہی تھیں ۔سر پر دوپٹہ سلیقے سے جما ہوا تھا ۔کاندھوں پر ایک اور زرا موٹی اور شال اوڑھ ڈال رکھی تھی

"کون سا کام کرو گے خوش بخت ۔۔۔؟" دادا نے دریافت کیا۔اس کے نزدیک خوشی ابھی بھی بچہ ہی تھا۔

"کوئی بھی کرلوں گا۔۔کل میں مچھلی منڈی گیا تھا۔سوچ رہا ہوں کشتی لے کے چلاتا ہوں۔۔۔"

"نہیں خوشی۔۔۔دریا کے علاوہ کسی اور روزی کا سوچو۔۔" دادا نے حسب توقع منع کردیا

" کیوں داداجی اس میں حرج ہی کیا ہے۔۔۔؟"

"حرج ہے جو روک رہا ہوں نا۔۔۔تم کچھ اور سوچ لو۔"

" میں جانتا ہوں آپ کس لیئے ایسا کہہ رہے ہیں۔" خوشی جانتا تھا کہ اس کے چچا عمران بچپن میں ہی دریا میں ڈوب گئے تھے۔اس واقعے کے نا تو دین محمد نے کبھی دریا میں دوبارہ کشتی اتاری تھی اور نا ہی کبھی سلطان کو یہ اجازت دی تھی اور اب وہ خود اسی بات کی ضد کر رہا تھا

" جانتے ہو پھر بھی ایسا پوچھ رہے ہو۔۔۔حیرت ہے"

ارحم بھی اب ناشتے سے فارغ ہو کر خاموشی سے ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا

" ہاں داداجی۔۔۔جانتے ہوئے بھی اجازت مانگ رہا ہوں۔ہم اپنی قسمت سے لڑ نہیں سکتے۔جو ہونا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔چاہے ہم جتنی بھی احتیاطی تدابیر کیوں نا کریں۔۔۔" اس نے داداجی کو سمجھانا چاہا

" اس کے علاوہ کچھ اور سوچ لو۔" داداجی ٹس سے مس بھی نا ہوئے

" اور بھی تو روزی کمانے کے ہزاروں کام ہیں دنیا میں تم کچھ اور سوچ لو۔اگر دادا ایک بات نہیں مان رہے تو ضد کیوں کرتے ہو۔۔۔"

اس بار پراٹھے بناتی بختاور نے بھی دین محمد کی طرفداری کی۔جو کہ اب آخری دو پراٹھے لگا رہی تھی

" ہم اپنی قسمت سے کبھی نہیں لڑ سکتے۔اور جو ہونا ہے وہ ہمیشہ ہر حالت میں ہو کر ہی رہتا ہے تمہاری باتیں درست ہیں۔لیکن میں پھر بھی اس کی اجازت نہیں دوں گا۔میں اپنے دل کو راضی نہیں کر سکتا اس بات پر۔۔۔" دین محمد نے گرم بھاپ اڑاتی چائے کا ایک گھونٹ اپنے اندر اتارتے ہوئے کہا۔

ان کی ہمیشہ کی عادت تھی ناشتے کے بعد وہ اپنے لیئے ایک الگ چائے کا کپ ضرور پیتے تھے

"دادا جی۔۔۔ڈیڈ بہت سی ہم سب کیلئے بہت سا پیسہ چھوڑ کے گئے ہیں۔میرے خیال میں یہ کسی اچھے کاروبار کیلئے اور ہم سب کیلئے سالوں تک کافی رہے گی۔۔۔" ارحم نے پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیا تھا اور وہ سب چونک ہی گئے تھے۔

"کتنی رقم ہوگی۔۔۔؟" دین محمد نے دریافت کیا

"اتنی کہ سالوں تک ہم سب کو کسی پریشانی کا سامنا ہرگز نہیں کرنا پڑے گا۔۔"

ارحم نے انہیں رقم بتائی تو وہ سب حیران ہی رہ گئے تھے۔کمرے میں خاموشی چھا گئی کچھ دیر کیلئے ایک مغموم سی اداسی در آئی تھی۔

"پھر کچھ زمین کیوں نا لے لی جائے۔۔۔؟" خوشی نے ایک اور مشورہ دیا تھا۔وہ ساری زندگی اپنے باپ سے نالاں رہا تھا۔آج وہی باپ پہلی بار اس کیلئے کسی خوشی کا باعث بن رہے تھے۔

اسی فیصلے پر سب نے اتفاق کرلیا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے بھی اب کچھ نا کچھ کرنا چاہیئے۔۔۔بہت دن فارغ رہ لیا۔۔۔" اس بار ارحم نے سب کو حیران کیا تھا۔سارے افراد حیرت سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔

"تم کیا کروگے ارحم۔۔۔تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔جو کروں گا میں خود کروں گا" خوشی نے اسے اپنے بڑے بھائی ہونے کا احساس دلایا

"میری ہمیشہ سے خواہش تھی ایک بڑا آرٹسٹ بن کر اپنا آرٹ سکول کھولنے کی۔جو شاید ممکن نہیں ہے۔ تو میں اب سوچ رہا ہوں کہ کیوں نا گاؤں کے سکول میں پڑھانا شروع کردوں۔" اس نے اپنی سوچ سب پر واضح کی

"یہ تو بہت اچھی بات ہے پتر۔اس سے نیک بات اور بھلا کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے علم کو خود تک محدود رکھنے کی بجائے دوسروں تک بھی پھیلایا جائے۔" نانی تاج نے تسبیح رکھ کر پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

"ہاں اسی لیئے میں نے سوچا سارا دن فارغ رہنے سے پڑھانا بہت بہتر ہے۔"

" پھر آج ہی میں تمہیں عابد صاحب کے سکول لے چلتا ہوں۔اب تو خیر سے میٹرک تک کلاسیں بھی لگ چکی ہیں۔۔۔" خوشی پر جوش ہوا

" اور جانتے ہو ارحم۔۔۔میں نے خود بھی اپنا مڈل اسی سکول سے پاس کیا تھا۔" خوشی نے اس قدر خوش ہوتے ہوئے بتایا جیسے اس نے مڈل نہیں ماسٹر کر رکھا ہو۔

ارحم اپنے بھائی کی بات پر دل ہی دل میں مسکرا دیا تھا۔

☆......☆......☆

کیلنڈر بدل جاتے ہیں، تاریخ بدل جاتی ہے، وقت اور مقام بدل جاتے ہیں، سٹیج اور اداکار بھی بدل جاتے ہیں۔مگر اکثر کہانی وہی ایک ہی رہتی ہے۔آسمانوں کے اوپر دنیا کا سکرپٹ لکھنے والا کہانیوں میں تھوڑی سی ردو بدل کرتا ہے اور نئی کہانی بن جاتی ہے

" بس اب تو تسلی ہوگئی نا تمہیں۔چھوڑ کے چلا گیا ہے وہ۔اس نے ہم میں سے کسی کو بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا اور تم ایسے شخص کیلئے آنسوؤں بہا رہی ہو۔حیرت ہے مجھے تم پر۔۔۔" کرسٹی اس پر برس رہی تھی۔وہ سب فرینڈز حیران تھے کہ ارحم نے اتنا بڑا فیصلہ لے لیا اور کسی کو خبر تک نہیں ہونے دی

" میں تمہیں روکتی تھی بار بار کہتی تھی کہ ایسا شخص جس کو تمہاری پرواہ نا ہو تم بھی اس کی پرواہ مت کرو۔خود کو بے مول مت کرو ارحم کیلئے۔مگر تمہاری آنکھوں پر تو ارحم کے نام نہاد پیار کی پٹی بندھی تھی نا۔تمہیں اس کے علاوہ اور کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔"

" اب بس بھی کرو کرسٹی۔اس کی کوئی مجبوری بھی تو ہو سکتی ہے۔تم دیکھنا وہ واپس لوٹ آئے گا۔۔۔" کوکب بالآخر تنگ آ گئی۔

" ہنہہ۔۔۔خوش فہمیوں کی عینک جو تم نے پہن رکھی ہے اسے اتار کر پھینک دو۔تاکہ باقی دنیا صاف صاف نظر آسکے۔وہ اب کبھی نہیں واپس آئے گا۔وہ کالج سے لیونگ سرٹیفکیٹ تک لے گیا ہے۔وہ واپس آنے کیلئے گیا ہی نہیں۔ارحم اب کبھی نہیں آئے گا۔" کرسٹی ان سب باتوں پر چلا رہی تھی جو آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی کوکب اگنور کر رہی تھی۔

"اچھا چھوڑو ان سب باتوں کو۔۔۔ پلیز ٹاپک تبدیل کرو" کوکب نے ہاتھ اٹھا کر کرسٹی کو مزید بولنے سے روکتے ہوئے کہا

"کیوں برا لگ رہا ہے اب۔ دکھ ہو رہا ہے کہ میں کیوں سچائی بیان کر رہی ہوں۔ کڑوی لگ رہی ہیں میری باتیں۔ جب میں تمہیں کہتی تھی کوکب اور بھی تو دنیا جہان ہے کوئی اور بات بھی کر لیا کرو سوائے ارحم کی باتوں کے۔ تب تمہیں اس کی باتیں اچھی لگتی تھی۔ اب اس کے خلاف بولنا برا لگ رہا ہے۔ واہ کوکب۔۔۔" کرسٹی کی کمان میں طنز کے تیر ابھی بھی ختم نہیں ہوئے تھے

"ہاں بری لگ رہی ہیں۔ برا لگ رہا ہے مجھے تمہارا اس کے خلاف بولنا۔ کیونکہ میں پاگل ہوں۔ میں تھی ہی پاگل۔ اب بھی پاگل ہوں۔ ہمیشہ پاگل رہوں گی اس کیلیے۔۔۔ میں خود کو نہیں روک سکتی اسے سوچنے سے۔ اسے چاہنے سے۔ کیونکہ میں پاگل ہوں۔ دنیا کی سب سے بڑی پاگل۔۔۔ سنا تم نے" کوکب بھڑک اٹھی۔ پاگلوں کی طرح سر پکڑ کر چیخنے لگی۔

شاید اس کا ضبط اب جواب دے چکا تھا۔ ارحم کے یوں اس طرح انہیں چھوڑ جانے سے اسے حقیقت میں بہت دکھ پہنچا تھا۔ بھری ہوئی تو وہ پہلے سے ہی تھی بس تھوڑی سی آگ دکھانے کی دیر تھی جو کرسٹی کی باتوں نے اب لگا دی تھی تو کوکب بھڑک اٹھی۔

کرسٹی اسے یوں چیختا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اب وہ چیخ نہیں رہی تھی۔ پھر سے اپنی جگہ بیٹھ کر گھٹنوں میں سر چھپائے سسکیاں بھر رہی تھی۔ کالج گراؤنڈ میں موجود لڑکے لڑکیاں سب کوکب کے اس طرح چیخنے پر ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ہر کسی کو اپنی طرف گھورتا پا کر کرسٹی کو بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اور وہ ساتھ بیٹھی کوکب اسے اس بات کی خبر ہی نہیں تھی کہ سب لڑکے لڑکیاں انہیں گھور رہے ہیں۔ وہ ابھی بھی گھٹنوں میں سر دیئے گراؤنڈ میں ہی سسکیاں بھر رہی تھی۔

"کوکب۔۔۔ تم مجھے بہت عزیز ہو۔ فکر رہتی ہے مجھے تمہاری۔ اور تمہیں سمجھاتی اس لیئے ہوں کہ تم اس لاپرواہ کیلئے خود کو ڈی گریڈ مت کرو۔ میرا مقصد تمہیں رلانا ہر گز نہیں تھا یار۔۔۔ بہادر بنو۔"

کرسٹی کو اسے طرح سسکیاں بھرتے دیکھ کر اب سچ میں افسوس ہونے لگا تھا۔ وہ اسے اب خود سے

لپٹائے تسلیاں دے رہی تھی اس کی پیٹھ سہلا رہی تھی۔
"میں بس صرف یہی چاہتی تھی کہ تم کسی ایسے شخص کیلئے اپنے جذبے لٹاؤ جسے تمہارے جذبات کی قدر ہو جو تم سے تمہاری طرح محبت کرے، جو تمہاری فکر کرے۔ جو تمہیں سمجھ سکے۔ جو ارحم کی طرح لا پرواہ نا ہو تمہاری ذات سے۔ جانتی ہو تم مجھے سب سے زیادہ پیاری ہو۔ اور تمہارا اس طرح رونا میرا دل چیر رہا ہے۔ کوکب پلیز اٹھو اب" کرسٹی اسے تھپکتے ہوئے دلاسے دینے لگی۔
مگر وہ بدستور اسی پوزیشن میں بیٹھی روئے جا رہی تھی۔
"کوکب تمہیں معلوم ہے نا کہ میں ہیری کے ساتھ ریلیشن میں تھی۔ میں اسے خود سے زیادہ چاہنے لگی تھی۔ مجھے بھی تمہاری طرح سوائے ہیری کے کچھ اور دکھائی نہیں دیتا تھا۔
جانتی ہو جب ایک کلب میں اسے ڈرم بجانے کی جاب ملی تو اس نے مجھے فقط یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ اب اسے مجھے دینے کیلئے وقت نہیں ہے۔۔۔
مجھے دکھ ہوا تھا مگر میں برداشت کر گئی۔ یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ شاید واقعی وہ وقت کو مینیج نہیں کر پاتا کچھ مصروفیت جو اب بڑھ گئی ہیں ہیری کی۔۔۔
مگر جانتی ہو مجھے دکھ کب ہوا۔۔۔؟
مجھے دکھ تب ہوا جب وہی ہیری تیسرے دن مجھے کسی اور لڑکی کے گلے میں باہیں ڈالے دکھائی دیا تھا۔۔۔
کوکب لوگ جذبات کی کوئی قدر نہیں کرتی، بلکہ جذبوں کو اپنے پاؤں تلے روند دیتی ہے۔۔۔
دنیا کو آپ کے احساسات کی کوئی فکر نہیں ہوتی کیونکہ دنیا بے حس ہے۔۔۔
میں اسی لیئے تمہیں ہمیشہ روکتی تھی کہ خود کو کسی کیلئے ارزاں مت کرو۔۔۔ خود کو کسی کیلئے اس قدر بے وقعت مت کرو۔۔۔ خود کو کسی کی پیار میں اس قدر مت الجھاؤ کہ اس غیر موجودگی تمہیں کاٹنے لگے۔۔۔"
کرسٹی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے مسلسل سمجھانے میں لگی ہوئی تھی
کوکب کی سسکیاں بھی اب تھمنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں اٹھ کر اندر کلاس روم کی طرف چل دی

وہ جو ہر وقت ہنستی رہتی تھی۔ کھلکھلاتی رہتی تھی زندگی سے بھرپور لڑکی مشہور تھی۔ گزرتے دنوں کے ساتھ اس کی وقت بے وقت کی ہنسی کہیں کھوگئی۔ اس کی زندگی سے بھرپور مسکراہٹیں اور شوخیاں جیسے ناپید ہوگئی ہوں۔۔۔

وہ کوکب جسے خود پر ناز تھا کہ اسے ارحم کبھی نا کبھی ضرور سوچے گا اپنی زندگی میں کوکب کی کمی محسوس کرے گا۔ اسے خود بلائے گا اور اقرار کرے گا کہ ہاں کوکب میری زندگی میں تمہاری بہت کمی ہے۔ وہ خود کو دیئے گئے سارے دلاسے کہیں ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ اسے آج یقین ہوگیا تھا کہ وہ ارحم کی زندگی میں نا تو کبھی پہلے تھی اور نا کبھی پھر آئے گی۔ اس نے اب حقیقت میں اپنی آنکھوں سے خوش فہمی کی پٹی اتار پھینکی۔ حقیقت میں جینا شروع کر دیا

سپنے ٹوٹ جائیں تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے ہمیشہ۔ ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں آنکھوں میں چبھنے لگتی ہیں۔ آنکھیں زخمی ہو جاتی ہیں۔ خون ٹپکانے لگ جاتی ہیں۔ پھر انسان اپنے ہی خوابوں سے ڈرنے لگتا ہے۔ دور بھاگنے لگتا ہے سپنوں سے۔ پیچھا چھڑانا چاہتا ہے یادوں سے۔ دیوانہ وار بھاگتا رہتا ہے۔ اپنے ہی خوابوں سے چھپتا پھرتا ہے۔ مگر ادھورے اور ٹوٹے ہوئے خواب کب پیچھا چھوڑتے ہیں۔ وہ بھی انسان کا پیچھا جاری رکھتے ہیں اسے بھگاتے رہتے ہیں جب تک وہ بے بس ہو کر گر نہیں جاتا۔ وسیع صحرا میں ننگے پاؤں پانی کو تلاشتے مسافر کی طرح جو آخر میں پیاس سے تڑپ کر گر جاتا ہے کبھی نا اٹھنے کیلئے۔

ریزہ ریزہ۔۔۔ سپنوں والے
ٹوٹے چہرے۔۔۔ آدھے لوگ
جانے والے۔۔۔ کب آتے ہیں؟
کیوں کرتے ہیں وعدے۔۔۔ لوگ
آس میں بیٹھی۔۔۔ شہزادی کی
مانگ میں چاندی۔۔۔ جھانک چکی
اتنی دیر سے۔۔۔ کیوں آتے ہیں
آخر یہ۔۔۔ شہزادے لوگ

پیار کی راہ پر۔۔۔اُنگلی تھامے
اندھا دُھند۔۔۔چل پڑتے ہیں
ناسمجھی میں۔۔۔مَر جاتے ہیں
ہم سے۔۔۔سیدھے سادے لوگ
ہم دونوں میں۔۔۔کون ہے مجرم
یہ طے ہونا۔۔۔باقی ہے
آدھا شہر ہے۔۔۔حامی اُس کا
ساتھ ہیں میرے۔۔۔آدھے لوگ

☆......☆......☆

گھر میں ایک نئے فرد کا اضافہ سب کیلئے اجنبیت سے بھرپور تھا تو ارحم کیلئے بھی کسی سے کم نہیں تھا ۔نئے لوگوں کے بیچ نئی جگہہ پر رہنا اس کیلئے بہت مشکل تھا۔ یہاں وہ لندن والی زندگی میسر نا تھی۔ وہ عیش ختم ہو گئے تھے اس کے دوست نہیں تھے یہاں اس کی سب سے محبوب آرٹ اکیڈمی بھی نہیں تھی ۔۔اسے ایسا لگتا جیسے وہ ایک صدی پیچھے کی طرف آ گیا ہو۔

خوشی اسے لیئے بازاروں میں گھومتا تو سب لوگوں کی حیرت زدہ نظریں اس کا دور دور تک پیچھا کرتی رہتیں ۔لوگ سادہ تھے مگر اچھے تھے مخلص تھے۔ یہاں جو ایک بات اس نے خاص طور پر نوٹ کی کہ یہاں لوگوں کے پاس ایک دوسرے کو دینے کیلئے بہت سا وقت ہوتا تھا۔لندن کی طرح نہیں جہاں زندگی بہت مصروف تھی۔کوئی مرے جیئے کسی کو کچھ معلوم تک نہیں ہوتا۔ یہاں کسی کے پاؤں میں موچ آجائے تو آدھا گاؤں خبر گیری کرنے پہنچ جاتا۔

اور یہی بات ارحم کو سب سے زیادہ پسند آئی تھی۔گاؤں کے لوگ ارحم سے بھی بہت سی باتیں کرتے تھے اس سے لندن کی بابت سوال کرتے اور ارحم کی زبانی لندن کے قصے سن کر حیرتوں کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتے پھرتے کہ کیا سچ میں ایسی زندگی بھی ہوتی ہے۔۔۔

دوسری سب سے اہم بات وہ اس کا بھائی خوش بخت تھا۔جس طرح ان سب کے گمان میں ارحم کا وجود نہیں تھا اسی طرح ارحم نے بھی سوچا تک نہیں تھا کہ اس طرح اچانک اسے اپنا بھائی مل جائے گا ۔اور وہ بھی اس سے دو تین سال بڑا۔دونوں بھائی ساتھ چلتے تو قد کاٹھ سے ہرگز معلوم ہی نا ہوتا کہ کون بڑا ہے اور کون چھوٹا۔ایک عجیب سا خوش کن احساس تھا اتنے سارے رشتوں کو ایک ساتھ پا کر۔۔۔

خوشی بہت اچھا لگا تھا اسے۔کھانا اس کے ساتھ بیٹھ کے کھاتا۔سارا دن گاؤں کی گلیوں میں گھماتا رہتا۔ایک ایک بندے سے جا کر ملواتا۔ساری ساری رات باتیں چلتی رہتی۔خوش اس سے وہاں کی باتیں حیرت سے سنتا رہتا۔یہاں کے قصے سناتا۔ارحم کو دریا کنارے لے جاتا۔اسے کھیتوں کی طرف گھمانے لے جاتا۔۔۔سارا دن خوشی کے ساتھ کس طرح گزر جاتا اسے پتا ہی نا چلتا۔۔۔

خوشی کی زبانی ہی ارحم کو سن کر بہت افسوس ہوا کہ اس کی ماں ملوکھاں اسے جنم دیتے ہی گزر گئی تھی۔وہ دونوں ارحم کے کہنے پر قبرستان گئے جہاں دونوں نے فاتحہ خوانی کی۔ارحم نے دل ہی دل اللہ سے اپنے بابا کی بخشش کیلئے دعا مانگی

وہ اسے نور بانو پھپھو سے ملوانے کھیتوں پر بھی لے آیا۔اسے اپنے ڈیڈ کی نصیحت اچھی طرح سے یاد تھیں کہ نور بانو سے خصوصی طور پر ملنا ہے اس سے سلطان کیلئے معافی طلب کرنی ہے۔اور وہ دونوں ان سے ملنے زمینوں پر آ پہنچے۔نور بانو سدا کی صابر خاتون انہوں نے تو کبھی دل میں سلطان کیلئے شکایت رکھی ہی نہیں تھی۔سو کیسی ناراضگی اور کیسی معافی۔۔۔جب زندگی بھر اس سے کوئی گلہ نہیں رکھا تو سلطان کی موت کے بعد تو کسی ناراضگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔بلکہ وہ اس خبر کو سن کر مزید اداس ہو گئی تھیں اور ان دونوں کے ساتھ سلطان کیلئے دعا بھی کی۔

وہ دونوں مطمئن لوٹ آئے۔ایک دن فرصت میسر آئی تو ارحم نے خوشی کو انٹرنیٹ کا استعمال سکھانا شروع کر دیا۔خوشی کیلئے یہ سب کچھ نیا تھا موبائل کے استعمال میں اب تک وہ صرف فون کالز تک محدود تھا سو اس کی دلچسپی دیدنی تھی۔

ارحم نے اس دن میلز چیک کیں تو لا تعداد میلز تھیں جو ان باکس میں پینڈنگ میں پڑی تھی۔جن

میں اس کے باقی دوستوں کے علاوہ کوکب کی طرف سے آنے والی میلز اور وائس میسیجز کی ایک لمبی لائن تھی۔اس نے میلز کا جواب کسی اور دن پر چھوڑ کر انٹرنیٹ بند کر دیا۔

ان پندرہ دنوں میں وہ خوشی کے ساتھ اس قدر گھل مل گیا تھا جیسے اس کی پیدائش لندن کی نہیں بلکہ یہیں شاہ والی کی ہو۔خوشی کی طبیعت ہی ایسی تھی۔محبتوں سے گندھی ہوئی۔۔خوشی کے ہاتھ بھی جیسے ایک کھلونا سا لگ گیا ہو۔۔۔سارا دن بھائی کے ساتھ گزارتا۔

یہاں اسے آئے ہوئے سولھواں دن تھا۔خوشی اس دن کسی خاص کام سے نزدیکی مچھلی منڈی تک گیا ہوا تھا۔ارحم ہوا لگوانے کی غرض سے ٹہلنے کیلئے کھیتوں کی طرف نکل آیا۔ٹہلتے ٹہلتے وہ زمیندار صاحب کے کھیتوں تک آ پہنچا اسے خبر ہی نا ہوئی کہ وہ اتنی دور نکل آیا ہے۔

اس سے پہلے وہ یہاں تک صرف ایک بار خوشی کے ساتھ آیا تھا۔وہ ابھی تک کھیتوں کی پر پیچ پگڈنڈیوں سے اتنا بھی مانوس نہیں ہوا تھا کہ واپس اکیلا گھر چلا جاتا۔اسے محسوس ہوا کہ وہ اب راستہ بھول چکا ہے۔تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھتے رہنے کے بعد بھی اسے کوئی ایسا بندہ نظر نا آیا جس سے وہ مدد مانگ سکے۔

اسی پریشانی میں کچھ دیر مزید گزری تو ایک لڑکی اسے سر پر گھاس کا گٹھڑ اٹھائے پگڈنڈی پر اپنی طرف آتی دکھائی دی۔

وہ رک کر اس کا انتظار کرنے لگا کہ اسی سے ہی راستہ معلوم کیا جا سکتا تھا۔اس کے علاوہ اسے آس پاس کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا جس سے وہ کچھ مدد طلب کرتا یا گھر واپسی کا راستہ پوچھتا۔

"سنیئے۔۔۔میں وہ واپسی کا راستہ بھول چکا ہوں۔آپ مجھے راستہ سمجھا سکتی ہیں۔۔۔؟" پاس آنے پر ارحم اس لڑکی سے مخاطب ہوا۔اسے بتاتے ہوئے ہلکی سی شرم بھی محسوس ہو رہی تھی کہ وہ راستہ بھول چکا ہے۔۔

اور یہاں لندن کی طرح کوئی جگہ جگہ سائن بورڈ بھی نہیں لگے ہوئے جو وہ پڑھتا ہوا اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچتا۔۔۔یہ گاؤں تھا شاہ والی تھا

گھاس اٹھائے لڑکی نے گھاس کا گھٹڑ ذرا اونچا کر کے اس لڑکے کو دیکھا تو وہ ایک نظر میں ہی

پہچان گئی کہ یہ اجنبی لڑکا خوشی کا بھائی ہے۔جس کے قصے وہ ماں سے سن چکی تھی۔
دوسری طرف جیسے ہی اس لڑکی نے اپنا چہرہ اوپر کیا ارحم اس کا چہرہ دیکھتے ہی وہیں مجسمہ بن گیا تھا۔
یہ چہرہ۔۔۔یہ وہی چہرہ تھا ہو بہو وہی چہرہ تھا جو اس نے کبھی تصور میں اپنے کینوس پر اتارا تھا۔
"گھر جانا ہے آپ کو۔۔۔" جنت نے اس کے روکنے پر ارحم سے پوچھا
مگر وہ بت بنا کھڑا جنت کے چہرے میں گم ہو چکا تھا۔
"کہاں جانا ہے آپ کو۔۔۔گھر یا کسی اور طرف۔۔؟" اسے مجسمہ بنے دیکھ کر جنت نے اس بار زرا اونچی آواز میں پوچھا
"جی۔۔جی ہاں گھر واپس جانا ہے مجھے۔آپ راستہ سمجھا دیں گی پلیز۔۔۔؟" وہ ابھی تک حیرتوں میں مبتلا تھا ایسا کیسے ہو سکتا ہے
"جی میرے ساتھ آجائیے۔۔۔میں بھی گھر کی طرف ہی جا رہی ہوں۔۔"
وہ گھاس کا گٹھڑ اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔
"نام کیا ہے آپ کا۔۔؟" ارحم نے پگڈنڈی پر اس کے پیچھے چلتے ہوئے نام پوچھا۔دل میں کچھ ہلکا سا خوف بھی تھا کہ کہیں وہ لڑکی برا نا مان جائے۔
"جنت۔۔۔"
"یہ کیسا نام ہوا۔کچھ عجیب سا نہیں ہے۔" اسے یہ نام اچھوتا اور پیارا سا لگا
"عجیب سا کیوں۔۔۔اچھا تو ہے؟" گھاس کے گھٹڑ کے پیچھے سے آواز آئی تھی۔
وہ شاید خود سے بھی زیادہ پیارا بولتی تھی۔
"میرا مطلب کہ جنت تو آسمانوں پر کہیں ہوتی ہے نا۔پھر زمین پر کیسے۔۔۔؟"
"کبھی کبھی کسی کی جنت زمین پر بھی اتر آتی ہے۔۔۔"
وہ اس کی باتوں میں کھونے لگا۔وہ لڑکی اسے اچھی لگی۔من موہنی صورت من موہنی باتیں۔۔۔وہ اس کے سحر میں جکڑنے لگا۔پہلی بار زندگی میں ارحم سلطان کو کوئی لڑکی اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ اس کے سحر

میں کھونے لگا۔

" ویسے حیرت کی بات ہے نا کہ لندن میں رہنے والے گاؤں کی چھوٹی سی پگڈنڈیوں میں کھو گئے۔۔۔" ارحم کو خاموش پا کر جنت نے پھر خود ہی بات آگے بڑھائی

" آپ کو کس نے بتایا میں لندن سے ہوں۔۔۔؟" اسے خوشگوار حیرت ہوئی تو مطلب وہ اس کے بارے پہلے سے جانتی تھی

" یہ گاؤں ہے۔۔۔ یہاں بات ہواؤں پر اڑتی رہتی ہے۔۔۔اور پھر جب ہوا چلتی ہے تو ہر انسان کو لگتی ہے نا۔۔۔"

" کبھی کبھی انسان کے راستے اسے صرف کسی سے ملوانے کیلئے بھی کھو جاتے ہیں۔" پگڈنڈی پر جنت کے پیچھے موڑ مڑتے ارحم نے اس کی پہلی بات کا جواب دیا۔

"مطلب کیسے۔۔۔میں سمجھی نہیں۔۔۔"

"مطلب جیسے اگر میں یہاں راستہ نا بھولتا تو شاید ہماری ملاقات ہی نا ہوتی۔۔۔" ارحم نے جلدی سے بات کو سنبھال لیا

باتوں باتوں میں وہ گاؤں کی حدود تک آ گئے۔جنت اسے آگے کا باقی بچا تھوڑا سا راستہ سمجھا کر اپنے گھر کی طرف مڑ گئی۔وہ وہیں کہیں رہ گیا ابھی تک اس سانولے قدرتی حسن سے بھرے معصوم چہرے میں کھویا ہوا تھا۔اسے آج سچ میں لگا تھا کہ واقعی من چاہے انسان کی سنگت میں سفر جلدی کٹ جاتا ہے یا پھر راستہ ہی چھوٹا ہو جاتا ہے۔

ارحم خود پر حیران تھا اسے کبھی لندن کے حسن نے اپنی طرف نہیں کھینچا تھا۔اور پوری دنیا کو چھوڑ کر اس کا دل اٹکا بھی تو اس چھوٹے سے گاؤں کی جنت میں۔۔۔

وہ واپس گھر آ گیا۔اس نے آتے ہی سب سے پہلے اپنا تصویروں والا بیگ کھولا ۔ایک تصویر نکالی اپنے سامنے رکھی۔سرسبز وادیوں میں بیٹھی اداس لڑکی کی تصویر۔یہ وہی چہرہ تو تھا۔وہی آنکھیں،وہی ناک،ہونٹ سب کچھ وہی۔

وہ اسی چہرے کے سحر سے ابھی تک نہیں نکل پایا تھا۔کانوں میں سر جانسن کی آواز گونج رہی تھی

" ہم جب بھی غیر ارادتاً اپنے تصور میں کوئی چہرہ کینوس پر اتارتے ہیں ۔تو یقین کریں اس چہرے سے مشابہہ چہرہ کہیں نا کہیں دنیا کے کسی نا کسی کونے میں ضرور موجود ہوتا ہے۔۔۔

اگر اتفاقاً ہی زندگی میں کبھی آپ کی ملاقات اس چہرے سے ہو جائے جسے آپ نے اپنے تصور میں کینوس پر اتارا تھا۔تو ایک بار اسے اپنا پینٹ کیا گیا چہرہ ضرور دکھائیے گا۔۔۔وہ اپنے سے مشابہہ چہرہ دیکھ کر خوش ہونے کے ساتھ حیرتوں کے سمندر میں ڈوب جائے گا۔اور اس وقت جو خوشی آپ اپنے اندر محسوس کریں گے اس کا اندازہ آپ کو صرف تبھی ہو گا جب وہ چہرہ آپ کے سامنے اپنی تصویر دیکھ رہا ہو گا۔"

ارحم نے اپنے تصور میں بنایا ہوا چہرہ پا لیا تھا۔اسے خود سے اقرار کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوئی کہ ایک ہی نظر میں وہ اس چہرے کی چاہت میں مبتلا ہونے لگا ہے۔"

☆......☆......☆

تیئسواں حصہ

صبح کا اجالا پورے شاہ والی میں پھیل چکا تھا۔پنچھی اپنے اپنے رزق کی تلاش میں نکل چکے تھے۔نانی ابھی تک اپنے ازکار کیلئے جائے نماز پر بیٹھی تھی۔آج کل اس کی دعائیں اس لیئے بھی لمبی ہوگئی تھیں کہ انہیں دو چار دن میں زمیندار صاحب کے گھر جانا تھا۔خوشی کے رشتے اور ٹوٹے رشتوں کو پھر سے جوڑنے کی ایک آخری کوشش کرنی تھی۔

ابھی کل ہی ارحم اور خوشی شہر جا کر بنک سے رقم کیش کروا آئے تھے۔پاکستانی روپوں میں یہ ایک بہت بڑی رقم تھی۔زمیندار صاحب مطمئن ہو گئے تھے کیونکہ دو دن پہلے ہی وہ صدیق زمیندار سے زمین خریدنے کے معاملے میں معاملات طے کر چکے تھے۔صدیق زمیندار کسی سلسلے میں اپنی کچھ زمین بیچنے کا ارادہ رکھتے تھے۔دین محمد نے اس سے چھ کنال زمین کا معاملہ طے کر دیا تھا۔

دین محمد خوش تھے۔کہ وہ خود ساری زندگی مزدوری کرنے کے بعد بھی ایک ٹکڑا زمین اپنے نام نہیں چڑھا سکے۔اور اب ایکدم سے چھ کنال زمین ان کے بچوں کے نام ہونے والی تھی۔ارحم کی شاہ والی آمد گویا خوش کن ثابت ہوئی تھی۔اور وہ ان کیلئے فرشتہ ثابت ہوا تھا۔

سلطان نے زندگی بھر جو کچھ بھی کیا وہ اس کے لیئے خدا کے سامنے شاید جوابدہ ضرور ہو گا مگر مرنے سے پہلے اس نے اپنے بچوں کیلئے بہت کچھ کر دیا تھا۔

دین محمد کچھ سال بعد کے خواب ابھی سے دیکھنے لگے تھے جب ان کے بچوں کے بھی اپنی ذاتی زمین ہو گی انہیں پھر اپنے دادا جی کی طرح مشقت کر کے اپنی ہڈیاں نہیں گلانی پڑیں گی وہ لوگ بھی گاؤں کے چند زمینداروں میں شامل ہو جائیں گے اب ان کی بھی اپنی زمینیں ہوں گی جہاں وہ ہر موسم کے مطابق

فصلیں کاشت کریں گے۔وہ بہت خوش تھے کہ ان کی قسمت اچانک ایکدم سے تبدیل ہوگئی تھی۔

ارحم نہا کے آج پہلی بار خوشی کے کپڑے پہن کر باہر نکلا تو اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔اس سے پہلے اس نے کبھی شلوار قمیض استعمال نہیں کی تھی یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔

" میرے کپڑے تم پر بہت جچ رہے ہیں ارحم ۔۔۔" خوشی نے اسے کپڑوں میں دیکھ کر مسکراتے ہوئے تعریف کی

" جبکہ مجھے اپنا آپ عجیب سا لگ رہا ہے۔۔۔آدھا پاگل لگ رہا ہوں خود کو" ارحم نے مسکراتے ہوئے کہا

" اررے نہیں یار۔۔بہت اچھے لگ رہے ہو۔۔۔سچ میں"

" اچھا۔۔کوئی اور مانے تو پتا چلے"

" یہ تمہاری" او ور" سے کون مراد ہے ویسے۔۔۔؟؟؟" خوشی نے مذاق کیا

"مطلب کہ گھر والے تو تعریف کرتے ہی ہیں کوئی باہر والا تعریف کرے تو پتا چلے گا نا۔۔" ارحم نے بات سمبھال لی

"کہیں تمہارا گاؤں کی کسی لڑکی پر دل تو نہیں آگیا۔۔؟" ارحم ابھی تک مذاق کے موڈ میں تھا

" ارے نہیں بھائی۔۔۔ایسی کوئی بات نہیں ہے۔میں ویسے ہی ایک بات کر رہا تھا۔۔" اپنی چوری پکڑے جانے پر وہ تھوڑا سا سرخ ہوا۔

خیالات کے پردہ سکرین سر پر گھاس کی گھٹڑی اٹھائے ایک چہرہ ابھرا تھا۔

مگر اس نے خوشی کے سامنے اعتراف کرنے سے احتیاط برتی تھی۔کیا سوچے گا اس کا بھائی۔ابھی اسے آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔اور ابھی سے اس نے خوشی کو کل والی لڑکی کے بارے میں بتا دیا تو شاید وہ غلط سوچنے لگے۔

چند دن بعد بتاؤں گا ضرور اس کے بارے میں آخر تفصیلات بھی تو معلوم کرنی ہیں۔

دونوں بھائی کھانے سے فارغ ہوئے تو ارحم نے خوشی کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔انٹرنیٹ آن کیا اور

سکائپ پر کوکب کو کال ملادی۔

"آؤ خوشی۔۔۔آج میں تمہیں اپنی سب سے پیاری دوست سے ملواتا ہوں۔۔جو ہمیشہ میرا خیال رکھتی ہے ایسی دوست جو ہر جگہہ چھا جاتی ہے۔بالکل نکمی سی ہے لیکن دل کی بہت اچھی ہے وہ۔" ارحم نے اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔اور کھنکتے ہوئے لہجے میں کوکب کبیر کا غائبانہ تعارف کروایا۔

تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد کے رابطہ ممکن ہو گیا تھا۔یہاں انٹرنیٹ کی سپیڈ وہی لندن والی تو نہیں تھی پھر بھی نا ہونے سے کچھ ہونا بہتر والی بات تھی

"ہائے۔۔۔کیسی ہو کوکب۔" بڑی سی سکرین والے ٹیپ میں کوکب بلیوٹی شرٹ میں ملبوس اوپر سرمئی کلر کا گرم کوٹ پہنے کانوں میں ہینڈ فری لگائے اس کے سامنے بیٹھی تھی

"ارحم۔۔۔تم اس قدر بے حس ہو چکے ہو۔ہمیں بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔۔۔" کوکب پھر شکوہ کر رہی تھی

"اگر بتا دیتا تو کیا تم مجھے پاکستان آنے دیتی۔۔۔؟" ارحم نے مسکرا کر دوبارہ اسی سے سوال کیا

"کبھی نہیں۔۔۔"

کوکب نے نفی میں سر ہلایا

"اسی لیئے نہیں بتایا کسی کو بھی خبر نہیں ہونے دی۔ورنہ شاید میں کمزور پڑ جاتا"

"یہ کیا طریقہ ہے۔۔۔ہم سب اتنے پریشان ہوئے اور تم کم از کم میلز کا ریپلائی تو کر سکتے تھے۔کتنی میلز کی تھی میں نے۔۔۔اتنی بھی بے حسی اچھی نہیں ہوتی۔۔۔" وہ اس پر چیخ رہی تھی۔

"بس یار کیا کروں۔۔یہاں کی تو لائف ہی الگ ہے۔بہت مصروف رہا تھا۔آج دو ہفتوں بعد کچھ فرصت ملی تو سوچا تم سے بات کر لوں۔۔۔"

"ہاں بہت بڑا احسان کیا ہے نا تم۔۔۔دو ہفتوں بعد آخر خیال آ ہی گیا تمہیں۔۔۔" وہ اس کی پوری پوری کلاس لینے کا ارادہ رکھتی تھی۔کتنے دنوں کا غصہ تھا

"نہیں یار۔۔۔سب نئے لوگ ہیں تو ایڈجسٹ ہونے میں کچھ وقت تو لگتا ہے نا۔۔" ارحم اسے

آرام آرام سے ٹھنڈا کرنے لگا۔

"تمہارا جانا اتنا لازمی تھا۔ہم سب سے بھی زیادہ لازم؟"

ہاں شاید۔۔۔لازم تو تھا"

"ٹھیک ہے پھر۔۔۔خوش رہو تم جہاں بھی رہو۔۔۔" وہ جانے لگی

"سنو کوکب۔۔۔ناراض ہو؟"

"تمہیں کوئی فرق پڑتا ہے میرے ناراض ہونے سے۔۔۔؟"

" ارے ہاں کوکب۔۔۔میں تو بھول ہی گیا۔ان سے ملو۔میرے بڑے بھائی خوش بخت سلطان۔۔۔" اسے اب یاد آیا کہ خوشی کو کوکب سے ملوانا تھا

وہ خوشی کو ٹیپ تھما کر خود اٹھ کے باہر چلا گیا

" میں کیا بات کروں گا یار۔۔۔بس دیکھ رہا ہوں۔اور تم ساتھ بیٹھو جا کہاں رہے ہو۔۔۔" خوشی کو اس طرح کسی اجنبی لڑکی سے بات کرنے سے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔۔۔

وہ نہیں رکا۔اسے تسلی دے کر باہر چلا گیا۔۔۔

" السلام وعلیکم۔۔۔کیسی ہیں آپ۔۔۔" گھبراہٹ سے بھرپور لہجے میں خوشی نے اسے سلام کیا

" آپ سمجھاتے کیوں نہیں ہیں۔اپنے چھوٹے بھائی کو۔اسے کیوں اپنے ذات سے جڑے لوگوں کی فکر نہیں ہے۔۔۔" رسمی سلام دعا کے بعد وہ پھر سے ارحم کا شکوہ کر رہی تھی

"یہ ناسمجھ ہے نا ابھی۔۔۔سیکھ جائے گا آہستہ آہستہ"

وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ڈھیروں ڈھیر باتیں۔ارحم اسے ٹیپ تھما کر خود جانے کہاں چلا گیا تھا۔

خوشی نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا کہ ہونا ہو یہ لڑکی ارحم کو بہت چاہتی ہے۔وہ زیادہ پڑھا لکھا نا سہی مگر کوکب کی آنکھوں سے چھلکتی ارحم کیلئے بے پناہ محبت پڑھ سکتا تھا۔

اس کے فکرمند لہجے میں چھپا ارحم کیلئے پیار خوشی نے واضح طور پر بہت محسوس کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں ارحم واپس آ گیا۔ خوشی ابھی تک کوکب سے اس کی چٹکلی اور کھنکتی ہوئی باتیں سن رہا تھا جو ارحم کے نزدیک بالکل فضول سی ہوتی تھیں۔ ارحم نے آتے ہی خوشی سے ٹیپ واپس لے لیا۔

" ایسے ہی پاگلوں کی طرح ہر جگہ شروع نہیں ہو جاتے۔۔۔ میں نے تمہاری اتنی تعریف کی تھی خوشی کے سامنے۔۔۔ سارا بھانڈا پھوڑ دیا نا۔۔۔"

" جی نہیں۔۔۔ اور ارحم تمہارا بھائی تم سے بالکل مختلف ہے۔ بہت اچھا ہے۔۔۔"

" ہاں جو تمہاری فضول سی باتیں گھنٹوں سن سکتا ہے تمہارے نزدیک وہی اچھا ہوتا ہے۔۔۔" ارحم نے اسے چھیڑنے سے بس نہیں کی

" اچھا سنو یار۔۔۔ یہاں زندگی بہت مختلف ہے۔۔۔ بہت سادہ ہے اور لوگ بھی بہت اچھے اور سادہ ہیں۔۔۔"

" تم یہاں خوش تو ہو نا۔۔۔؟" ارحم کے لہجے سے فکرمندی جھلکی

" بہت خوش ہوں یار۔۔۔ اور سنو تمہیں ایک سرپرائز بھی دینا ہے۔۔۔"

" ہاں بتاؤ کون سا۔۔۔؟" وہ خوش ہو گئی

" ابھی نہیں بعد میں۔۔۔"

" یہ کیا بات ہوئی ارحم۔۔۔ کب سدھرو گے آخر تم۔۔۔ بعض کیوں نہیں آ جاتے۔۔۔؟ کتنی بار سمجھایا آدھی باتیں نہیں کیا کرو۔۔۔"

اور پھر کوکب کے ہزار کہنے پر بھی ارحم نے اسے سرپرائز نہیں بتا کے دیا۔ خوشی کے سامنے وہ اسے کیسے بتا سکتا تھا بھلا۔

پھر جوں جوں دن گزرنے لگے۔۔۔ خوشی روز سکائپ پر کوکب سے بات کرنے لگا۔ ان دونوں میں اب اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔ ارحم بھی خوشی کی اس نئی سرگرمی کو دلچسپی سے دیکھتا رہتا۔ وہ اسی بات میں ہی خوش تھا کہ خوشی اس بہانے خوشی محسوس کرتا ہے۔۔۔

کوکب کی نا ختم ہونے والی باتیں وہ بڑی دلچسپی سے سنتا رہتا۔ کوکب اسے ڈھیروں باتیں سناتی

رہتی اپنی ، دوستوں کی ، ارحم کی لاپرواہی کی ۔۔اور وہ سنتا رہتا محسوس کرتا رہتا۔ بظاہر خوش خوش رہنے والی اس لڑکی کے دل میں چھپی ارحم کیلئے بے پناہ محبت محسوس کرتا رہتا۔۔

اور ارحم وہ خود جنت کو سوچنے لگا۔ اسے زندگی میں پہلی بار محبت ہو رہی تھی۔ سارا دن اسے سوچنا، اس سے خیالوں میں باتیں کرنا۔ اس کے خواب دیکھنا۔۔ ان چند دنوں میں ارحم کیلئے جنت کی ذات ہی سب کچھ بن گئی تھی۔ وہ ابھی تک اس بات سے واقف نہیں تھا کہ خوش بخت اور جنت ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔۔ چاہتے ہیں ایک دوسرے کو۔ اور ان کے رشتے کیلئے کوششیں کی جا رہی ہیں۔ وہ ابھی تک ان سب باتوں سے واقف ہی نہیں تھا

☆......☆......☆

اور اس دن ارحم اپنے ہاتھوں سے بنائی گئی تصویر فولڈ کر کے ایک بار پھر جنت کے کھیتوں کی طرف آنکلا تھا۔

اس بار وہ راستہ بالکل نہیں بھولا تھا۔ ناہی پگڈنڈیوں میں الجھا تھا۔

دن آدھے سے زیادہ چڑھ آیا تھا۔ جنت اپنی ماں کے ساتھ زمینوں پر آئی ہوئی تھی۔ دونوں ماں بیٹی اسی بیری کے درخت تلے ستانے بیٹھی ہوئی تھی۔ جب ارحم وہاں جا پہنچا

" آؤ ارحم۔۔۔ کیسے آنا ہوا آج۔۔" نور بانو اسے اپنی زمینوں پر دیکھ کر خوش ہوئیں

" ایسے ہی پھپھو۔۔۔ بس آج دل کیا کہ آپ لوگوں کی زمینوں کا چکر لگایا جائے۔۔۔"

" تم عادی نہیں ہو بیٹا ان سب چیزوں کے۔ تھک جاؤ گے"

" نہیں پھپھو۔۔۔ اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ آخر میں ہوں تو اسی مٹی کا بیج جو اڑ کر لندن جا پہنچا۔۔۔ آخر یہیں کا خون شامل ہے مجھ میں۔۔" ارحم نے مسکرا کر ہلکے پھلکے انداز میں مزاق کیا

" ہاں ۔۔۔ اچھا جنت جاؤ۔ ارحم کو زرا گھما لاؤ اپنی ساری زمین دکھاؤ میں زرا تھک گئی ہوں ۔۔۔ اور دھیان رکھنا زیادہ دور مت جانا۔۔۔"

ارحم کے دل کی مراد بر آئی تھی۔ جنت سلیقے سے دوپٹا درست کرتی اس کے ساتھ پگڈنڈی پر

آگے آگے چل پڑی۔اسے اپنی زمینیں اپنی فصلیں دکھانے لگی اس کی پشت پر کمر تک آتا ایک لمبا سا پراندہ جھول رہا تھا۔

"آج پھر کہیں راستہ بھولنے کا ارادہ تو نہیں آپ کا۔۔۔" جنت نے آگے آگے چلتے ہوئے ازراہ مذاق پوچھا

"بالکل نہیں۔۔۔اب تو پاؤں نے راستے پہچان لیئے ہیں۔اب تو منزل تک پہنچ کر ہی دم لینا ہے۔۔۔" ارحم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ذومعنی جواب دیا

"منزلیں اتنی آسانی سے اور اتنا جلدی تھوڑی ملتی ہیں۔۔بہت سی کٹھنائیوں کو پار کرنا پڑتا ہے۔"

"میں مشکلات سے نہیں گھبراتا۔۔۔عادی ہو چکا ہوں اب۔مجھے یقین ہے میری منزل مجھے بہت جلد مل جائے گی۔"

"وہ کیسے۔۔۔؟"

"کیونکہ میری منزل بالکل میرے سامنے ہے۔۔۔" ارحم اسے ذومعنی جملوں اور اشاروں میں سمجھا رہا تھا

"پھر تو اچھی بات ہے۔کمال کے ہیں آپ۔۔۔"

"ابھی آپ نے میرے کمال دیکھے ہی نہیں ہیں۔۔۔"

"اچھا کیا کیا کمالات ہیں آپ میں۔۔۔؟"

"باقی سب کو چھوڑیئے۔۔۔یہ میں نے کبھی تصور میں آپ کی تصویر بنائی تھی۔آپ صرف یہی کمال دیکھ لیں۔دیکھیں میں نے ہوبہو آپ کو تراشا ہے نا۔۔۔"

ارحم نے تصویر اس کے سامنے کھول دی۔۔۔اور وہ بھی حقیقت میں تصویر میں اپنے آپ کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔تصویر سامنے رکھے اسے ایسا لگا جیسے وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو۔۔۔وہی آنکھیں، وہی ناک، وہی ہونٹ۔۔۔وہ اپنے سامنے دوسری جنت کو دیکھ رہی تھی

"کیسی لگی۔۔۔؟" اسے تصویر میں کھویا دیکھ کر ارحم نے اسے چونکایا

" بہت اچھی ہے ۔۔۔لیکن آپ نے یہ کیسے ۔۔۔میرا مطلب ہے ہم تو ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں ۔۔۔پھر پھر آپ نے میرا چہرہ کیسے بنالیا بغیر دیکھے ۔"

سر جانسن کی بات سچ ثابت ہو رہی تھی وہ واقعی اپنا چہرہ دیکھ کر حیرتوں میں ڈوبی ہوئی تھی ۔۔۔اور ارحم بھی اپنے اندر ایک عجیب سی خوشی سی محسوس کر رہا تھا جسے وہ بیان کرنے سے قاصر تھا

" آپ نہیں جانتی تھی مجھے ۔لیکن شاید میں آپ کو جانتا تھا ۔۔۔بہت پہلے سے ۔"

جنت نے چونک کر تصویر سے سر اٹھا کر ارحم کی طرف دیکھا

" میں کچھ بھی نہیں سمجھی ۔۔۔"

" کچھ باتیں کبھی سمجھ ہی نہیں آتیں ۔۔۔ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں ۔"

" آپ تو سچ میں مجھے الجھا رہے ہیں آج ۔۔۔" اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آیا

" الجھے لوگ ہی سلجھنے کی کوشش کرتے ہیں پھر ۔۔۔آپ کا الجھنا بے مقصد نہیں ہے ۔"

جنت ابھی بھی کچھ نہیں سمجھی تھی ۔وہ تصویر فولڈ کر کے اسے تھمانے لگی

" یہ آپ کیلئے ہی ہے ۔۔۔میں آج آپ کو دینے کیلئے ہی اسے یہاں لایا تھا ۔میری طرف سے گفٹ سمجھ لیں ۔۔۔"

" مگر میں اسے نہیں رکھ سکتی ۔۔۔" جنت نے معزرت کر لی ۔ارحم کا چہرہ بجھ گیا ۔

" لیکن کیوں ۔۔۔میں بہت دل سے لایا تھا آپ کیلئے ۔۔۔"

" آپ کا بہت شکریہ ۔۔۔لیکن میں اسے نہیں لے سکتی ۔بس آپ سمجھ لیں آپ کا تحفہ قبول کر لیا میں نے اور مجھے حقیقتاََ بہت خوشی ہوئی ہے" وہ خاموش ہوگیا

وہ خاموش ہوگیا ۔اسے امید نہیں تھی کہ جنت اس کا اتنے پیار سے دیا گیا گفٹ قبول کرنے سے معذرت کر لے گی ۔

" اب چلیں واپس ۔۔۔؟"

وہ دونوں واپس آگئے ۔۔۔اس کی امیدیں ٹوٹنے لگی ۔کتنے دل سے وہ جانے کیا کیا سوچ کے

آیا تھا۔۔۔
اس نے دل ہی دل میں خدا سے دعا کی یا اللہ اس لڑکی کو میرے نصیب میں لکھ دے۔پہلی بار مجھے محبت ہو رہی ہے۔میری محبت کو ثمر آور ٹھہرانا۔
اس کے دل کے کس کونے میں جنت کی محبت کی ایک چھوٹی سی کونپل پھوٹ چکی تھی۔اب اس کونپل نے پرورش پا کر ایک تناور درخت کی صورت اختیار کرنی تھی

☆......☆......☆

"بی بی۔۔۔وہ لوگ اس رشتے پر تیار ہی نہیں ہیں۔۔۔دو بار انکار کر چکے ہیں زمیندار صاحب۔اب بار بار جانا مناسب نہیں ہے۔۔۔"
نانی تاج نے دین محمد کو اپنے ساتھ چلنے کا کہا تو انہوں نے انکار کر دیا۔
"ایک اور کوشش کر لینے میں تو کوئی حرج نہیں ہوتا۔خوشی کو میں نے پالا ہے۔میرا بھی تو کچھ فرض بنتا ہے کہ کم از کم میرا ضمیر مجھے یہ گلہ تو نہیں دے گا کہ میں نے اپنے خوشی کیلئے کوئی کوشش ہی نہیں کی۔"
نانی بضد رہیں
"مگر وہ لوگ کیا سوچیں گے۔ایک ہی بات کو لے کر بار بار انہیں تنگ کرنا مناسب ہے۔شاید خوشی کے نصیب میں جنت نہیں ہے۔۔۔"
"دین محمد۔۔۔میں بھی جانتی ہوں یہ عمل دہرانا غیر مناسب ہے۔صرف ایک آخری بار۔۔۔بس ایک آخری کوشش۔۔۔پھر کبھی نہیں۔۔۔کیا پتا میرے خوشی کے نصیب میں جنت لکھ دی گئی ہو۔۔۔"
نانی نے انہیں منوا کر ہی دم لیا۔۔۔ایک آخری کوشش کرنے وہ تینوں آج پھر اس چوکھٹ کو عبور کر رہے تھے۔
آج بھی ان کا استقبال اسی گرمجوشی سے کیا گیا تھا جو پہلی بار کیا گیا تھا۔بلکہ آج تو نور بانو بہت زیادہ خوش تھی آج ان کے گھر نانی جنت خود چل کر آئی تھیں۔
آج زمیندار صاحب کے رویئے میں بھی کافی تبدیلی تھی۔وہ جان چکے تھے کہ نور بانو اور جنت

اس کے فیصلے پر دل سے خوش نہیں ہیں ۔گھر کے ماحول میں تبدیلی ، اداسی اور ہر وقت رہنے والی خاموشی سے وہ بہت کچھ محسوس کر چکے تھے ۔دل ہی دل میں جان چکے تھے کہ ایک ان کو چھوڑ کر باقی سب اس رشتے پر دل سے خوش ہیں ۔سو یا تو اپنی انا کو پانی دیا جا سکتا تھا ۔یا پھر سب کی خوشی ۔۔۔اور سب کی دلی خوشی اسی ایک رشتے سے جڑی تھی ۔جو صرف اسی کی وجہ سے رکا ہوا تھا ۔سب کی خوشی اسی ایک کی ہاں کے پیچھے رکی ہوئی تھی

"پتر ۔۔۔ہم جنت کے رشتے کیلئے ایک بار پھر درخواست کرنے آئے ہیں ۔اس رشتے میں ہی سب کی خوشی ہے ۔ٹوٹے دل جڑ جائیں گے ۔سب پھر سے ایک ہو جائیں گے ۔اللہ نے ان بچوں کو زریعہ بنایا ہے ۔ورنہ زندگی کا کیا ہے زیادہ گزر گئی ہے تھوڑی رہ گئی ہے ۔اتنی زندگی پہلے گزر گئی ہے تو اس رشتے کے بغیر آگے بھی گزر جائے گی ۔

مگر اس طرح سے نہیں گزرے گی جس طرح گزرنی چاہیئے ۔

بیٹا ۔۔۔پرانی باتوں کو دل سے نکال دو ۔آگے کا سوچو ۔اگلی نسلوں کا سوچو ۔بچوں کی خوشی کا سوچو جو ہوا وہ نصیب میں لکھا تھا ہونا ۔۔۔اب ہو چکا سالوں پہلے گزر چکا ۔۔۔تلخ ضرور تھا مگر اس تلخی کی وجہ سے ہم اپنے بچوں کی شیرینی تو ختم نہیں کر سکتے نا ۔

خوشی کو میں نے پالا ہے ۔جوان کیا ہے ۔میں اچھی طرح جانتی ہوں اسے ۔وہ بہت خوش رکھے گا تمہاری جنت کو ۔وہ صرف تمہاری جنت نہیں ہے ہم سب کی جنت ہے ۔ھم سب کو عزیز ہے ۔۔۔

اور اگر بات غربت امارت کی ہے تو پتر پیسہ اصل خوشی نہیں دے سکتا ۔اہمیت پیسے کی نہیں ہوتی ۔رشتوں کی ہوتی ہے ۔خون کی ہوتی ہے ۔احساسات اور جذبات کی ہوتی ہے ۔دلی خوشی کی ہوتی ہے ۔اور دلی خوشی کا باعث بننے والے انسانوں کی ہوتی ہے ۔اور یہ بچے ہم سب کی دلی خوشی کا باعث بن رہے ہیں تو ان خوشیوں کو آنے دو ۔ان کے راستے میں آڑ نا بنو ۔۔۔

ہم ایک بار پھر جھولی پھیلانے آئے ہیں ۔اس بار ہمیں خالی ہاتھ نا بھیجنا "

"نانی آپ صحیح کہہ رہی ہیں ۔میں نے جان لیا ہے سب کی خوشی اسی رشتے میں ہے ۔جب سب

خوش ہیں تو میں کیوں سب کی خوشیوں میں روڑے اٹکاؤں ۔میں کیوں دو خاندانوں کے ملاپ کا راستہ روکوں ۔۔۔؟؟؟" ایک طویل خاموشی اور نانی کی ساری باتیں سننے کے بعد وہ بولا تھا۔سب کی نظریں اب اسی ایک کے چہرے پر جمی تھیں ۔سب کے کان اسی کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کو سننے پر لگے تھے

" میں راضی ہوں جنت اور خوشی کے رشتے کیلئے ۔۔۔میں اپنی جنت آپ لوگوں کو سونپتا ہوں ۔آگے اس کا مقدر اس کا اپنا نصیب ۔۔۔میں نے اپنی جنت اللہ اور آپ لوگوں کے حوالے کی۔"

زمیندار صاحب پگھل گئے تھے ۔وہ اتنے بھی خود غرض نہیں تھے کہ ایک اپنے لیئے سب کی خوشیوں پر پاؤں رکھ دیتے ۔انہوں نے ہاں کر دی ۔خوشی کیلئے جنت دینے پر تیار ہو گئے ۔۔۔

وہاں صرف ان کی ایک ہاں سن کر سب کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی تھی ۔عورتیں ایک دوسرے کے گلے لگ کر آنسوؤں بہا رہی تھی ۔دین محمد نے اٹھ کر زمیندار صاحب کو گلے لگا لیا۔

اندر بیٹھی جنت بھی رو رہی تھی ۔خوشی کی جنت خوشی کے ملنے پر خوشی سے رو رہی تھی ۔۔۔

وہ لوگ گھر واپس گئے ۔اس دن عید نہیں تھی لیکن پھر بھی دین محمد کے گھر میں عید کا سا سماں تھا ۔خوشی کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس کا رشتہ جنت سے ہو گیا ہے ۔اسے اس کی جنت مل گئی

اس نے جوش سے ارحم کو گلے لگا کر سرپرائز دیا۔اور اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوش خبری سنائی

" ارحم تم جانتے ہو آج میں کتنا خوش ہوں ۔آج مجھے میری جنت مل گئی ہے ۔مجھے میری محبت مل گئی ہے ۔ارحم آج کا دن میری زندگی کا سب سے خوبصورت دن ہے ۔۔۔" وہ خوشی سے بھر پور لہجے میں ارحم کو بتا رہا تھا اور ارحم کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلتی جا رہی تھی ۔وہ کہیں نیچے ،بہت نیچے گرتا جا رہا تھا ۔اور اگر خوشی کی زندگی کا یہ خوشگوار اور خوبصورت ترین دن تھا تو ارحم کی زندگی کا شاید یہ ناخوشگوار ترین دن تھا ۔اس کا سر چکرانے لگا ۔گھر ،کمرے ،دیواریں گول گول گھومتی نظر آنے لگیں"

اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی اسے ایسے موڑ پر لا کھڑا کرے گی ۔اسے زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی سے محبت ہونے لگی تھی ۔اور چند ہی دن بعد اسے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ تو اس کے بھائی کی محبت

ہے ۔وہ دونوں تو ایک دوسرے کو چاہتے ہیں ۔بے پناہ چاہتے ہیں ۔وہ دونوں تو بنے ہی ایک دوسرے کیلیئے تھے۔

اسے لگا کہ میں تو ایسے ہی بیچ میں آ گیا۔۔۔مجھے تو ان کی محبت میں نہیں آنا چاہیئے۔۔۔

اور میں آؤں گا بھی نہیں ۔میں اپنے بھائی کا رقیب کیسے بن سکتا ہوں بھلا۔میں اپنے بھائی کے مقابل کیسے کھڑا ہو سکتا ہوں بھلا۔میں بھلا اپنے بھائی کو کیسے کوئی دکھ دے سکتا ہوں ۔میں اس سے اس کی محبت کیسے چھین سکتا ہوں۔

اس کے دل میں جو محبت کی چھوٹی سی کونپل کھل رہی تھی وہ وہیں مرجھا گئی۔کسی کے پاؤں تلے آ گئی ۔اس کی کمزور جڑیں اکھڑ گئیں ۔اس کی زندگی وہیں پوری ہو گئی

اور خوشی اور باقی سب گھر والے اتنے خوش تھے کہ انہیں ارحم کا بجھا چہرہ نظر ہی نہیں آیا۔انہیں اپنی خوشی میں محسوس ہی نہیں ہوا کہ کوئی اور زندگی بجھنے لگی ہے۔

اس دن دین محمد کے گھر میں پکوان پکے تھے ۔دین محمد نے اپنی حیثیت کو بھی نہیں دیکھا ۔چاولوں کی دیگ پکوا کر اللہ کے نام پر بانٹی گئی تھی۔

سب خوشیاں منا رہے تھے اور وہ سر درد کا بہانہ کیئے اندر سویا کانوں میں ہینڈ فری لگائے آنکھیں بند کر کے ایک بازو آنکھوں پر رکھے نصرت فتح علی خان کو سن رہا تھا

"سن چرخے دی مٹھی مٹھی کوک

سن چرخے دی مٹھی مٹھی کوک

ماہیا مینو یاد آنودا۔۔۔

میرے دل وچوں اٹھدی اے ہوووووک ک ک۔۔

ماہیا مینوں یاد آنوداااا۔۔

میری عید وال چن کدوں چڑے گا۔۔چڑے گا۔۔

اللہ جانے ماہی کدوں وہیڑے وڑے گا

دکھ ڈاڈھے نے تے جندڑی ملوک

ماھیا مینوں یاد آنودا

سن چرخے دے مٹھی مٹھی کوک ک ک

ماھیا مینوں یاد آنودا۔اااا۔۔۔"

جب اس سے بھی دل نہیں بھرا تو اپنے بیگ سے اپنی بانسری نکال کر باہر نکل آیا دریا کی طرف ۔۔۔سورج بہت دور پانی میں اتر کر غروب ہو چکا تھا۔اندھیرا اپنے پر پھیلانے لگا۔

دریا کا کنارہ ویران پڑا ہوا تھا۔کوئی کشتی بھی دور دور تک کہیں نظر نہیں آتی تھی۔کنارے سے بھی لوگ واپس جا چکے تھے۔اور ارحم دریا کے کنارے بیٹھا بانسری بجاتا رہا۔اپنے دکھڑے ہواؤں کو کانوں میں گھولتا رہا۔سر بکھیرتا رہا۔ہوائیں اس کے ساتھ بے آواز روتی رہیں۔وہ رات کو دیر تک وہیں بیٹھا بانسری بجاتا رہا۔اس رات وہ بہت دیر سے گھر واپس گیا تھا

دل باغی ہو رہا تھا۔بار بار بغاوت پر اکسا رہا تھا اسے سمجھا رہا تھا کہ اپنی محبت حاصل کرنے کیلئے ہر رکاوٹ کو روند دینا چاہیئے۔محبت اور جنگ میں جب سب جائز ہوتا ہے تو پھر یہ فرق کیوں رکھا جائے کہ سامنے والا تمہارا دشمن ہے یا تمہارا بھائی۔

ارحم کا دل چیخ چیخ کر اسے اکسا رہا تھا اسے مجبور کر رہا تھا۔اور اسے آگے کا راستہ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔۔۔دو آپشن تھے

بھائی یا محبت۔۔۔

☆......☆......☆

"آج تو آپ بہت خوش دکھائی دے رہے ہیں۔۔۔کوئی خاص بات ہے۔۔۔؟" آج خوشی پھر سے سکائپ پر کوکب سے بات کر رہا تھا۔

اب تو اسے خود سے بھی سکائپ پر کال کرنا آ گیا تھا۔اب اسے ارحم کی ضرورت بھی نا پڑتی۔

اسے یہ اپنی نئی بننے والی دوست بہت اچھی لگی تھی۔بہت ہنس مکھ سی، چلبلی سی، ہر وقت ہنسنے

ہنسانے والی۔اور سب سے بڑی بات اس کے چھوٹے بھائی ارحم کو چاہنے والی

"ہاں جی آج میں بہت خوش ہوں۔۔۔آج مجھے میری جنت مل گئی ہے۔ہمارا رشتہ طے ہوگیا ہے۔"

خوشی نے اپنی خوشی اپنی دوست کے ساتھ بانٹنا لازمی سمجھا

"کیا مطلب۔۔۔جنت سے کسی کا رشتہ کیسے ہوسکتا ہے۔۔؟"کوکب حیران تھی

خوشی کھلکھلا کر ہنس پڑا

"ارے۔۔۔وہ والی جنت نہیں۔میری جنت۔۔۔نور بانو پھپھو کی بیٹی۔۔۔تمہاری ہونے والی بھابھی۔۔۔اس کا نام جنت ہے۔"

"اووہ۔۔اچھا۔۔پھر تو مبارک ہو آپ کو۔۔۔میرے حصے کی مٹھائی،میرا گفٹ،کوئی پارٹی۔۔۔؟؟؟"

"پارٹی وارٹی ہم کرتے نہیں۔دادا ابو نے چاولوں کی پوری دیگ خیرات کی ہے۔ہماری تو وہی خیرات بھی ہوگئی اور پارٹی بھی۔۔۔

اور گفٹ۔۔تم پاکستان آجاؤ۔۔۔مل جائے گا گفٹ۔"

"ارے واہ۔۔۔اتنی دور ایک گفٹ لینے کیسے آؤں میں۔"

"ہاں تو آجاؤ۔۔۔گفٹ بھی مل جائے گا ہم مل بھی لیں گے اور پاکستان بھی دیکھ لینا"

اچھا اگر میں آبھی گئی تو کیا گفٹ دو گے مجھے۔۔۔"

"جو آپ منہ سے نکالیں گی ملے گا۔۔۔جو بولیں گی حاضر کردوں گا۔چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو۔"

"اتنے بڑے دعوے۔۔۔خیال کرو دوست۔۔۔میں نے کچھ قیمتی مانگ لینا ہے پھر مکرمت جانا۔۔"

"میں زبان دے کر پوری کرنے والا ہوں مکرنے والا نہیں۔۔۔"

"میں کچھ ایسا بھی تو مانگ سکتی ہوں جس کی کوئی قیمت نا ہو۔۔۔بے مول ہو نایاب ہو۔۔۔"

" آپ میری دوست ہیں تو میری حیثیت دیکھ کر ہی مانگنا نا۔۔کیوں اپنے دوست کو مشکل میں ڈالو گی۔۔۔"

" ارے میں صرف مزاق کر رہی تھی۔۔۔فکر نا کرو تم۔۔۔"

" ایک بات پوچھوں اگر تم سچ بتاؤ تو۔۔۔"

" ہاں پوچھو۔۔۔؟"

" تم ارحم کو چاہتی ہو نا۔۔۔پیار کرتی ہو نا اس سے۔۔۔؟"

کوکب کو ایسے کسی سوال کی امید نہیں تھی۔وہ چپ رہ گئی

" آپ کو کس نے بتایا یہ سب۔۔۔ارحم نے۔۔۔؟"

" نہیں اس نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔۔میں نے خود محسوس کیا ہے۔تمہاری آنکھوں نے بتایا ہے، تمہارے لفظوں نے بتایا ہے، تمہارے لہجے نے بتایا ہے، میں نے آپ کی آنکھوں میں ارحم کیلئے چاہت پڑھی ہے۔۔۔"

" ہاں کرتی ہوں۔۔۔" کوکب نے سر تسلیم خم کر دیا۔دل ہی دل افسوس بھی کیا کہ ایک گاؤں کا لڑکا اس سے میلوں دور رہ کر کچھ دن بات کر کے اس کی آنکھوں میں چھپی شبیہہ ڈھونڈنے میں ناکام ہو گیا۔جبکہ ارحم سالوں تک اس کے قریب رہ کر بھی اپنے لیئے چاہت نہیں پڑھ پایا تھا

" کتنا۔۔۔؟"

" محبت کا کوئی پیمانہ ہوتا ہے کبھی۔۔؟؟؟

آپ کتنا چاہتے ہیں اپنی جنت کو۔۔۔؟؟؟"

وہ غلط سوال پوچھ بیٹھا تھا۔محبت تو کبھی نہیں ماپی جاتی۔دنیا میں ابھی تک ایسا کوئی پیمانہ ایجاد ہی نہیں ہوا

۔جو محبت کو ناپ سکے۔دنیا نے اونچی سے اونچی، چھوٹی سے چھوٹی، باریک سے باریک اور گہری سے گہری چیز کیلئے پیمانے ایجاد کر لیئے ہیں۔مگر کوئی بھی محبت ماپنے کا کوئی پیمانہ آج تک ایجاد

نہیں کر پایا

"ہاں واقعی محبت کی پیمائش تو ممکن ہی نہیں ۔۔۔اگر زندگی میں کبھی کسی ایک خواہش کے پورا ہونے کا موقع ملے تو کونسی خواہش پوری کرنا چاہو گی۔۔۔"

"آپ نے کبھی کسی اندھے سے پوچھا ہے۔کہ اسے کیا چاہیئے۔وہ فوراً کہے گا دو آنکھیں۔۔۔ میں بھی ایسے ہی ارحم کو مانگوں گی۔۔۔"

"اور اگر ارحم مل جائے تو۔۔"

"جو چیزیں ممکنات میں ہی نا ہوں ان کے بارے کیا کہوں اب"

"تم بتاؤ۔۔۔اور اگر مل جائے تو۔۔۔؟؟؟" وہ ضد رہا

"تو میں سمجھوں گی کہ دنیا میں مجھ سے بڑا کوئی اور خوش نصیب نہیں ہے۔کیونکہ میں نے جو چاہا جو مانگا مجھے مل چکا ہوگا۔۔۔"

"تو پھر سمجھ لو کہ تم دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی بننے والی ہو۔۔ارحم تمہیں ضرور ملے گا۔۔۔خود تمہیں بلائے گا ۔خود درخواست کرے گا کہ کوکب میں ادھورا ہوں مجھے مکمل کر دو۔۔۔میری زندگی میں شامل ہو جاؤ۔۔"

کوکب نے کرب سے قہقہہ لگا دیا

"یہی سب میں بھی اس سے کہتی تھی۔اسی بات کیلئے میں نے اس سے شرط لگائی تھی۔لیکن میں غلط تھی میں ہار گئی ہوں۔میں نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔"

"نہیں آپ جیتنے والی ہو۔۔۔ابھی سے گھٹنے نا ٹیکو۔۔۔آپ ضرور جیت جاؤ گی۔میرا وعدہ ہے آپ سے۔۔۔"

"یہ ناممکنات میں سے ہے میرے بھولے دوست۔۔۔"

"نانی کہتی ہیں کہ دعائیں مقدر تبدیل بھی کر دیتی ہیں۔۔۔میں دعا مانگوں گا آپ کیلئے۔۔"

وہ مسکرا دی۔۔۔بہت سا پیار آیا تھا کوکب کو اس خوبصورت دل کے مالک لڑکے پہ۔جانے ارحم اس جیسا کیوں نہیں ہے۔اس کا اپنا دل بھی تو بیری تھا اس کا۔اس نے بھی تو ایسے لڑکے کو جا کے چنا

جو بے حس تھا بے پرواہ تھا۔

اور اب دل کی یہ خواہش کہ وہ میرا ہو جائے، کیسے ہی کسی طرح سہی بس میرا ہو جائے۔دل کو کون سمجھائے کہ ناممکنات کبھی ممکن نہیں ہوتے۔مگر یہ دل ہے اور دل کا دماغ تھوڑی ہوتا ہے جو کچھ سمجھ جائے۔دل تو بغیر دماغ کے ہوتا ہے۔۔۔پاگل

"ہم سانجھ سمے کی چھایا ہیں تم چڑھتی رات کے چندرما
ہم جاتے ہیں تم آتے ہو پھر میل کی صورت کیونکر ہو
دل ہجر کے درد سے بوجھل ہے اب آن ملو تو بہتر ہے
اس بات سے ہم کو کیا مطلب یہ کیسے ہو یہ کیونکر ہو"

☆......☆......☆

"نانی۔۔۔میں بہت تھک گیا زندگی سے۔۔۔"

خوشی کے رشتہ ہونے کے کچھ دن بعد وہ نانی کے پاس آبیٹھا

"کیوں کیا ہوا پتر۔۔خیر تو ہے طبیعت ٹھیک ہے تمہاری۔۔؟"

نانی فکرمند ہونے لگیں

"کبھی کبھی دل چاہتا ہے بس بولتا رہوں۔۔بولتا رہوں اتنا بولوں کہ سننے والے تھک جائیں۔کبھی دل چاہتا ہے کہ خاموش ہو جاؤں ہمیشہ کیلئے۔ایک لفظ بھی کبھی منہ سے نا نکالوں۔سب میری آواز سننے کو ترس جائیں۔۔۔"اس نے اپنی کیفیت بیان کی

"ارحم بیٹا۔۔۔ایسی کیا بات ہوئی ہے۔کیا ہوا ہے۔۔۔کوئی مسئلہ ہے۔۔۔؟"

"نانی جب انسان کی چاہت اس کے رشتوں کے مقابلے میں آکھڑی ہو تو اسے کیا کرنا چاہیے کس کا انتخاب کرنا چاہیے۔۔؟"

"رشتوں کا۔۔۔کیونکہ رشتے بہت انمول ہوتے ہیں۔۔۔"

"اور چاہت چھوڑ دینی چاہیئے۔؟ چاہت انمول نہیں ہوتی۔۔۔؟"

"چاہت بھی انمول ہوتی ہے۔مگر انسان کو ہمیشہ رشتوں کو زیادہ ترجیح دینی چاہیئے۔۔"

"کیا اپنی چاہت کو چھوڑ دینا اتنا آسان ہوتا ہے۔جب وہ آپکی آنکھوں کے سامنے بھی ہو۔"

"تو اس سے دوری اختیار کر لینی چاہیئے۔جتنا آنکھوں کے سامنے ہوگی اسے چھوڑنے میں اتنی ہی دشواری ہوگی۔"

"میں عجیب سے دوراہے پر آ کھڑا ہوں نانی۔۔۔کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا کیا کروں کون سا راستہ اپناؤں۔ایک طرف رشتے ہیں ایک طرف میری چاہت ہے۔دونوں کو چھوڑنا دشوار ہے میرے لیئے۔۔۔"

"ارحم میں پھر وہی کہوں گی۔جب انسان کی چاہت اس کے رشتوں کے مقابلے میں آ کھڑی ہو۔تو چاہت کو چھوڑ دینا چاہیئے۔رشتوں کو اپنا لینا چاہیئے۔اپنی چاہت چھوڑ دو جو تمہیں چاہتے ہیں ان کا دامن تھام لو۔تمہارے رشتے تمہیں چاہتے ہیں۔کوئی ایسا ہوگا دنیا میں جسے تم چاہتے ہو۔کوئی ایسا بھی دنیا میں ضرور ہوگا جو تمہیں چاہتا ہوگا۔اسے اپنا لو جو تمہیں چاہتا ہے۔چاہنے اور چاہے جانے میں چاہے جانے کا احساس زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔"

نانی کی باتوں نے اس پر بہت سے در کھول دیئے تھے۔اس کیلئے فیصلہ بہت دشوار تھا۔ایک طرف سارے رشتے تھے ایک طرف اس کے دل میں جنت کیلئے روز بروز بڑھتی محبت۔وہ خود پر سے اختیار کھوتا جا رہا تھا۔

ارحم اپنے ڈیڈ کے قرض اتارنے آیا تھا۔یہاں آ کر خود ہی رشتوں کے قرضوں میں پھنسنے لگا۔اس کے باپ کی آخری نصیحت میں یہ لفظ بھی خاص طور پر شامل تھے کہ جو میری اولاد شاہ ولا میں ہے۔وہ محبتوں کو ترسی ہوئی ہے۔اس نے اپنی پیدائش سے باپ کا چہرہ تک نہیں دیکھا۔اسے کبھی اداس نا ہونے دینا۔اسے ہمیشہ خوش رکھنا۔کبھی اس کی آنکھوں میں آنسوؤں مت آنے دینا۔۔۔

ارحم نے بہت زیادہ سوچنے کے بعد آخر کار فیصلہ کر لیا تھا۔اس نے شاہ ولا چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔سب سے دور جانے کا فیصلہ کر لیا۔وہ جانتا تھا اگر یہاں رہا تو وہ خود کو جنت سے محبت کرنے سے نہیں

روک پائے گا اس کی محبت بڑھتی چلی جائے گی۔نانی کی بات پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔چاہت سے دور چلا جائے گا تو آسانی ہو گی۔ابھی محبت اس کے دل میں پھوٹ رہی تھی۔وہ پانی سے دور چلا جائے گا تو محبت کی چھوٹی سی کونپل خود ہی سوکھ جائے گی۔مرجھا جائے گی۔

وہ خوشی کی محبت میں شراکت نہیں کرنا چاہتا تھا۔اس نے اپنی زندگی کا بڑا فیصلہ لے لیا۔

خود کو کہیں گم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔بھیس بدلنے کا فیصلہ کرلیا۔اس دن موقع دیکھ کر ارحم نے اپنے سامان والا بیگ اٹھایا اور چپکے سے شاہ والی سے نکل آیا۔کسی کو بھی بتائے بغیر۔جیسے لندن سے آیا تھا ۔جانتا تھا کسی کو خبر ہو گئی تو کوئی بھی اسے کسی حالت میں جانے نہیں دے گا۔

ارحم نے شاہ والی چھوڑ دیا۔اپنے ڈیڈ کے گاؤں کو اللہ حافظ کہہ دیا۔وہ چلا گیا۔اسے راستوں کی کچھ خبر تھی ناہی منزلوں کا کچھ پتا تھا۔بس اس کے پاؤں جس سمت مڑ گئے اس نے بھی اسی سمت چلنا شروع کر دیا۔بغیر تھکے بغیر رکے۔۔۔وہ انجان منزلوں کا مسافر بن گیا

وہ پھرنے لگا گاؤں گاؤں، گلیوں گلیوں، شہر شہر۔کہیں کسی گاؤں میں بھیس بدل کر بالے کی ریشماں کے تماشے دکھانے،کہیں اسلام آباد کے کسی پارک میں اندھا بن کر بانسری اور گٹار بجانے،کہیں کسی سکول میں جادوگر کے بھیس میں کرتب دکھانے،کہیں کسی تصویری مقابلے میں حصہ لے کر مقابلہ جیتنے، مقصد صرف اپنے آپ کو گم کرنا تھا۔اپنے اندر سے محبت کی پھوٹتی جڑوں کو اکھاڑنا تھا،خوشی کی محبت میں اس کا رقیب بننے سے بچنا تھا۔

سو اس نے بھیس بھی بدل لیئے اور خود کو دنیا کی بھول بھلیوں میں گم بھی کر دیا

☆......☆......☆

ملتان شہر کے بیچوں بیچ وہ اس شہر کے مشہور دربار کے بیرونی دروازے سے آگے کچھ فاصلے پر ایک پرانا کپڑا بچھائے بیٹھا رباب بجا رہا تھا۔بال بڑے بڑے اور الجھے ہوئے تھے جیسے پچھلے کئی ہفتوں سے انہیں دھونے کی نوبت نا آئی ہو۔چہرے پر دو تین ہفتوں کی بڑھی ہوئی شیو نے بھی اس کے حلیے کو عجیب سا تاثر دے دیا تھا۔گلے میں ایک لمبا پرانا چغہ ڈالے وہ آلتی پالتی مارے رباب کے

سر ہواؤں میں بکھیر رہا تھا۔اس کے حلیے سے بالکل بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اکیس بائیس سال کا ایک نوجوان ہے اسے اپنے حلیے نے تیس برس سے بھی زیادہ عمر کا دکھانے میں بھرپور ساتھ دیا تھا۔

یہاں سے سامنے دربار کی طرف نگاہ کی جائے تو قریب سو قدم کے فاصلے پر دربار کا خوبصورت اور منقش نیلا گول گنبد واضح دکھائی دے رہا تھا۔اس بڑے گنبد کے دائیں بائیں دو اور نسبتاً چھوٹے اور منقش گنبد تھے۔اور دربار کے بیرونی بڑے سے لکڑی کے دروازے سے (جس پر چاندی کی چادر چڑھا کر اس پر نفیس بیل بوٹوں کا کام کیا گیا تھا) کثیر تعداد میں مرد وزن اندر حاضری دینے کیلئے ایک لمبی قطار میں داخل ہو رہے تھے۔عقیدت مندوں کا ایک جم غفیر تھا جو دربار کے دروازے پر امڈ آیا تھا۔سب کو ہی درگاہ کی حاضری اور فاتحہ پڑھنے کی جلدی ہو جیسے۔جبکہ دوسرے چھوٹے دروازے سے لوگ ایک قطار میں منظم طریقے سے باہر نکل رہے تھے شاید یہ ان لوگوں کی قطار تھی جو دربار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد اب واپس جا رہے تھے۔لکڑی کے بڑے اونچے دروازے سے بائیں طرف ایک الجھے اور بڑے بڑے براؤن رنگ کے بالوں والا بوڑھا اپنے آدھے جسم پر رنگ برنگی چادر تانے سویا ہوا تھا خدا جانے محوِ خواب تھا یا جاگ رہا تھا دور سے دیکھنے سے کچھ بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔اس کے اس طرح بے فکری سے سوئے رہنے سے یہی لگتا تھا جیسے ایک لمبے عرصے سے یہی اس کا ٹھکانہ ہو اور اس طرح بے فکری سے سونے پر اسے دربار کے سیکورٹی عملے سے کوئی بھی کسی قسم کی رکاوٹ نا ہو۔

وہ گردن جھکائے اپنی ہی دھن میں رباب بجاتا رہا کچھ لوگ درگاہ حاضری کے بعد اس کے پاس جمع ہونے لگے مگر اس نے اوپر گردن اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔لوگ اس کے فن پر حیران تھے کہ حلیہ دیکھو اور اس میلے کچیلے حلیے میں چھپے فقیر بندے کا ہنر دیکھو۔جھونپڑیوں میں بھی لعل وگوہر چھپے ہوتے ہیں آج یہ مثل اس رباب بجاتے بندے پر عین پوری اتر رہی تھی۔لوگ داد دیئے بنا نہیں رہ سکے۔جانے کب وہ میلے کپڑوں والا بوڑھا جو دربار کے دروازے کے پاس سویا ہوا تھا اٹھ کے اس کی رباب سننے پہنچ گیا۔وہ اپنی اسی پہلی دھن میں بجاتا رہا بجاتا رہا جب تک اس کے ہاتھ تھک نا گئے۔جب تک انگلیوں کے سرے درد نا کرنے لگے۔اور جب وہ تھک چکا تو اچانک رباب بجانا بند کر دیا

۔انگلیاں ساکت ہوئیں تو فضا میں جو ایک سحر گھلا ہوا تھا وہ اچانک ٹوٹ سا گیا۔لوگ اس کی تعریف کرتے ہوئے اور تھوڑے بہت پیسے اس کے سامنے بچھے کپڑے پر پھینکنے کے بعد ادھر ادھر بکھر نے لگے ۔وہ اپنا سامان سمیٹنے لگا تو اس کی نگاہ اپنے ساتھ پڑے اسی میلے کچیلے بوڑھے پر پڑی جو آتے ہی لوگوں کے بیچوں بیچ راستہ بناتا اس کے پاس آ کے سو چکا تھا اور جب اس نے اپنا رباب بند کیا تو بوڑھے نے بھی ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دی۔

"کیوں بند کر دیا بچے۔۔۔؟" لوگ چلے گئے تو بوڑھے نے پھٹے ہونٹوں سے سوال کیا

"تھک گیا ہوں بابا۔۔۔"

"کس سے۔۔۔؟" عجیب سا سوال آیا

"ہر چیز سے۔خود سے،اس دنیا سے،اس دنیا کی رونقوں سے،اپنے اندر کی وحشتوں سے"

"ایسا کیوں۔کیا ہوا ہے۔۔۔؟"

"کچھ معلوم نہیں بابا۔۔۔چلتا ہوں۔۔۔" وہ رباب اپنے تھیلے میں رکھ کر اٹھنے لگا

"کہاں جاؤ گے۔۔۔گھر کہاں ہے تمہارا۔۔۔"

"کہیں بھی چلا جاؤں گا۔گھر کوئی نہیں ہے۔بنجارہ سمجھ لیں۔" وہ اب اٹھ کھڑا ہوا تھا

"آج رات میرے ساتھ گزارلو۔۔۔میرا بھی گھر نہیں ہے۔" وہ بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا جو ابھی زمینی فرش پر سویا سکون سے اس سے باتیں کر رہا تھا

وہ کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گیا۔سوچ رہا تھا کیا جواب دے

"بنجاروں کا تو کوئی گھر نہیں ہوتا مجھے بھی بنجارہ ہی سمجھ لو اپنے جیسا۔" بوڑھے نے اسے خاموش دیکھ کر اپنے اسی پہلے لہجے میں کہا

"کہاں گزاریں گے ہم رات۔۔؟" لڑکے نے اس کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ویسے بھی تو کہیں نا کہیں کسی نا کسی ہوٹل میں رات گزارنی ہی تھی۔آج رات اس بابے کے ساتھ ہی سہی۔ایک نیا تجربہ ہی سہی

"یہیں ۔۔۔" بوڑھے نے یک لفظی جواب دیا۔ بابے کے جواب سے وہ تھوڑا سا متذبذب ہوا پھر فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا

"ٹھیک ہے باباجی ۔۔۔ اور کھانا کہاں سے کھائیں گے ۔۔۔؟"

" آجائے گا۔ پہلے کبھی اس نے بھوکا سلایا ہے جو آج بھوکا رکھے گا۔۔۔"

نوجوان کی گردن نفی میں ہلنے لگی۔ اسے بابا اچھا لگا تھا

اتنے میں دربار سے ملحق مسجد سے مغرب کی اذان سنائی دینے لگی۔

" نماز پڑھ لو ۔۔۔ پھر یہیں آجانا" اذان ختم ہوئی تو بوڑھا پھر اس سے مخاطب ہوا

" اور آپ ۔۔۔؟" اس نے بوڑھے کو مطمئن انداز میں سوئے دیکھ کر کہا جو اسے تو نماز کی تلقین کر رہا تھا مگر خود سکون سے سویا ہوا تھا

" میں پڑھ لوں گا۔ جاؤ وقت گزر جائے گا۔" وہ حیران ہوتا بوڑھے کے ساتھ اپنا مختصر سا سامان رکھ کر مسجد کی طرف چل دیا۔

خدا جانے آج کتنے عرصے بعد اس نے بارگاہِ الہی میں اپنی جبیں کو زمین پر رکھا تھا۔ سجدے میں خدا کی تعریف سرگوشیوں میں بیان کرتے ہوئے اس کے دل میں ایک پرسکون سا احساس اتر رہا تھا ۔ جیسے اس نے سالوں تک صحراؤں کی خاک چھاننے کے بعد اچانک سامنے آئے کسی ٹھنڈے چشمے میں چھلانگ لگا دی ہو۔

نماز ختم کرنے کے لوگ آہستہ آہستہ مسجد سے نکلنے لگے مگر اس کے ہاتھ ابھی بھی دعائیہ انداز میں بلند تھے ۔ ہونٹ ایک رفتار کے ساتھ ہل رہے تھے ۔ اس کے دل سے صدائیں نکل رہی تھیں ۔" اے بزرگیوں کے عظیم رب ۔۔۔! میں تھک گیا ہوں ۔ آبلا پا ہو چکا ہوں ۔ مجھے ایک ٹھکانہ عطا فرما۔ میرے قدموں کو آرام نصیب فرما۔ دل کو سکون نصیب فرماء۔ اور میں نے جس مقصد کیلئے اپنے گھر اور گھر والوں کو چھوڑا ہے مجھے اس مقصد میں مکمل کامیابی نصیب فرما۔ میرے دل میں جو جنت کی محبت ایک کونپل کی صورت پھوٹ رہی تھی اسے جڑ سے اکھاڑ پھینک ۔ مجھے اپنے بھائی کی محبت پر ہرگز ڈاکہ نہیں ڈالنا

۔مالک تو عظیم ہے سب کچھ تیرے ہاتھ ہے۔اے عظمتوں کے رب۔۔۔میری التجائیں اپنی بارگاہ میں قبول ومقبول فرما۔آمین" دعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو دل میں ٹھنڈک سی اترنے لگی۔تھوڑی دیر مزید مسجد میں بیٹھنے کے واپس وہ مسجد سے باہر نکل آیا۔مسجد کی اندرونی روشنیوں سے باہر نکلا تو باہر اندھیرے نے اپنی تاریک چادر تانی شروع کر دی تھی۔وہ قدم قدم چلتا ہوا واپس اپنی جگہہ پہنچا تو فقیر ابھی بھی اسی حالت میں سویا پڑا تھا۔اس کے قریب پہنچتے ہی بوڑھے کی آنکھیں بھی وا ہو گئیں شاید اس نے قدموں کی چاپ سن لی تھی۔۔۔

"آگئے ہو واپس لڑکے۔۔۔بڑے عرصے سے پیاسے تھے۔۔۔"اس کے بیٹھتے ہی بوڑھے نے پہلا سوال کیا

"ہاں۔۔۔بابا بڑے عرصے کی پیاس تھی۔خشک ہونٹوں کو آج پانی میسر آیا تو اندر کچھ سیرابی اتری ہے۔۔۔"

"دنیا سے کیوں تھک گئے ہو۔۔۔؟"بوڑھے نے عجیب سوال داغ دیا۔

"کچھ خبر نہیں۔۔۔شاید بہت زیادہ بھاگتا رہا ہوں۔۔۔"

"کس سے۔۔۔؟"ایک اور مختصر سوال آیا تھا

"خود سے۔۔۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"اس کیوں کا جواب ہوتا تو بھاگتا ہی کیوں۔۔۔"وہ بوڑھے کے عجیب سوالوں سے تھکنے لگا تھا

"انسان اگر اپنے آپ سے بھاگنے کی بجائے اپنے آپ کی طرف بھاگے تو سارے جواب بھی مل جاتے ہیں اور وہ تھکتا بھی نہیں ہے۔۔۔" جواب دیتے ہوئے بوڑھے کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی تھی جیسے سمجھ گیا ہو کہ نوجوان اس کے سوالوں سے تنگ آ گیا ہے۔

لڑکا حیران رہ گیا تھا

"نام کیا ہے تمہارا۔۔۔؟"

"ارحم سلطان۔۔۔" جب سے اس نے اپنے آپ کو چھپا کر بھیس بدلنے شروع کیئے تھے آج پہلی بار کسی کو اپنا صحیح نام بتایا تھا

"محبت کی چوٹ کھائے ہوئے ہو۔۔۔"

"ہاں بابا۔۔۔" جانے کیوں وہ میکانکی انداز میں بوڑھے کے ہر سوال کا صحیح صحیح جواب دینے لگا

"لوٹ جاؤ واپس۔۔۔"

"میں خود پر اختیار نہیں رکھ پاؤں گا۔"

"یہی تو آزمائش ہے۔دل پتھر کرنا پڑتا ہے۔اور محبت نصیب میں نہیں تو بہتر ہے کسی اور کی محبت بن جاؤ۔"

"کیا مطلب میں کچھ سمجھا نہیں بابا۔۔۔"

"واپس جاؤ اور محبت بانٹو"

"میرا اپنا دامن محبت سے خالی ہے۔میں بھلا کیا بانٹوں گا محبت۔" ارحم کے لبوں پر ایک استہزائیہ ہنسی آئی تھی

"بانٹنے کا ارادہ کرو گے تو دینے والا دامن کو بھی بھر دے گا۔کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کو تمہاری محبت کی ضرورت ہوگی مگر تم نے خود کو گم کر کے ان سب کی دسترس سے دور کر دیا ہے۔

لوٹ جاؤ بچے۔۔۔واپس چلے جاؤ۔" ارحم کو بوڑھے کی بات سن کر ایک جھٹکا سا لگا تھا ذہن کے پردے پر کچھ چہرے گھومنے لگے تھے۔دادا،دادی،نانی،خوشی،اور ایک معصوم چہرہ کوکب کبیر۔۔۔

وہ ابھی اپنے دماغ میں چلتے جھکڑوں سے باہر نہیں آیا تھا کہ ایک آدمی کی آمد نے اسے چونکا دیا۔سر پر سبز پلاسٹک سے ٹوپی پہنے جو عموماً مسجد میں نمازی سر پر رکھ لیتے ہیں۔ہاتھ میں چاولوں سے بھرا ایک بڑا ڈول اٹھائے کھڑا تھا۔اس نے آتے ہی چاول اس بوڑھے کے آگے رکھے اور واپس چلا گیا۔خدا جانے دربار سے نیاز آئی تھی یا ویسے ہی کسی خدا ترس نے بجھوائے تھے۔ارحم نے بوڑھے کی طرف دیکھا وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

" وہ کبھی بھوکا نہیں سونے دیتا۔آؤ اپنے نصیب کا کھالو پھر سوچتے رہنا" شاید بوڑھے نے اس کی سوچ پڑھ لی تھی

بوڑھا اٹھ بیٹھا تو وہ بھی بوڑھے کے ساتھ چاول کھانے لگا۔ چاول ختم کرنے کے بعد بوڑھا پھر سو گیا اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ارحم اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔

رات بہت زیادہ اتر چکی تھی۔وہ کافی دیر مزید بیٹھا رہا مگر نا تو بابے کی طرف سے پھر کوئی سوال آیا اور نا ہی اس کی آنکھیں کھلیں۔تو وہ بھی آخر تھک کر وہیں کپڑے پر بوڑھے کے ساتھ لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر میں آنکھوں کی پتلیاں باہم مل گئیں۔اور کب وہ نیند کی وادیوں میں اتر گیا اسے خبر ہی نا ہوئی۔

صبح آنکھ کھلی تو سورج کافی سارا چڑھ چکا تھا۔اس نے اپنے پاس دیکھا تو بابے والی جگہہ خالی پڑی تھی۔خدا جانے کب وہ اٹھ کے چلا گیا تھا۔ارحم کا سامان بھی اسی طرح اس کے پہلو میں پڑا ہوا تھا۔اس نے سامان اٹھایا اور ناشتے کیلئے کسی ہوٹل کی تلاش میں ادھر ادھر پھرنے لگا۔

ناشتہ کرنے سے بھی پہلے وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ مزید اب نہیں بھاگے گا نا اپنے آپ سے اور نا ہی اپنوں سے۔

اگر خدا نے اس کے نصیب میں محبت نہیں لکھی تو وہ محبت بانٹے گا ان لوگوں کیلئے جن کو اس کی محبت کی ضرورت تھی۔وہ واپس جائے گا سب اپنوں کیلئے،کوکب کبیر کیلئے۔۔۔

اور ناشتہ کرنے سے پہلے وہ اپنا فون آن کرنا نہیں بھولا تھا۔جو شاید پچھلے تین ہفتوں سے مسلسل بند چلا آ رہا تھا

☆......☆......☆

آخری حصہ

ارحم کے یوں اچانک غائب ہو جانے سے سارے گھر والے پریشان تھے۔کسی کو اندازہ تک نہیں تھی کہ وہ یوں اچانک کہیں چلا جائے گا۔نا ہی کسی کے گمان میں تھا کہ وہ اس طرح کہیں جا بھی سکتا ہے۔وہ تو یہاں جانتا ہی کسی کو نہیں تھا۔پھر کہاں جا سکتا ہے آخر۔سارے گھر والے اسی ایک بات کو لے کر بے حد پریشان تھے۔

ہر کوئی اپنی جگہہ سر پکڑے بیٹھا تھا۔

اسے گئے پورے تین دن گزر گئے مگر وہ واپس ہی نا آیا۔خوشی نے گاؤں کا کونا کونا چھان مارا مگر کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔۔۔

ان تین دنوں میں وہ کوئی تین سو دفعہ اس کا نمبر ٹرائی کر چکا تھا مگر کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا۔ارحم کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا۔

گاؤں والوں تک بھی یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ پچھلے ماہ لندن سے آنے والا دین محمد کا پوتا کہیں غائب ہو گیا ہے۔جگہہ جگہہ باتیں بننے لگیں۔انہوں نے آس پڑوس کے گاؤں میں بھی چھان بین کروالی ساتھ والے شہروں تک بھی چھان مارا مگر کہیں اس کی کوئی خبر ہی نا مل سکی۔دین محمد نے نزدیکی تھانے میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی

لکھوائی مگر ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی نتائج وہی صفر تھے۔۔۔

ارحم کے جانے سے گھر کا ماحول بھی بوجھل بوجھل سا لگنے لگا۔

"وہ وہیں واپس چلا گیا ہوگا جہاں سے آیا تھا۔۔۔"

جب ہر طرف سے ناکامی ہوگئی تب دین محمد نے تھک ہار کو ششیں ترک کر دیں

"نہیں دادا جی۔۔۔میرا دل کہتا ہے وہ واپس نہیں گیا۔یہیں کہیں ہوگا پاکستان میں۔"

"وہ یہاں جانتا ہی کس کو تھا جو کسی کے پاس جاتا۔۔" بختاور نے ایک اور سچ اگلا

"وہ کسی مصیبت میں پھنسا ہوا بھی تو ہو سکتا ہے۔دنیا اتنی ظالم ہے۔اور وہ یہاں سب سے انجان"

خوشی کا دل مان ہی نہیں رہا تھا کہ وہ واپس چلا گیا ہوگا

"اللہ نا کرے وہ کسی مصیبت کا شکار ہو۔۔۔یا اللہ وہ جہاں بھی ہو خیریت سے ہو۔حفاظت کرنا اسکی ہر جگہ۔۔۔" بختاور کے دل سے دعا نکلی

نانی تاج کو ارحم کے ساتھ کی گئی آخری گفتگو حرف با حرف یاد تھی۔وہ اندازہ ہی نا لگا سکیں کہ وہ کن کو چھوڑنے کا پوچھ رہا ہے۔کون ہے اس کی چاہت جو اس کے اپنوں کے بیچ آ کے حائل ہوگئی ہے۔۔۔

انہیں بھی یہی شک تھا کہ ارحم ضرور واپس لندن چلا گیا ہوگیا۔۔۔

"ہاں خوشی میرا دل بھی یہی کہتا ہے کہ ارحم لندن واپس چلا گیا ہوگا۔جانے سے ایک دن پہلے وہ کچھا الجھی باتیں کر رہا تھا۔جیسے انسان بہت مجبور ہو یا اسے کچھ بھی سجھائی نا دے رہا ہو۔۔" نانی تاج بھی دل کی بات زبان پر لے ہی آئیں

اس کا دل پھر بھی نہیں مان رہا تھا۔جانے کیوں اچانک وہ اٹھا۔ارحم کے کپڑوں والے بیگ سے ارحم کا ٹیپ نکالا۔اور سکائپ آن کر کے کوکب کو کال ملا دی

وہ اپنے ساتھ صرف اپنے میوزیکل انسٹرومنٹس اور پینٹنگز والا بیگ لے گیا تھا۔

باقی سامان اس کا ابھی تک یہیں پڑا ہوا تھا۔

"کہاں گم ہو آجکل۔۔۔منگنی ہوگئی تو بات کرنا بھی چھوڑ دی۔۔۔؟" کال ملتے ہی وہ اپنے انداز میں شروع ہوگئی

"کوکب۔۔۔ارحم وہاں آیا ہے۔؟" خوشی نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر سنجیدہ لہجے میں سوال کیا

"کیا مطلب ۔۔۔کہاں ہے وہ؟" وہ بھی حیران رہ گئی

" ارحم کہیں کھو گیا ہے کوکب ۔۔۔ہم تین دن سے مسلسل اسے ڈھونڈ رہے ہیں مگر اس کا کچھ بھی پتہ نہیں لگ رہا۔۔ناہی وہ جانے سے پہلے کسی کو کچھ بتا کے گیا ہے۔"

" میں نے کہا تھا نا خوشی ۔۔۔وہ بے حس ہے ۔اسے اپنی ذات سے جڑے رشتوں کی پرواہ ہی نہیں ہے ۔۔۔وہ ہمیشہ ایسا کرتا ہے ۔۔۔"

" ایسا مت کہو کوکب ۔۔۔بس دعا کرو وہ جلدی سے مل جائے ۔اور تم وہاں بھی معلومات کرواؤ اس کے دوستوں سے پوچھو۔کیا پتا وہ وہیں واپس آگیا ہو۔۔۔"

" ہاں میں کرتی ہوں ۔۔۔خوشی میں نے کہا تھا نا جو چیز ناممکنات میں ہو وہ ممکن کبھی نہیں ہوتی۔"

" تم بس دعا کرو کوکب ۔۔۔وہ جلدی سے مل جائے ۔دعائیں دستک ہوتی ہیں ۔دستک مسلسل دیتے رہیں گے تو دروازہ کھل بھی سکتا ہے۔

دعائیں تقدیر بدل بھی دیتی ہیں ۔۔۔"

کال کٹ چکی تھی ۔وہ وہیں بیٹھا گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اللہ سے دعائیں مانگنے لگا ۔۔۔

اور ہزاروں میل دور بیٹھی نازک سے دل والی کوکب کبیر کا چہرہ ایک بار پھر سے مرجھا گیا۔اس کا دل جو چند دن پہلے خوشی کے امید دلانے پر ہلکا سا کھلنے لگا تھا اب پھر کسی اندھیری کوٹھڑی کے اندھیرے چپ چاپ خانے میں جا چھپا تھا۔۔

کیا ہے یہ شخص ۔۔۔مسئلہ کیا ہے اس کے ساتھ کیوں وہ ہمیشہ ہم سب کے ساتھ ایسا کرتا ہے ۔اسے خود سے جڑے رشتوں کی پرواہ کیوں نہیں ہوتی ۔۔۔وہ خود سے سوچے جا رہی تھی

اس کا سوچنا بنتا بھی تھا ۔کیونکہ اس نے ارحم کی زندگی کا صرف ایک چہرہ دیکھا تھا ۔زندگی ہر کسی کیلئے آسائشوں کا بستر تو نہیں ہوتی ۔۔۔اس نے جب بھی رشتوں کو چھوڑا وجہ رشتے ہی بنے تھے ۔۔۔پہلے باپ کی آخری خواہش سے مجبور ہو کر ان سب کو چھوڑ کے پاکستان آیا تھا ۔اور اس بار صرف خوشی کی محبت کو بچانے کیلئے ، بھائی کی زندگی میں رقیب نا بننے کیلئے اس نے خود کو گم کر دیا تھا

اس کی آزمائشیں ہی ایسی تھیں ۔اس کے امتحان ہی اتنے سخت ہوتے تھے کہ اسے سخت سے سخت فیصلے لینے پڑتے تھے ۔وہ جانتا تھا لندن چھوڑنا اپنے دوستوں اپنے گھر اور اپنے مستقبل کو چھوڑنا بہت مشکل فیصلہ ہے مگر اس نے یہ پہاڑ سر کر لیا صرف اپنے ڈیڈ کی خواہش کیلیئے ۔

اور اب جب اس نے ایک بار ان سب رشتوں کو چھوڑا تھا تو بھی وجہ رشتے ہی تھے مقصد نیک ہی تھا ۔سلطان نے اسے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ تمہاری وجہ سے کبھی "اس" کی آنکھ بھیگنے نا پائے ۔اور وہ جانے انجانے میں اس کی محبت کا دشمن بننے جا رہا تھا ۔

جنت اسی کی تھی وہ اسی کے لیئے ہی بنائی گئی تھی جنت کی خوشی بھی صرف خوشی میں ہی تھی ۔اسے ان دو معصوم لوگوں کے بیچ میں آ کر کوئی انہونی نہیں کرنی تھی ۔اسی مقصد کو لے کر وہ چلا گیا ۔جب جنت کو دیکھے گا ہی نہیں، جب وہ نظر ہی نہیں آئے گی تو دل میں پرورش پاتی اس کی محبت کی کونپل خود بخود مرجھا جائے گی ۔

☆......☆......☆

آج تین ہفتوں بعد اس کے نمبر پر بیل جا رہی تھی ۔خوشی کے دل کی دھڑکن تیز سی ہو گئی ۔امید کی ایک کرن سی جاگ اٹھی

بیل بجتے بجتے بند ہو گئی ۔مگر کال کسی نے ریسیو نہیں کی ۔اس نے دوبارہ کال ملائی اس بار بھی کسی نے اس کی کال کسی نے ریسیو نہیں کی ،سہہ بارہ ملائی نتیجہ وہی ۔خوشی بھی مسلسل کال ملاتا رہا ،۔۔۔لگاتار اسے ٹرائی کرتے دس منٹ سے اوپر ہو گئے تھے ۔امید کی جو ایک کرن جگمگائی تھی وہ پھر سے مدھم پڑنے لگی

خدشات زہریلے سانپ کی طرح سر اٹھائے پھن پھیلائے ڈرانے لگے

آخر دس منٹ بعد کال ریسیو کر لی گئی تھی ۔

"ہیلو ارحم ہیلو۔۔۔ہیلو کہاں ہو تم۔۔۔؟"

کال ریسیو ہوتے ہی خوشی ایک سانس میں بولا تھا مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نا آیا سوائے آتی جاتی سانسوں کے وہ کچھ بھی محسوس نا کر سکا

"ارحم۔۔۔یار بات تو کرو مجھ سے۔۔۔ہم سب بہت پریشان ہیں تمہارے لیئے۔کہاں چلے گئے ہو تم۔۔؟"

وہ مسلسل بول رہا تھا

"ارحم ایسا کیوں کر رہے ہو یار۔۔۔اگر یوں اچانک ہمیں چھوڑ کے جانا تھا تو ہماری زندگیوں میں آئے ہی کیوں تھے۔۔۔ہم سب کو اپنے ہونے کا احساس دلایا ہی کیوں تھا۔۔۔؟"

"بولو بات کرو مجھ سے۔کیوں کر رہے ایسا ہمارے ساتھ۔۔؟"

"میں آپ کے ساتھ کچھ نہیں کر رہا۔۔۔جو کچھ کر رہا ہوں آپ کیلئے کر رہا ہوں۔۔"

آخر اس کی آواز خوشی کے کانوں سے ٹکرائی تھی

"کیا مطلب ہمارے لیئے کر رہے ہو۔۔۔جانتے ہو تمہارے اس طرح غائب ہو جانے سے ہم سب کتنے دکھی ہیں؟ کتنی تکلیف سے گزر رہے ہیں۔۔۔جانتے ہو تم۔۔۔؟"

"خوشی ڈیڈ نے کہا تھا کہ کبھی تمہاری آنکھوں میں اپنی وجہ سے آنسوؤں نا آنے دوں۔۔۔میں خود پر سے اختیار کھو رہا تھا۔میرا دل بے ایمانی کرنے لگا تھا۔بس اسی لیئے چلا آیا۔۔۔"

"کیا مطلب کیسا اختیار۔۔۔کیسی بے ایمانی۔۔۔مجھے بتاؤ کھل کے کیا مسئلہ ہوا آخر۔۔۔میں بھائی ہوں تمہارا مجھے بتاؤ ہوا کیا تھا ایسا۔۔۔؟"

"نہیں خوشی میں یہ کبھی نہیں بتا سکتا۔چاہ کر بھی کبھی بتا نہیں پاؤں گا۔۔۔اور خدا کیلئے دوبارہ یہ بات کبھی مجھ سے پوچھنا بھی نہیں۔۔۔"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے میں کبھی نہیں پوچھوں گا وعدہ۔بس تم یہ بتاؤ تم ہو کہاں۔۔؟

ارحم تم جانتے ہو تمہارے جانے سے لوگ کیا کیا باتیں بنا رہے ہیں۔۔۔؟

لوگ کہہ رہے ہیں کہ آخر بیٹا تو سلطان کا تھا نا۔وہ بھی تو یوں اچانک سب کو چھوڑ کے بھاگ گیا تھا یہ بھی چھوڑ کے بھاگ گیا تو کیا نیا کیا۔سلطان کا خون تھا بھاگنا تو تھا اس نے۔۔۔" اس نے ارحم کے جواب کا انتظار کیئے بغیر خود ہی اسے بتا دیا۔جانے خوشی نے کس دل سے یہ الفاظ ادا کیئے تھے۔اور

ارحم کا تو دل ہی کٹ گیا تھا۔وہ بجائے ان لوگوں کو خوشی دینے کے ان سب کیلئے رسوائی کا سبب بن رہا تھا ۔اس کی زبان ہی گنگ ہوگئی ۔وہ بولنا ہی بھول گیا تھا۔

"ارحم تم ہو کہاں ۔۔۔پاکستان ہو یا واپس چلے گئے ہو۔۔۔؟"

"میں یہیں پاکستان ہوں ۔لاہور میں ۔۔۔"لہجہ ٹوٹ چکا تھا

"تو یار آجاؤ نا واپس ہم سب بہت پریشان ہیں یہاں ۔"

"آؤ مجھے لے جاؤ۔۔میں بھی بہت تھک گیا ہوں ۔۔"وہ تھک کر بولا

"لاہور میں کہاں ہو۔۔۔اتنا بڑا

شہر ہے میں کہاں ڈھونڈوں گا تمہیں ۔۔۔؟"

"بڑے بھائی ہو۔۔۔خود ڈھونڈ لینا مجھے ۔چھوٹے بھائی کیلئے اتنے لاڈ تو اٹھانے پڑتے ہیں

۔۔۔"

"پاگل ۔۔۔یہ زندگی ہے کوئی گیم تھوڑی ہے ۔۔۔وہ بہت بڑا شہر ہے ۔کوئی اشارہ تو دو کوئی جگہہ کا نام تو بتاؤ کہاں ڈھونڈوں میں ۔۔۔؟"

"مسجد ،مندر ،میوزیم ،درگاہ ،پارک کہیں نا کہیں مل جاؤں گا۔۔۔"

فون کٹ چکا تھا ۔خوشی فون ہاتھ میں پکڑے بیٹھا تھا ۔کتنا پاگل تھا یہ اس کا چھوٹا بھائی ۔۔۔

دوسری طرف ارحم نے ایک لمبی سانس لے کر فون

کاٹ دیا ۔۔وہ خود بھی بھاگتے بھاگتے تھکنے لگا تھا ۔اور جس مقصد کیلئے اس نے خود کو روپوش کیا تھا ۔وہ اس میں کامیاب ہوا یا نہیں ۔لیکن وہ ان سب کیلئے رسوائی کا سبب ضرور بن رہا تھا ۔اور یہ تو اس کے ڈیڈ بالکل نہیں چاہتے تھے ۔اسے اب لوٹنا تھا ۔واپس جانا تھا ۔پھر سے اسی گاؤں میں ۔کبھی نا بھاگنے کیلئے ۔اب اسے ہمیشہ کیلئے وہیں رہنا تھا

☆......☆......☆

ارحم کے پاکستان میں ہونے کی خبر سن کر سب کے جھلستے دلوں پر ایک ٹھنڈی پھوار سی پڑی تھی ۔خوشی ان سب کی دعائیں لے کر آج لاہور کیلئے روانہ ہو رہا تھا۔نانی نے اسے ڈھیروں دعائیں دے کر ارحم کے ساتھ جلد واپسی کی تلقین کی تھی۔۔۔

" جلدی واپس آنا پتر۔۔۔بڑے شہر بہت رنگین ہوتے ہیں۔دل لبھا لیتے ہیں۔تم بھی کہیں وہاں کی رنگینیوں میں کھو مت جانا۔۔۔" دادا جان نے بھی جانے سے پہلے اپنے حصے کی نصیحت کرنا لازمی سمجھا تھا

" بے فکر رہیں دادا۔۔۔مجھے اپنے شاہ والی سے بہت پیار ہے۔میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔۔۔"

" ہاں خوشی بس اسے لے کر جلدی آنا۔۔۔ہم سب راستے میں آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں۔۔۔" اس بار بختاور نے اپنی بے اختیاری ظاہر کی تھی

" بے فکر رہیں آپ۔۔۔اور بس اللہ سے دعا کریں۔۔۔میں جلد ہی اسے کان سے پکڑ کر واپس آجاؤں گا۔" خوشی نے مسکراتے ہوئے انہیں تسلی دی اور دعاؤں کے سائے میں رخصت ہو گیا۔۔

خوشی نے ابھی ان سب کو یہ بات نہیں بتائی تھی کہ ابھی ارحم کو ڈھونڈنا باقی ہے۔ابھی تو صرف ایک امید جاگی تھی اور وہ اسی امید کی کرن کی انگلی پکڑے لاہور کیلئے رختِ سفر باندھ چکا تھا۔لیکن وہ پریقین تھا۔اس نے ارحم کا تھکا تھکا لہجہ بھی محسوس کیا تھا۔اسے یقین تھا کہ وہ اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہی ٹھہرے گا۔

نزدیکی شہر سے لاہور کی گاڑی پکڑی۔یہ اس کی زندگی کا پہلا بڑا سفر تھا۔تھوڑی سی گھبراہٹ لازمی تھی۔عشاء کی نماز کے بعد ان کی گاڑی اڈے سے نکل چکی تھی۔۔

رات ساری سفر میں کٹ گئی

۔وہ صحیح طرح سے نیند بھی پوری نہیں کر سکا تھا۔رات کو جیسے ہی آنکھ لگتی پھر کسی ہچکولے سے آنکھ کھل جاتی۔پوری رات سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اب کمر بھی درد کرنے لگی تھی۔۔۔

رات بھر کے لمبے تھکا دینے والے سفر کے بعد ان کی گاڑی صبح منہ اندھیرے ازانوں کے بعد لاہور اڈے پر آپہنچی تھی۔ باقی مسافروں کی طرح اس نے بھی خیریت سے پہنچنے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

اڈے پر اترتے ہی تمام مسافر

اپنا سامان اٹھاتے اپنی منزلوں کی طرف چل دیئے۔ مگر اس کے پاس نا تو کوئی سامان تھا اور ناہی اسے اپنی منزل کا علم تھا۔ وہ جائے بھی تو جائے کہاں، اور کس طرف۔۔؟ کس سے پوچھے۔۔۔؟

ارحم کا نمبر ملایا۔۔۔ نمبر ایک بار پھر بند تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ اس کے سامنے ہوتا تو شاید اپنے چھوٹے بھائی کو غصے سے ڈپٹ ڈالتا۔ کہ اب نمبر بند کر لینے کی کیا تک بنتی ہے بھلا۔

مگر سامنے ہوتا تب نا۔۔۔

اور کچھ سجھائی نا دیا تو وہ اڈے کے قریب بنی مسجد کی طرف چل دیا جس کا اونچا مینارا اسے یہیں سے نظر آرہا تھا۔

مسجد میں فجر کی نماز کے بعد وہ وہیں لیٹ گیا۔ اور تو کسی سے واقف نہیں تھا۔ مگر اللہ سے تو سب کی واقفیت ہوتی ہے نا۔ وہ تو سب کا دوست ہے۔ سو خوشی بھی اپنے اس مہربان دوست کے گھر اسی کے سہارے لیٹ گیا۔۔۔

ایک گھنٹے کی پرسکون نیند کے بعد اس کی آنکھ خود بخود کھل گئی۔

مسجد سے باہر نکلا تو پیٹ نے اپنی طرف توجہ دلائی کہ کچھ میرے بارے بھی سوچو سو ناشتے کیلئے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل کی طرف قدم بڑھا دیئے۔۔۔

ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے اپنی تلاش کا آغاز کر دیا۔۔۔ ٹیکسیوں کے دھکے کھاتا، پارکوں کا کونا کونا تلاشتا رہا، جوں جوں دن گزرتا جا رہا تھا لاہور کی رونقوں میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔۔۔ ایک سمندر تھا گاڑیاں تھیں چاروں طرف۔۔۔ خوشی اتنی ساری دنیا ایک ہی شہر میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے لاہور کے تمام مشہور پارک چھان مارے۔ اتوار کی چھٹی ہونے کی وجہ سے پارکوں میں بھی عوام کا ایک ہجوم تھا۔ بچے بڑے عورتیں۔ ہر عمر کے لوگ۔۔۔

سارے پارک چھان مارنے کے بعد اس نے ٹیکسی میں چڑیا گھر کا رخ کیا۔۔۔نتیجہ وہی تھا ۔داتا دربار، لاہور میوزیم، مینار پاکستان، انارکلی غرض اس نے لاہور کی آدھی سے زائد مشہور جگہیں چھان ماریں مگر ارحم کو ڈھونڈنے میں ابھی تک ناکام رہا تھا۔

اس نے ایک بار پھر فون نکال کر خوشی کو کال کی مگر نتیجہ وہی تھا۔کمپنی کے نمائندے کی ریکارڈڈ آواز اس کا منہ چڑا رہی تھی

وہ صبح سے اس کی تلاش میں گھوم رہا تھا اور اب عصر ہونے کو آئی تھی۔عصر کی نماز اس نے بادشاہی مسجد میں ادا کی۔بادشاہی مسجد کا جلال دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔نماز کے بعد ایک بار پھر اللہ سے ارحم کیلیئے دعا مانگی اور اٹھ کر باہر نکل آیا۔مسجد میں کافی تعداد میں لوگ آئے ہوئے تھے۔ننگے سر گھومتی تصاویر بناتی لڑکیاں۔۔۔فیشن ایبل لڑکے۔اس نے ایک ہی دن میں" بہت کچھ" دیکھ لیا تھا خوشی ان پڑھے لکھے اور ماڈرن لوگوں کی سوچ پر ہی حیران رہ گیا۔جس کو دیکھو تصاویر بنانے میں مگن۔لڑکیاں کھلے سر مسجد میں گھوم رہی تھیں۔لڑکوں کے کندھے سے کندھا ملا ہوا ۔۔۔گویا مسجد کا تو احترام ہی ختم ہو گیا۔

مسجد نا ہوئی کوئی پبلک پوائنٹ ہو گیا۔۔۔

بادشاہی مسجد کے احاطے میں سوئے علامہ اقبال کی قبر کو دور سے دیکھ کر فاتحہ پڑھی۔اور شاہی قلعے کی طرف آگیا۔شاہی قلعے کی شان و شوکت قابل دید تھی اور اس کا طرزِ تعمیر ماہر معماروں کا منہ بولتا ثبوت تھا۔سینکڑوں سال پرانا قلعہ وہ تو قلعے میں گھومتے گھومتے ہی تھک گیا۔قلعے میں بھی لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔کچھ گوری چمڑی والے لوگ بھی کہیں کہیں نظر آجاتے زیادہ تر پاکستانی ہی تھے جو اپنے کیمروں میں یادگاریں محفوظ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

قلعے سے باہر نکلا تو تھوڑی ہی دور اسے کچھ لوگوں کا رش لگا نظر آیا جو ایک دائرے میں کھڑے ہوئے تھے۔قدم بے اختیار اس ہجوم کی طرف بڑھ گئے۔دائرے کے درمیان میں ایک نوجوان لڑکا مسخرے کے لباس میں لوگوں کو کرتب دکھانے میں مصروف تھا۔وہ اپنے ہاتھوں کے کرتب سے لوگوں

کو محظوظ کر رہا تھا۔ ہر کرتب پر لوگ تالیاں بجا کر داد دیتے ۔وہ داد وصول کرتا اور پھر سے نیا کرتب شروع ہو جاتا۔۔۔کبھی چار گیندوں کو ہوا میں آگے پیچھے اچھالتا اور انہیں کیچ کر کے پھر جلدی سے اوپر پھینک دیتا۔

خوشی کو اس مسخرے میں جانے کیا جادو نظر آیا کہ اس کے پاؤں وہیں زمین میں جکڑے رہے۔

مسخرہ اب ہاتھ میں ایک تاش کا پتا لہرا رہا تھا۔تاش کے پتے پر غلام کی تصویر نقش تھی۔مسخرے نے دائرے میں پھر کر سب کے سامنے وہ پتا لہرا لہرا کے دکھایا سب کو تسلی کروا کے پھر درمیان میں اپنی جگہہ آ کھڑا ہوا۔

اگلے پل اس نے اپنا دوسرا خالی ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور آہستہ آہستہ اسے تاش کے پتے تک لے آیا۔تاش پر ہاتھ لگانے کی دیر تھی اگلے پل وہ پتا جس پر غلام کی تصویر تھی اب بالکل سفید ہو چکا تھا اس پر کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔

سارا مجمع آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا مگر تاش کا پتا واقعی سفید کورا تھا۔سب نے زوردار تالیاں بجا کے مسخرے کے لباس میں خود کو چھپائے اس آدمی کے ہنر کو داد دی

اس طرح کئی اور بھی چھوٹے چھوٹے کرتب چلتے رہے اور وہ سب کی داد وصول کرتا رہا

پندرہ منٹ بعد کرتب ختم ہوا تو مسخرہ ایک گول ٹوپی اٹھائے لوگوں سے پیسے وصول کرنے لگا۔

اس کے کرتب ختم ہو چکے تھے۔لوگ آپس میں اس کے کرتب پر تبصرے کرتے ادھر ادھر بکھرنے لگے۔وہ مسخرہ بھی اپنا تھوڑا سا سامان سمیٹ کر ایک طرف چل دیا۔۔اس سے پہلے کہ وہ لوگوں کی بھیڑ میں کہیں گم ہوتا۔خوشی دوڑ کر اس مسخرے تک جا پہنچا۔۔۔

"کس سے بھاگ رہے ہو تم۔۔۔؟" وہ اس تک پہنچ گیا تھا اس کے ہاتھ کو پکڑ کر آگے بڑھنے سے روک دیا

"خود سے۔۔۔"مسخرے کی میک اپ لگی آنکھوں میں شناسائی ابھری

"بس بھاگ لیئے۔۔۔یا مزید بھاگنا ہے۔۔۔؟"

"بس اب تھک چکا ہوں۔۔"

"تو میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا نا۔۔۔"

"ہاں خوشی تم نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا ہے۔۔۔"

"تو اب چلیں واپس۔۔۔؟"

"ایک منٹ۔۔۔"

مسخرے نے اپنا ہاتھ چھڑا کر ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔خوشی کو دھڑ کا لگا کہ ارحم پھر کہیں نا کھو جائے سو وہ بھی اس کے پیچھے تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔۔۔

مسخرہ قلعے کی دیوار تک آیا۔قلعے کی بیرونی دیوار کی طرف ایک لنگڑا اور آنکھوں سے معذور فقیر صدائیں لگا رہا تھا۔اپنی گول ٹوپی میں موجود سارے پیسے اس فقیر کے ڈبے میں ڈالے۔اور واپس مڑ آیا۔

خوشی کے لبوں پر ایک خوبصورت مسکراہٹ آ ٹھہری۔

اس نے ارحم کا ہاتھ پکڑا اور اڈے کی طرف چل دیا۔واپس شاہ والی جانے کیلئے جہاں سب کی آنکھیں ان کے انتظار میں راستہ دیکھ رہی تھیں

☆......☆......☆

خوشی، ارحم کو لے کر واپس گھر آ گیا تھا۔سب اس سے پیار بھری ناراضگی کا اظہار کر رہے تھے۔گھر کی خوشیاں پھر سے لوٹ آئی تھیں۔ارحم کے جانے کے بعد گھر میں جو ایک بوجھل اور اداس سا ماحول بن گیا تھا۔وہ اس کی واپسی کے ساتھ ہی ایک دم کہیں گم ہو گیا۔اس کی جگہہ پیار بھری مسکراہٹوں نے لے لی۔

"ارحم وعدہ کرو تم پھر ہمیں کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔۔۔" دین محمد اس سے آئندہ کیلئے وعدہ لے رہا تھا۔اب اور اس طرح کی کوئی بھی بے وقوفی افورڈ کرنے کی طاقت ان میں نہیں تھی۔

"ہاں دادا جی۔۔۔وعدہ ہے اب کہیں نہیں جاؤں گا آپ لوگوں کو چھوڑ کر۔۔۔ پکا پرامس"

" دادا جی یہ اب کہیں نہیں جائے گا۔۔۔میں نے ارحم کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالوانے کا بندوبست کر لیا ہے۔۔۔" خوشی نے ان سب کو حیران کر دیا

"کیا مطلب۔۔۔کیسی بیڑیاں؟" نانی تاج کی پریشانی جائز تھی

"نانی لندن کی ایک لڑکی ہے کوکب۔۔۔اسے بہت چاہتی ہے۔اور اس نکمے نے اسے بہت تڑپایا ہے۔میں نے سوچا ان دونوں کی منگنی کر دیتے ہیں۔"

سارے گھر والے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے

"ارے نہیں یار۔۔۔وہ پاگل ہے پوری۔مجھے بھی اپنے ساتھ پاگل کر دے گی۔۔۔" ارحم نے مزاحمت کرنا چاہی

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔وہ پاگل نہیں ہے وہ صرف تم پر پاگل ہے۔۔۔ویسے بہت اچھے دل کی مالک ہے میری دوست۔۔میں اس کی برائی بالکل برداشت نہیں کروں گا"

خوشی نے کوکب کے حق میں اپنا ووٹ دے دیا

"ارحم میں نے کیا سمجھایا تھا۔۔۔چاہتوں کو کبھی نہیں ٹھکرانا چاہیئے۔اگر تمہارے اردگرد کچھ ایسے لوگ ہوں جو تمہیں بے لوث چاہتے ہوں تو سمجھو بہت خوش قسمت ہو تم۔۔۔چاہے جانے کا احساس بہت خوبصورت ہوتا ہے پتر۔۔زندگی حسین ہو جاتی ہے انسان کی۔اپنے چاہنے والوں کا کبھی دل نہیں توڑنا چاہیئے۔"

وہ خاموش بیٹھا نانی کی بات سنتا رہا۔

"بیٹا میری ایک بات ہمیشہ پلے باندھ کر رکھنا۔۔۔"

"جی بولیں نانی۔۔۔"

"ہم میں سے اکثریت انسان اندھیروں سے خائف رہتے ہیں۔ہر کوئی یہی چاہتا ہے کہ وہ اندھیرے سے روشنی کی طرف سفر کرے۔جلد از جلد روشنیاں پا لے۔۔۔

مگر ہم میں سے کوئی بھی اپنے اندر اور اپنی ذات کے اندھیرے کوئی نہیں دور کرنا چاہتا۔اندر روشنی ہو تو باہر سارا روشن ہی روشن نظر آتا ہے۔

جب اندر تاریکی حد سے زیادہ بھری ہوئی ہو باہر چاہے کتنے اجالے کر لو، ہمارے اندر کے اندھیرے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔

انسان اگر اپنے اندر کے اندھیروں میں کہیں گم ہو گیا تو وہ لاکھ ہاتھ پاوں مارتا ہے، راستے، دیواریں اور سہارے ٹٹولتا رہے مگر پھر اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔وہ اسی طرح ٹٹولتا ہی رہ جاتا ہے، اندھیرے اس کا نصیب بن جاتے ہیں۔

ہم روشنیوں کی طرف اندھا دھند سفر تو کرتے ہیں مگر راستوں میں پڑے چھوٹے چھوٹے دیئے نہیں جلاتے جاتے۔

یہی چھوٹے چھوٹے دیئے ہی تو ہمارے اگلے سفر کیلئے زادِ راہ ہوتے۔

تمہارے راستے میں بھی اگر اس طرح کے کچھ دیئے آجائیں تو ان کو روشن کرنا مت بھولنا

یہی چھوٹے چھوٹے دیئے تمہیں آگے کا راستہ دکھائیں گے۔

چاند چھونے کی خواہش سب کی ہوتی ہے۔مگر چاند کی خواہش میں ہمیں ستاروں کو نظر انداز بالکل نہیں کرنا چاہیئے۔۔" نانی تاج نے اسے پیار سے سمجھایا تو اس کے عقل میں بھی بات بیٹھنے لگی۔

وہ بھی تو ایک چاند کیلئے کسی ستارے کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا

ارحم نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی پچھلی ساری زندگی پر نظر دوڑائی تو اسے والدین کے بعد صرف کوکب ہی نظر آئی جو اسے بے لوث چاہتی تھی۔ہر جگہہ اس کا ساتھ دینے والی۔ہمیشہ ہر دکھ سکھ میں اس کے ساتھ کھڑی رہنے والی لڑکی صرف کوکب ہی تھی۔

اسے لگا صرف کوکب ہی ہے جو اس کی زندگی سنوار سکتی ہے۔اس کے پاؤں میں بیڑی ڈال سکتی ہے۔۔اسے برداشت کر سکتی ہے اس کے مزاج کے سرد گرم سہہ سکتی ہے اور شاید وہ دنیا کی واحد لڑکی بھی ہے جو اسے سمجھ سکتی ہے۔

اسی لمحے اس نے کوکب کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔۔

سر اٹھا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں خوشی کو اشارہ کیا۔وہ دونوں ان سب کے بیچ سے اٹھ کے آگئے۔

خوشی نے ٹیپ نکالا۔اور سکائپ پر کوکب کو کال ملا دی

"کوکب اندازہ لگاؤ میں آج اتنا کیوں خوش ہوں۔۔۔؟" کوکب کے سکرین پر آتے ہی خوشی

جوش سے بولا تھا

"ہمم۔۔۔لگتا ہے جنت بھابھی سے مل کر آرہے ہو۔۔۔تبھی اتنا خوش ہو۔۔۔"

"کوکب۔۔۔میں نے ڈھونڈ لیا ہے ارحم کو۔۔۔میں اسے واپس لے آیا ہوں" پہلے خوشی نے اس کے ساتھ اپنی خوشی بانٹی

"شکر ہے۔۔۔"کوکب نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا

"کوکب۔۔۔ہم بہت جلد آرہے ہیں تمہیں لینے۔۔۔"

"کیا مطلب۔۔۔کہاں؟"

"ہم دونوں لندن آرہے ہیں کوکب۔۔۔میری پیاری سی دوست کو بھی تو اس کی بے لوث چاہتوں کا صلہ ملنا چاہیئے"

"خوشی یہ زندگی کا بندھن ہوتا ہے۔کسی ایک انسان کی خواہش پر نہیں باندھا جا سکتا۔اور اگر کسی بہانے بندھ بھی جائے تو زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ٹوٹ جاتا ہے۔زندگی کی گاڑی کھینچنے کیلئے دو انسانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔اگر صرف ایک ہی کھینچتا رہے تو وہ تھک جاتا ہے۔بہت جلد اس کی سانس اکھڑ جاتی ہے۔پھر بکھر جاتا ہے سب کچھ"

"نہیں کوکب۔۔۔اس بدھو کو عقل آچکی ہے۔۔۔ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا جو تم سوچ رہی ہو۔اس بار ساری کایا پلٹ چکی ہے۔

لو خود بات کرلو تم۔۔۔"

خوشی اسے ٹیپ تھما کر خود اٹھ کے چلا گیا

"کیسی ہو کوکب۔۔۔؟"

"ارحم تم نے وہاں جا کر بھی اپنی عادتوں کو ترک نہیں کیا۔کتنا پریشان کیا ہے تم نے ہم سب کو۔۔۔"کوکب نے سلام کا جواب دیئے بغیر اسے جھاڑ پلادی

"تو مجھے سدھار دو نا۔۔"

" میں۔۔۔؟"

"ہاں تم کوکب۔۔۔"

سدھرتے وہ لوگ ہیں جو سدھرنا چاہتے ہوں۔تم نے تو ہمیشہ بگڑے رہنے اور سب کو پریشان کرتے رہنے کی قسم کھا رکھی ہے۔" وہ ابھی تک اس سے ناراض بیٹھی تھی اس نے خوب ارحم کو لتاڑنے کا سوچا تھا

" میں نے ہار مان لی ہے۔۔۔تم اپنی شرط جیت گئی ہو۔تمہاری محبت جیت گئی ہے۔۔۔"

" ارحم یہ تم ہی ہو نا۔۔۔؟ اسے یقین نا آیا اپنی آنکھیں مسل کر بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھنے لگی واقعی ارحم ہی تھا۔تسلی ہو گئی تھی۔

" ہاں یہ میں ہی ہوں کوکب۔۔۔اور آج میں اقرار کر رہا ہوں۔کہ میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں مجھے مکمل کر دو۔۔۔میں خود گھٹنے ٹیک رہا ہوں۔تمہیں بلا رہا ہوں۔درخواست کر رہا ہوں مجھے اپنی زندگی میں شامل کر لو۔مجھے سنوار دو مجھے مکمل کر دو۔۔کیونکہ دنیا میں واحد تم ہی ہو جو مجھے سنوار سکتی ہو۔۔۔"

ارحم نے شکست تسلیم کر لی۔ہار مان لی۔

کوکب کو اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگی تھی۔اسے ایسا لگا جیسے سالوں سے دشت میں پھرتے مسافر کو منزل نظر آ گئی ہو۔جیسے سالوں سے صحراؤں کی گرمی میں گرد چھانتے مسافر کو پانی مل گیا۔جیسے بارش نے جل تھل کر دیا تھا۔

"کوکب مجھ سے شادی کرو گی۔۔۔؟"

اس نے آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ سر اثبات میں ہلا دیا۔۔ضبط کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی مگر ناکام رہی تھی

"میرے ساتھ یہاں گاؤں میں زندگی گزار سکو گی۔۔۔؟"

" میں تمہارے ساتھ کہیں بھی رہ سکتی ہوں۔دنیا کے کسی کونے میں بھی۔۔۔"

" اچھا پھر تیار رہنا۔۔۔ہم بہت جلد آ رہے ہیں تمہیں لینے۔۔۔" وہ نم آنکھوں سے مسکرا دی تھی

اگلے دن دین محمد کی بات کوکب کے والدین سے بھی کرا دی گئی۔ دین محمد نے اپنے پوتے کیلئے ان سے کوکب کا رشتہ طلب کیا۔ ارحم ان سب کا دیکھا بھالا لڑکا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر کبیر صاحب کیلئے اپنی بیٹی کی خوشی سے بڑھ کر دنیا میں کچھ بھی عزیز نہیں تھا۔

وہیں فون پر ہی منگنی کر دی گئی۔۔۔ بہت جلد ارحم اور خوشی دادا جی کے ساتھ لندن جا کر نکاح پڑھوانے کی تیاری کرنے لگے

کوکب کے گھر میں بھی خوشی کا سا سماں بندھ گیا تھا۔ کبیر صاحب اور سائرہ بیگم اپنی بیٹی کی خوشی چاہتے تھے اور کوکب نے انہیں ارحم کیلئے "ہاں" بول دی تھی۔ انجم کوکب کو بار بار چھیڑ رہی تھی اسے تنگ کر رہی تھی۔ اور وہ خود دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی کہ ایک لمبی مسافت کے بعد آخر کار اسے منزل مل ہی گئی تھی اسے یقین ہو گیا تھا کہ بے لوث محبتیں کبھی بے صلہ نہیں ٹھہرتی۔

کمرے میں آتے ہی اس نے اپنے پسندیدہ عاطف اسلم کا گانا لگا دیا تھا

تیرے سنگ یارا۔۔۔ خوش رنگ بہارا

میں رات دیوانی۔۔۔ تو زرد ستارا۔۔

آسمان کو کالے کالے بادلوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ بادلوں کے دامن پانی سے بھرے ہوئے تھے ایسے لگتا تھا جیسے ابھی چھاجوں چھاج پانی برس پڑے گا۔۔۔ دریا میں دور دور تک کہیں ایک دو کشتی دکھائی دیتی تھی جن کے ملاح بارش برسنے سے پہلے کشتی کو کنارے تک لانے کی کوشش میں مگن تھے۔

اور وہ دونوں آج پھر دریا کنارے اسی جگہہ بیٹھے گیلی مٹی سے گھروندے بنا رہے تھے جیسے کبھی بچپن میں اکثر بنایا کرتے تھے۔ اسی دریا کے کنارے جو ان کی سچی محبت کا گواہ تھا۔ آج ایک ماہ بعد شاید وہ دونوں اس طرح فرصت سے مل رہے تھے

"جنت تم جانتی ہو میں نے تمہیں بڑی مشکلوں سے حاصل کیا ہے۔۔۔" گھروندہ بنانے میں مگن خوشی نے جنت سے کہا

"جنت پھر کسی کو اتنی آسانی سے تھوڑی ملتی ہے۔"

وہ اپنا گھر مکمل کر کے اب کنارے پر پانی سے ہاتھ دھونے لگی تھی۔اس کا گھر آج بھی خوشی سے پہلے بن گیا تھا ہاتھ دھو کر جنت نے بالوں کی ایک شریر لٹ کو کان کے پیچھے قید کیا جو بار بار اس کا گال چھونے لگتی

"۔۔دیکھو جنت میرا گھر آج پہلی بار مکمل بن گیا ہے۔۔"خوش بخت کے لہجے سے معصومانہ خوشی جھلک رہی تھی۔۔

"تمہیں یاد ہے خوشی میں نے بچپن میں اسی جگہہ بیٹھ کر تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں ہمیشہ تمہارا گھر بناؤں گی۔

اب میں آگئی ہوں نا۔۔اب تمہارا گھر کبھی نہیں ٹوٹے گا۔۔" وہ بھی مسکرا پڑی تھی۔۔۔

"ہاں جنت تم نہیں جانتی کہ آج میں کتنا خوش ہوں۔۔۔یوں سمجھو کہ آج میں نے سب کچھ پا لیا ہے۔۔۔"

"خوش تو میں بھی بہت ہوں خوشی۔۔۔لیکن اب چلو ورنہ بارش ہمیں بھگو دے گی۔۔۔" آسمان سے بارش کی بوندیں ٹپکنا شروع ہو گئی تھیں

"تو اچھا ہے نا۔۔تمہیں پتا ہے نا مجھے بارش بہت پسند ہے جنت۔بارش میں بھیگنا بہت پسند ہے مجھے۔۔۔اور بارش میں اگر تم بھی میرے ساتھ ہو تو بس پھر دل چاہتا ہے سب کچھ رک جائے وقت تھم جائے۔۔۔صرف بارش برستی رہے۔اور بارش میں ہم دونوں بھیگتے رہیں۔۔۔" بارش کی بوندیں تیز ہونے لگی تھیں

"خوشی۔۔۔پاگل۔۔۔اٹھو۔۔۔بس اب سب کچھ حاصل ہو گیا نا۔۔۔یہ خواہش بھی پوری ہو گئی آج تمہاری۔" اس کے لمبے بال بارش میں گیلے ہونے لگے۔پانی کی شفاف بوندیں جنت کے چہرے سے ٹپک رہی تھیں

مگر وہ ڈھیٹ بنا بیٹھا رہا۔تو جنت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی خوشی کو وہاں سے اٹھایا

ان دونوں کے تھوڑی دیر پہلے بنائے گئے گیلی مٹی کے گھر بارش کی بوندوں سے مسمار ہونے لگے

تھے مگر دونوں کو اب کوئی فکر نہیں تھی۔۔۔ان کے چھوٹے چھوٹے گیلی ریت کے گھروندوں کو بارش کے قطرے مسمار کر رہے تھے مگر انہیں کوئی فکر نہیں تھی۔ان دونوں نے ایک دوسرے کو پالیا تھا۔اب کچھ بھی کہیں غم باقی نہیں رہا تھا۔

خوشی کو اپنی جنت مل گئی تھی اور جنت کو خوشی۔۔۔

دونوں ہنستے ہوئے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے واپس گھر کی سمت چلنے لگے۔۔

پیچھے سے دریا کا کنارہ ان کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

دونوں ایک ہو گئے تھے۔زندگی مسکرا رہی تھی۔۔۔

ختم شد